علوم و نکات

(مجموعۂ مضامین)

جلد دوم

مؤلف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ

(م: ۲۸؍ ستمبر ۲۰۱۳ء)

(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو، یوپی)

ترتیب

محمد عرفات اعظمی

مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)

فہرست

(۱) مرتب کی جانب سے ۸
(۲) مقدمہ ۱۳

مقالات ومضامین

(۳) قاضی اطہر صاحب۔ معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں ۲۲
(۴) دیار پورب میں علم اور علما۔ قاضی اطہر مبارک پوری کی ایک قابل قدر تصنیف ... ۴۵
(۵) حضرت مولانا نازوار حسین صاحب بحیثیت مترجم ۶۰
(۶) کیا رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں حضرات شیخین شریک نہ تھے؟ ۷۹
(۷) کتب شیعہ کی شہادت ۱۰۲
(۸) تصوف اور علماء دیوبند ۱۰۸
(۹) بہار کا ایک مرد عظیم۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ۱۱۵
(۱۰) نصیحت نامۂ پیر ومرشد ۱۲۹
(۱۱) قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام۔ معارف وحقائق ۱۳۶
(۱۲) سید المجاہدین حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کا ارادۂ حج ۱۴۵
(۱۳) ترجمہ مقدمہ ''الیاقوت والمرجان فی لغات القرآن'' ۱۷۱
(۱۴) فقہی اختلاف رحمت ہیں ۱۸۷
(۱۵) سبیل المومنین سے انحراف ۱۹۱
(۱۶) تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار کی شرعی حیثیت ۲۰۵
(۱۷) جماعت تبلیغ۔ مشورے اور گزارشیں ۲۲۰

(۱۸) تبلیغی جماعت اوراس کے اجتماعات ۲۲۷
(۱۹) بے احتیاطیوں کا طوفان ۲۳۱
(۲۰) صبر ۲۳۵
(۲۱) اخلاص ۲۴۰
(۲۲) اہل بیت کون ہیں؟ ۲۴۳
(۲۳) قوم انصار کی حقیقت وقطب وابدال اور مجذوب کی شرعی حیثیت ۲۴۷

ادارئیے

(۲۴) رسالۃ الاوائل اور ناشر دیوبند ۲۵۸
(۲۵) کتب خانہ محدث کبیر ۲۶۱
(۲۶) محدث کبیر کی سوانح حیات کی ضرورت ۲۶۴
(۲۷) دارالعلوم دیوبند کا نمائندہ اجلاس بسلسلۂ نصاب تعلیم ۲۶۷
(۲۸) حکومت کی پالیسیاں اور مسلمانوں کے کالائحہ عمل ۲۷۰
(۲۹) سیمناروں کے سوال نامے؟ ۲۷۴
(۳۰) بیمہ اور فقہ اکیڈمی کا فیصلہ؟ ۲۸۳
(۳۱) تمہیں بتاؤ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟ ۲۸۸
(۳۲) ایک مجلس کی تین طلاق اور غیر مقلدین کا رویہ ۲۹۲
(۳۳) مملکت سعودیہ عربیہ میں غیر مقلدین کی بدعنوانیاں ۲۹۵
(۳۴) فرق ضالہ اور علمائے حق ۳۰۱
(۳۵) منافق علیم اللسان ۳۰۶
(۳۶) تحریف وتبدل کی ابتدا اور قرآن وحدیث کی وضاحت ۳۱۰

سفرنامے

(۳۷) سفر کاندھلہ اور ایک شاہکار علمی تحفہ ۳۱۷
(۳۸) تحفۂ مدینہ ۳۳۰

(۳۹) تحفۂ بہار..۳۴۷
(۴۰) سفر بنگلہ دیش..۳۶۹
(۴۱) سفر بنگلہ دیش..۳۷۴

تبصرہ وتعارف

(۴۲) وقفۃ مع اللامذہبیۃ..۳۹۶
(۴۳) مسائل غیر مقلدین..۴۱۷
(۴۴) فیضان محبت..۴۲۱
(۴۵) تقریر دلپذیر..۴۲۵
(۴۶) الفوز الکبیر..۴۳۱
(۴۷) صدیق اکبر۔ ایک انسان کامل..۴۳۴
(۴۸) مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینے میں..۴۴۲
(۴۹) افادات صدیق..۴۴۵
(۵۰) حیات ابوالمآثر..۴۴۷
(۵۱) مقالات ابوالمآثر..۴۵۱
(۵۲) نصرۃ الحدیث (عربی)..۴۵۳
(۵۳) تعدیل رجال بخاری..۴۵۵
(۵۴) دار الاسلام اور دار الحرب..۴۵۷
(۵۵) بیمہ اور اس کا شرعی حکم..۴۵۹
(۵۶) عظمت صحابہ..۴۶۱
(۵۷) ابطال عزاداری..۴۶۳
(۵۸) رحمۃ اللہ الواسعۃ..۴۶۴
(۵۹) رحمۃ اللہ الواسعۃ..۴۷۴
(۶۰) رحمۃ اللہ الواسعۃ..۴۷۶

(۶۱) اللؤلؤ والمرجان فی لطائف القرآن..............................۴۸۲
(۶۲) مسئلہ امام مہدی..............................۴۸۴
(۶۳) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں..............................۴۸۷
(۶۴) زندگی سے لطف اٹھائیے..............................۴۸۹

مقدمات وتقریظات

(۶۵) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ بحیثیت فقیہ ومجدد..............۴۹۲
(۶۶) غیر مقلد۔ جماعت یا فرقہ؟..............................۵۰۹
(۶۷) تأثر برحیات ابوالمآثر..............................۵۲۲
(۶۸) جہاد اور شہادت..............................۵۲۶
(۶۹) سیرت نبوی کی جامعیت کا ایک درخشاں پہلو..............................۵۳۶
(۷۰) مقدمہ ’’اخلاق نبوی غزوات کے آئینے میں‘‘..............................۵۴۵
(۷۱) اندلس اور ہندوستان..............................۵۵۰
(۷۲) مقدمہ ’’قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے‘‘..............................۵۵۸
(۷۳) تقریب بر ’’تذکرہ مولانا عبدالقیوم صاحب فتح پوری‘‘..............۵۶۱
(۷۴) تقریظ بر ’’مسجد نبوی میں تراویح عہد بعہد‘‘..............................۵۶۶
(۷۵) چراغ سے چراغ جلا..............................۵۷۰
(۷۶) تقریب بر ’’چند بسیشور‘‘..............................۵۷۴
(۷۷) علماء ومشائخ کے تذکرے کا دینی پہلو..............................۵۷۶
(۷۸) تأثر بر ’’اپنی باتیں‘‘..............................۵۸۰
(۷۹) فیضانِ حکیم الامت..............................۵۸۳
(۸۰) تقریظ بر ’’عمدۃ الاقاویل فی تحقیق الاباطیل‘‘..............................۵۸۷
(۸۱) مقدمہ ’’تبلیغی جماعت کی شرعی حیثیت‘‘..............................۵۹۱.

☆☆☆☆☆☆

مرتب کی جانب سے

والدمحترم (حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نوراللہ مرقدہ) کے حیات مستعار کی کل مدت ۶۳ ؍سال ہے، ان کی فرصت حیات اوران کی علمی، عملی اور قلمی خدمات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ عرصۂ حیات کے اتنے کم لمحات میں انہوں نے اتنی گوناگوں اور متنوع خدمات کیسے انجام دیں؟ خدا کی ذات مسبب الاسباب ہے، وہ جس سے چاہے، جتنا چاہے کام لے سکتی ہے، سہولت وآسانی اورصعوبت وپریشانی اس کے کارخانۂ اسباب سے متعلق ہیں، مگر پھر بھی انسانی دماغ تھوڑی دیر ٹھہر کر سوچنے پر ضرور مجبور ہوگا کہ یہ کیوں اور کیسے ممکن ہوا؟ ۶۳ ؍سال کی زندگی میں ۴۲ ؍سال بلا انقطاع تدریسی خدمات انجام دیں، مرحلۂ تصوف وسلوک طے کیا، ۳۵ ؍سے زائد تصنیفات وتراجم اور ترتیب دادہ کتابوں کی تعداد ہے، اس کے علاوہ وعظ وتذکیر اور تقریر و تعویذ کا بھی عوامی ایک طویل سلسلہ ہے، پھر راہ سلوک طے کرنے والوں کی راہنمائی اوران کا تزکیہ نفس اور رجال سازی اور مردم گری کا وقت طلب کام وہ عرصۂ زیست کے ہر لمحہ میں کرتے رہے، اور پھر مزید یہ کہ ان امور کو انجام دینے کے لئے نہ کوئی تنظیم نہ کوئی تحریک اور نہ کوئی ادارہ قائم کیا، اور نہ کسی سے معاونت طلب کی، سارے کام تن تنہا بذات خود انجام دیا۔

ان کی زندگی کے لمحات اوران کے کاموں کی تعداد دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فرصت حیات کے کسی لمحہ کو ضائع نہیں جانے دیا ہے، انہیں استعمال کیا ہے اور بہترین مصرف میں استعمال کیا ہے۔ اخیر عمر میں جب کہ ضعف وبیماری دونوں اپنے شباب پر تھے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اگر ذرا سی قوت محسوس کرتے تو فوراً لکھنے پڑھنے کے کام میں لگ جاتے شدید ضعف کے زمانے میں بھی میں نے انہیں متواتر دو دو تین تین گھنٹے بیٹھ کر لکھتے ہوئے دیکھا

ہے، کتاب پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے بارے میں تو کچھ مت پوچھئے، خود مجھ سے تاکیداً کہہ رکھا تھا کہ میرے سرہانے کچھ نہ کچھ کتابیں رکھ دیا کرو اور انہیں وقتاً فوقتاً بدلتے رہا کرو، تاکہ مطالعہ کا موضوع بھی کتاب کے ساتھ بدلتا رہے۔

قلمی میدان میں ان کے قلم نے اردو کے نثری ادب میں رائج تقریباً تمام صنف کو برتا ہے، ناول اور افسانہ کو چھوڑ کر تقریباً ہر میدان میں ان کے قلم نے اپنے واضح نقش پا کو چھوڑا ہے، تحقیق وتنقید سے متعلق آپ کو اسی کتاب کی دونوں جلدوں میں متعدد مضامین مل جائیں گے، سوانحی ادب میں ان کی بے مثال کتاب ’’حیات مصلح الامت‘‘، شخصی خاکے میں ’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘ آپ بیتی میں ’’حکایت ہستی‘‘ سفرنامہ میں ’’بطواف کعبہ رفتم‘‘ اور اس کتاب میں شامل مستقل ایک عنوان سفرنامے کا، مکتوباتی ادب میں ’’حدیث دوستاں‘‘ ترجمہ میں ’’برکات زمزم‘‘ مودودی صاحب اپنے افکار وخیالات کے آئینے میں‘‘ اور ’’اخلاق العلماء‘‘ اور ان کے علاوہ ان کی بہت سی مطبوعہ تصنیفات میری اس بات کی منہ بولتی شہادت ہیں۔ ان کے مسودات میں ایک دو تحریریں ہمیں طنز ومزاح اور ظرافت سے متعلق بھی ملی ہیں جن کو اس جلد میں شامل کرنے کا ارادہ تھا مگر ضخامت کے بڑھ جانے کی وجہ سے اسے معرض التوا میں ڈالنا پڑا، ان شاء اللہ کسی اور مناسب موقع سے ان کی یہ تحریریں بھی شائع کی جائیں گی۔

زیر نظر کتاب والد صاحب کے مختلف مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے، مضامین کے علاوہ اس کتاب میں سفرنامے، تبصرہ وتعارف اور مقدمات وتقریظات بھی شامل ہیں۔ مقدمہ و تقریظ کے سلسلے میں عام مشاہدہ یہ ہے کہ جستہ جستہ دیکھ کر یا مصنف ومرتب پر اعتماد کر کے لکھ دیا جاتا ہے، لیکن والد صاحب کا طریقۂ کار اس سے جدا تھا، وہ اس کو ایک طرح کی شہادت سمجھتے تھے، اس لئے کسی کتاب پر مقدمہ وتقریظ لکھنے سے پہلے بالاستیعاب اس کو دیکھتے تھے، اس کے بعد ہی کچھ لکھتے تھے۔ ممبئی میں قیام کے زمانہ میں جب کہ ڈائلیسیس ہو رہی تھی، اور بہت زیادہ ضعف رہتا تھا، اس وقت ایک عالم نے اپنی کتاب کا مسودہ دیا، اور اس پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی، تو محض مسودہ دیکھ کر لکھ نہیں دیا بلکہ پورا مسودہ اس بیماری اور کمزوری میں پڑھا اور اس کے بعد لکھا۔

ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زیادہ احتیاط ہو تو مقدمہ ہو یا تقریظ اس کا حرف

حرف صداقت بن جائے گا، اوراس پر بے دغدغہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں کل چار سفرنامے شامل ہیں، جس میں دو تو محض نام کے سفرنامے ہیں، سفر اور مشاہدات سفر سے متعلق اس میں کچھ بھی نہیں ہے، بلکہ دو اہم کتابوں کا تعارف ہے، ایک سفر کاندھلہ، اور دوسرا التحفۂ مدینہ۔ مگر چونکہ عنوان سفر ہی کا لگا ہے اس لئے ہم نے ان دونوں کو سفر ناموں کے ذیل میں رکھا۔ سفر بنگلہ دیش کا پہلا حصہ مجلّہ الماثر کا اداریہ ہے، والد صاحب کا مستقل سفرنامہ لکھنے کا ارادہ تھا مگر شرمندۂ عمل نہ ہو سکا، اور دوسرا حصہ ہم نے ان کی ذاتی ڈائری سے قدرے حک واضافہ کے ساتھ نقل کیا ہے، اس میں سفرنامے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اس میں بنگلہ دیش کے عالمی اجتماع اور وہاں کے مدارس کے متعلق مشاہدات وتأثرات ہیں۔

مجلّہ المآثر، ماہنامہ ضیاء الاسلام اور انوار العلوم کے لئے لمبے عرصے تک والد صاحب نے اداریئے تحریر کئے ہیں، جن میں سے بیشتر اداریئے ''حدیث درد دل'' میں شائع ہو چکے ہیں، مجلّہ الماثر کے کچھ اداریئے ایسے تھے جن کو بوجوہ والد صاحب نے اداریوں کے اس مجموعہ میں شامل نہیں کرنے دیا، ہم نے تمام اداریوں کو ''اداریئے'' کے عنوان کے تحت جمع کر دیا ہے۔

کتاب میں غالب تعداد مضامین ومقالات کی ہے، جن میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن سے بہت سے آبگینۂ دل کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے، یعنی ان میں تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار اور اس کے اعتدال سے تجاوز کرنے پر دلائل ومشاہدات کی روشنی میں گرفت کی گئی ہے، ممکن ہے کہ تبلیغی احباب کو یہ ناگوار گزرے مگر ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ کوئی بھی فرد یا جماعت غلطی سے مبرا نہیں ہے۔ صحابہ کرام کی جماعت اور ان کا طریقۂ کار ہی معیار حق وصداقت ہے، کیوں کہ وہ بارگاہ نبوت کے تربیت یافتہ اور وہاں سے مبعوث تھے، ان کے بعد کسی بھی تحریک یا جماعت کے صحیح ہونے کے لئے ان کے قائم کردہ خطوط پر ثابت قدم رہنا ضروری ہے، ورنہ اس کے غلط ہونے میں کوئی دورائے نہیں ہے۔ رہی از دیاد منفعت کی بات تو وہ کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، بہت سی تحریکیں مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے بظاہر بہت فائدہ ہے مگر حقیقت میں وہ صراط مستقیم سے منحرف ہیں۔ تبلیغی جماعت ابتداءِ کار میں بانی کے خلوص اور بار بار علما کی جانب مراجعت کی وجہ سے بالکل درست خطوط پر کام کر رہی تھی، مگر افسوس کی دیگر تحریکوں کی طرح عموماً

جیسا کہ تحریک کا مزاج ہوتا ہے یہ جماعت بھی غلو اور علما سے بے نیازی کی راہ پر چل پڑی، چونکہ یہ اپنی ہی جماعت کا ایک حصہ ہے، اس لئے درست راستے کی راہنمائی کے لئے بعض علما نے ....جنہیں خدا نے غیر معمولی دینی حمیت وغیرت عطا فرمائی ہے ....ٹوکا، اگرچہ ان کی تعداد ابھی تک بہت کم ہے، اس ٹوکنے کے نتیجے میں انہیں دنیاوی خسران اور تبلیغی احباب کی ناراضگیاں ہی ابھی تک ہاتھ لگیں ہیں مگر **الحق احق ان یقال**

پھر یہ کہ مثبت تنقید بھی ایک ضروری امر ہے، اور اس کا سلسلہ ابتداءِ اسلام ہی سے جاری ہے، احادیث وآثار کے اتنے بڑے ذخیرے میں جو آج جزم ویقین کے ساتھ کسی روایت کے بارے میں حدیث رسول ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے وہ اسی مثبت تنقید کی برکت ہے۔ تنقید اگر مثبت ہو اور خلوص کے ساتھ ہو تو یہ بہت بڑے خیر کا ذریعہ ہے، اس سے افساد نہیں بلکہ اصلاح کا دروازہ کھلتا ہے، الا یہ کہ جس پر تنقید کی جارہی ہو اس کی طبیعت میں ہی کجی اور فساد کا عنصر ہو تو ہر طرح کی تنقید فساد ہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ نقد کرنے والا کس انداز سے نقد کررہا ہے؟ انداز تنقید خود واضح کردے گا کہ ناقد کا مقصد کیا ہے؟ نہ یہ کہ ہماری محبوب و مالوف چیز پر فلاں نے نقد کیا ہے یا اس سے اختلاف کرتا ہے، اس لئے وہ ہمارا مخالف ہے، اس کی ہر بات بلا سوچے سمجھے اور بغیر جانچے پرکھے لائقِ رد ہے، اگر وہ کوئی بات کہتا ہے تو یہ سوچ کر کہ وہ ہمارا مخالف ہے اس کی بات کو سنا ہی نہ جائے، یہ طریقۂ کار غلط ہے۔ اختلاف اور مخالفت میں فرق ہوتا ہے، اختلاف دلائل کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اس میں خلوص اور خیر خواہی کا بھی پہلو ہوسکتا ہے، اور مخالفت بے جا ضد وعناد اور محض تحزب وعصبیت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس لئے اختلاف کرنے والے کی بات کو غور سے سن کر یا پڑھ کر اور اس کے دلائل کو سنت وشریعت کی روشنی میں پرکھ کر اپنا محاسبہ کرنا چاہئے، اگر اس کی بات صحیح ہے تو اسے قبول کرنا چاہئے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

یہ طولانی تمہید محض اس لئے ہے تاکہ تبلیغی اکابر واحباب تبلیغی جماعت سے متعلق اس میں شامل مضمون دیکھ کر سیخ پا نہ ہوں، بلکہ اس کو پڑھیں اور لکھنے والے کی دردمندی، خیر حواہی اور سوز دروں کو محسوس کریں، اور یہ بھی دیکھیں کہ لکھنے والے نے ان کی مخالفت کی ہے یا دلائل کی

روشنی میں ان کے موجودہ طریقۂ کار سے اختلاف کیا ہے۔ ہر پڑھنے والا صاف طور سے محسوس کرے گا کہ یہ مخالفت نہیں بلکہ اختلاف ہے، جو انہی کی بہی خواہی اور خیر خواہی کے واسطے کیا گیا ہے، اس میں اختلاف کرنے والے کی نہ کوئی ذاتی منفعت ہے اور نہ کوئی دنیاوی غرض ہے، خالصۃً لوجہ اللہ تبلیغی احباب کی درست راہنمائی کی ایک کوشش ہے۔ اللہ کرے یہ کوشش بار آور ہو۔

اخیر میں استاذ محترم مولانا ضیاء الحق صاحب خیر آبادی، مولانا محمد عابد صاحب اور مولانا محمد عامر صاحب کا ذکر خیر اور شکریہ ضروری ہے کہ انہیں حضرات کی راہنمائیوں، تعاون اور حوصلہ افزائی نے اس کتاب کو مرحلۂ تکمیل تک پہونچایا۔ خدا کرے کہ صاحب مضامین کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی حسن قبولیت حاصل کرے اور ان کے حق میں صدقۂ جاریہ بنے۔ آمین

محمد عرفات اعظمی
۲۰۱۵/۵/۶

☆☆☆☆☆☆

مُقَدِّمَہ

حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ ایک جامع الجہات شخصیت کے مالک تھے، وہ بیک وقت بہترین معلم ومربی، سحر نگار انشا پرداز وادیب، بے مثال مقرر و خطیب اور ایک طرف دین وشریعت کے راز دار تھے تو دوسری طرف سلوک وطریقت کے نکتہ داں اور اداشناس بھی تھے۔ خود ان کے بقول کہ انھیں سب سے کم مناسبت قرطاس وقلم سے ہے، اس کے باوجود ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد دو درجن سے زائد ہے، جن میں سوانح، شخصی خاکے سفر نامے، آپ بیتی، مکاتیب، فقہی مضامین، تبصرے اور مقدمے وتقریظات سب شامل ہیں، بعض کتابیں تو چھ سات سو صفحات پر مشتمل ہیں، جب حضرات اہل ذوق ان کی تحریر پڑھتے ہیں تو ان کے طرز واسلوب پر بے ساختہ ان کی زبانوں پر داد وتحسین اور ستائش وآفریں کے کلمات آجاتے ہیں۔

میرے دوست مولانا محمد اللہ قاسمی (شعبہ انٹرنیٹ دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا کے اسلوب نگارش کے متعلق رقم طراز ہیں:

> طرز نگارش نہایت شستہ، سبک اور بہتے پانی (اور گرتے ہوئے آبشار) کی مانند رواں دواں تھا۔ انداز تحریر سے قادر الکلامی اور کہنگی کی جھلک صاف محسوس ہوتی تھی، جس میں کلاسیکی خوبیوں کے ساتھ علمی وادبی چاشنی بھی برابر موجود ہوتی تھی۔ انھیں ٹھیٹھ اردو الفاظ کے برمحل استعمال پر بڑی قدرت تھی۔
>
> مولانا بلا کے ذہین اور مطالعہ کے رسیا تھے۔ بڑے ثاقب الذہن اور اخاذ طبیعت کے مالک تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ جس طرح وہ مطالعہ سے علوم ومعارف کے جواہر اخذ کرتے تھے اسی طرح

وہ طرز واسلوب اور زبان وبیان کی خوبیوں کے موتی بھی سمیٹتے جاتے تھے جو دوران تحریر اُن کے قلم سے چھن چھن کر قرطاس وقلم کی سلامی قبول کیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا کی تحریر کو پڑھنے والا ہر شخص اس کی ہو بہو تصدیق کرے گا۔

یہ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کے مقالات کی دوسری جلد ہے، اس کی پہلی جلد پر اس خاکسار اپنے تاثرات تحریر کئے تھے۔ اس کو وہاں ملاحظہ کر لینا چاہئے۔ جلد اول کے تقریباً سبھی مقالات علمی وفقہی نوعیت کے تھے اور اس جلد میں ان مقالات کو اکٹھا گیا ہے جو مختلف موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ جس موضوع پر بھی کچھ لکھا گیا اس کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی، جیسے قاضی قاطہر مبارکپوریؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ''دیار پورب میں علم اور علماء'' کا تعارف اور اس کی تلخیص پیش کی گئی، اس مضمون کو پڑھ کر پوری کتاب کا خلاصہ سامنے آجاتا ہے، اسی طرح ایک مضمون ہے ''مولانا زوار حسین صاحب بحیثیت مترجم'' مولانا موصوف پاکستان کے ایک صاحب نسبت بزرگ اور صاحب قلم عالم وفقیہ تھے، حضرت مولانا نے ان کی مترجمانہ خصوصیت کو ذکر کرنے سے پہلے نفس ترجمہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اسے ضرور ملاحظہ کرنا چاہئے، اس سے حضرت مولانا کی اس موضوع پر گہری نظر اور بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:

> ''ترجمہ کا کام ایک مشکل کام ہے، اس سے عہدہ برآ ہونا بڑی مہارت اور حذاقت کو چاہتا ہے، طبع زاد تصنیف میں مصنف آزاد ہوتا ہے، جن معلومات کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے، انھیں اپنی تعبیر، اپنے اسلوب اور اپنے انداز میں ڈھال لیتا ہے، اختصار کے ساتھ ہو یا تفصیل کے ساتھ! ایجاز کے ساتھ ہو یا اطناب کے ساتھ!
>
> لیکن ترجمہ کرنے میں وہ دوسرے کا پابند ہوتا ہے، اسے مصنف کی زبان میں مصنف کی مراد سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے، پھر ضروری ہوتا ہے کہ اس کی مراد کو بعینہ دوسری زبان میں منتقل کرے، اس پابندی کو نبھانے کے لئے مترجم کو
>
> (۱) دو زبانوں کا ماہر ہونا ضروری ہے، ایک اصل کتاب کی زبان کا، دوسرے ترجمہ والی زبان کا۔ ہر ایک کے اسالیب اور تعبیرات سے وہ کما حقہ واقف ہو، تا کہ مصنف کی مراد اور اس

کے مقصد کو سمجھ سکے، اور پھر دوسری زبان کی اسی تعبیر میں اسے ادا کرے، جو تصنیف کے اسلوب وتعبیر کے مترادف ہو، اگر اس نے مصنف کا مقصد نہیں پایا تو ترجمہ غلط ہوگا، اور اگر اس کا مقصد تو پا گیا، مگر ترجمہ کی زبان میں اس کی تعبیر نہ پا سکا تو مطلب الجھ کر رہ جائے گا۔

(۲) اسی طرح ہر فن میں کچھ اصطلاحی الفاظ ہوتے ہیں، اصطلاحات کا ترجمہ اور مشکل ہوتا ہے، اصل کتاب کی اصطلاحات کو سمجھنا، پھر اس کے مفہوم کو دوسری زبان میں ادا کرنا بغایت دشوار ہوتا ہے، بالخصوص اگر اس کی مترادف اصطلاح دوسری زبان میں موجود ہو، تو اس کی تلاش اور اس کا استعمال بہت وسعت نظر اور دقت نظر کو چاہتا ہے۔

(۳) ہر زبان کا نحوی وصرفی قواعد اور ترکیب الفاظ کے اعتبار سے ایک خاص مزاج اور اسلوب ہوتا ہے، ترجمہ میں اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے، ترجمہ اسی ترکیب واسلوب کے مزاج میں ہو، نرا لفظ کے نیچے لفظ کا ترجمہ، جیسا کہ درس وتدریس میں کبھی بضرورت اختیار کرنا پڑتا ہے، تصنیف میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔

(۴) ہر زبان میں کلمات کے درمیان ربط کے لئے کچھ حروف ہوتے ہیں، جنھیں حروفِ جر، حروفِ ربط یا صلہ کہا جاتا ہے، ان حروف کے استعمال کا طریقہ ہر زبان میں علٰیحدہ ہے، انھیں جاننا بہت ضروری ہوتا ہے، ورنہ ترجمہ خبط ہوکر رہ جائے گا۔

(۵) مترجم کو اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ترجمہ کی عبارت اصل عبارت سے بہت زیادہ بڑھنے نہ پائے، مترجم کو اگر دونوں زبانوں پر قدرت ہوتی ہے اور مفہوم کو صحیح طور سے پالیتا ہے تو اصل عبارت کے مطابق ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، اور اگر اس میں کچھ خلل ہوتا ہے تو مطلب ادا کرنے کے لئے اسے طول طویل عبارت لانی پڑتی ہے، یہ ترجمہ کا عیب ہے۔

(۶) پھر ترجمہ اتنا واضح اور سلیس ہونا چاہئے کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ مطلب ذہن نشین ہوتا چلا جائے، پڑھنے والا اگر خود صاحب فن ہے تو اسے کہیں الجھن نہ ہو۔

(۷) پھر مترجم کو دیانت دار بھی ہونا چاہئے کہ مصنف نے جس نظریہ کو پیش کیا ہے، مترجم بعینہٖ اسی کو پیش کرے، کوئی تصرف اس میں نہ کرے، اگر اسے اختلاف ہو تو حاشیے میں ظاہر کرسکتا ہے، مگر اس طرح ترجمہ کرنا کہ اصل نظریہ ہی تبدیل ہوجائے درست نہیں۔''

ایک بہت اہم مضمون ''کیا رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں حضرات شیخینؓ شریک نہ

تھے؟‘‘ ہے، اس میں مدلل طور پر ثابت کیا گیا ہے، حضرات شیخین (حضرت صدیق اکبر وفاروق اعظمؓ) رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں شریک تھے۔

اس میں ایک مضمون ’’سبیل المومنین سے انحراف‘‘ ہے، جو مشہور عالم اور نامور خطیب مولانا سید سلمان صاحب ندوی کے ایک علمی اور فکری انحراف کا احتساب اور تردید ہے۔

انہوں نے دعوی کیا کہ ’’علم دین‘‘ صرف وہی نہیں ہے جسے اب تک علما علم دین قرار دیتے چلے آرہے ہیں، یعنی قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ کا علم! بلکہ علم دین کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس دائرے میں وہ علوم بھی آتے ہیں جنہیں لوگ غلط فہمی سے ’’علم دنیا‘‘ سمجھتے ہیں، انجینئری، ڈاکٹری، سائنس اور اس کے مختلف شعبے حتی کہ صنعتیں مثلا بڑھئی گری، لوہاری، سناری، معماری، وغیرہ کی صنعتیں یہ سب علم دین کے زمرے میں آتی ہیں۔ اس کی تائید میں انہوں نے قرآن کی آیتیں پیش کیں، لیکن ان آیتوں نے ان کے دعوی کی جب تصدیق نہیں کی تو تفسیر بالرائے کے ذریعے ان سے اپنے دعووں کی تصدیق حاصل کرنی چاہی۔

حضرت مولانا نے اس کا جو احتساب کیا ہے اسے پڑھ کر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ سب صرف خطابت کا فسوں اور بیان کی ساحری کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

اسی طرح ماہنامہ ضیاء الاسلام میں سوال واستفسار کا کالم شروع کیا گیا تھا، اس میں حضرت مولانا نے کئی سوالوں کے جوابات بہت تفصیل سے دئے تھے، اسے بھی اس مجموعہ میں شامل کردیا گیا ہے۔

اس میں بعض عربی تحریروں کے ترجمے بھی ہیں، اس سے مترجم کی دونوں زبانوں پر بے پناہ قدرت کا پتہ چلتا ہے، جیسے حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجویؒ کی کتاب ’’الیاقوت و المرجان فی لغات القرآن‘‘ کے مقدمہ کا ترجمہ جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ نے لکھا ہے، اسی طرح رابطہ عالم اسلامی کی ایک قرارداد کا ترجمہ جس کا عنوان ’’فقہی اختلاف رحمت ہیں‘‘ ہے۔

اس کا ایک اچھا خاصا حصہ کتابوں کے تعارف وتبصرہ پر مشتمل ہے، اس سے زبان و ادب سے آپ کی گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے، اس میں بطور خاص ان کتابوں پر تبصرے پڑھ پر

تبصرہ نگار کی وسعت نگاہ سامنے آتی ہے۔ **وقفة مع اللامذهبية**، مولفہ مولانا محمد ابوبکر غازی پوری، صدیق اکبر: ایک انسان کامل مترجمہ ڈاکٹر بدر الدین الحافظ، اس پر جو تبصرہ ہے وہ بطور خاص پڑھنے کے لائق ہے اس سے تبصرہ نگار کی عربی زبان وادب پر قدرت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب کے بارے میں تبصرہ نگار کا کہنا ہے کہ: ''یہ کتاب اغلاط کا عجائب خانہ ہے، کوئی صفحہ ترجمہ کی غلطی سے شاید ہی خالی ہو، اور غلطیاں بھی ایسی کہ نا قابل توجیہ! بعض ابواب تو اول سے آخر تک اغلاط کا مجموعہ ہیں۔'' رحمۃ اللہ الواسعہ، مولفہ: مفتی سعید احمد پالن پوری۔ تقریر دلپذیر (حضرت نانوتویؒ) الفوز الکبیر مترجمہ: مفتی سعید احمد پالن پوری۔

اس کے بعد ایک بڑا حصہ مقدمے اور تقریظات کا ہے، جس میں آپ نے کتاب کے متعلقہ موضوع کا نہایت جامع تعارف کرایا ہے، خصوصاً مولانا طاہر حسین صاحب گیاوی کی کتاب "**احسن التنقیح**" کا مقدمہ، مولانا انوار احمد صاحب خیرآبادی کی کتاب ''شہدائے اسلام'' اور ''امہات المومنین'' کے مقدمے، خود میری کتاب ''اندلس میں اسلام'' کے مقدمہ کا ابتدائی حصہ تو زبان وادب کا شاہکار ہے۔ اس میں کچھ سفرنامے ہیں، جیسے ''تحفۂ بہار'' اس میں رودادِ سفر کے ساتھ ساتھ تذکیر وموعظت کا بھی ایک بڑا حصہ ہے، پڑھنے والا مصنف کے سوز دروں کو جگہ جگہ محسوس کرے گا۔ کئی ایک سفر میں احوال سفر کے ساتھ کئی شخصیات اور کتابوں کا بہت عمدہ تعارف کرایا گیا ہے، جیسے تحفۂ مدینہ منورہ، وسفر کاندھلہ۔ تحفۂ مدینہ منورہ کو تو پڑھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ اللہ کی شان بے نیازی دیکھئے کہ جب وہ کسی سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو ایسے اسباب پیدا کردیتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، ایک شخص ایک غیر مسلم گھرانے میں کفر وشرک کی تاریکیوں میں جنم لیتا ہے، توفیق الٰہی ایمان وہدایت کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے، مختلف صعوبتوں سے گزر کر وہ عمر آباد کی ایک دینی درسگاہ میں پہونچ کر علوم دینیہ سے بہرہ ور ہوتا ہے، پھر وہ مدینہ یونیورسٹی، جامعہ ام القریٰ اور جامع ازہر جیسے اداروں میں پہونچتا ہے اور علم وفضل کی دنیا میں مولانا ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن الاعظمی کے نام سے شہرت دوام پاتا ہے۔ **ذلک فضل ا للہ یوتیه من یشاء** اس مضمون میں مولانا ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ کی ایک بہت اہم خدمت حدیث کا ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک عظیم الشان منصوبہ بنایا، اوراس میں یکسوئی کے ساتھ منہمک ہوگئے، وہ منصوبہ یہ ہے کہ جہاں جہاں جس جس کتاب میں صحیح اور حسن مرفوع حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں سب کو یکجا کردیا جائے، یہ کام بہت ہمت طلب اور پُر مشقت ہے، اس کے لئے تمام ذخائر حدیث کا مطالعہ کرنا ، ان میں سے صحیح یا حسن مرفوع روایتوں کو تلاش کرنا، پھران کی صحت کے متعلق دلائل مہیا کرنا، انھیں مرتب کرنا، ایک طویل اور مسلسل جہد ومشقت کا عمل ہے، ایک عرصہ ہوا کہ مولانا اسی محنت وکاوش میں لگے ہوئے ہیں، وہ فرمارہے تھے کہ میری نیت ہے کہ سب صحیح حدیثیں جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے اور وہ صحت کے ساتھ ثابت ہیں، اور جو دین کی بنیاد ہیں، میں یکجا کرکے حضورا کرم ﷺ کی خدمت میں پیش کردوں، اس کے واسطے سے حضورا کرم ﷺ کی صحبت میں میری حاضری ہوجائے اور اللہ کی رضا حاصل ہوجائے۔

مولانا نے اپنے اس عظیم منصوبہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

قسم اول: ایمان، علم، عبادات
قسم ثانی: معاملات واحکام
قسم ثالث: تفسیر، سیرۃ، مغازی، مناقب، ادعیہ، گزشتہ انبیاء واقوام وملل کے واقعات

اس منصوبہ کے دو حصے بفضل اللہ وعونہ پورے ہوچکے ہیں، جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہیں، ان کے مجموعی صفحات ۷۲۰۰ ہیں، اوران میں حدیثوں کی تعداد ۶۸۰۰ ہے۔

اب مولانا تیسری قسم مرتب کررہے ہیں، فرمارہے تھے کہ سیرت نبوی پر کام چل رہا ہے، غزوۂ احد تک پہونچا ہوں۔

یہ منصوبہ مولانا نے ۱۴۲۲ھ میں شروع کیا تھا، اورامید ہے کہ ۱۴۳۵ھ میں تکمیل کو ان شاءاللہ پہونچے گا۔

مولانا فرمارہے تھے کہ صحاح ستہ میں کل صحیح حدیثیں بغیر تکرار کے سات ہزار سے کچھ زائد ہیں، اوراتنی ہی ان کے علاوہ میں بھی ہیں، اس طرح تقریباً پندرہ ہزار متونِ حدیث جمع ہوجائیں گی، ان شاءاللہ، اس مجموعہ کا نام مولانا نے ''**الجامع الكامل فی الحديث الصحيح الشامل**'' رکھا ہے۔

> مولانا نے فرمایا کہ میری تلاش وجستجو کے مطابق حدیث کے تمام ذخائر میں ساٹھ سے ستر ہزار کے درمیان حدیثیں ہیں جو تقریباً تین لاکھ سندوں سے مروی ہیں، لیکن یہ حدیثیں بکثرت سندوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مکرر سہ کرر ہیں، تکرار سے خالی کر کے جب حدیث صحیح کے متون کو منتخب کیا جائے گا تو ۱۲ سے ۱۵ ہزار کے درمیان ہوں گے۔

’’سفر کاندھلہ اور ایک شاہکار علمی تحفہ‘‘ میں مولانا نورالحسن راشد صاحب کی تصنیف ’’قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، احوال وآثار وباقیات ومتعلقات‘‘ کا تعارف، اس کی فروگزاشتوں کی نشاندہی اور اس کے سلسلے میں کچھ مشورے دیئے گئے ہیں۔

مولانا لکھتے ہیں:

> ’’حضرت نانوتوی قدس سرہ کے حالات پر یہ کتاب سیرت وسوانح کے انداز پر کوئی مسلسل تحریر نہیں، یہ فرض تو مشہور صاحب قلم، مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے صاحب نظر عالم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نوراللہ مرقدہ ’’سوانح قاسمی‘‘ کے نام سے ادا کر چکے ہیں، لیکن حیات قاسم کے بہت سے گوشے ابھی مخفی تھے، کئی تحریریں ابھی غیر مطبوعہ تھیں، غیر مطبوعہ مکاتیب کا بھی خاصا ذخیرہ ہے، جو بجائے خود علم وحکمت کے شاہکار ہیں، زیر نظر کتاب میں وہ مخفی گوشے نمایاں کئے گئے ہیں، اور غیر مطبوعہ مضامین ومکاتیب کی تحقیق کی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے علمی وتصنیفی کارناموں کے متعلق متعدد رسائل کا مجموعہ ہے، ان رسائل کے عنوانات ملاحظہ ہو۔
>
> (۱) آئینۂ کمالات (۲) مرقومات قاسمی (۳) متاع دلفروز (۴) افادات قاسمی (۵) مآثر قاسمی (۶) رہنمائے راہ‘‘۔

کچھ مقالات دور حاضر کی مفید وہمہ گیر تحریک ’’تبلیغی جماعت‘‘ سے متعلق ہیں، جس میں اس کی بعض بے اعتدالیوں اور افراط وتفریط کی نشاندہی کی گئی ہے اور اکابرین جماعت کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ان معروضات پر غور کریں اور اس کی روک تھام کی کوشش کریں ورنہ فتنوں کا ایک دروازہ کھل جائے گا، اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا اس کی سطر سطر سے لکھنے والے کے خلوص اور دردمندی کو محسوس کیا جا سکتا ہے، اس سے لکھنے والے کا کوئی ذاتی نفع ونقصان متعلق نہیں ہے، محض ایک دینی فریضہ سمجھ کر لکھا گیا، میں نے جلد اول کے مقدمے میں لکھا تھا کہ:

> ’’اخلاص وللّٰہیت کے فقدان کے اس دور میں جبکہ قلوب کے اندر انا پرستی ونفسانیت روز افزوں ہے بہت کم ارباب علم خالص اللہ کے لئے نقد وتبصرہ کی ہمت وجرأت کر پاتے ہیں، اور ایک بات کو درست سمجھتے ہوئے بھی اس کے اظہار سے گریز کر جاتے ہیں، جس کی وجہ سے خاصا التباس واشتباہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب تک علماء اسلام کے اندر اخلاص وللّٰہیت کی دولت بے بہا تھی وہ نقد پر خوش ہوتے تھے، اگر کسی نے ان کی غلطی پر متنبہ کیا تو اس کے شکر گزار ہوتے تھے، لیکن اب ایسا کم ہوتا ہے بلکہ بالعموم اب تنقید کا جواب تنقیص اور بسا اوقات تحقیر سے بھی دیا جاتا ہے اور معاملہ ابتذال تک بھی جا پہونچتا ہے، لیکن اللہ کے کچھ خاص بندے ہر دور اور ہر عہد میں ایسے رہے ہیں جنھیں اللہ سچائی اور حقیقت کے اظہار کے لئے غیر معمولی حوصلہ اور جذبہ عطا کرتا ہے، **وهم قليلون جداً**‘‘

کسی بھی تحریر کو پڑھتے وقت یہ مذکورہ باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، اور جو بات کہی گئی ہے اسے دیکھنا چاہئے کہ وہ صحیح ہے یا غلط، صحیح ہو تو مان لینا چاہئے اور اگر غلط ہے تو اس کی غلطی کو واضح کر دینا چاہئے۔

اس کے علاوہ کچھ اداریئے ہیں جو حدیث دردِل کی اشاعت کے بعد لکھے گئے، اور کچھ الماآثر کے اداریئے ہیں جو حدیث دردِل میں نہیں آسکے تھے۔ یہ اس جلد کا ایک اجمالی اور سرسری تعارف ہے، مطالعہ کے بعد قارئین خود اس کی اہمیت ووقعت کو محسوس کریں گے۔

پہلی جلد کی طرح یہ دوسری جلد بھی تمام تر عزیزم مولانا محمد عرفات سلّمہٗ کی سعی وکاوش کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل وذہن وقلم میں برکت دیں اور مزید خدمات علمیہ کی توفیق بخشیں، اور اس خدمت کو شرف قبولیت سے نوازیں اور انھیں بہترین صلہ دیں۔ آمین

ضیاء الحق خیرآبادی
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۳۶ھ
۵؍مئی ۲۰۱۵ء سہ شنبہ

☆☆☆☆☆☆

مقالات ومضامین

(۱) قاضی اطہر صاحب۔ معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں
(۲) دیار پورب میں علم اور علما۔ قاضی اطہر مبارک پوری کی ایک قابل قدر تصنیف
(۳) حضرت مولانا زوار حسین صاحب بحیثیت مترجم
(۴) کیا رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں حضرات شیخین شریک نہ تھے؟
(۵) کتب شیعہ کی شہادت
(۶) تصوف اور علماء دیوبند
(۷) بہار کا ایک مرد عظیم۔ شیخ شرف الدین یحیٰ منیری
(۸) نصیحت نامۂ پیر ومرشد
(۹) قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام۔ معارف وحقائق
(۱۰) سید المجاہدین حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کا ارادۂ حج
(۱۱) ترجمہ مقدمہ ”الیاقوت والمرجان فی لغات القرآن“
(۱۲) فقہی اختلاف رحمت ہیں
(۱۳) سبیل المومنین سے انحراف
(۱۴) تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار کی شرعی حیثیت
(۱۵) جماعت تبلیغ۔ مشورے وگزارشیں
(۱۶) تبلیغی جماعت اور اس کے اجتماعات
(۱۷) بے احتیاطیوں کا طوفان
(۱۸) صبر
(۱۹) اخلاص
(۲۰) اہل بیت کون ہیں؟
(۲۱) قوم انصار کی حقیقت وقطب وابدال اور مجذوب کی شرعی حیثیت

قاضی اطہر صاحب

معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ **المعاصرة اهل المنافرة**، ہم عصر ہونا باہمی منافرت کی بنیاد ہے، یہ کہاوت تجربہ کی روشنی میں بہت حد تک صحیح ہے، دیکھا یہی جاتا ہے کہ، لوگ اپنے ہم عصر اصحابِ کمال کے اعتراف میں عموماً بخل سے کام لیتے ہیں، ان کی خوبیاں نظر انداز کر دیتے ہیں، بسا اوقات باہمی چشمک اور حسد کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن اس مثل سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے تواضع اور سادگی کا جذبۂ فراواں رکھا ہے۔ یہ حضرات اپنی فطری تواضع کی بنا پر اصحاب کمال بلکہ بے کمالوں کے سامنے بھی جھکے رہتے ہیں، اور ان کے سامنے اپنے کو اس طرح پیش کرتے ہیں، جیسے انھیں کوئی عظمت حاصل نہ ہو اور دوسرے کو تمام عظمتیں حاصل ہوں، اور یہ معاملہ از راہ تصنع نہیں ہوتا، انھیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں ہوں تو بڑا، لیکن از راہ تواضع خود کو چھوٹا بنا کر پیش کر رہا ہوں۔ ایسا کوئی شائبہ ان کے دل میں نہیں ہوتا، وہ واقعی دل وجان سے خود کو چھوٹا دوسروں کو بڑا دیکھتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے حق تعالیٰ کے دستور **من تواضع لله رفعه الله** کا ظہور ہوتا ہے، کہ جو اللہ کے لئے پستی اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

حضرت قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ ایسی ہی مستثنیٰ شخصیات میں ہیں، آپ جتنے بھی مضامین اس نمبر [۱] میں اور اس کے علاوہ دوسرے جرائد ومجلّات میں مختلف اہل علم حضرات کے قلم سے پڑھیں گے، سب قاضی صاحب کی تواضع، کسر نفسی اور سادگی کا ذکر کرتے ہیں، جن

لوگوں نے قاضی صاحب کو دیکھا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ قاضی صاحب میں دینی غیرت اور خودداری گوکہ بہت تھی، مگر ان میں کبر ونخوت کا شائبہ نہ تھا۔ بلکہ سچی تواضع اور بےنفسی ان کی طبیعت اور مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی، وہ بہت بڑے تھے، بہت نامور صاحب علم تھے، کثیر التصانیف بزرگ تھے، اعلیٰ درجے کے محقق تھے، اور انھیں معلوم تھا کہ علم وتحقیق میں ان کا پایہ کتنا بلند ہے، مگر جب کسی سے ملتے تو نہ اپنی کسی بڑائی کا اظہار کرتے، نہ اپنے علم کا دباؤ ڈالتے، ہر شخص سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو، بےتکلف ملتے، بسا اوقات اسی کی زبان میں بات کرتے، جو انھیں پہلے سے نہ جانتا ہوتا اسے احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ علمی دنیا کی ایک عظیم ہستی سے مل رہا ہے۔

قاضی صاحب کی اسی تواضع کا اثر تھا کہ معاصرین کو ان سے حسد کرنے اور ان کا رتبہ گھٹانے کا موقع ہی نہ مل پاتا تھا، قاضی صاحب کے انداز اور ان کے معاملات سے ہر شخص محسوس کرتا کہ وہ اسے بلند رتبہ دے رہے ہیں، پھر کوئی کس بنا پر نفرت کرے۔ وہ تو محبت کا اسیر ہوکر رہ جاتا ہے، اس سلسلے میں اکابر تو خیر اکابر ہیں، وہ جو چھوٹے ہیں، بہت چھوٹے ہیں، ان کے ساتھ بھی ان کے رتبے اور درجے سے بڑھ کر قاضی صاحب معاملہ فرماتے۔

قاضی صاحب کو معاصرین کس نگاہ سے دیکھتے تھے؟ قاضی صاحب کا رتبہ ان کے نزدیک کیا تھا؟ اس کی کچھ جھلکیاں ان مکاتیب ومراسلات میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو معاصر علماء نے انھیں لکھے ہیں، قاضی صاحب کی عظمت یہاں بھی جھلکتی ہے کہ انھوں نے خطوط کا بڑا ذخیرہ نہایت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا، ملک کے بہت سے نامور علماء اور بڑے اصحاب علم نے یہ خطوط لکھے ہیں۔ ہم اس مضمون میں ان معاصر علماء کے خطوط کے کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمۃ المتوفی ۱۹۹۲ء:

ہمارے علم میں ہندوستان کے بڑے علماء میں سب سے قدیم اور مستحکم تعلق محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہٗ کے ساتھ تھا۔ قاضی صاحب کے دل میں ان کی بڑی عظمت تھی، اور مولانا اعظمی بھی قاضی صاحب کے بڑے قدرداں تھے، دونوں حضرات میں ملاقاتوں کے علاوہ مراسلت کا سلسلہ بلاانقطاع جاری رہتا تھا، میرے پاس حضرت محدث کبیر کے خطوط کا ایک حصہ موجود ہے، یہ ۱۰/ مارچ ۱۹۵۹ء سے ۳/ مارچ ۱۹۸۱ء تک کے مکاتیب ہیں۔

ان کی تعداد ۶۸ر ہے، اللہ جانے ان کے علاوہ اور کتنے خطوط ہوں گے۔ یہ خطوط زیادہ تر علمی کتابوں کی تحقیق وتفتیش، گھریلو نجی حالات اور سفر وغیرہ سے متعلق ہیں، ان کی سطر سطر سے بے تکلفی، بے ساختگی، محبت وتعلق کی گرمی اور باہم مخلصانہ مناسبت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے، چند ایک خطوط کے اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں، حضرت مولانا اعظمی اور قاضی صاحب کو یہ خیال ہوا کہ ایک علمی وتصنیفی اور نشر واشاعت کا ادارہ قائم کیا جائے، جو علمی وتحقیقی کاموں کا مرکز ہو، اس کیلئے غور وفکر اور باہم مشورے ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں دو جگہیں زیر غور تھیں، مئو اور بمبئی۔ مئو میں حضرت مولانا اعظمی تھے، بمبئی میں قاضی صاحب رہتے تھے، ایسا ادارہ غالباً مولانا چاہتے تھے کہ بمبئی میں ہو اور قاضی صاحب چاہتے تھے کہ مئو میں ہو۔ قاضی صاحب نے اس کیلئے کوشش بھی کی تھی، مگر حضرت مولانا اِدھر کے حالات سے مطمئن نہ تھے، چنانچہ ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

> ”مالیگاؤں میں ۱۹ر دن لگ گئے، اس کے بعد بمبئی آنے کا موقع نہیں معلوم ہوا، نیز بڑا محرک آنے کا یہ خیال تھا کہ آپ سے، یحییٰ زبیر سے بمبئی میں کسی ادارہ کیلئے بات ہوئی ہوگی، جب معلوم ہو گیا کہ یہ بات نہیں ہے، تو کوئی خاص محرک نہیں رہا، اپنے قرب وجوار میں اب بھی میرا خیال یہی ہے کہ جیسا ادارہ آپ چاہتے ہیں، قائم ہونا مشکل ہے، اسی طرف (بمبئی میں) ایسے ادارے قائم ہو سکتے ہیں اور چل سکتے ہیں، اِس طرف بخل، حسد اور بے ذوقی نے راستے بند کر رکھے ہیں لیکن اُدھر جو خرابیاں ہیں ان کا انکار بھی ممکن نہیں، آپ دور رہتے ہیں اس لئے قرب مطلوب ہے، مگر مستقل قرب حاصل ہو جائے تو یقین ہے کہ یہاں کے حالات چند ہی دنوں میں بعد کو مرغوب ومطلوب بنا دیں گے۔
>
> میں آج کل کھانسی سے بہت پریشان ہوں، آج خصوصیت سے بہت مضمحل ہوں، بہت جبر کر کے یہ خط لکھ رہا ہوں، میری صحت اتنی کمزور ہے کہ ہمت نہیں پڑتی، اگرچہ شوق بے نہایت ہے“۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۰ء

ایک خط میں، جو اکتوبر ۱۹۶۱ء کا لکھا ہوا ہے، چند کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں، اس سے

مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے ذوق ومناسبت کا پتہ چلتا ہے، لکھتے ہیں:

''الحمد للہ خیریت ہے، ادھر میرا ایک نواسہ سخت بیمار ہوگیا تھا، اس سلسلہ میں بہت پریشان تھا، الحمد للہ اب وہ اچھا ہے، **العبر** جب واپس آجائے، عبارت نقل کرکے بھیجئے گا، (**العبر للذهبی** میں جنگ صفین کے ذکر میں بدری صحابہ کی شرکت کا ذکر ہے، غالبًا اس کی تعداد بتائی ہے، اسی عبارت کی نقل حضرت مولانا نے طلب کی تھی) اب اعظم گڈھ کیا لکھوں، مجمع البحرین جہاں تک یاد ہے محمد بن علی الطریحی (کٹر شیعہ اثناءعشری) کی تصنیف ہے، ایران میں چھپی ہے، لکھنؤ میں غالبًا میں نے اسے دیکھا تھا، الفاظ آیات واحادیث کی تفسیر تمامتر کتب اہل سنت سے ماخوذ ہے۔

آپ نے جو عبارت لکھی ہے اس میں حلق کا فاعل متعین طور پر معلوم نہیں، اغلب یہ ہے کہ وہ حدیث مرفوع (فعلی) نہیں ہے، کسی صحابی یا تابعی کا واقعہ ہوگا۔ خیال میں رکھوں گا، کہیں کوئی بات نظر آئی تو لکھوں گا، ....فضائل اعمال انھوں نے مجھے دکھائی تھی............اس کا ترجمہ بڑے کام کا ہوگا۔

حیدرآباد سے مولانا سید فضل اللہ نے سلام لکھنے کو لکھا ہے، وہ اپنی کتاب کا غلط نامہ چھپوا رہے ہیں، مجھ کو باربار لکھا کہ کوئی خامی ہو تو لکھئے، آج ان کو چند باتوں کی طرف متوجہ کررہا ہوں۔

آج سنن سعید بن منصور کی تیسری جلد کے تین ورق کا عکس ایک صاحب نے بھیج کر دریافت کیا ہے کہ یہ کون سی کتاب ہے، افسوس ہے کہ بس اتنی ہی مل سکی، یعنی فقط ایک جلد، باقی جلدوں کا ابھی پتہ نہیں چل سکا۔

ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ:

''خط ملا، سب حالات معلوم ہوئے، خوشی ہوئی شیخ عبدالعزیز بن باز (المتوفی ۱۹۹۹ء) کا جواب آگیا، لکھتے ہیں کہ ۸۱ھ کے لئے داخلہ کی مدت ختم ہوگئی، لیکن خالد کمال (قاضی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا خالد کمال صاحب، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستان سے ابتداً گئے تھے) ۸۲ھ کے داخلہ کیلئے

اپنی درخواست مع شرائط قبول ومؤہلات سعودی سفیر کے پاس بھیج دیں ، اسلئے آپ دوسری درخواست ۸۲ھ کیلئے بھیج دیجئے ، اس کے بعد میں دوسرا خط ابن باز کو لکھوں گا۔

مارچ ۱۹۸۱ء کے خط میں محدث کبیر لکھتے ہیں:

’’ایک صاحب تاریخ گجرات خوب مفصل لکھوانا چاہتے ہیں ، صوبہ کی تاریخ کے ساتھ تاریخی مقامات اور نامور گجراتیوں کا تذکرہ لکھوانا چاہتے ہیں ، مواد فراہم کرنے کی ذمہ داری ان کی ہوگی ، میری نگاہ آپ پر پڑتی ہے ، اگر آپ کی رضامندی معلوم ہوتو میں ان سے معاملہ طے کروں۔

میں نے سنا ہے کہ آپ مبارکپور جلد ہی آنے والے ہیں ، کیا یہ صحیح ہے؟

خطوط کے ان اقتباسات سے باہمی مناسبت اور بے تکلفی اور مخلصانہ تعلقات کی لطافت کا احساس بخوبی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا ابوالوفاء افغانی علیہ الرحمۃ:

حضرت مولانا ابوالوفاء افغانی علیہ الرحمۃ کا شمار اس دور کے محقق اور جید علماء میں تھا ، اصلاً افغانی تھے ، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد سے فارغ ہوئے ، اور پھر وہیں کے ہو رہے ، **لجنة احياء المعارف النعمانيه** کے نام سے فقہ حنفی کی امہات الکتب کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ قائم کیا ، جس سے امام ابوحنیفہ ، امام ابو یوسف اور امام محمد **عليهم الرحمة** کی کتابیں شائع ہوئیں ، علم وفضل میں مولانا ابوالوفاء افغانی کا پایہ بہت بلند تھا ، ادب وتاریخ اور فقہ وحدیث میں سند کا درجہ رکھتے تھے ، بالخصوص فقہ حنفی کے ساتھ ان کا شغف مثالی تھا ، علم کیلئے انھوں نے دنیا کو تج دیا تھا ، متعدد بیش قیمت کتابیں ان کی تعلیق وتحقیق سے شائع ہوئیں ، جن میں سے اکثر فقہ حنفی سے متعلق نوادرات کی حیثیت رکھتی ہیں ، مولانا کے ساتھ قاضی صاحب کے نہایت گہرے اور مخلصانہ روابط وتعلقات تھے۔

مولانا ابوالوفاء صاحب افغانی کا ایک گرامی نامہ قاضی صاحب کے نام ملاحظہ ہو۔ تبرکاً اسے من عن نقل کرتا ہوں۔

از:۔ جلال کوچہ ۴۶۵۔ حیدرآباد دکن ، یوم شنبہ ۲۰؍رجب ۱۳۹۴ھ

عزیزم قاضی جی! **رفعهٗ الله إلى الدرجة العليا و اطال عمرهٗ مع السلامة**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل آپ کا ہدیہ عالیہ موصول ہوکر موجب مسرت ہوا، **بارک الله فی قلمک و شکرک مساعیک** ۔ آپ نے ماشاءاللہ قوم کی ایسی خدمت کی، جس کو اب تک کسی نے نہیں کیا تھا اور ایسے مضایق سے جواہر پارے نکالے کہ جن کی روشنی سے عالم منور ہوا، یہ خدمت آپ کے مقسوم میں تھی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　تانہ بخشد خدائے بخشندہ

پھر اس پر اللہ جل شانہٗ نے آپ کو ادب سے نوازا ہے کہ کسی کا نام بغیر احترام کے نہیں لیا۔ جزاک اللہ خیراً

حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ المتوفی ۱۹۷۲ء:

حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ مراد آباد کے رہنے والے تھے، عرصۂ دراز تک مدرسہ شاہی مراد آباد میں شیخ الحدیث رہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے اخیر عمر میں دار العلوم دیوبند بلایا تھا۔ حضرت شیخ کے انتقال کے بعد دار العلوم میں کامیاب شیخ الحدیث رہے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب نے بخاری شریف انھیں سے پڑھی تھی۔ قاضی صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے، اور شیخ کو بھی ان سے بہت تعلق تھا۔ ایک مکتوب ان کا ملاحظہ ہو:

> ’’میرا جی چاہتا ہے کہ میں مدینہ منورہ جا کر زیارت رسول ﷺ سے مشرف ہوکر خالد کمال سے بھی ملاقات کروں، سنا ہے کہ وہ مدینہ یونیورسٹی میں ہیں، میری حج کی درخواست نامنظور ہوگئی ہے، قدوائی صاحب سے کہلوایا ہے، امید ہے کہ منظور ہوجائے گی، آپ سے بھی درخواست ہے کہ اس بارے میں سعی فرمائیں۔ شعبان ۱۳۸۵ھ

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ المتوفی ۱۹۷۵ء:

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ قاضی صاحب کے خاص اساتذہ میں ہیں، جنھوں نے لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں قاضی صاحب کی بہت کچھ رہنمائی اور حوصلہ افزائی

فرمائی ہے، مدرسہ شاہی مرد آباد میں استاذ تھے، اور ایک رسالہ وہیں سے بنام ’’قائد‘‘ نکالا کرتے تھے، اس میں قاضی صاحب کے مضامین شائع فرماتے تھے، قاضی صاحب نے ان سے اخیر تک طالب علمانہ تعلق برقرار رکھا۔ قاضی صاحب نے جب بمبئ چھوڑنے کا ارادہ کیا، تو مولانا محمد میاں صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ اس پر مولانا لکھتے ہیں:

> نامہ عزیز باعثِ مسرت ہوا...... اچھا آپ کا دل بمبئ سے گھبرا گیا، اب کیا ارادہ ہے؟ وطن میں دل لگتا ہے، تو کیا پارچہ بافی کا کارخانہ قائم کریں گے، یا مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیمی اور تدریسی خدمت انجام دیں گے؟ اگر ایسا ہے تو بمبئ سے دل گھبرا جانا مبارک ہو، مگر شاید یہ بھی نہ ہو سکے، تو پھر کیا؟
>
> احقر کے ذہن میں آپ کے مناسب چند کام ہیں۔
>
> (۱) انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا، بہت بڑا کام ہے، اگر وسائل مہیا ہوں تو حکومت سے اس میں امداد بھی مل سکتی ہے۔
>
> (۲) اگر یہ نہ ہو تو دوسرا کام ہے تاریخ مذاہب ہند، یہ پہلے کے مقابلے میں آسان ہے۔
>
> (۳) تیسرا کام جو ان دونوں کے مقابلے میں آسان ہے، تاریخ علماء ومشائخ ہند۔
>
> تینوں کاموں کیلئے جاں فشانی اور ہمت مردانہ کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری المتوفی ۱۹۷۶ء:

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری کے ممتاز شاگرد اور ان کے علوم کے شارح تھے، علم حدیث میں خصوصی کمال انھیں حاصل تھا، عربی زبان وادب پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔

۱۳۹۷ھ میں ان کا وصال ہوا، **معارف السنن** کے نام سے ترمذی شریف کی بہترین شرح لکھی۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی المحدث نے لکھا تھا:

> ’’اس دور قحط الرجال میں مولانا کا فقدان اتنا بڑا خسارہ ہے کہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، ایسا کامل مدتوں میں پیدا ہوتا ہے‘‘۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ، قاضی صاحب کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

> تقریباً ایک ماہ کے بعد نامۂ گرامی کا جواب دے رہا ہوں، اس اضطراری تاخیر کے لئے

معافی چاہتا ہوں، رجال السند والہند کا شکریہ، ماشاءاللہ خوب زیور طبع سے آراستہ ہوئی، جزاکم اللہ خیراً۔ رجال السند والہند کے سلسلے میں ایک بہت بڑے محقق، جو امام صاغانی کے معاصر ہیں، گزرے ہیں، مسعود بن حسین بن شیبہ ہندی صاحب کتاب التعلیم، جنھوں نے امام ابوحنیفہ کی حمایت میں امام الحرمین وغزالی کی سخت تردید کی ہے، غالباً اس کو میں نے دیکھا ہوگا، اس وقت مزید کچھ یاد نہیں، تقریظ عند الفرصت لکھ کر ارسال خدمت کردوں گا، ان شاءاللہ۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

> نامۂ گرامی نے ممنون فرمایا، کل ان شاءاللہ معارف السنن خالد صاحب کے یہاں پہونچا دی جائے گی، سنن سعید بن منصور کا کام مکمل ہوگیا، الحمدللہ، خوش خبری آپ سے سنی۔
>
> جواہر الاصول للتقی الفاسی المکی کا مجھے بالکل علم نہیں، دیکھ لیجئے کہ اگر فوائد ہوں تو اس پر کام کیجئے، بہرحال یہ فن تو اب بہت غنی ہوگیا، اچھا ذخیرہ مطبوعات میں آگیا ہے۔
>
> آپ کے صاحبزادے سے مل کر بہت خوشی ہوئی، ماشاءاللہ ذکی اور باوقار ہیں، اللہ تعالیٰ جید عالم بنائے۔ ۲۰؍صفر ۱۳۸۴ھ

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی المتوفی ۱۹۸۴ء:

دار العلوم دیوبند کے ابتدائی مفتی، ولی صفت، پاک فطرت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے صاحبزادے تھے، دین وسیاست دونوں میدانوں میں صف اول کے لوگوں میں رہے۔ بڑے مدبر صاحب فراست اور صاحب علم تھے، قاضی صاحب سے خصوصی تعلق تھا، قاضی صاحب کی اردو کی تمام اہم کتابیں انھوں نے اپنے قائم کردہ ادارہ ندوۃ المصنفین سے شائع کیں، اور ہر کتاب میں پیش لفظ کے طور پر بہترین تعارف لکھا۔ ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

> مکرمت نامہ ملا، مضمون گرامی پہونچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کردی گئی ہے، بہرحال معذرت خواہ ہوں، ان شاءاللہ جنوری کے برہان میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون برہان کے معیار پر پورا نہ اترے یہ کیسے ہوسکتا ہے، جماعت میں آپ کا

وجود قیمتی ہے، علماء کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں پنہاں ہیں۔

۲۲/ اکتوبر ۱۹۶۰ء

حضرت مولانا فضل اللہ صاحب المتوفی ۱۹۷۹ء:

بہار کے مشہور بزرگ حضرت مولانا محمد علی مونگیری یکے از بانیان ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پوتے ہیں، بڑے بزرگ صاحب علم اور نیک نفس تھے، امام بخاری کی تصنیف ''الادب المفرد'' کی شرح ''فضل اللہ الصمد'' کے نام سے لکھی، اس پر قاضی صاحب نے البلاغ میں تبصرہ کیا تو انھوں نے خط لکھا:

> آپ کا مرسلہ البلاغ پڑھا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آپ یقین مانئے کہ آپ نے تبصرہ لکھنے میں دیر کی، اس کا ذرا ملال نہیں، انسان شے کی خوبی کو دیکھتا ہے، نہ یہ کہ وہ چیز جلد حاصل ہوئی یا دیر سے۔ حافظ مجیب اللہ نے ایک سال سے زیادہ ہی دیر لگائی، بڑے اچھے الفاظ میرے متعلق اور کتاب کے متعلق لکھے، مگر پھر بھی کتاب کا حق ادا نہیں کیا، ''زندگی'' نے بڑی ہوشیاری برتی، کتاب کے شروع میں جو تعارف کتاب کا ہے، اسکو مختصر کرکے تبصرہ کا نام دے دیا۔
>
> مولانا عبد الماجد دریابادی بڑے لوگوں میں ہیں، مجھ فقیر کو ان کی بارگاہ میں بار کہاں مل سکتا تھا، آپ نے تمام ہندوستانی جریدوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کردیا ہے''۔ ۲۰/ اپریل ۱۹۶۳ء

حضرت مولانا عبدالباطن صاحب جونپوری:

حضرت مولانا عبدالباطن صاحب جون پوری ان خاصان خدا میں تھے، جنھیں دیکھ کر خدا کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی ہے، جن کی مجلس میں بیٹھ کر مجلس نبوت کی خنکی حاصل ہوتی ہے، جونپور کے مشہور صاحب کرامت بزرگ، مصلح بنگال حضرت مولانا کرامت علی جون پوری کے پوتے، حضرت مولانا عبدالاول صاحب جونپوری کے فرزند گرامی ہیں، ایک بار ان کی خدمت میں اس خاکسار کی حاضری ہوئی ہے، طالب علمی کا دور تھا، نوجوانی کا زمانہ تھا، مگر انھوں نے ایسی خاطر مدارات کی، اور اتنی تواضع وفروتنی کا معاملہ فرمایا کہ حیرت ہوگئی، چہرہ اتنا روشن اور نورانی

تھا کہ اب تک اس کی تابانی آنکھوں میں محفوظ ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہو گیا، اتنا بڑا جنازہ اب تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔ اخبارات کی خبر تھی کہ چوبیس لاکھ سے زائد مجمع نے ان کی نماز جنازہ ادا کی تھی، ان کے چھوٹے چھوٹے متعدد رسائل ہیں جو بہت مؤثر اور دلآویز ہیں۔ ایک مکتوب اس بزرگ ہستی کا بھی قاضی صاحب کے ذخیرے میں ملا، برکت کے واسطے اسے نقل کرتا ہوں:

> ''البلاغ کے پرچے آجاتے ہیں، اور آپ سے غائبانہ علمی ملاقات ہو جاتی ہے، مارچ کے البلاغ کے شذرات میں جو مضمون دوسرے صفحہ پر ارقام فرمایا ہے، جس میں ہند وپاک کے اہل علم کی کس مپرسی کا رونا رویا گیا ہے، وہ ہو بہو میرے حسب حال ہے، کتاب ''واقعات النبی'' مکمل ہو کر مسودہ صاف ہو کر رکھا ہوا ہے، لیکن طباعت واشاعت کی نوبت نہیں آئی، اس کی طباعت کے لئے چند مشہور اداروں اور مستند ہستیوں کو خط لکھا اور متوجہ کیا، افسوس کہ کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں آیا، بعض حضرات نے تو جوابی خط کا جواب تک نہ دیا، ...... واقعات النبی'' میری جملہ تالیفات میں محبوب ترین کتاب ہے، آنحضرت ﷺ کے دو سو منتخب واقعات جو کہ سبق آموز دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں، دل کی خواہش ہے کہ کیسے امت مسلمہ کے سامنے پیش کر دئے جائیں۔
>
> تعلیقات میں کشکول کے حصہ سے بھی انتخاب فرما سکتے ہیں، اگر میری دی ہوئی کتابیں ساتھ ہوں تو ان پر تبصرہ بھی فرما دیجئے۔ آپ نے اپنی قیمتی تالیفات مجھے دے کر جو عزت ومحبت فرمائی اس کا دل سے شکریہ، یقینی استاذ مرحوم کی روح اس تعلق سے خوش ہوئی ہوگی''۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم المتوفی ۲۰۰۲:

فرانس کے مشہور شہر پیرس میں رہ کر اسلامی علوم وفنون کے بلند پایہ مخلص خدمت گزار، مشہور حیدر آبادی عالم ومحقق جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو کون نہیں جانتا، دنیائے اسلام کی یہ عجیب وغریب مایۂ ناز ہستی ایک عرصہ تک یورپ کے کفرستان میں اسلام وایمان کی روشنی بکھیرتی رہی، ان کا بھی ایک خط قاضی صاحب کے نام ملاحظہ فرمائیے:

''آج نوازش نامہ ملا، سرفراز ہوا...... آپ کی فاضلانہ کتاب کا ذکر سن چکا ہوں خاص کر بمبئی کے پروفیسر عبدالرحمٰن مؤمن صاحب سے، لیکن ادھر کی ڈاک اب انگریزوں کے زمانے کی طرح نہیں ہے، مشیة اللہ غالبة ، کتاب آپ کی اور تالیفوں کی طرح نفیس اور مفید ہی ہوگی، اور اس کی قطعاً محتاج نہیں کہ ایک ناچیز اس کا تعارف کرائے

عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید ۲۶؍ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

شبلی اکاڈیمی دار المصنفین اعظم گڈھ کے سابق ناظم مشہور اہل علم و اہل قلم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قاضی صاحب کو لکھتے ہیں کہ:

آپ کے مضامین محفوظ ہیں ان شاء اللہ جنوری یا فروری سے چھپیں گے، بمبئی کے ماحول وہاں کی زندگی اور معاشی جدوجہد میں علمی ذوق کا قائم رکھنا آپ ہی کا کام ہے۔

۲۴؍دسمبر ۱۹۶۳ء

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سنی شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا تقی امینی مرحوم (المتوفی ۱۹۹۱ء) نے ایک خط میں لکھا:

اللہ کا بہت بڑا فضل ہے، آپ کے حال پر، جو اس قسم کے علمی کام (آپ سے) لے رہا ہے، بمبئی میں رہ کر یہ کام کرتے رہنا محض آپ کی کرامت ہے۔ ۲۵؍جنوری ۱۹۷۳ء

حافظ غلام مرتضیٰ پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

کل لائبریری میں ''صدق جدید'' نظر آیا، اس میں ''حکومت کویت کی جانب سے ایک ہندوستانی عالم کو اعزاز'' کے عنوان کے تحت یہ خبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ حکومت کویت نے آپ کو اپنے یہاں کے نشریاتی شعبہ کا معتمد اور مشیر قرار دیا ہے، میں اس موقع پر آپ کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ ایک سادہ لیکن مصروف زندگی گزارتے ہوئے جو نمایاں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کے پیش نظر آپ واقعی اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ میں نے آپ کی قابل قدر تصنیف رجال السند والہند کو بغداد میں جن جن اساتذہ کی خدمت میں پیش کیا، انھوں نے اس کی بے حد تعریف کی، اور جب اس کا ایک نسخہ المتحف العراقی کی لائبریری میں رکھوانے کے لئے

لے گیا، تو اس کے ناظم جناب کورکیس عواد نے فرمایا کہ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ آج بھی ہندوستان میں عربی کے ایسے جلیل القدر علماء موجود ہیں۔ ۳۱/مارچ ۱۹۶۳ء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۹۹۹ء) بھی قاضی صاحب کے بڑے قدرداں تھے، اس سلسلے میں ان کا ایک مکتوب گرامی پڑھئے:

> افسوس ہے کہ ۸/جون کو جب میں بمبئی واپس ہوا تو آپ سے ملاقات نہ ہوسکی، صرف چند گھنٹے قیام رہا، ایک خاندانی حادثہ کی اطلاع پاکر بہ عجلت وہاں سے روانہ ہوگیا، محمد بھائی کے یہاں آپ کا لفافہ ملا، جس میں انقلاب کے دوتین تراشے تھے، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، پہلی مرتبہ آپ کے قلم سے الہند فی العہد الاسلامي کا ایک کثیر الاشاعت اخبار میں نام آیا، اور اس کا مختصر لیکن وقیع تعارف ہوگیا، اس کا ایک فوری فائدہ تو یہ ہوا کہ لکھنؤ کے قومی آواز میں ادارتی صفحہ پر ایک اچھا نوٹ، اس کتاب کی اشاعت کے متعلق دیا گیا، جو اول سے آخر تک آپ ہی کے مضمون پر مبنی اور اس سے ماخوذ تھا، اگرچہ ظاہر یہ ہوتا تھا کہ ان کو براہ راست اس کتاب کی طباعت کی اطلاع ملی ہے، اور وہ اس کو ایک علمی خبر کے طور پر شائع کررہے ہیں۔ اس سے بھی بہت سے اہل علم اور اہل ذوق کو کتاب کے مکمل ہونے کی خبر مل گئی، یہ کتاب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا، جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا، میری اس وقت بھی نیت ہدیہ کی تھی، معلوم نہیں آپ کو کیوں تردد رہا؟
>
> ابھی تک میرے پاس اس کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں پہونچا............
>
> مجھے تو پہلے خیال نہ تھا اور نہ کتاب پیش کرتے وقت یہ نیت تھی کہ آپ سے اس کتاب پر کچھ لکھنے کی فرمائش کروں، لیکن آپ کے اس مختصر مضمون کو پڑھ کر دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ آپ سے اس کتاب پر ایک مفصل مضمون اور تبصرہ کی درخواست کروں، جس کو آپ اشاعت کے لئے معارف میں بھیجیں، ہندوستان میں اس کتاب پر تبصرہ کرنے کا جن چندگنی چنی ہستیوں کو حق ہے، ان میں آپ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، اس لئے کہ آپ کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر گہری نظر بھی ہے، اور آپ کا یہ

موضوع بھی ہے، آپ مصنف کی کاوش ومحنت کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں، پھر آپ کا قلب اور قلم گروہی عصبیتوں سے بھی پاک ہے، جو ہمارے اہل علم، اور اہل قلم کا پرانا مرض ہے، اس لئے اگر آپ کی طبیعت پر بار نہ ہو، تو آپ پوری کتاب پر نظر ڈال کر ایک علمی مضمون معارف کے لئے سپرد قلم فرمائیں۔ والسلام

مخلص ۔ابوالحسن علی

مولانا ابومحفوظ الکریم صاحب معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ (المتوفی ۲۰۰۹) ان کے متعلق قاضی صاحب فرماتے تھے کہ میری نگاہ میں یہ ہندوستان کے عظیم ترین عربی کے اسکالروں میں ہیں، اور انھوں نے میری کتاب ’’رجال السند والہند‘‘ حرف بحرف پڑھی ہے......

ایک خط میں لکھتے ہیں:

محترم المقام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب۔ **حرسه الله ومتعنا بطول بقائهٖ**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف بعافیت تمام باد، امید کہ آپ دیوبند سہارنپور سے بخیریت واپس پہنچ چکے ہوں گے، آپ کے غائبانہ راقم نے مبارک پور کی سیر کی، آپ سے نہ ملنے کا افسوس رہا، لیکن صاحبزادگان مولانا ظفر مسعود اور حسان مسعود حفظہما اللہ نے مہمان نوازی کا حق پوری مستعدی وانشراح صدر سے ایسا ادا کیا جس کی توقع بزمانۂ حال نہیں کی جاسکتی، **فجزاهم الله احسن الجزاء وزادهم خيراً وميراً.**

دارالمصنفین کی دعوت پر اعظم گڈھ کا سفر کرنا پڑا۔ ۱۸/اپریل دوشنبہ کو یہاں سے روانہ ہوا، ۱۹/اپریل سہ پہر کے لگ بھگ شاہ گنج اترا، اعظم گڈھ کی ٹرین جانے ہی والی تھی اس پر بیٹھ کر اعظم گڈھ پہونچا، دارالمصنفین پہونچتے پہونچتے ساڑھے چار شام کا وقت ہو چکا تھا، مؤرخہ ۲۰/اپریل دارالمصنفین کی نذر رہوا، ۲۱ کو مبارکپور جانا طے کر لیا کہ اب کی دفع آپ کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا، علاوہ بریں یہ خیال بھی ہوا کہ زندگی میں تو مولانا عبیداللہ مبارکپوری سے ملاقات میسر نہ آسکی، کم از کم سنت تعزیت تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے مل کر ادا ہو جائیگی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب (المتوفی

۲۰۰۸ء) نے بڑی فراخ دلی اور محبت سے کتب خانہ دارالمصنفین کے جواں سال ملازم مولوی ابوالبرکات اصلاحی کو رہنمائی کے لئے ساتھ کر دیا، غرض مبارکپور کی آمد ورفت میں سہولت پیدا ہوگئی اور بڑا آرام رہا، آپ کو پیشگی اطلاع نہیں دی کہ دراصل یہ سفر تذبذب کے عالم میں کیا گیا، اور خود دارالمصنفین کو اپنے پہونچنے کی خبر صرف ٹیلیگرام کے ذریعہ بھیجی، ٹیلیگرام کی رفتار بھی ایسی ثابت ہوئی کہ اس سے پہلے بندہ خود دارالمصنفین جا پہنچا، اور مبارکپور سے واپسی پر ۲۲/ اپریل کی صبح تک شاید ہمارا ٹیلیگرام نہیں پہونچ پایا۔

مبارکپور کی یاد اب مشہود ہونے کے بعد تو نقش بر حجر ہے، واپسی میں اعظم گڈھ پہونچتے پہونچتے کچھ اشعار موزوں ہوئے جو کلکتہ پہونچ کر اتمام کو پہونچے، آپ کو مولانا ظفر مسعود نے کچھ تفصیلات بتائی ہوں گی، ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے اپنی موٹر بائیک پر بیٹھا کر رسول پور کی بھی سیر کرادی، **فجزاه الله خيراً.**

باقی باتوں کا اندازہ اس شعری دستاویز سے کیجئے جو اپنی نااہلی کی دلیل ہے:

قصة المسير إلىٰ مبارك فور

(فى اليوم التاسع من ذى القعدة ؁۱۴۱۴ھ وفق الحادي والعشرين من شهر إبريل ؁۱۹۹۴م)

ٔعظم بيوم سرت من ”أعظم كر“   امعى أبو البركات، خرّيت حرى
كانت (مبارك فور) غاية مذهبى   حتى انتهيت أمام منزل (أطهر)

اى الشيخ المؤقر مولانا القاضى اطهر حرسه الله ومتعنا ببقائه الطويل

فوجدتهٔ عن داره متنائيا   إذ لم يكن أخبرتهٔ بتصدّرى
ًهو في (سهارنفور) أو جنباتها   ما بين كتب خزائن والمحبر
غررا يؤلف درها وعقيقها   في سلك منتظم بهيّ المنظر
فلقيت حساناً وبعد هنيهة   ”ظفرا‘ وقد أتيا بوجه مسفر

حسان بن مسعود و ظفر مسعود حرسهما الله من أنجال صديقنا القاضي

الأطهر حفهم الله بنعمائهٖ

فاستوقفاني دون ما متكلف   واستبشرا بي، دون أي تأخر
لله درهما ودر أبيهما   طبعوا على كرم وطيبة عنصر
ومضى بنا 'ظفر' إلى دار المحدُ   دِث، من توفى قبل عدة أشهر

أي الشيخ الكبير مولانا عبيد الله المباركفوري رحمه الله

قابلت نجيله على وجه العزا   ءِ،وفاح طيب الاصل من فرع طرى

أحدهما مولانا عبد الرحمٰن وهو وأخوه كلاهما من الفضلاء حفظهما الله

وإذا أبو الحسن الإمام، برهطه   وافى هنالک واستحث، بمحضري

أي الشيخ العلامة الهمام ابوالحسن علي الندوي أبقاه الله ورفاقه الكرام

فمضوا إلى غاياتهم، ومضيت من   مغنى 'المحدث'، صوب مغنى 'أطهر،
فأتى بنا 'ظفر' إلىٰ دهليزه   حيث استرحنا من كلال يعتري
وأتىٰ عقيب (الظهر) غدّانا بكلُ   لِ اطايب ومطايب المتخيَّر
هذا، وأردفني علىٰ دراجة   ألية قد ساقها بتمهر
فخرجت نحو مقابر معهودة   وتهمني منها ثلاثه أقبر
ذا قبر مولانا عبيد الله، من   خدم الحديث وعاش غير مقصرٍّ
متورعاً، متواضعاً، متخشعاً   نشر الحديث بفكره والمزمر
'مرعاته' دلت علىٰ إحرازه   من سنة الهادي بحظ أوفر
وهناک قبر الشيخ صاحب تحفة   ضمنت شفاء مزورا وممترى

أي الشيخ المحدث مولانا عبد الرحمٰن المباركفوري رحمه الله المتوفى في ١٦ شوال ١٣٥٣ھ وفق ١٩٣٥م

برسول فور' ضريح(أحمد) حائز'   عربيّة وطراز شعر البحتري

أي الشيخ الأديب الكبير مولانا أحمد حسين بن عبد الرحيم رحمه الله كان من أصدقاء أبي غفر لهما الله وقد رأيته في طفولتي وهو جد صديقنا 'قاضي أطهر' من جهة أمه المرحومة

زهداً وعلماً زاخراً وتورعاً   وجمال معروف وردّ المنكر
بطلاقة بدوية وطلاوة   حضرية، وبهاء جودة عبقر
و’العصر‘ صلينا بمسجدها، وزُر   نا دار هذا المضرحي العبقري
حوت القبور معالماً علمية   عملية أعيت لسان معبِّر
بحبوحة الفردوس يدخلهم وجمـ   ع المؤمنين بدينه المتيسر
سردي لقصتي العجيبة منبئ   عما به امتازت سلالة ’أطهر‘
حياهمو رب الورىٰ بياهمو   في منتهى دعة وعيش مزهر
ثم انصرفنا شاكرين لجمعهم   عوداً علىٰ بدءٍ، إلىٰ ’أعظم كر‘

ترجمه

مبارکپور کا سفر

۹/ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۱/اپریل ۱۹۹۴ء

وہ دن کتنا بابرکت اور عظمت والا تھا، جب میں اعظم گڈھ شہر سے روانہ ہوا، اور میرے ساتھ ایک معتبر رہبر مولوی ابوالبرکات صاحب تھے۔

قصبہ مبارکپور میرے اس سفر کی منزل تھا، میں قاضی اطہر صاحب کے مکان پر پہونچا۔

مجھے معلوم ہوا کہ وہ گھر سے باہر دور گئے ہوئے ہیں، پہلے سے میں نے انھیں آنے کی اطلاع نہ دی تھی۔

وہ سہارنپور میں یا اسی علاقہ میں کہیں قرطاس وقلم کے درمیان ہیں۔

جہاں وہ علم وفن کے حسین موتیوں اور جواہر پاروں کو تصنیف وتالیف کی لڑی میں پرو رہے ہیں

وہاں میری ملاقات پہلے حسان سے ہوئی، پھر تھوڑی دیر کے بعد مولوی ظفر مسعود سے ہوئی، دونوں بہت ہی خندہ پیشانی سے ملے۔

(حسان احمد اور مولوی ظفر مسعود، قاضی صاحب کے صاحبزادگان گرامی ہیں)

صاحبزادگان محترم نے بے تکلفی اور بشاشت کے ساتھ مجھے اپنے گھر ٹھہرایا، انھیں اس سے بڑی مسرت ہوئی۔

دونوں کیا خوب فرزند ہیں، اوران کے والد محترم بھی کیا خوب ہیں، نہایت شریف اور پاک طینت لوگ ہیں۔

پھر مولوی ظفر مسعود مجھے ان محدث کے گھر لے گئے، جن کا ابھی چند ماہ پہلے انتقال ہوا ہے۔

(یعنی شیخ کبیر مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ)

میں ان کے دو صاحبزادوں سے بطور تعزیت کے ملا، اس تازہ شاخ سے اصل کی خوشبو محسوس ہوئی۔

(ایک مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور دوسرے ان کے بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب دونوں عالم وفاضل ہیں)

وہاں اتفاقاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی موجود تھے، میری حاضری سے وہ خوش ہوئے۔

پھر سب لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف چلے گئے، اور میں بھی وہاں سے قاضی اطہر صاحب کے گھر آ گیا۔

ظفر مسعود اپنے گھر لے آئے اور ان کی بیٹھک میں ہم نے آرام کیا۔

ظہر کی نماز کے بعد انھوں نے کھانا کھلایا، عمدہ اور لذیذ کھانا۔

پھر انھوں نے اپنی موٹر سائیکل پر مجھے بیٹھایا، اور بڑی مہارت سے چلا کر لے گئے۔

یہ مولانا عبیداللہ صاحب کی قبر ہے، جنھوں نے حدیث کی بڑی خدمت کی ہے، اور اچھی خاصی بابرکت زندگی گزاری ہے۔

صاحب ورع تھے، متواضع اور خاشع وخاضع تھے، انھوں نے حدیث کی نشر واشاعت کی اپنی فکر وذہانت سے بھی کی اور تحریر وکتابت سے بھی۔

ان کی کتاب مرعاۃ المفاتیح، اس بات کی دلیل ہے کہ ہادیٔ اکرم ﷺ کی سنتوں سے انھوں نے حظ وافر پایا تھا۔

وہیں صاحب تحفۃ الاحوذی کی بھی قبر ہے، تحفۃ الاحوذی جو ہر شک وتزویر کے لئے شفا ہے۔

(یعنی شیخ محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری علیہ الرحمہ متوفی ۱۶؍شوال ۱۴۵۳ھ مطابق ۱۹۳۵ء)

رسول پور میں مولانا احمد حسین صاحب کا مرقد ہے، جو علوم عربیت کے ماہر اور بحتری کے طرز کے شاعر تھے۔

(یعنی شیخ ادیب کبیر مولانا احمد حسین ابن عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ، میرے والد محترم کے دوستوں میں سے تھے، میں نے بچپن میں ان کی زیارت کی تھی، وہ ہمارے دوست قاضی اطہر صاحب کے نانا تھے)

وہ صاحب زہد وورع تھے، علم کے بحر ذخار تھے، نیکی وسعادت کے جمال اور برائی کی سراپا تردید تھے۔

انہیں بدوی طلاقت، شہری جگمگاہٹ اور عمدگی کی رونق حاصل تھی۔

ہم نے عصر کی نماز وہیں کی مسجد میں پڑھی، اور ان بزرگ کے گھر کی زیارت کی۔

یہ قبریں ایسے علمی وعملی کمالات کو سمیٹے ہوئے ہیں جن کے بیان سے زبانیں قاصر ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان پر بھی اور ہم پر بھی رحم فرمائے اور اپنے فضل عمیم سے سب کی مغفرت فرمائیں۔

انھیں اور تمام مسلمانوں کو اپنے دین یسیر کے طفیل باغ فردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔

میرے اس بیان واقعہ سے قاضی اطہر صاحب کے خاندان کے امتیازات نمایاں ہیں۔

رب کائنات انھیں انتہائی خوشحالی اور پھلتی پھولتی زندگانی عطا فرمائے۔

پھر ہم ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں یعنی اعظم گڈھ شہر لوٹ آئے۔

میری یاوہ گوئی سے درگذر فرمایئے اور دعا فرمایئے کہ بقیہ زندگی لاف زنی کے بجائے

فکرِ آخرت میں گذرے۔ ابھی ایک بڑے سانحہ سے یوں دوچار ہوا کہ میری بیوی ۷؍مارچ (۱۹۹۴ء) یعنی ۲۴؍رمضان ۱۴۱۴ھ کو صبح ۹؍بجے انتقال کرگئی، اناللہ وانا الیہ راجعون

دہم؍فروری کو اچانک بیہوش ہوگئی، آج کل کی زبان میں جس کو ’’کوما‘‘ میں چلا جانا کہتے ہیں، فوراً اسپتال میں داخل کیا اور انتہائی احتیاطی وارڈ I.T. میں رکھ کر تدبیریں کی گئیں جو لاحاصل رہیں اور مشیت ایزدی کے آگے سرخم کرنا ہی پڑا، بحمداللہ علاج کی دوادوش بھی داووا عباداللہ ’’الحدیث‘‘ کے تحت شروع کی تھی اور نتیجہ جو نکلا اس پر بھی انا للہ وانا الیہ راجعون ہی موجب سکون وتحمل ہے۔ آپ بھی رحمت ومغفرت کی دعا فرمادیں۔ عزیزان کو میں نے دانستہ اس کی اطلاع نہیں دی تھی اب جو آپ دعا فرمائیں گے تو وہ بھی آمین کہنے مین شریک ہوجائیں گے،

جملہ عزیزان ومتعلقین کو علیٰ قدر مراتب سلام ودعا، اور مولانا ظفر مسعود اور حسان مسعود صاحبان کو خصوصی سلام وشکریہ۔

اپنی اور عزیزان کی خیریت وعافیت سے حسب موقع مطلع فرمائیں

والسلام ابومحفوظ الکریم معصومی

جمعہ ۱۷؍ذوالقعدہ ۱۴۱۴ھ۔ ۲۹؍اپریل ۱۹۹۴ء

1/33۔ سی، ہرے کرشنا کونار روڈ کلکتہ۔ 700014

جناب اصغر مجاہد صاحب سکریٹری تنظیم فکر ونظر، سندھ، پاکستان لکھتے ہیں:

محترم حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے کہ آپ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے ہر طرح بعافیت ہوں گے۔

حضرت قاضی صاحب! برصغیر پاک وہند کے سب اہلِ علم، اہل فکر ونظر، مؤرخ، محقق، آپ کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے ’’مسلمانوں کی عظمت رفتہ‘‘ کو جس طریقے سے اجاگر کیا ہے کہ مسلمانوں کا تابناک وشاندار ماضی، چاند وسورج سے بھی زیادہ روشن نظر آرہا ہے، دنیا کے چاند وسورج تو ابھرتے وڈوبتے رہیں گے، مگر آپ کا روشن کیا ہوا محققانہ سورج رہتی دنیا تک یونہی چمکتا دمکتا رہے گا، خشک وسوکھے ہوئے ذہنوں کو آبِ

حیات کی طرح سیراب کرتا رہے گا۔ یہ علم وادب کی ایسی روشنی ہے جو کبھی بھی ماند نہیں ہوتی، آپ کا تاریخ انسانیت پر عموماً اور تاریخ اسلام پر خصوصاً بڑا احسان اور قرض ہے، جو اتارے نہیں اترتا۔ یہ قرض اس طرح اتر سکتا ہے کہ آپ کی سب کتب کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کرا کے شائع کیا جائے، تاکہ مسلمانوں کی تاریخ عزیمت سے مُسلم تو کیا غیر مُسلم بھی باخبر ہو جائیں، بلا مبالغہ آپ تاریخ انسانیت اور تاریخ اسلام کے محسن ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔ آمین

آپ کی دو کتابیں سندھی میں ترجمہ ہو کر شائع ہوگئی، جو ان شاء اللہ عنقریب آپ کی خدمت میں ارسال کی جائیں گی۔

پاکستان کے معروف اہل قلم ومصنف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر وفکر کے داعی حضرت علامہ طالب ہاشمی صاحب کو صدر تنظیم جناب پروفیسر اسد اللہ بھٹو صاحب نے ان کی علمی ودینی خدمات کے پیش نظر آپ کی کتابوں کا سیٹ تحفتاً دیا، جنھیں پڑھ کر موصوف نے جناب بھٹو صاحب کے نام شکریہ کا خط لکھا ہے، اور فرمایا ہے کہ ''مجھے قاضی صاحب کی کتابوں سے اپنی زیر تالیف کتب کی تکمیل کیلئے بہت بڑا مواد ملا ہے''۔ (ہاشمی صاحب کے خط کی نقل پیش خدمت ہے)

علامہ ہاشمی صاحب نے آپ کی کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کے حصول کیلئے اشد ضرورت کا اظہار فرمایا ہے، اس خط کی روشنی میں ہم آپ کی خدمت عالیہ میں ادب واحترام سے عرض کرتے ہیں کہ آپ اپنی بلند پایہ کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کی کچھ کاپیاں ارسال فرمائیں، ہم آپ کے ممنون ومشکور ہوں گے۔

آنجناب سے استدعاء ہے کہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور ساتھ ہی میرا پُرخلوص سلام میرے پیارے بھائی اور دوست جناب حسان احمد صاحب تک پہونچائیں، اللہ کرے آپ ہمیشہ خیر وعافیت سے ہوں۔

والسلام آپ کا مخلص، احقر اصغر مجاہد
جوائنٹ سکریٹری تنظیم فکر ونظر سندھ (پاکستان)

محترم جناب طالب ہاشمی صاحب کے خط کا اقتباس پیش خدمت ہے:

جناب مخدوم ومعظم مجاہد اسلام پروفیسر صاحب! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

لاہور میں آپ کی صحبت میں جو لمحات میسر آئے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔

آپ نے مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کی تالیفات کی صورت میں جن گرانقدر ہدیوں سے نوازا، ان کیلئے صمیم قلب سے سپاس گذار ہوں۔ میرا احساس تشکر اور بھی بڑھ گیا جب ان بلند پایہ کتابوں کو اپنی زیر تالیف کتابوں کی تکمیل کیلئے نہایت کارآمد پایا، بخدا آپ کیلئے دل سے دعائیں نکلیں۔ یہ کتابیں اور دوسرا لٹریچر پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ جو مہتم بالشان ملی خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی،

علاوہ ازیں مجھے قاضی اطہر مبارکپوری صاحب کی کتاب ‘‘اسلامی ہند کی عظمت رفتہ’’ کی اشد ضرورت ہے، اگر یہ کتاب یا اس کی فوٹو اسٹیٹ مہیا فرما سکیں تو آپ کا احسان ہوگا، اس پر جو خرچ بھی آئے اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔

ہماری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

والسلام مع الاکرام دعا گو۔ طالب ہاشمی غفرلہٗ

مولانا لقمان سلفی صاحب ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

دارالافتاء۔ الریاض۔ ۵؍جون ۱۹۶۸ء

ذوالمجد والکرم حضرت قاضی صاحب، مدظلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، میں بھی آپ کی دعاؤں سے بخیر ہوں۔

کل ‘‘المنہل’’ میں آپ کا خط عبدالقدوس انصاری صاحب کے نام پڑھا، بے حد خوشی ہوئی، انھوں نے آپ کو بھی عدد مذکور کا ایک نسخہ بھیجا ہے، امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔

آپ کی تحقیقی کتابیں اصحاب علم ودانش کیلئے خزینہ کی حیثیت رکھتی ہیں، امید ہے کہ آپ کی کتاب ‘‘العقد الثمین’’ جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوکر آجائے گی، میں

اپنے کو خوش قسمت سمجھوں گا اور میرے احساس کی رفعت کا باعث ہوگا اگر ایک نسخہ سے مجھے بھی نوازا جائے۔

میری تو رائے ہے کہ آپ مملکت سعودیہ کے مجلوں اور جرائد میں گاہے گاہے اپنے مضامین ضرور بھیجتے رہیں، علمی حلقوں میں اچھا اثر پیدا کریں گے، اب آہستہ آہستہ یہ علم کی قدر پہچاننے لگے ہیں۔

کل بھائی خالد کمال کا خط آیا تھا، خیریت سے ہیں، اور مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے تعاقد کے بعد فوراً ہی خط کیوں نہ لکھا، میں نے ان کو خط لکھ دیا ہے، اور معذرت کی ہے، ان کی چھٹی ۸/ربیع الثانی سے شروع ہوگی، انکے کام سے نائب مفتی خوش ہیں، خدا مزید کی توفیق دے۔

میں دارالافتاء میں مستقل ہوگیا ہوں، یہ خدا کا کرم ہے، اب کوئی قانونی پریشانی باقی نہیں رہی ہے، امید ہے کہ جواب سے ضرور نوازیں گے، میں آپ کو اپنا بزرگ اور نہایت مخلص بزرگ مانتا ہوں، آپ کی علمی گیرائی کے ساتھ بے حد سادگی اور تقویٰ مجھے ہمیشہ دعوت فکر وعمل دیتے رہتے ہیں۔ جناب قمر صاحب اور دیگر پُرسانِ حال کو سلام کہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ طالب دعا۔ محمد لقمان سلفی

قاضی صاحب کے نام ایک تعزیتی مکتوب

محترم المقام جناب الحاج مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری
السلام علیکم

ایک خط روانہ کر دیا ہوں، ملا ہوگا، ابھی ابھی مبارکپور سے حاجی ظفر مسعود سلمہٗ کا خط ملا جس سے معلوم کر کے بیحد افسوس ہوا کہ آپ کے والد محترم کا[۲] انتقال ہوگیا، مرحوم کا ایسے وقت جدا ہو جانا جب کہ آپ نہ صرف وطن بلکہ ملک سے ہزاروں میل دور ہیں۔ ظاہر ہے آپ کے لئے زبردست اور ناقابل برداشت المیہ ہے مگر مرضیٔ مولیٰ کے آگے ہر انسان مجبور ہے۔ آپ اور خالد کمال سلمہٗ صبر کیجئے۔ میں بحیثیت ایک دیرینہ رفیق اور قریبی دوست اور اگر کہوں تو سب سے زیادہ مخلص ہونے کے ناطے اس حادثہ پر بے حد غم زدہ ہوں آپ سب لوگوں کو صبر جمیل کے لئے

تلقین کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین منزل عنایت فرمائے، آمین

ظفر مسعود سلمہٗ کے خط کا ایک روشن پہلو بڑا ہی خوش کن رہا کہ جب والد مرحوم کی قبر کی کھدائی آپ کی والدہ مرحومہ[۳] (جن کو انتقال فرمائے ہوئے ۴۴ سال گزرے ہیں) کے پہلو میں ہو رہی تھیں تو ایک سوراخ نظر آیا، کفن تو کالا ہو چکا تھا مگر پھٹا نہیں تھا، اور والدہ کی نعش مبارک بالکل صحیح وسالم حالت میں پائی گئی، اس سے ان کے عذاب قبر سے محفوظ رہنے اور جنتی ہونے کی دنیا ہی میں سب لوگوں کو بشارت ہوگئی، اور لوگ جوق در جوق اس منظر کو دیکھنے کے لئے جمع ہونے لگے، اس سے آپ کے گھر والوں نے غم واندوہ کے ساتھ ساتھ خوشی ومسرت کے آنسو بھی بہائے، اس لئے آپ کی تربیت دینے والی اس جنتی ماں کے دنیا میں ہی ثبوت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، جن کے نیک اور......خون کی آمیزش آپ کے ایک ایک قطرہ خون میں گردش کر رہی ہے، اور جن کی دعاؤں کے طفیل آپ کو تمام ممالک اسلامیہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، خدا آپ کی ساری خدمات دینیہ کو قبول فرمائے اور پھر مکرر طور پر میری جانب سے میرے ساتھیوں اور رفقاء کار کی جانب سے آپ کو صبر کی تلقین ہے، کمالِ حبیب الرحمٰن، انیس الرحمٰن، صلاح الدین اور عرفان سلام کہتے ہیں، مولوی خالد کمال کو بھی سب کا سلام قبول ہو۔

والسلام

قمر (مولانا عبید الرحمٰن صاحب قمر) مبارکپوری بمبئی۔ ۴؍ مارچ ۱۹۷۸ء

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) یہ مضمون ماہنامہ ضیاء الاسلام، قاضی اطہر مبارک پوری نمبر میں شائع ہوا تھا، اسی کی جانب اشارہ ہے۔

(۲) میاں جی محمد حسن، متوفی ۲۸؍ فروری ۱۹۷۸ء

(۳) حمیدہ بنت حضرت مولانا حکیم احمد حسین صاحب، (متوفیہ ۲۲؍ ذی قعدی ۱۳۵۲ھ)

دیار ’’پورب‘‘ [۱] میں علم اور علماء
قاضی اطہر مبارکپوری کی ایک قابل قدر تصنیف
تعارف اور قدرے تلخیص

مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے علامہ غلام آزاد بلگرامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ’’پورب کی سمت میں تین صوبے تھے۔ صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ [۲] اور صوبہ عظیم آباد۔ مغلوں سے پہلے اودھ اور جونپور ایک ساتھ بولے جاتے تھے اور قنوج سے لے کر بہار کی سرحد تک ایک صوبہ کی حیثیت سے ایک حاکم کے ماتحت تھا جس میں اودھ اور جون پور دونوں شامل تھے اور دوسرا صوبہ کڑا یعنی الہ آباد کا تھا جس میں گنگا کے اس پار کا علاقہ موجودہ کان پور سے کڑہ مانک پور، فتح پور، موجودہ رائے بریلی، سلون وغیرہ سے گزرتا ہوا غازی پور تک چلا جاتا تھا، صوبہ عظیم آباد، موجودہ بہار کا صوبہ ہے۔ (حیات شبلی: ص: ۱۰)

قاضی اطہر صاحب نے اپنی کتاب ’’دیار پورب میں علم اور علماء‘‘ میں اس خطے کے علم اور علماء کی تاریخ مرتب کی ہے، خود قاضی صاحب کے قلم سے اس علاقہ کا تعارف ملاحظہ کر لیجئے:

> ’’مسلم دور حکومت میں دہلی کے مشرق میں صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ اور صوبہ عظیم آباد پر مشتمل جو وسیع اور محدود خطہ ہے اس کو ملک پورب کہتے تھے، ہر صوبہ میں دارالامارت ہر دارالامارت سے متعلق بڑے بڑے شہر، ہر شہر سے متعلق قصبات اور ہر قصبہ سے متعلق دیہات تھے، ملک پورب کے قصبات شہروں کے حکم میں تھے جن میں عالی شان عمارتیں، شرفاء کے محلات، علماء ومشائخ، مختلف قسم کے پیشہ ور، مدارس ومساجد تھیں جو جمعہ و جماعت سے معمور

رہتی تھیں، اسی ملک کو ہم دیار پورب سے تعبیر کرتے ہیں‘‘۔ (ص:۲۱)

ہندوستان کا یہ مشرقی حصہ اس کے مغربی حصہ ہی کی طرح بڑا مردم خیز اور علم و ہنر کا گہوارہ تھا، اسلام کا ابر کرم سرزمین عرب سے اٹھ کر جانب سندھ بڑھا تو مکران، سندھ، ملتان سے ہوتا ہوا دہلی تک کی سرزمین کو نہال اور خوش حال کر گیا، پھر چشم فلک نے دیکھا کہ یہ ابر نیساں پورب کی طرف بڑھ رہا ہے اور مشرق کے اس خطے پر جس کا ہم نے ابھی اوپر کی سطروں میں تعارف کرایا۔ موسلا دھار برس رہا ہے۔ یہ مٹی بڑی زرخیز تھی۔ اس ابر کرم کا ہر قطرہ گہر بن بن کر اس علاقہ کو روشن کرنے لگا۔ اس علاقے کا ہر شہر ہر قصبہ بلکہ ہر قریہ معدن علم وعلماء بن گیا۔ بالخصوص جونپور کی تاسیس وتعمیر کے بعد اس کے اطراف ونواح، مسجدوں اور مدرسوں اور خانقاہوں کے ساتھ علماء وفضلاء اور مشائخ سے کچھ اس طرح معمور وآباد ہوئے کہ دیار پورب شیراز ھند بن گیا۔ اس خطہ میں بڑے بڑے نامور علماء و مشائخ پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے علم و عمل اور روحانیت وتقویٰ سے پورے خطے کو جگمگا دیا۔

ان علماء ومشائخ کی ایک مختصر اجمالی فہرست دیکھنی ہو تو زیر تذکرہ کتاب ’’دیار پورب میں علم اور علماء‘‘ کی مختصر سی تمہید پڑھ لیجئے جو خود قاضی صاحب کے قلم سے ہے، لکھتے ہیں:

> ’’اس خطۂ زمین سے شیخ الاسلام فریدالدین اودھی، شیخ الاسلام شرف الدین یحییٰ منیری، مولانا علاءالدین نیلی اودھی، شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی، شیخ نصیرالدین اودھی، چراغ دہلی، شیخ حسام الدین مانک پوری، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری، ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، ملا محمود جونپوری، ملا محمد افضل جونپوری، مولانا حاجی ابوالخیر بھیروی، مولانا الہداد جونپوری، دیوان محمد رشید جون پوری، شیخ احمد عبدالحق ردولوی، سید اشرف جہاں گیر سمنانی، شیخ علی متقی جونپوری، برہان پوری مکی، علامہ سید مرتضٰی بلگرامی زبیدی، شیخ محبّ اللہ بہاری، حافظ امان اللہ بنارسی، ملا احمد جیون امیٹھی، ملا نظام الدین فرنگی محلی، شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی، مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی اور ان کے علاوہ بہت سے عباقرہ دوراں اور جہابذۂ زماں پیدا ہوئے، اس دیار میں روحانی طرق سلاسل میں چشتیہ، سہروردیہ، شطاریہ، اشرفیہ، قلندریہ عاشقیہ، مداریہ کو فروغ حاصل ہوا۔ آخری دور میں اس سرزمین سے مجاہدین کی تحریک عام ہوئی جو بنگال سے سرحد تک پھیلی ہوئی تھی‘‘۔ (ص:۱۷)

علماء ومشائخ کے یہ نام جو آپ نے پڑھے ان میں سے ہر ایک آسمان علم وکمال کا آفتاب وماہتاب تھا، جہاں اتنے اتنے صاحبان علم وفضل رہے ہوں۔ حق یہ تھا کہ ان کی مفصل تاریخ لکھی جاتی، ان کے سوانح حیات کی چھان بین کی جاتی۔ ان کے علمی وذہنی کارناموں کو یاد رکھا جاتا، ان کی روحانی تربیت کے آثار کو محفوظ کردیا جاتا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے علماء وفضلاء اور مشائخ کے مقابلہ میں دیار پورب کے ان بزرگوں کے تذکرے کم لکھے گئے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''علمائے پورب پر اب تک کوئی ایسی جامع اور مفصل کتاب نہیں لکھی گئی جس سے ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا تفصیلی تعارف ہو سکے اور معلوم ہو کہ اس قدیم معدن علم وعلماء اور شیراز ہند پورب سے کیسے کیسے سرآمدگان روزگار اٹھے ہیں اور انھوں نے کیا خدمات انجام دی ہیں؟''۔ (ص:۱۹)

زیر نظر کتاب میں اسی علمی وتاریخی قرضہ کی ادائیگی کی پہلی کوشش ہے قاضی صاحب نے پورب کی علمی تاریخ کو چار دور میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کی علمی ودینی سرگرمی اور ارباب فضل وکمال کا اجمالی تعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد اس علاقے کے آٹھ بڑے بڑے علماء ومشائخ کا تفصیلی تذکرہ لکھا ہے ان کے ضمن میں بہت سے دوسرے ارباب کمال کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

پہلا علمی دور:

اس عنوان کے تحت قاضی صاحب نے بڑی جستجو اور تحقیق کے بعد یہ بتایا ہے کہ پورب کے اس خطہ میں اسلام کی روشنی کب چمکی اور کیسے پھلی اور پھیلتی چلی گئی، یہ روشنی پہلی بار کب چمکی؟ اور کس جگہ سے اس کا آغاز ہوا؟ یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے مسلسل فتوحات کے عہد میں یہ خطہ اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہو چکا تھا اس کے بعد حضرت سید سالار مسعود غازی (شہادت ۴۸۸) اور ان کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے اس روشنی کو عام کیا

سید سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد ایک صدی تک تاریخ پر سناٹا چھایا رہا، پھر ۵۹۱ھ میں سلطان شہاب الدین نے قنوج پر فوج کشی کی، اس فوج کشی میں مسلمان کامیاب رہے، اس کے بعد قنوج سے بنارس تک تمام علاقوں میں مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا اور بنارس سے

نیپال کی سرحد تک پھر اس کے آگے پورب کی طرف بنگال تک راستہ صاف ہوگیا۔ اس دور میں کٹرہ مانک پور اس دیار کا دارالحکومت بنا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے اپنے غلام قطب الدین ایبک کو ۵۵۴ھ میں نظام سلطنت سونپا تھا۔ قطب الدین ایبک نے ۶۰۲ھ میں دہلی کو فتح کر کے غلام سلطنت کی بنیاد رکھی اس کے دور میں پورب میں قنوج اور اودھ کے علاقے فتح ہوئے اور نیپال کے نیچے سے لیکر بنارس تک کا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔ یہ حکومت مختلف بادشاہوں کی ماتحتی میں ۶۸۹ھ تک رہی۔ ۶۸۹ھ میں خلجیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ ۷۲۰ھ تک رہی۔ ۷۲۰ھ میں خاندان تغلق مسند حکومت پر آیا۔ جس نے ۸۱۶ھ تک اپنا قبضہ جمائے رکھا، اس خاندان کے نامور اور علم پرور بادشاہ سلطان فیروز شاہ نے جس کا نام جونا تھا اپنے نام پر جون پور آباد کیا۔

قاضی صاحب نے ۶۰۲ھ سے لے کر ۷۷۲ھ تک یعنی شہر جون پور کی تاسیس وتعمیر تک پورب کی علمی تاریخ کا دور اول قرار دیا ہے، پھر تفصیل سے ہر عہد سلطنت میں علم وعلماء کی تاریخ مرتب کی ہے اس میں بڑی قیمتی معلومات اور تاریخی حقائق قاضی صاحب نے تحریر کئے ہیں۔ اس دور کے بکثرت علماء کا اجمالی تذکرہ آ گیا اور علم وفضل کے چمن اور اس کی بہار کا تذکرہ بڑے دلآویز انداز میں کیا ہے۔

غلام خاندان کے دور حکومت میں قاضی صاحب نے حسب ذیل علماء کا نام لیا ہے۔

شیخ الاسلام شیخ فریدالدین اودھی ان کا شمار اس دور کے نامور علماء میں تھا۔ پھر ان کے تلامذہ میں مولانا علاء الدین نیلی اودھی اور مولانا شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی خاص شہرت کے مالک ہوئے۔

اودھ کے مشہور قدوائی خاندان کے جد اعلیٰ شیخ قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی جو حضرت عثمان ہارونی کے مرید اور خواہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے پیر بھائی تھے۔ ہندوستان تشریف لائے اور اودھ میں مقیم ہوئے سلطان التمش کے دور میں مولانا ابوتوامہ شرف الدین حنفی دہلوی نے دہلی سے بنگال کا رخ کیا اور وہاں کے سنارگاؤں میں درس وتدریس کی بساط بچھائی، ان سے مشہور شیخ بزرگ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہ نے تعلیم حاصل

کی۔ اسی دور میں دو بھائی سید شمس الدین اور سید شہاب الدین شہر گردیز سے دہلی آئے، سید شہاب الدین دہلی سے آ کر کٹرہ مانک پور میں آباد ہوگئے، ان کی نسل سے سید راجہ مانک پوری ہیں جنھوں سلاطین شرقیہ کے عہد میں دیار پورب کو اپنا دینی اور روحانی مرکز بنایا، ان کی اولاد میں راجہ سید مبارک نے مبارک پور اور راجہ سید خیر اللہ نے خیر آباد کی تعمیر کی۔

غلام خاندان کے بعد خلجیوں کا دور حکومت آیا۔ اس دور میں بھی علم اور علماء کی بہار رہی، یہ دور ۳۰؍سال تک رہا قاضی صاحب خبر دیتے ہیں کہ:

> ’’اس مختصر دور سلطنت میں پورب اور بہار و بنگال میں دینی اور علمی رونق بڑھتی رہی اور ان علاقوں میں علماء ومشائخ مدرسوں اور خانقاہوں کے ذریعے اپنے اپنے انداز میں کام کرتے رہے‘‘۔ (ص:۲۹)

اس دور میں کچھ خاص خاص علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی صاحب نے مولانا بدر الدین حنفی اودھی کا نام لیا ہے کہ وہ سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں اودھ کے علماء کبار میں تھے اور یہاں سے دہلی تشریف لے جایا کرتے تھے اور کئی کئی ماہ وہاں رہ کر وعظ وتذکیر کی خدمت انجام دیتے تھے۔

اس سلسلے میں انھوں نے بہار کے مشہور بزرگ مخدوم شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰی منیری کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ وہ ۶۶۱ھ میں بعہد سلطان ناصر بن محمود بن التمش پیدا ہوئے، انھوں نے خلجی دور میں بہار میں دین وایمان کی بزم سجائی ان کے فیوض و برکات سے خلجی دور خوب مستفید ہوا۔ (ص:۲۹)

خلجی خاندان کے بعد ہندوستان کی زمام حکومت تغلق خاندان میں آئی، اس خاندان کے تیسرے بادشاہ فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں جونپور شہر آباد کر کے بلاد پورب کو علم ومعرفت کے نئے دور میں داخل کیا۔

اسی خاندان کے دور حکومت میں مولانا فرید الدین اودھی شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز تھے، ان کے علم وفضل کی دھوم اودھ سے دہلی تک مچی ہوئی تھی۔ ان کے دو شاگرد ہندوستان کے مایۂ ناز علماء میں ہوئے۔ ایک مولانا شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰی اودھی ہیں جن کے تلامذہ میں

مشہور عالم و بزرگ حضرت مولانا شیخ نصیر الدین محمود ہیں، جو حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں اور ''چراغ دہلی'' کے لقب سے ممتاز ہیں۔

ان کے دوسرے شاگرد مولانا علاء الدین نیلی اودھی ہیں جو خاص شہرت کے مالک ہیں، اس دور میں یہ اودھی علماء ومشائخ دہلی کی علمی وروحانی فضا پر چھائے ہوئے تھے اور کفرستان اودھ کے ان ایمانی چراغوں سے دہلی کے بام ودر روشن تھے۔

اسی دور میں اودھ کی بزم علم ومعرفت کے ایک چراغ نے سرزمین بنگال کو بقعہ نور بنایا تھا، یعنی مولانا سراج الدین عثمان چشتی اودھی (خلیفہ حضرت محبوب الٰہی) بنگال تشریف لے گئے اور ان سے خلق اللہ نے فیض پایا، ان ہی میں حضرت شیخ علاء الدین عمر بن اسعد لاہوری پنڈوی متوفی ۷۵۸ بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے مرشد سراج الدین عثمان اودھی کے کام کو آگے بڑھایا اور پنڈوہ میں مستقل قیام کر کے ارض بنگال کو علم ومعرفت کا گلستان بنادیا۔

ان حضرات کے علاوہ قاضی صاحب نے اور متعدد علماء کبار اور مشائخ کرام کا نام لکھا ہے، یہ دیار پورب کی علمی وعملی تاریخ کا دور اول ہے جو ۶۰۲ھ سے شروع ہو کر ۷۷۲ھ میں ختم ہوتا ہے۔

دوسرا علمی دور:

قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں دوسرے علمی دور کا تعارف کراتے ہوئے بتایا ہے کہ دور اول جو پونے دوسو سال کے عرصے کو محیط ہے، میں علماء وفضلاء کی اچھی خاصی تعداد مختلف قصبات وقریات میں پائی جاتی تھی۔

> ''مگر مانک پور کڑہ کے علاوہ پورب کے علاقہ میں کوئی دوسرا علمی اور دینی مرکز نہیں تھا تا آنکہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں شہر جونپور آباد کر کے ایک عظیم علمی و دینی مرکز قائم کیا اور قطب الاسلام حاجی صدر الدین چراغ ہند ظفر آبادی کی ذات والا صفات سے سواد جونپور میں اسلام کو فروغ ہوا، اور عہد فیروز شاہ تغلق سے لے کر خاتمۃ السلاطین محمد شاہ کے دور تک تقریباً چار سو سال یہ شہر حدود سمیت علم وفضل اور علماء و فضلاء کا گہوارہ بنا رہا ہے''۔ (ص:۳۲)

قاضی صاحب نے دوسرے علمی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے تاسیس جونپور ۷۷۲ھ سے لودھی سلطنت کے خاتمہ ۹۳۲ھ تک قرار دیا ہے۔

اس دور میں پورب کے اندر علما اور علماء کی تاریخ بڑی تابناک رہی ہے، فیروز شاہ تغلق نے مولانا علاء الدین دہلوی سے درخواست کی کہ وہ جون پور تشریف لے جائیں، وہ جب جونپور کیلئے دہلی سے نکلے ہیں تو بادشاہ نے اپنا خاص گھوڑا سواری کیلئے پیش کیا اور خود رکاب پکڑ کر سوار کرایا، مولانا چار سو طلبہ کو لے کر جونپور تشریف لے آئے، شاہزادہ فتح خاں جو اپنے والد فیروز شاہ کی طرف سے جونپور کا حاکم تھا اس نے شہر سے بارہ کوس آگے بڑھ کر مولانا کا استقبال کیا اور دو مرتبہ انہیں سونے کے سکوں سے تولا اور وہ رقم انہیں نذر کی۔

مولانا نے اشاعت علم کیلئے ایسی جدوجہد کی کہ تھوڑے ہی عرصے میں جونپور اور اس کے اطراف میں تعلیم وتدریس کے چوالیس مدرسے قائم ہوگئے، اور ہر طرف علم وفن کا چرچہ عام ہوگیا، مولانا کا انتقال ۷۸۲ھ میں ہوا۔

۷۹۷ھ میں تغلق خاندان کے آخری فرمانروا سلطان محمود شاہ تغلق نے اپنے باپ کے وزیر ملک سرور خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر جونپور کی فرمانروائی عطا کی، وہ اپنے ساتھ دہلی سے مولانا شرف الدین لاہوری کو جون پور لایا۔ ان دونوں کی آمد سے جون پور علم و فضل کے لحاظ سے اور چمک اٹھا۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''درحقیقت سرزمین پورب کا سارا علمی افتخار ان ہی چاروں کا مرہون منت ہے جن میں دو امراء (فتح خاں اور خواجہ جہاں ملک الشرق) اور دو علماء (مولانا علاء الدین دہلوی اور شیخ شرف الدین لاہوری) شامل ہیں، ان ہی عناصر اربعہ سے یہاں کا علمی مزاج بنا، اس پچیس سالہ دور میں باہر کے کئی علمی خانوادے دیار پورب میں آکر مستقل سکونت پذیر ہوئے جن میں صدیوں علم وفضل کا چرچا رہا''۔ (ص: ۳۸)

شرقی سلطنت:

۷۹۶ھ یا ۷۹۷ھ میں حاکم جونپور ملک سرور خواجہ جہاں نے اپنی مستقل حکومت کا

اعلان کیا اور سلطان الشرق کے خطاب کے ساتھ تخت نشیں ہوکر ایک نئ حکومت کی بنیاد ڈالی، اسی حکومت میں جو شرقی سلطنت کے نام سے معروف ہوئی۔ چھ بادشاہ ہوئے جن میں سب سے نامور اور سب سے زیادہ علم پرور سلطان ابراہیم شاہ شرقی از ۸۰۴ھ تا ۸۴۲ھ بادشاہ ہوا۔

شرقی سلطنت کی حدود طبقات اکبری کے بیان کے مطابق مشرق میں بہار کے صوبے میں علاقہ ترہت تک تھیں، یعنی مظفر پور اور دربھنگہ تک، قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ''جون پور کی تاسیس ۷۷۲ھ سے لے کر شرقی سلطنت کے پہلے حکمراں کے آخری زمانے ۸۰۳ھ تک دیار مشرق میں علم و علماء کی تازہ بہار آتی رہی، اس دور میں جب کہ دہلی کا مرکز حوادث وفتن کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور وہاں کی علمی اور دینی محفلیں اجڑ اجڑ کر دوسرے دیار و امصار کی طرف منتقل ہورہی تھیں جون پور دارالعلوم دارالامان اور دہلی ثانی بن رہا تھا''۔ ص: ۴۱
>
> ''شرقی سلطنت کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس سالہ دور اس سلطنت کا عہد زریں، اور پورب میں علمی بہار کا زمانہ ہے، ابراہیمی دور میں تمام اطراف کے علماء و مشائخ کھنچ کھنچ کر جون پور آ گئے اور ہندوستان کے علم کا خلاصہ یہاں جمع ہوگیا''۔ (ص: ۴۵)

اس دور میں علماء کی فہرست طویل ہے اس مختصر مضمون میں ان سب کے ذکر کی گنجائش نہیں ہے تاہم چند ناموں کا ذکر ناگزیر ہے۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، قاضی نصیر الدین دہلوی، مولانا قیام الدین دہلوی شیخ محمد عیسیٰ دہلوی، شیخ فتح اللہ اودھی انصاری، شیخ محمد بن خضر دہلوی۔

سلسلہ عالیہ چشتیہ کے مرکزی بزرگ حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ ابراہیمی دور کے اکابر اولیاء اللہ میں تھے، شیخ محمد بن خضر متوفی ۸۱۱ھ ابراہیمی دور میں دہلی سے جونپور تشریف لائے، ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد گہنہ میں قریہ ولید پور وغیرہ کئی گاؤں جاگیر میں دیئے گئے، بعد میں شیخ مشید کا خاندان وہیں منتقل ہوگیا جس میں شاہ ابوسعید، شاہ ابوالخیر شاہ اسمٰعیل ملا محمود، شاہ ابوالغوث ملا محمود اور شاہ ابواسحاق وغیرہ پیدا ہوئے۔ (ص: ۴۹)

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

’’ہمارے خیال میں دیار اعظم گڈھ میں سب سے پہلا مدرسہ شیخ مشید کی جاگیر داری میں موضع سلطان پور (بھیرا) [۳] میں جاری ہوا‘‘۔ (ص:۴۹)

اسی دور میں شیخ فتح اللہ بن عبداللہ انصاری اودھی دہلی سے جون پور آئے، جامع مسجد میں ان کا وعظ ہوتا جس میں عمائدین سلطنت شریک ہوتے، بعد میں انہیں پرگنہ ماہل میں کئی گاؤں جاگیر میں ملے، ان کی اولاد میں علمی سلسلہ باقی رہا۔ مولوی حسن علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ انہیں کی اولاد میں ہوئے۔

حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جونپوری متوفی ۸۷۰ھ دور ابراہیمی کے کبار اولیاء اللہ میں تھے۔

اس دور میں علماء ومشائخ کی جو کثرت تھی وہ حد بیان سے باہر ہے، ان میں سب سے اہم اور مشہور ومقبول شخصیت حضرت قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تھی۔

قاضی صاحب نے شرقی سلطنت کے زمانے میں علماء وفضلاء کی ایک اجمالی فہرست بھی لکھی ہے جو تقریباً ستر علمائے کبار کے ناموں پر مشتمل ہے، اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ اس وقت پورب کا ملک علم وعلماء کی کثرت سے کیسا بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

مشرق سلطنت کا خاتمہ بہلول شاہ لودھی کے ہاتھوں ہوا، اس حکومت کا اختتام ۸۸۱ھ میں ہوا، لودھی حکومت ۸۸۱ھ سے ۹۳۳ھ تک رہی، لودھیوں میں سلطان سکندر لودھی کا عہد سلطنت قریب قریب ویسا ہی رہا۔ جیسا کہ ابراہیم شاہ شرقی کا تھا، اس کا اٹھائیس سالہ دور بہت خیر وبرکت کا تھا۔

اس دور کے چند علماء کے نام یہ ہیں۔

شیخ نظام الدین میران شاہ چشتی مانک پوری، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری، مولانا الہداد حنفی جونپوری، شیخ قطب الدین بینائے دل وغیرہ۔ قاضی صاحب نے تقریباً بیس نام شمار کرائے ہیں۔

تیسرا علمی دور:

دیار پورب میں تیسرا علمی دور مغل سلطنت کے قیام ۹۳۲ھ سے شروع ہو کر ۱۱۳۰ھ تک

پھیلا ہوا ہے، قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ’’اس دوسوسالہ مدت میں ہندوستان کے مختلف دیار وامصار کی طرح دیار پورب میں بھی بہت سے علمی ودینی مرکز پورے انبساط ونشاط کے ساتھ اپنے اپنے علمی حلقوں میں کام کرتے رہے، کہنا چاہئے کہ گذشتہ دونوں ادوار کے حسنات وبرکات تیسرے دور میں پوری طرح کھل کر سامنے آگئے تھے اور اس دیار کے قصبات وقریات علم وعلماء کی کثرت اور سرگرمی کی وجہ سے ہرات اور نیشاپور معلوم ہوتے تھے، اور اسی دور کے پانچویں سلطان شہاب الدین محمد شاہ جہاں کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ ’’پورب شیراز ماست‘‘۔(ص:۷۰)

مغلیہ حکومت کے دور میں دو بادشاہوں نے خاص طور سے پورب کے علمی چمنستان کی رکھوالی کی اور اسے آباد وشاداب رکھنے کا اہتمام کیا۔ ایک جہاں گیر، دوسرے شاہجہاں۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ’’واضح ہو کہ صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ، اور صوبہ عظیم آباد تینوں ملکوں کے مجموعے کو ملک پورب کہا جاتا تھا اور تینوں علاقوں میں مسجدیں، مدارس، خانقاہیں ارباب علم وفن اور علماء ومشائخ سے آباد تھیں، البتہ ان میں الہ آباد اور صوبہ اودھ تیموری عہد میں جداگانہ شان رکھتے تھے، پھر ان دونوں میں صوبہ اودھ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی‘‘۔

قاضی صاحب علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب مآثر الکرام اور مولانا خیر الدین محمد جون پوری کی کتاب تذکرۃ العلماء کے دو طویل اقتباس نقل کئے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں ملک پورب کی علمی ودینی سرگرمیوں اور رونق کا کیا حال تھا۔

ہمایونی عہد سلطنت میں دیار پورب میں کئی ایسے علماء ومشائخ آباد ہوئے جن کے خانوادوں میں صدیوں تک علم وفضل اور علماء وفضلاء کی رونق رہی، اسی دور میں ایک مشہور بزرگ میر علی عاشقان متوفی ۹۵۰ھ علاقۂ سرہند سے آکر یہاں آباد ہونے اور اپنے نام سے ایک بستی سرائے میر ضلع اعظم گڈھ میں بسائی۔

اسی زمانہ میں خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے چشم وچراغ راجہ سید مبارک شاہ نے مبارک پور [۴] کو اپنے نام سے آباد کیا، اسی دور میں چریا کوٹ کا نام بھی دینی وعلمی تاریخ کے صفحات پر نظر آتا ہے۔

دورِ ہمایوں میں قاضی خاں ظفر آبادی علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔

دور اکبری میں بھی ملک پورب علم اور علماء کے لازوال سرمایہ سے مالا مال تھا۔ کبار علماء اس عہد میں یہاں موجود تھے، دور جہانگیری تو اس حیثیت سے امتیاز رکھتا ہے کہ علم اور دین کے گلستاں پر بہار چھا رہی تھی۔ جہانگیری دور میں ایک زبردست عالم و فاضل ملا محمد افضل جونپوری تھے۔ جن کے شاگردوں میں ملا محمود جونپوری اور دیوان محمد رشید جونپوری نہایت نامور ہوئے۔

دور جہانگیری میں گلستان علم پر جو بہار آنی شروع ہوئی تھی دور شاہجہانی میں وہ اپنے شباب پر آ گئی تھی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ’’شاہ جہاں نے تقریباً تیس سال حکومت کی، اس کا طویل دور سلطنت علم و علماء کے حق میں بڑا پر بہار تھا...... اس کا زمانہ ہر اعتبار سے بہتر تھا بلاد پورب میں علم و فن کی نشأۃ نو ہوئی اور جون پور دار العلم، دار الامن اور دہلی ثانی کے القاب کے بعد شیراز ہند کے لقب سے یاد کیا گیا‘‘۔ (ص:۸۲)

دیار پورب پر شاہجہاں نے خاص توجہ کی، شاہجہاں نے اپنی بیٹی شہزادی جہاں آراء کو قصبہ مئو بطور جاگیر کے دیا۔ شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے والے کاریگروں کو جمع کیا اور جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کیلئے حجرے بنوائے۔

شیخ مشید کے خاندان میں ایک بزرگ مولانا حاجی ابوالخیر بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ میں ملا محمود جونپوری کے بہنوئی اور معاصر تھے، وہ شاہجہانی دور میں پورب کے علمائے فحول میں شمار ہوتے تھے اور شاہی دربار سے انکے تعلقات نہایت گہرے تھے۔

جہانگیر نے ملا محمد افضل جونپوری بھیروی متوفی ۱۰۶۲ھ تھے اور دوسرے دیوان محمد رشید جون پوری متوفی ۱۰۸۳ھ تھے، استاذ الملک فرمایا کرتے تھے کہ علامہ جرجانی اور علامہ تفتازانی کے بعد ایک عہد اور ایک شہر میں ان دو فضلاء کے جیسے اب تک دو فاضل جمع نہیں ہو سکے تھے۔ (ص:۶۸)

ملا محمود جونپوری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد حکمت و فلسفہ میں ان کی ٹکر کا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا۔

اس دور میں بڑے علماء و مشائخ میں ملا رکن الدین بحری آبادی غازیپوری، مفتی عبدالسلام دیوی، قاضی محمد حسین جون پوری، مفتی مبارک بن مفتی ابوالبقاء جونپوری مفتی محمد صادق بن شیخ شمس الدین جون پوری وغیرہ تھے۔

مشائخ چشتیہ میں ایک بڑے مقام ومرتبہ کے بزرگ حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی بھی اس دور شاہجہانی کی ایک عظیم برکت تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر خود ایک صاحب علم وفضل بادشاہ تھے، انھوں نے علماء کی بڑی سرپرستی فرمائی، فتاویٰ ھندیہ کے نام سے فقہ وفتاویٰ کا عظیم الشان ذخیرہ جمع کرایا تھا۔

قاضی صاحب نے عہد عالمگیری کے علماء ومشائخ اوران کے بعد عہد تیموری کے اکابرو بزرگان کی ایک طویل فہرست لکھی ہے اور ہر ایک کا مختصر مختصر تعارف کرایا ہے۔

عہد تیموری کے اواخر میں علم وفضل کی محفلیں اجڑنے لگیں تھیں، سیاسی اتھل پتھل اور انگریزوں کی دخل اندازیوں نے بہار علم کو بڑا نقصان پہونچایا۔ ۱۱۳۰ھ کے بعد دہلی کی مرکزیت طوائف الملوکی سے بدل گئی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ’’اس بدامنی میں علمی مراکز بھی تباہی سے دوچار ہوئے، مدتوں کے جمے ہوئے مدرسے اکھڑ گئے، خانقاہیں ویران ہوگئیں اور علماء وطلبہ ادھر ادھر منتشر ہوگئے، مورخین بغداد کی تباہی کو روتے ہیں، لیکن ہندوستان کی بربادی کی داستان اس سے کچھ کم دردناک نہیں ہے‘‘۔ ص: ۱۰۳

چوتھا علمی دور:

دیار پورب کا چوتھا علمی دور اودھ کی نوابی کے قیام ۱۱۳۰ھ سے اس کے خاتمے ۱۲۷۳ھ تک کل ۱۴۳؍سال ہے۔ یہ دور علم اور علماء کیلئے بڑا نامبارک دور تھا۔ نوابان اودھ شیعی تھے، نہایت تنگ نظر تھے۔ عیش وعشرت میں مست رہتے تھے انہیں علم اور علماء سے دلچسپی نہ تھی۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ’’اس دور میں ان اطراف کی ساری علمی رونق سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ (شیعوں) میں محدود ہوکر رہ گئی، قدیم علمی و دینی خانوادے تباہ و برباد ہوگئے۔ ان کی جاگیریں اور معافیاں ضبط کرلی گئیں، وظائف بند کردیئے گئے اور مختلف طریقوں سے ان کو شیعہ بنایا جس

کے نتیجے میں ایک نیا علمی ماحول اور نئی مذہبی زندگی قائم ہوئی‘‘۔(ص:۱۰۳)

قاضی صاحب نے اس دور کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، انھوں نے یہ داستان بھی سنائی ہے کہ کس طرح علمی و دینی خانوادوں کو جو صدیوں سے علم اور دین کی خدمت کرتے آئے تھے، شیعہ مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا اور جو لوگ سنی ہونے پر مصر ہوتے، انہیں کن کن ایذاؤں سے دوچار ہونا پڑتا، اور پھر یہ کہ شیعہ علماء کس کس طرح انعام واکرام سے نوازے جاتے تھے۔ اس کے باوجود حوصلہ مند حضرات متعدد جگہوں پر علم وفضل کا چراغ روشن کئے ہوئے تھے۔

قاضی صاحب نے اپنی اس کتاب میں ۶۰۲ھ سے شروع کرکے ۱۲۷۳ھ تک کو چار دور میں تقسیم کرکے پورب میں علم وعلماء کی تاریخی داستان سنائی ہے۔

قاضی صاحب نے اس کتاب میں تاریخ کی ایک نئی جہت کا سفر شروع کیا ہے، یہ کام بہت مشکل تھا مگر قاضی صاحب کی ہمت مردانہ ایسی ہی مشکل جہتوں کو اختیار کرتی تھی اور مظفر ومنصور ہوا کرتی تھی۔ عرب و ہند کے قدیم تعلقات کی تلاش میں نکلے تو کئی کئی مجلدات تیار کر دیئے، پورب میں علم وعلماء کی کہانی سنانے بیٹھے تو تقریباً پانچ سو صفحات کا ایک ضخیم دفتر تیار کر دیا۔

اس اجمالی تاریخ اور تذکرے کے بعد قاضی صاحب نے کچھ خاص خاص بڑے بڑے علماء کے تفصیلی تذکرے لکھے ہیں جن کے ضمن میں اور بھی بہت سے علماء کا ذکر آ گیا ہے، اس طرح یہ کتاب نادر معلومات کا گنج گرانمایہ بن گئی ہے، جن علماء کا تفصیلی تذکرہ قاضی صاحب نے کیا ہے ان کی فہرست علی الترتیب یہ ہے۔

(۱) ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ۔ قاضی صاحب کا تذکرہ ص:۱۲۱ سے ص:۲۱۰ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۲) حضرت راجہ سید حامد مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ ان کا اور ان کے خانوادے کے حالات کا سلسلہ ص:۲۱۱ سے ص:۲۴۸ تک ہے۔

(۳) حضرت میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ ان کا تذکرہ ص:۲۴۹ سے ص:۲۸۷ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۴) ملامحمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ یہ تذکرہ ص: ۲۸۸ سے ص: ۳۷۵ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۵) مولانا حافظ امان اللہ بنارسی متوفی ۱۱۳۳ھ۔ یہ تذکرہ ،ص: ۳۷۶ سے شروع ہوتا اور ص: ۳۹۷ پر اختتام کو پہونچتا ہے۔

(۶) مولانا شیخ غلام نقشبندی گھوسوی متوفی ۱۱۲۶۔ ان کا تذکرہ ص: ۳۹۸ سے شروع ہوکر ص: ۴۲۶ پر ختم ہوتا ہے۔

(۷) مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی متوفی ۱۱۷۸ھ۔ ص: ۴۲۷ تا ص: ۴۶۳

(۸) مولوی حسن علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ۔ از ص: ۴۶۴ تا ص: ۴۸۰

تفصیلات اصل کتاب میں پڑھنے کے لائق ہے، اس کتاب کی ترتیب وتالیف میں قاضی صاحب نے پچاس کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان کے نام شروع کتاب میں انھوں نے درج کردیئے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) کتاب کے نام اور ہمارے اس مضمون میں ''پورب'' کا لفظ بطور وصف کے نہیں بلکہ بطور علم اور نام کے استعمال ہوا ہے اور یہ علم مغل بادشاہ شاہجہاں کے ایک جملہ ''پورب شیراز ماست'' سے ماخوذ ہے، یہ ایک خاص علاقے کا نام ہے، جس کی تفصیل آپ کو اس مضمون میں ملے گی۔ اس لئے دیارِ پورب کی فارسی اضافت پر اعتراض صحیح نہیں ہے، کہ دیار عربی لفظ ہے، اور پورب ہندی، اور ایسے دو لفظوں جن میں ایک عربی یا فارسی ہو، اور دوسرا ہندی، کی فارسی اضافت صحیح نہیں ہوتی، پس جب لفظ ''پورب'' ایک خاص علاقے کا نام ہے، تو چونکہ علم ناقابل تغیر ہوتا ہے، اس لئے یہ اضافت درست ہے۔

(۲) سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

یہ (اودھ) اصل میں اس شہر کا نام تھا، جس کو رام اور لچھمن کے مولد بننے کا فخر حاصل تھا، جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام سے مشہور ہے، مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں (اودھ)

کیااورایک پورے صوبے کانام ہے۔ (حیات شبلی ص:۷)

(۳) بھیراایک متوسط آبادی کا گاؤں ہے، جومحمد آباد کے شمال میں مائل بہ مغرب تین کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے، ٹونس ندی کے شمالی کنارے پرآباد ہے، راقم الحروف کامولد یہی گاؤں ہے۔

(۴) قاضی اطہر صاحب مبارکپور ہی کے رہنے والے تھے، اور اسی نام کی نسبت سے اپنے کو مبارکپوری لکھتے ہیں۔

حضرت مولانا سیّد زوّار حسین شاہ صاحب علیہ الرحمہ

بحیثیت مترجم

رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر یافتاح بک نستعین

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ انبیائہ المرسلین خصوصاً علیٰ اشرفھم وخاتمھم سیدنا محمد المصطفیٰ احمد المرتضیٰ وعلیٰ آلہ وأصحابہ وأتباعہ نجوم الھدی، أمابعد!

اسلامی علوم ومعارف کے خزانے سے اولاً عربی زبان مالامال ہوئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب کے لئے عربی زبان کا انتخاب کیا، اور اپنے آخری نبی کو عرب میں مبعوث فرمایا، اس کا قدرتی اور فطری اثر یہی ہونا تھا کہ ابتداءً اسلامی علوم کا تمامتر ذخیرہ عربی زبان میں آیا۔ پھر اہل عرب کے قریب تر جو زبان تھی وہ فارسی تھی، جب اسلام کے ابر کرم کا فیضان عرب سے آگے بڑھا تو سب سے پہلے دوسری زبانوں میں جو زبان اس سے مانوس اور شاداب ہوئی، وہ فارسی زبان تھی، چنانچہ عربی کا یہ ذخیرہ آہستہ آہستہ فارسی میں منتقل ہوتا رہا۔ ترجمے کی شکل میں بھی اور مستقل تصنیف وتالیف کی شکل میں بھی! فارسی زبان بولنے اور لکھنے والے بکثرت حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، ان میں ایک بڑی تعداد تو عربی زبان میں ضم ہوگئی، لیکن ایسے بھی بہت ہوئے جن کی بولنے اور لکھنے کی زبان فارسی ہی رہی، پھر جب مسلمان فاتحین کے ذریعے فارسی زبان ہندوستان میں داخل ہوئی تو علوم اسلامی کا بیشتر سرمایہ یہاں بھی فارسی زبان میں آگیا، ہندوستان میں مسلمانوں کی بنیادی علمی زبان فارسی قرار پائی، اس لئے دینی علوم زیادہ تر فارسی زبان میں

منتقل ہو گئے، علماء ومشائخ نے تصنیف وتالیف کے لئے زیادہ تر فارسی زبان کو اختیار کیا۔

اس علمی اور دینی سرمایہ کا ایک اہم حصہ وہ کتابیں ہیں جن کا تعلق تصوف وسلوک سے ہے۔ اس موضوع پر فارسی زبان میں ایک بڑا ذخیرہ وجود میں آیا، تصوف وسلوک کی جو کتابیں ہندوستان میں زیادہ مشہور ومقبول ہوئیں، وہ (۱) حضرت خواجہ علی بن عثمان داتا گنج بخش ہجویری لاہوری کی ''کشف المحجوب''۔ (۲) محبوبِ الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی کے ملفوظات ''فوائد الفؤاد''۔ (۳) بہار کے مشہور بزرگ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات صدی سہ صدی اور ان کے ملفوظات ''معدن المعانی''۔ (۴) امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات، (۵) ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات ہیں۔ جب تک ہندوستان میں فارسی زبان کا رواج رہا، یہ کتابیں فارسی زبان میں پڑھی جاتی رہیں۔ پھر جب فارسی وعربی کے سائے میں ایک نئی زبان اردو نشو ونما پانے لگی تو عربی اور فارسی کا ذخیرہ اس نئی زبان میں منتقل ہونے لگا، اس زبان کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے بڑی مناسبت تھی، اس لئے اسلامی علوم وفنون کو اردو زبان میں منتقل کرنا آسان تھا۔ اردو زبان آہستہ آہستہ ترقی کرتی گئی اور حالات ایسے پیدا ہوئے کہ فارسی زبان سمٹتی چلی گئی۔ اس صورت حال میں علماء نے اس خزانہ کو اردو زبان میں منتقل کرنا ضروری سمجھا، تاکہ اردو بولنے والی نسل دین سے بے بہرہ نہ ہو جائے، چنانچہ مستقل تصنیف کے علاوہ ترجمہ کا کام بھی بڑے پیمانے پر ہوا، لیکن ترجمہ کا کام ایک مشکل کام ہے، اس سے عہدہ برآ ہونا بڑی مہارت اور حذاقت کو چاہتا ہے، طبع زاد تصنیف میں مصنف آزاد ہوتا ہے، جن معلومات کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے، انھیں اپنی تعبیر، اپنے اسلوب اور اپنے انداز میں ڈھال لیتا ہے، اختصار کے ساتھ ہو یا تفصیل کے ساتھ! ایجاز کے ساتھ ہو یا اطناب کے ساتھ!

لیکن ترجمہ کرنے میں وہ دوسرے کا پابند ہوتا ہے، اسے مصنف کی زبان میں مصنف کی مراد سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے، پھر ضروری ہوتا ہے کہ اس کی مراد کو بعینہٖ دوسری زبان میں منتقل کرے، اس پابندی کو نبھانے کے لئے مترجم کو

(۱) دو زبانوں کا ماہر ہونا ضروری ہے، ایک اصل کتاب کی زبان کا، دوسرے ترجمہ والی

زبان کا۔ ہر ایک کے اسالیب اور تعبیرات سے وہ کماحقہ واقف ہو، تاکہ مصنف کی مراد اور اس کے مقصد کو سمجھ سکے، اور پھر دوسری زبان کی اسی تعبیر میں اسے ادا کرے، جو تصنیف کے اسلوب وتعبیر کے مترادف ہو، اگر اس نے مصنف کا مقصد نہیں پایا تو ترجمہ غلط ہوگا، اور اگر اس کا مقصد تو پا گیا، مگر ترجمہ کی زبان میں اس کی تعبیر نہ پا سکا تو مطلب الجھ کر رہ جائے گا۔

(۲) اسی طرح ہر فن میں کچھ اصطلاحی الفاظ ہوتے ہیں، اصطلاحات کا ترجمہ اور مشکل ہوتا ہے، اصل کتاب کی اصطلاحات کو سمجھنا، پھر اس کے مفہوم کو دوسری زبان میں ادا کرنا بغایت دشوار ہوتا ہے، بالخصوص اگر اس کی مترادف اصطلاح دوسری زبان میں موجود ہو، تو اس کی تلاش اور اس کا استعمال بہت وسعت نظر اور دقت نظر کو چاہتا ہے۔

(۳) ہر زبان کا نحوی وصرفی قواعد اور ترکیب الفاظ کے اعتبار سے ایک خاص مزاج اور اسلوب ہوتا ہے، ترجمہ میں اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، ترجمہ اسی ترکیب واسلوب کے مزاج میں ہو، نرا لفظ کے نیچے لفظ کا ترجمہ، جیسا کہ درس وتدریس میں کبھی بضرورت اختیار کرنا پڑتا ہے، تصنیف میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔

(۴) ہر زبان میں کلمات کے درمیان ربط کے لئے کچھ حروف ہوتے ہیں، جنھیں حروفِ جر، حروفِ ربط یا صلہ کہا جاتا ہے، ان حروف کے استعمال کا طریقہ ہر زبان میں علیٰحدہ ہے، انھیں جاننا بہت ضروری ہوتا ہے، ورنہ ترجمہ خبط ہو کر رہ جائے گا۔

(۵) مترجم کو اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ترجمہ کی عبارت اصل عبارت سے بہت زیادہ بڑھنے نہ پائے، مترجم کو اگر دونوں زبانوں پر قدرت ہوتی ہے اور مفہوم کو صحیح طور سے پا لیتا ہے تو اصل عبارت کے مطابق ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور اگر اس میں کچھ خلل ہوتا ہے تو مطلب ادا کرنے کے لئے اسے طول طویل عبارت لانی پڑتی ہے، یہ ترجمہ کا عیب ہے۔

(۶) پھر ترجمہ اتنا واضح اور سلیس ہونا چاہئے کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ مطلب ذہن نشین ہوتا چلا جائے، پڑھنے والا اگر خود صاحب فن ہے تو اسے کہیں الجھن نہ ہو۔

(۷) پھر مترجم کو دیانت دار بھی ہونا چاہئے کہ مصنف نے جس نظریہ کو پیش کیا ہے، مترجم بعینہٖ اسی کو پیش کرے، کوئی تصرف اس میں نہ کرے، اگر اسے اختلاف ہو تو حاشیے میں ظاہر کر سکتا

ہے، مگر اس طرح ترجمہ کرنا کہ اصل نظریہ ہی تبدیل ہوجائے درست نہیں۔

اردو زبان میں ترجموں کی بہتات ہے، بہت اچھے ترجمے بھی ہیں، اور اغلاط کے مجموعے بھی! اس مقالہ میں ہم ایک ممتاز اور کامیاب مترجم اور ان کی ترجمہ کی ہوئی کتاب کا تعارف کرانا چاہتے ہیں۔

حضرت مولانا سیّد زوّار حسین شاہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ:

یہ ہیں پاکستان کے نامور شیخ ومرشد، سلسلۂ نقشبندیہ کے گل سرسبد، صاحب نسبت بزرگ، صاحب تصانیف، عالم ربانی حضرت مولانا زوار حسین صاحب نقشبندی مجددی نوراللہ مرقدہٗ۔ ہم ان کا تعارف بحیثیت مترجم کرانا چاہتے ہیں۔

ہمارے سامنے حضرت موصوف کے دو ترجمے ہیں (۱) حضرت امام ربانی سیّدنا مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کے مکتوبات کا ترجمہ۔ (۲) حضرت مجدد صاحب کے فرزند گرامی اور جانشین عروۃ الوثقیٰ حضرت خواجہ محمد معصوم فاروقی قدس سرہٗ کے مکتوبات کا مکمل ترجمہ۔

دونوں بزرگوں کے مکاتیب کا موضوع تصوف وسلوک ہے! یہ دونوں حضرات تصوف کے بڑے امام گزرے ہیں، انھوں نے تصوف وسلوک کی گہرائیوں میں اتر کر علم معرفت کے تابدار موتی نکالے ہیں۔

حضرت مجدد صاحب کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے، اور نہ ان کے علوم ومعارف جو مکتوبات کے تین دفتروں میں دریا بکوزہ کے مصداق ہیں، یہ علوم ومعارف اتنے بلند اور دقیق ہیں کہ ان تک رسائی بہت مشکل ہے، جب تک حضرت مجدد صاحب علیہ الرحمہ کے علوم سے کسی کو مناسبت نہ ہو، اور تصوف کی اصطلاحوں پر پورا عبور نہ رکھتا ہو، نیز عملی طور پر ان منازل ومقامات کا تجربہ نہ رکھتا ہو، جنھیں مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ اپنے مکتوبات میں بکثرت بیان کرتے ہیں، جب تک یہ نہ ہو، وہ ان علوم ومعارف کو سمجھ بھی نہیں سکتا، ترجمہ کرنا تو دور کی بات ہے۔

حضرت مولانا زوار حسین صاحب علیہ الرحمہ کے ترجموں کے مطالعہ اور ان کے اصل کے ساتھ مقابلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موصوف ان تمام اوصاف سے بوجہ اتم متصف ہیں، جن کا اس خاکسار نے ذکر کیا ہے، فارسی زبان اور اردو زبان پر پورے عبور ومہارت کے

ساتھ ساتھ خاص بات یہ ہے کہ وہ بحر تصوف وسلوک کے بہترین اور ماہر شناور تھے، وہ ان مقامات ومنازل سے واقف تھے، جن کا حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات میں تذکرہ آیا ہے۔

حضرت موصوف نے امام ربانی کے سو مکتوبات کا ترجمہ کیا ہے، باقی ترجمہ کا کام ان کے خصوصی مسترشد اور خلیفہ حضرت حاجی محمد اعلیٰ صاحب نے اور ان کے دوست پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد عادل صاحب سہارن پوری نے مکمل کیا، چنانچہ پیش لفظ میں حاجی محمد اعلیٰ صاحب لکھتے ہیں:

> ’’سیّدی ومرشدی حضرت مولانا سید زوّار حسین شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے جو سو مکتوبات کا اردو ترجمہ کیا تھا وہ محفوظ ہے، علاوہ ازیں آپ کی تالیف ’’حضرت مجدد الف ثانی‘‘ میں بھی جگہ جگہ بکثرت مکتوبات کے اجزا کا ترجمہ موجود ہے، لہٰذا ان کی روشنی میں بسم اللہ کردی جائے اور جہاں ضرورت ہو دوستوں کو تکلیف دی جائے، چنانچہ کام شروع کئے ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایک مہربان دوست جناب پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد عادل صاحب سہارن پوری مدظلہ العالی نے ازخود بقیہ اجزا کے ترجمہ کی خدمت اپنے ذمہ لے لی۔
>
> چونکہ ترجمہ کا زیادہ تر حصہ اور تشریح وتعلیقات، نیز مکتوب الیہم اور دیگر بزرگوں کے تذکرے وغیرہ حضرت شاہ صاحب کی کتاب سے استنباط کئے گئے ہیں، اس لئے پیش نظر ترجمہ کو حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے نام نامی اسم گرامی سے شائع کیا جارہا ہے۔‘‘
>
> (مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، پیش لفظ، ص: ۲۷، ج: ۱)

پیش لفظ کے اس اقتباس سے ترجمہ کی تفصیلات معلوم ہوگئیں، لیکن یہ سوال رہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے صرف سو ہی مکتوبات کے ترجمے پر کیوں اکتفا کی، اس کا جواب حاجی صاحب مدظلہٗ حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ’’مزید ترجمہ اس خیال سے نہیں کیا کہ مکتوبات شریف کے ترجمے تو بہر حال موجود ہیں، لیکن مکتوبات معصومیہ کے ترجمہ کو تو کسی نے بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے، لہٰذا اس کو مقدم کرنا چاہئے، چنانچہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے بفضلہٖ تعالیٰ مکتوبات معصومیہ کے تینوں دفتروں کا اردو ترجمہ فرمایا، جس کو ادارہ مجددیہ شائع کرچکا ہے اور دستیاب ہے‘‘۔

اس تفصیل کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے ترجمے کے کچھ

نمونے پیش کردئے جائیں، یہ نمونے آسان مضامین سے بھی لئے جائیں گے اوران مقامات سے بھی لئے جائیں گے، جو دقیق اور مشکل علوم ومعارف پر مشتمل ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت موصوف کوترجمہ وتفہیم پرکیسی قدرت حاصل تھی۔

مقام عبدیت:

حضرت مجدد صاحب کے وہ مکتوبات جو انھوں نے اپنے شیخ ومرشد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کو اپنے سیر وسلوک کے احوال میں لکھے ہیں، وہ بہت دقیق ہیں، ایک نمونہ اس میں سے درج کیا جاتا ہے:

> ’’پس لاجرم مقام عبدیت فوق جمیع مقامات باشد چہ ایں معنی درمقام عبدیت اتم واکمل است، محبوباں را بایں مقام مشرف می سازند، محبان بذوق شہود متلذ ذ اند، التذاذ در بندگی وانس بآں مخصوص بمحبوبان ست، انس محبان بمشاہدۂ محبوب ست وانس محبوبان بہ بندگی محبوب ودریں انس ایشاں را بایں دولت می رسانند وبایں نعمت سرفرازمی سازند، شہسوار یکہ تاز ایں میدان آں سرور دنیا ودیں وسیّد اولین وآخرین حبیب رب العالمین است علیه من الصلوٰۃ أتمها ومن التحیات أکملها
>
> وکسے را کہ بمحض فضل خواہند کہ بایں دولت رسانند اورا بکمال متابعت آں سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام می سازند وبتوسل آں بآں ذروۂ علیا می برند، ذٰلک فضل الله یوتیه من یشاء ، والله ذو الفضل العظیم۔ (دفتر اول، مکتوب:۹)

ترجمہ: پس لازمی طور پر عبدیت کا مقام تمام مقامات سے بلند ہوگا، اس لئے کہ یہ معنی (یعنی اپنے نقص کو دیکھنا) مقام عبدیت میں کامل اور مکمل طور پر پائے جاتے ہیں (لہٰذا) محبوبوں کو اس مقام سے مشرف فرماتے ہیں اور محبین (محبت کرنے والے) ذوق شہود کے ساتھ لذت حاصل کرتے ہیں، بندگی میں لذت حاصل کرنا اور اس کے ساتھ انس اختیار کرنا محبوبوں کے ساتھ مخصوص ہے، محبوں کا انس محبوب کے مشاہدے میں ہے، اور محبوبوں کا انس محبوب کی بندگی میں ہے، اسی انس (بندگی) میں ان کو اس (دید نقص) کی دولت کا شرف بخشتے اور اس نعمت کے ساتھ سرفراز کرتے ہیں،

> اس میدان کے یکتا شہسوار دنیا و دین کے سردار، اولین وآخرین کے آقا، حبیب رب العالمین ہیں (**علیه من الصلوٰة أتمها و من التحيات أكملها** آپ پر کامل ترین درود اور اکمل ترین سلام ہوں)
>
> اور (کارکنان قضا وقدر) جس کو محض فضل وکرم سے (نقص اعمال کے دیکھنے کی) یہ دولت عطا فرمانا چاہتے ہیں اس کو آں سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کمال متابعت سے نصیب فرماتے ہیں، اور اس متابعت کے وسیلے سے اس کو مقامات بلند کی دہلیز تک لے جاتے ہیں، **ذٰلک فضل اللہ یوتیه من یشاء ، واللہ ذو الفضل العظیم**۔ (مکتوب:۹)

انسان نقائص اور عیوب کا مجموعہ ہے، اس کی اصل نہاد عدم ہے، اور عدم ہی ہر نقص اور ہر عیب کا سرچشمہ ہے، لیکن یہ نقص ہی ہے، جو کمال کا آئینہ ہے، کمالات اسی آئینۂ نقص میں جھلکتے ہیں، اور عیب ہی ہنر کی جلوہ گاہ ہے، اسی عیب کے پس منظر میں کمالات کا ظہور ہوتا ہے، پانی وہیں پہونچتا ہے، جہاں پستی ہوتی ہے، پس انسان کا یہ نقص وعیب ہی کمالات کا مظہر ہے، اس نقص وعیب سے مناسبت رکھنے والی چیز بندگی اور غلامی ہے۔ ’’دید قصور‘‘ سے غلامی کا احساس بیدار ہوتا ہے، پس آدمی جب اپنی اصل پر نگاہ رکھتا ہے تو اس کے سامنے حق تعالیٰ کی کبریائی جلوہ گر ہوتی ہے، اور اس کا صحیح عرفان حاصل ہوتا ہے، جو کہ مقصود خلقت انسانی ہے، **وما خلقت الجن والانس إلا ليعبدون** کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس سے ’’**ليعرفون**‘‘ منقول ہے، یعنی جن وانس کو حق تعالیٰ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ انھیں معرفت الٰہی نصیب ہو۔

پس بندگی میں اپنے قصور ونقص کی بھی معرفت ہے، اور حق تعالیٰ کے کمال وجلال کی بھی! یہ درجہ انسانیت کا بلند ترین درجہ ہے، جس سے وہی لوگ نوازے جاتے ہیں، جو حق تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں، محبوبیت کے مقام بلند پر حضرت سرور دنیا ودین، پیغمبر آخریں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ فائز ہیں، اس لئے جب ان کے انتہائے عروج کا وقت آیا تو انھیں ’’عبد‘‘ بندہ وغلام سے حق تعالیٰ نے تعبیر فرمایا: **سبحان الذی اسریٰ بعبده ليلاً من المسجد الحرام إلى المسجد الاقصیٰ** ۔ (سورہ اسراء) پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو ایک رات میں

مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ میں پہونچا دیا، اور فرمایا: وأنه لما قام عبد الله يدعوه كادوا يكونون عليه لبداً (سورہ جن: ۱۹) اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ عبادت کے لئے کھڑا ہوتو ایسا لگتا ہے کہ اس پر ہجوم کر آئیں گے) نماز کی حالت انسان کی انتہائی بلندی کا وقت ہے، اور اسی حالت میں اس کا انتہائی تذلل ظاہر ہوتا ہے، پس یہ بھی عبدیت ہی کا مقام ہے، عجب حق تعالیٰ کی مہربانی ہے، کہ جو کمی اور کوتاہی تھی اسی کو اس پروردگار نے عروج وکمال کا زینہ بنا دیا۔ حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں:

> عجائب کاروبار ست کہ ایں ذم معنی مدح پیدا کردو ایں شرارت ونقصان محل خیر وکمال گشت۔ (مکتوب: ۹)
>
> عجیب معاملہ ہے کہ اس ذم (برائی) نے مدح (تعریف) کے معنی پیدا کر لئے، اور یہ شرارت ونقصان خیر وکمال کا محل بن گیا۔

آپ مکتوب شریف کی اصل عبارت پڑھئے، اور ترجمہ پڑھئے، بامحاورہ وسلیس ہونے کے ساتھ کتنا واضح اور خوبصورت ہے، اور ساتھ ہی اصل مکتوب کی عبارت کے الفاظ کی تعداد کے قریب قریب مساوی ہے۔

مکتوبات خواجہ محمد معصوم صاحب قدس سرہٗ:

حضرت مولانا سیّد زوار حسین شاہ صاحب نے مجدد الف ثانی سیدنا امام ربانی کے فرزند وجانشین حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کے مکاتیب کا بتمام وکمال ترجمہ کیا ہے، ان مکاتیب قدسیہ کا تعارف حضرت مترجم نے جن الفاظ میں کرایا ہے، انھیں نقل کرتا ہوں:

> ''امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ السامی کے صاحبزادے اور جانشین عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ کے مکتوبات شریف بھی بزبان فارسی وعربی آپ کے والد بزرگوار کے مکتوبات شریفہ کی طرح بہت بلند درجہ رکھتے ہیں، اور شریعت وطریقت، حقیقت ومعرفت کے جامع اور ادب وانشاء کا اعلیٰ شاہکار ہیں، ان میں سالکان طریقت کو پیش آنے والے سوالات کے جوابات، خوابوں کی تعبیرات اور بہت سے فقہی مسائل کا حل ہے، نیز مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی قدس

سرہٗ کے بہت سے ادق مقامات کی تشریح پر مشتمل ہے، جو سالکان طریقت کے لئے ایک بے بہا ذخیرہ اور انمول خزانہ ہیں‘‘۔ (مقدمہ، دفتر اول، ص: ۱۸)

مکتوبات امام ربانی کے ترجمے تو متعدد علماء نے کئے، لیکن مکتوبات معصومیہ کا اردو ترجمہ نہیں ہو سکا تھا، اس لئے اردو خواں طبقہ ان مکتوبات کے مطالعہ اور ان کے فیوض و برکات سے محروم تھا، حضرت شاہ صاحب نے ان کے ترجمے کا عزم کیا، اور بحمد اللہ حرفاً حرفاً پورا ترجمہ کر دیا۔ ایسا سلیس اور عام فہم کہ جس کو ذرا بھی مناسبت ہو وہ آسانی سے سمجھ جائے، جو مضامین ادق اور بلند ہیں، انھیں عام عقل و ذہن پر اتارنا تو ممکن نہیں، لیکن ترجمہ کی سلاست اور عمدگی نے انھیں اصحاب فن سلوک کے لئے سہل کر دیا ہے۔

ہم ان مکاتیب کے کچھ اقتباسات اور ان کے ترجمے نقل کرتے ہیں، ان سے اندازہ ہوگا کہ ترجمہ جیسا جانکاہ اور نازک عمل کس درجہ عمدگی کے ساتھ ہوا ہے۔

عظمتِ مصطفی ﷺ:

مکتوبات معصومیہ کھولئے اور دسواں مکتوب پڑھئے، کیا عشق و محبت ہے، کیا والہانہ انداز ہے، کیا فصاحت و بلاغت ہے، حضور سرور کائنات فداہ ابی و امی و روحی کی سرکار میں عقیدت و عظمت کا وہ جوش ہے کہ پڑھنے والے کا ایمان تازہ ہو جائے، اگرچہ فارسی ادب و انشا کا ذوق اب عنقاء ہے، مگر محبت و معرفت کی فراوانی اور حسن عبارت کی دلآویزی تقاضا کرتی ہے کہ پورا مکتوب نقل کیا جائے، پڑھئے اور بار بار پڑھئے، بغور پڑھئے، پھر قدم بقدم ترجمہ بھی ملاحظہ کیجئے:

’’ الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ،

> نقد سعادت دارین وابستہ بمتابعت سید کونین ست، علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام، اگر نجات از نار ست، مربوط بمتابعت سید ابرار ست، اگر دخول بدار القرار ست، ہم منوط باتباع قدوۃ الاخیار ست، و اگر رضائے پروردگار ست، نیز مشروط بہ پس رویِّ سید مختار ست، توبۂ و زہد و توکل و تبتل بے تبعیت او نامقبول ست واذکار و افکار و اشواق و اذواق بے توسل وے غیر مامول۔
>
> انبیاء بقدحے از سرچشمۂ آب حیات او سیراب و متمع، و اولیاء بجرعۂ از بے بحر

پایان اوقانع ومتنفع ! ملک طفیلیٔ اوست وفلک حویلیٔ او، رشتۂ وجود باومسلوک ست وسلسلۂ ایجاد بوے مربوط، وظہور ربوبیت باومنوط، کائنات جملگی درقفائے ویند، ومکوّن کائنات طالب رضائے او! کماورد ''أنا أطلب رضاء ک یا محمد''

نماند بعصیاں کسے درگرو   کہ دارد چنیں سیدے پیش رو

فان رسول الله نور يستضاء به
مهند من سيوف الله مسلول

صلوات الله تعالىٰ وتسليماته وتحياته سبحانه عليه وعلىٰ آله وصحبه كلما ذكره الذاكرون وكلما غفل عن ذكره الغافلون صلوة تكون لک رضاء ولحقه اداء.

پس بر جوانانِ سعادت مند وطالبان ہوش مند لازم است کہ ظاہراً وباطناً در اتباع اوکوشند وہر چہ منافی ایں دولت بود، چشم سَر وسِر ازاں پوشند وبیقین یقین دانند کہ اگر شخصے ہزاراں ہزار فضائل وخوارق داشتہ باشد ودر متابعت مداہن بود، صحبت ومحبت او سم قاتل ست، وشخصے کہ ہیچ ازیں خوارق وفضائل ندارد ودر اتباع قدم راسخ دارد صحبت ومحبت او تریاق نافع!

بیت

محال ست سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

عليه وعلىٰ آله الصلوات والتسليمات والبركات العلى

اب اس مکتوب شریف کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

" **الحمد لله وسلام علىٰ عباده الذين اصطفىٰ** (سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر سلام ہو) دونوں جہاں کی سعادت کی متاع سید کونین ﷺ کی پیروی پر موقوف ہے، اگر دوزخ سے نجات مقصود ہے، تو وہ بھی سیدابرار ﷺ کی متابعت سے وابستہ ہے، اور اگر دارالقرار یعنی جنت میں داخل ہونا ہے، تو وہ بھی پیشوائے صالحین کے اتباع پر منحصر ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کا

حاصل ہونا ہے، تو وہ بھی رسول مختار کی پیروی کے ساتھ مشروط ہے، توبہ وزہد وتوکل اور دنیا سے قطع تعلق کرنا آپ کی متابعت کے بغیر مقبول نہیں، اور آپ کے توسل کے بغیر اذکار اور اشواق واذواق کی امید نہیں کی جاسکتی، انبیاء علیہم السلام آپ کے سرچشمۂ آب حیات کے ایک پیالہ سے سیراب ومستفید ہیں، اور اولیاء اللہ آپ کے بے پایاں سمندر کے ایک گھونٹ پر قانع ومنتفع ہیں، فرشتے ان کے طفیلی اور آسمان ان کی حویلی ہے، وجود کا رشتہ ان کے ساتھ منسلک اور ایجاد کا سلسلہ ان کے ساتھ مربوط اور ربوبیت کا ظہور ان کے ساتھ وابستہ ہے، جملہ کائنات ان کے ہی پیچھے ہے، اور کائنات کا بنانے والا (اللہ) تعالیٰ، ان کی رضا کا طالب ہے، جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے: ’’**أنا أطلب رضاءک یا محمد**‘‘ (اے محمد ﷺ) میں تیری رضا چاہتا ہوں۔

جس کا امام ایسا سردار ہو، وہ شخص گناہوں کے بدلے میں گروی نہ رہے گا۔
بلاشبہ رسول اللہ ﷺ ایسا نور ہیں جن سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، اور آپ
اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے، میان سے نکلی ہوئی ایک (ہندی) عمدہ تلوار ہیں۔

صلوات اللہ تعالیٰ وتسلیماتہ وتحیاتہ سبحانہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ کلما ذکرہ الذاکرون وکلما غفل عن ذکرہ الغافلون صلوۃ تکون لک رضاء ولحقہ اداء، (اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور سلامتیاں اور نوازشات آپ پر اور آپ کی آل واصحاب پر ہوں، جب تک کہ ذکر کرنے والے اللہ کا ذکر کرتے رہیں، اور جب تک ذکر سے غافل لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہیں، ایسی رحمتیں جو اس کے لئے رضا کا باعث ہوں، اور اس کے حق کی ادائیگی کا ذریعہ ہوں)

پس سعادت مند جوانوں اور ہوش مند طالبو پر لازم ہے کہ ظاہر وباطن میں آنحضرت ﷺ کے اتباع کی کوشش کریں، اور جو چیز اس دولت (اتباع رسول) کے منافی ہے اس سے ظاہر وباطن کی آنکھ بند کرلیں، اور یقینی طور پر جان لیں کہ اگر کوئی شخص ہزارہا فضائل وخوارق رکھتا ہو اور آنحضرت ﷺ کی متابعت میں سستی کرتا ہو، تو اس شخص کی صحبت ومحبت زہر قاتل ہے، اور جو شخص کہ ان فضائل وخوارق میں سے کچھ بھی نہ رکھتا

ہو، اور آنحضرت ﷺ کے اتباع میں ثابت قدم ہو، اس کی صحبت ومحبت نفع دینے والی تریاق ہے۔

(اے سعدی! حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیروی کے بغیر پرہیزگاری کے راستہ پر چلنا محال ہے)

علیه وعلیٰ آله الصلوات والتسلیمات والبرکات العلی،

اصل مکتوب اور اس ترجمہ کو پڑھیے، اصل مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ کہیں کوئی ژولیدگی اور تعقید نہیں ہے، ورنہ ترجمہ میں تھوڑی سی بے احتیاطی سے تعقیدات پیدا ہو جاتی ہیں۔

صورت والفاظ معتبر نہیں حقیقت ومعنی معتبر ہیں:

حضرت خواجہ صاحب کے ایک مسترشد نے اپنے عریضہ میں اپنے عربی وفارسی اشعار لکھ کر حضرت کو ملاحظہ کے لئے بھیجے، حضرت نے ان کی دلجوئی کی اور ان کے فن کی داد دی، لیکن ساتھ ہی نصیحت کی کہ الفاظ وعبارت سے پہلے معانی پر توجہ کرنی چاہئے، وہ نہ ہو تو الفاظ وعبارت کی کاریگری مفید نہیں، فرماتے ہیں:

> ”لیکن پیش از تحقق معنی بصور وحروف در ماندن بطالت ست، از گفت وشنود کارے نمی کشاید، اقبال دائم بصفت ذل وعجز بجناب قدس درکار ست ومراقبہ متواتر، بنعت فرورفتگی ونیستی کہ فی الحقیقت کمال بے نعتی ست وبے رسمی، مطلوب ست تا باشد کہ قطرۂ از چاشنی معنی درکام جان او بچکانند، واورا ازاں سیراب ابد سازند وایں کار اوست سبحانہ وتعالیٰ وموہبت صرفہ است، آنچہ بظاہر ایں وابستہ است دوام عبودیت وتفقد است وہموارہ متعطش وبے آرام بودن وجز از وہیچ چیز مالوف ناشدن وبآتش شوق اوسوختن وہمہ وقت بایں تلواسہ ساختن وبدیں سوز گداختن ست، آیت کریمہ **وما خلقت الجن والانس إلا لیعبدون** شاہد ایں معنی است۔ (مکتوب دفتر اول، مکتوب:۵۱)

ترجمہ: لیکن معنی کے متحقق ہونے سے پہلے صورتوں اور حروف میں رہ جانا بے کار بات ہے، صرف کہنے اور سننے سے کوئی کام نہیں چلتا، ذلت وعاجزی کی صفت کے ساتھ ہمیشہ بارگاہ قدس کی طرف متوجہ رہنا درکار ہے اور فنائیت اور نیستی کی

صفت کے ساتھ جو کہ حقیقت میں کمال بے وصفی اور بے رسمی ہے، متواتر مراقبہ مطلوب ہے، تا کہ ایسا ہو کہ معنی کی چاشنی کا ایک قطرہ اس کی جان کی حلق میں ٹپکائیں، اور اس سے اس کو ابدی سیرابی عطا کر دیں، اور یہ اس (اللہ) سبحانہ وتعالیٰ کا کام ہے، اور محض عنایت وبخشش ہے، جو چیز کہ بظاہر اس کے ساتھ وابستہ ہے وہ ہمیشہ کی عبودیت (بندگی)اور تلاش ہے، اور ہمیشہ پیاسا اور بے آرام رہنا ہے، اور اس کے علاوہ کسی چیز سے محبت نہ کرنا، اور اس کے شوق کی آگ میں جلنا، اور ہر وقت اس کے ساتھ بے قرار رہنا اور اس سوز کے ساتھ پگھلنا ہے، آیت کریمہ وو **ما خلقت الجن و الانس إلا لیعبدو ن**، (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) اس معنی کے لئے شاہد ہے۔

آخرت کی نجات شریعت حقہ پر موقوف ہے:

بعض اوقات سالک کو دوران سلوک کچھ ایسے احوال پیش آتے ہیں، جو بظاہر شریعت کے مطابق نہیں ہوتے، یہ چیز عموماً سالکین کے لئے ایک مشکل اور آزمائش کی چیز ہوتی ہے، مرشد کامل ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ کی توفیق ہوتی ہے، تو سالک اس آزمائش سے کامیاب گزر جاتا ہے، ورنہ بعض اوقات یہ چیزیں ہلاکت کا سبب بن جاتی ہیں، ایک سالک نے شریعت پر استقامت کا اپنے بارے میں ذکر کیا، تو اس کے جواب میں خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں، اصل مکتوب کا اقتباس اور اس کے ترجمہ کی خوبی ملاحظہ فرمائیے:

”آنچہ در مکتوب اخیر مندرج بود کہ باوجود مغلوبیٔ اذواق باطن، ظاہر ہمہ بر طبق شریعت غرا است، بل آنچہ در مرآت شرائع مواجید مشہود ست اوفر الاحتظاظ است الخ ذوق بر ذوق افزود، حق سبحانہ مدار نجات اخروی را مربوط بشریعت حقہ کہ بوحی قطعی ثابت شدہ است ساختہ، وقرب خود را منوط باتباع سنت سنیہ نمودہ است، آیت کریمہ **قل إن کنتم تحبون اللہ** الآیۃ مشعر بآنست“۔ (مکتوب: ۵۷) دفتر اول

ترجمہ: اور یہ جو دوسرے خط میں تحریر تھا کہ ”باطنی اذواق سے مغلوب ہونے کے باوجود ظاہر پوری طرح شریعت غرا کے مطابق ہے، بلکہ شرائع کے آئینے میں

جو مواجید مشاہد ہوتے ہیں بہت زیادہ لذت دیتے ہیں الخ'' اس نے ذوق پر ذوق بڑھایا، حق سبحانہ وتعالیٰ نے آخرت کی نجات کا مدار شریعت حقہ کے ساتھ، جو کہ وحی قطعی سے ثابت ہو چکی ہے، وابستہ کیا ہے، اور اپنے قرب کو سنت منورہ کے اتباع پر موقوف کیا ہے، آیت کریمہ **قل إن كنتم تحبون الله** الخ اس بات کی خبر دیتی ہے۔

لفظ کے مطابق لفظ کا ترجمہ ہے، اسے آپ ترجمہ لفظی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن سلاست اور اردو کے اسلوب میں کہیں خلل واقع نہیں ہوا، یہ ترجمہ کا کمال ہے، آگے حضرت خواجہ صاحب معرفت کی مزید گہرائی میں اترتے ہیں:

''وآنچہ بعضے از سالکاں را در اثنائے راہ امورے کہ بظاہر خلاف طور نبوت است، روئے می دہد، اگر از مقبولانست ظاہر اورا باحکام شرعیہ متحلّی می دارند، واز ورطۂ مہالک محافظت می نمایند وخلاف وجدان او، از و بعمل می آرند جمعے را ازیں شہود می برآرند بحقیقت کار کہ اسلام حقیقی است ودراں موطن مطابقت کشوف است باعلوم شرعیہ مہتدمی سازند، وجمعے دیگر را در ہمیں شہود تا آخر می دارند، لیکن مقبولاں را کلائت ولید می فرمایند۔

الحمد للہ از مطالعہ مراسلات لطیفہ حظے فرا گرفتہ، از اصالت نسبت است کہ نوشتہ اند کہ مہما امکن از دائرۂ احکام بیروں رفتن نمی گزارند ودر ہر حکمے ذوق خاص لطیفۂ دل را حاصل است ومواجید ہمہ برطبق سنت سنیہ۔

ترجمہ: اور یہ جو بعض سالکوں کو راہ سلوک طے کرنے کے دوران بعض امور جو بظاہر طریقہ نبوت کے خلاف ظاہر ہوتے ہیں، اگر وہ سالک مقبول بندوں میں سے ہے، تو اس کے ظاہر کو احکام شرعیہ کے ساتھ مزین رکھتے ہیں، اور ہلاکتوں کے گرداب سے اس کی حفاظت فرماتے ہیں، اور اس کے وجدان کے خلاف اس سے عمل کراتے ہیں، ایک جماعت کو اس شہود سے باہر نکال لیتے ہیں، اور کام کی حقیقت کی طرف، جو کہ حقیقی اسلام ہے، اور اس مقام میں کشوف کو علوم شرعیہ کے ساتھ مطابقت ہے، ہدایت دیتے ہیں، اور ایک دوسری جماعت کو اسی شہود میں آخر تک رکھتے ہیں، لیکن مقبول بندوں کی نومولود بچوں کی طرح حفاظت کرتے ہیں۔

الحمدللہ آپ کے پاکیزہ خطوط کے مطالعہ سے بہت حظ حاصل ہوا، اور یہ جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

’’حتی الامکان احکام (شرعیہ) کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیتے اور ہر حکم میں لطیفۂ دل کو ایک خاص ذوق حاصل ہے، اور تمام مواجید (وجد وحال) روشن سنت کے مطابق ہیں‘‘۔ یہ اصالت نسبت سے ہے۔

حجاب اکبر نفس ہے:

حضرت خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمہ ایک سالک کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اللہ تعالیٰ ابواب فیوض وترقیات را مفتوح دارد، بزرگترین حجاب میان طالب ومطلوب نفس طالب است، **دع نفسک وتعال انت الغمامة علیٰ شمسک فاعرف حقیقتک.**

رفتن نفس سالک از میان امریست ذوقی ووجدانی، بگفتن ونوشتن راست نمی آید وبخواندن ومطالعۂ کتب بحصول نمی پیوندد، سابقۂ عنایت وجذب الٰہی جل شانہ می باید ودر عالم اسباب صحبت کامل ومکمل بشرط فنا دروے۔ (دفتر دوم ص:۳۸)

اس اقتباس کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

’’اللہ تعالیٰ فیوض وبرکات کے دروازے کھلے رکھے، طالب ومطلوب کے درمیان سب سے بڑا حجاب طالب کا نفس ہے، دع نفسک الخ (تو اپنے نفس کو چھوڑ دے اور آجا، تو اپنے سورج پر خود ہی ابر ہے، پس تو اپنی حقیقت کو پہچان لے)

سالک کے نفس کا درمیان سے دور ہو جانا، ایک ذوقی اور وجدانی امر ہے، جو تقریر وتحریر میں نہیں آسکتا، اور پڑھنے اور مطالعہ کتب سے حاصل نہیں ہوتا، اور اللہ جل شانہ کی عنایت وجذب کی سبقت اور عالم اسباب میں کسی شیخ کامل ومکمل کی صحبت، اس (شیخ) میں فنا ہونے کی شرط کے ساتھ ہونی چاہیئے۔

حضرات صوفیہ کا مرتبہ ومقام:

ایک سالک کے لئے چند دعائیں کرتے ہیں اور حضرات صوفیہ کرام کے مرتبہ ومقام

سے آگاہی بخشتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ بعافیت وجمعیت دارد وبر جادۂ شرع محمدی وسنت احمد علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام مستقیم ومستدیم گرداندواز تعلقات دنیا وگرفتاریٔ ماسوا محرر ساختہ در سرادقات معرفت وسراپردۂ قرب خویش والفت دہد۔

ایں معنی در عالم اسباب وابستہ بسلوک طریقۂ صوفیہ عالیہ است، ایں بزرگواراں درمحبت حق جل وعلا از خود وغیر خود گسستہ اند ودر عشق اواز آفاق گزشتہ، ماسوارا درراہ اودر باختہ باوساختہ اند، اگر حاصل دارند اورادارند واگر واصل اند باو واصل اند، باطن ایشاں را بنہجے انقطاع از مادون اوتعالیٰ روئے دادہ است کہ اگر سالہا یاد ماسوانمایند بیادشاں نیاید وازانانیت نفس بنوعے گزشتہ اند کہ عود کلمۂ انا را برخود شرک می دانند۔

(دفتر دوم مکتوب:۴۴)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ عافیت وجمعیت کے ساتھ رکھے اور شرع محمدی وسنت احمدی علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے راستہ پر استقامت ودوام عطا فرمائے، اور دنیا کے تعلقات اور ماسوا کی گرفتاری سے آزاد کر کے اپنی معرفت کے شامیانوں اور قرب کے سراپردوں میں انس والفت نصیب فرمائے۔

اور یہ حقیقت عالم اسباب میں صوفیائے کرام کے طریقے پر چلنے کے ساتھ وابستہ ہے، یہ اکابر حق جل وعلا کی محبت میں اپنے آپ سے بھی اور اپنے علاوہ دوسروں سے بھی قطع تعلق کر چکے ہیں، اور اس کے عشق کی وجہ سے آفاق وانفس سے گزر کر اور ماسوی اللہ کو اس کی راہ میں قربان کر کے اس کے ساتھ موافقت کر لی ہے، اگر حاصل رکھتے ہیں، تو اسی کو رکھتے ہیں، اور اگر واصل ہیں تو اسی کے ساتھ واصل ہیں، ان کے باطن کو ماسوی اللہ تعالیٰ سے اس حد تک انقطاع حاصل ہو گیا ہے کہ اگر وہ سالہا سال بھی ماسوا کو یاد کریں، تو وہ ان کو یاد نہ آئے، اور نفس کی انانیت سے اس قدر آزاد ہو چکے ہیں کہ اپنے اوپر کلمۂ انا (میں) کے اطلاق کو شرک جانتے ہیں۔

حق تعالیٰ کی جانب سے فیض مسلسل ہے:

حضرت خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمہ کے برادرزادہ خواجہ عبدالاحد صاحب جو استعداد عالی

رکھتے تھے، ان کے نام ایک مکتوب گرامی میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے بخشش وفیضان مسلسل اور علیٰ وجہ الاتم ہے، بندوں کی استعداد کا نقص ہوتا ہے کہ اس سے کما حقہ فیضیاب نہیں ہوتے۔ فرماتے ہیں:

> ”از مبدأ فیض تعطیل نیست، ہموارہ درکار است، بحسب استعدادات وقابلیات! اگر قبض وتعطیل ست منشا آں قابل است نہ مفیض، چہرۂ معشوق در مرایائے متقابلۂ او باندازۂ صفا ونورانیتِ آئینہ ہر وقت منعکس ونمایاں ست، آئینہ کہ زنگار دارد، پذیرائے صورت نیست، کمی ونقصان از جانب آئینہ ست نہ از جانب صورت۔ (دفتر سوم، مکتوب: ۱۶۸)
>
> ترجمہ: مبدأ فیض کی طرف سے بیکاری نہیں ہے، وہ ہمیشہ برسر کار ہے، استعدادوں اور قابلیتوں کے مطابق! اگر قبض وبیکاری ہے، تو اس کا منبع خود فیض قبول کرنے والا ہے، نہ فیض دینے والا، معشوق کا چہرہ اپنے بالمقابل آئینوں میں، آئینہ کی صفائی اور نورانیت کے مطابق ہی ہر وقت منعکس اور نمایاں ہوتا ہے، جو آئینہ کہ زنگ آلود ہے وہ صورت کو قبول نہیں کرتا، کمی ونقص آئینہ کی جانب سے ہے، نہ کہ صورت کی جانب سے“۔

فنائیت کا دوام اور قصور اعمال کی دید:

ترجمہ کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمایئے، حضرت خواجہ صاحب قدس سرہٗ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”نوشتہ بودند کہ وقت سلوک از قالب اثرے نمی بینم، چناں معلوم می شود کہ گویا ہیچ درمیان نیست، در حیرت می مانم کہ ایں چہ باشد؟
>
> مخدوما! ہیچ جائے حیرت نیست کہ حالتے ست نیکو، سالکاں را دست می دہد، لیکن معتبر آنست کہ ایں حالت دوام پیدا کند ومراقبہ وغیر مراقبہ وسکوت وغیر سکوت در دید عدمیت ونیستی یکساں بود، وعدمیتِ ذاتیہ رُو دہد ووجود موہوم کہ منشاء انانیت امارہ است روبزوال آرد۔

وآنچہ نوشتہ اند کہ اگر طاعت وعبادت کردہ می شود ازاں استغفار کردہ نظر بر فضل وکرم اومی دارد، مطالعۂ آں محظوظ ساخت، ہر چند دید قصور در اعمال پیدا شود اعمال را قیمت افزاید وقابل قبول سازد، **اعمل و استغفر** از عمل باز نمانند استغفار ازاں نمایند ونظر بر فضل صرف داشتہ باشد، راہِ بندگی این ست۔ (دفتر سوم، مکتوب: ۱۶۸)

ترجمہ: آپ نے لکھا تھا کہ میں سکوت (مراقبہ) کے وقت قالب سے کوئی اثر نہیں دیکھتا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ درمیان میں نہیں ہے، میں حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ یہ کیا ہے؟

میرے مخدوم! حیرت کا کوئی مقام نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک عمدہ حالت ہے، جو سالکوں کو پیش آتی ہے، لیکن معتبر یہ ہے کہ یہ حالت دوام حاصل کرلے، مراقبہ وغیر مراقبہ اور سکوت وغیر سکوت، عدمیت ونیستی کے دیکھنے میں یکساں ہوں، اور عدمیت ذاتی رونما ہوجائے، اور وجود موہوم جو کہ نفس امارہ کی انانیت کا منبع ہے، زوال پذیر ہوجائے۔

اور یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ ''اگر طاعت وعبادت کی جاتی ہے، تو اس سے استغفار کرکے نظر اس کے فضل وکرم پر رکھتا ہوں'' اس کے مطالعہ نے مسرور کیا، جس قدر قصور کی دید، اعمال کے اندر پیدا ہوگی، اعمال کی قیمت کو اسی قدر بڑھائے گی، اور قابل قبول بنائے گی، بزرگوں نے کہا ہے، **اعمل و استغفر** (عمل کر اور استغفار کر) عمل سے رکے نہ رہیں، اور اس سے استغفار بھی کریں، اور نظر محض فضل پر رکھیں، بندگی کا طریقہ یہی ہے''۔

یہ چند نمونے ترجمے کے اس خاکسار نے کیف ما اتفق نقل کئے ہیں، تمام ترجموں کا انھیں سے اندازہ کرلیجئے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے یہ ترجمے، ترجمہ کے اصولی معیار پر پورے اترتے ہیں، کہیں کہیں فروگزاشت کا ہوجانا تو بشری فطرت ہے، کہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ بہتر تعبیر لائی جائے، لیکن ایسے بلند معارف، ادق مضامین اور عمدہ تعبیرات واسالیب کا جو بہتر سے بہتر اور صحیح سے صحیح ترجمہ ہوسکتا ہے، اس کا نمونہ شاہ صاحب کے ترجمے ہیں، آپ اصل کو سامنے رکھ کر پڑھتے چلے جایئے۔ آپ کو ان شاء اللہ کہیں یہ نہیں محسوس ہوگا کہ مکتوب نگار کچھ کہہ

رہے ہوں اور ترجمہ نگار کچھ اور لکھ رہے ہوں، جو کچھ اصل مکتوب میں کہا گیا ہے، بعینہٖ وہی بات ترجمہ میں بھی ہے، اور الفاظ وعبارت میں بھی کسی اضافہ اور طوالت کو اختیار نہیں کیا گیا ہے، مزید یہ کہ سلاست اور وضوح بیان میں کچھ خلل نہیں ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

کیا رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین میں حضراتِ شیخین شریک نہ تھے؟

حضرات صحابہ کرام کی عزت وناموس کا تحفظ ابتداء تاریخ اسلام ہی سے علماء امت کے درمیان اہم اجماعی مسئلہ رہا ہے کیونکہ دورِ صحابہ ہی سے مختلف فرقوں کی پیداوار شروع ہوگئی تھی، ان میں سے بعض فرقے ایسے بھی تھے جن کی دراز دستیاں اسلام کے اس مقدس وپاکیزہ گروہ کے جیب وگریباں کا تماشا کرنا چاہتی تھیں، انھوں نے کھلے اور چھپے بہت کوشش کی کہ اس باعزت طبقہ کے بے داغ دامنوں کو داغدار بنادیں، لیکن ان کے مقابلے میں علماء اہل سنت نے ان بزرگوں کی عظمت وتقدیس کو دین وایمان کا ایک عظیم سرمایہ قرار دے کر ہر محاذ پر ان کا دفاع کیا، اور بحمد اللہ اس میں یہ حضرات سرخرو رہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں خاص طور سے دو بزرگ ان ناروا حملوں کے زیادہ تر ہدف بنائے گئے اور یہ دونوں بزرگ وہ ہیں جو اہل سنت کے نزدیک فضل وکمال اور شرف وکرامت میں تمام امت سے بڑھ کر ہیں، یعنی حضراتِ شیخین سیدنا ابوبکر وسیدنا عمر فاروق **رضی اللہ عنہما**، ایک جماعت جو قدیم ایرانی تہذیب کے زیر اثر کسی فضل وکمال اور حکومت وسلطنت کو نسلی اور خاندانی حدود سے باہر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اس کے خیال میں حق تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو جن کمالات وخصوصیات سے نوازا تھا، ضروری تھا کہ یہ خصوصیات آپ کی نسل عالی میں باقی وقائم رہتیں۔ چونکہ وفات کے وقت آپ ﷺ کے فرزندوں میں سے کوئی موجود نہ تھا اس لئے اس جماعت نے فرض کرلیا کہ یہ کمالات وامتیازات آپ ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد سیدنا حضرت

علی کرم اللہ وجہہ اوران کی اولاد...... جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسل سے ہیں...... میں منتقل ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اسی مزعومہ کی بنا پر اس جماعت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے خلافت بلافصل اور امامت...... جو اپنے آثار ونتائج کے اعتبار سے نبوّت کی ہم پایہ بلکہ اس سے بھی کچھ بلند تر ہے......کا منصب تجویز کیا، اور اسی گمان باطل کے نتیجے میں اس گروہ کو حضرات شیخین سے سخت عناد پیدا ہوگیا، ان کے خیال میں یہ دونوں حضرات نعوذ باللہ غاصب خلافت تھے، اہلسنت نے اس الزامِ باطل کی دھجیاں بکھیر دیں۔

زیرنظر مضمون میں اسی موضوع سے متعلق ایک خاص جزئیہ کی تحقیق مقصود ہے، بسا اوقات یہ سوال سننے میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو اہل بیت نبوت پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس وقت اہل تعلق کے ہوش وحواس بجا نہ تھے لیکن دوسری طرف دیکھئے تو حضرت ابوبکر وعمر اور دوسرے بہت سے صحابہ حکومت وامارت کی فکر میں سرگرداں تھے، اور اسی مشغولیت میں پڑ کر آپ ﷺ کی تجہیز وتکفین تک میں شریک نہ ہوسکے۔ یہ سوال تو ایک ہے، مگر اس کے نتیجے میں کئی اعتراضات پیدا ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ ان حضرات کو حضور اقدس ﷺ کی وفات کا رنج نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ حضرات خلافت وامارت کے آرزومند تھے۔ تیسرے یہ کہ اس اندیشہ سے کہ کہیں خلافت دوسروں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے، ضروری ہنگامی تقاضوں کو نظر انداز کرکے خلافت طلبی میں منہمک ہوگئے۔ چوتھے یہ کہ اسی انہاک کے باعث تجہیز وتکفین میں شریک نہ ہوئے۔ زیرنظر مضمون میں ان اعتراضات کا تاریخ کی روشنی میں منصفانہ جائزہ لیا جائے گا۔

چار مراحل:

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دنیوی کے آخری اوقات چار مرحلوں میں منقسم ہیں۔ پہلا مرحلہ مرض الوفات کا۔ دوسرا مرحلہ حالت وصال کا۔ تیسرا مرحلہ وصال کے بعد تجہیز وتکفین تک کا۔ چوتھا مرحلہ تجہیز وتکفین اور تدفین کا۔

تاریخ وسیر کی کتابیں شاہد ہیں کہ حضرات شیخین ان چاروں مرحلوں میں نہ صرف یہ کہ موجود رہے ہیں، بلکہ ان کی شخصیت ہر مرحلہ میں شرعی وانتظامی حیثیت سے رہنما اور فیصلہ کن رہی ہے۔

مرض الوفات:

آخر کون نہیں جانتا کہ جب نبی اکرم ﷺ کو مرض کی شدت ہوئی، اور نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں آنے سے آپ ﷺ معذور ہوگئے، تو امامت کے لئے حضرت صدیق اکبر ؓ کا انتخاب ہوا، یہ انتخاب کرنے والا اور کوئی نہیں، خود بنفس نفیس سرورِ کائنات ﷺ تھے، امامت کے لئے یہ انتخاب تواتراً ثابت ہے، اس میں تو کسی مخالف سے مخالف شخص کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ بعض حضرات نے حضرت صدیق اکبر ؓ کی جانب سے عذر خواہی بھی کی کہ وہ رقیق القلب ہیں، آپ کے مصلیٰ پر کھڑے ہوکر خود کو سنبھال نہ سکیں گے۔ اس لئے ان کے بجائے حضرت عمر کو متعین فرمادیا جائے تو آپ ﷺ نے سختی سے انکار فرمادیا۔

عن عائشةؓ قالت : لما مرض النبی ﷺ مرضه الذی مات فیه فحضرت الصلوٰة فأذن بلال فقال مروا أبابکر فلیصل بالناس فقیل له أن أبابکر رجل اسیف إذا قام مقامک لم یستطع أن یصلی بالناس فأعاد فأعادوا له فأعاد الثالثة فقال إنکم ”صواحبات یوسف“ مروا أبابکر فلیصل بالناس۔

(البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۳۲ بحوالہ بخاری شریف)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو مرض الموت لاحق ہوا، اور نماز کا وقت آگیا تو بلالؓ نے اذان کہی، حضور ﷺ نے فرمایا ابوبکرؓ سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں، آپ سے عرض کیا گیا کہ ابوبکرؓ رقیق القلب آدمی ہیں، آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو نماز پڑھانے پر قادر نہ ہوسکیں گے۔ آپ ﷺ نے دوبارہ وہی ارشاد فرمایا، لوگوں نے پھر وہی بات دہرائی، آپ ﷺ نے پھر مکرر ارشاد فرمایا اور فرمایا کہ تم ”صواحبات یوسف“ ہو، ابوبکرؓ سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

اور ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ ایک صاحب نے غلط فہمی سے حضرت عمرؓ کو آگے بڑھا دیا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انکار فرمادیا۔

عن عبد الله بن زمعه قال: لما استعز برسول الله ﷺ وأنا عنده فی نفر من المسلمین دعا بلال للصلوٰة فقال؛ مروا من یصلی بالناس قال: فخرجت فإذا عمر فی الناس وکان ابوبکر غائباً فقلت قم یا عمر فصل بالناس قال: فقام

فلما کبّر عمر سمع رسول اللہ ﷺ وکان عمر رجلا مجھرا فقال رسول اللہ ﷺ فاین ابوبکر یابی اللہ ذٰلک والمسلمون، یابی اللہ ذٰلک والمسلمون .
(البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۳۲ بحوالہ مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن زمعہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب مرض کی شدت ہوئی اور اس وقت میں مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ حضور ﷺ ہی کے پاس تھا، تو بلالؓ نے نماز کے لئے پکارا، فرمایا کہ کسی کو حکم دو کہ نماز پڑھادے، فرماتے ہیں کہ میں باہر نکلا، حضرت عمرؓ موجود تھے اور اتفاق سے حضرت ابوبکر وہاں نہ تھے، میں نے کہا عمر! نماز پڑھایئے، وہ کھڑے ہوگئے، جب انھوں نے تکبیر کہی تو حضور ﷺ نے سن لیا، ان کی آواز بلند تھی، فرمایا ابوبکر کہاں ہیں؟ اللہ کو اور مسلمانوں کو یہ منظور نہیں، دوبار فرمایا۔

یہ سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ مصلیٰ سے ہٹ آئے اور پھر اہتمام سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بلوایا گیا، وہ جب آئے تو انھوں نے نماز پڑھائی، اس طرح کی روایات سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول خدا ﷺ کے نزدیک سیدنا صدیق اکبرؓ کی امامت ایک طے شدہ بات تھی، وہیں دو باتیں اور معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ حضرات شیخین آپ ﷺ کے مرض الوفات میں مستقل حاضر باش تھے، اتفاق سے ایک وقت حضرت ابوبکر موجود نہ تھے تو انھیں بلوایا گیا، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے درمیان ان دونوں بزرگوں کی عظمت وصلاحیت مسلم تھی، خیال تو کیجئے جب حضرت ابوبکرؓ موجود نہ تھے، تو صحابی کی نظر انتخاب حضرت عمرؓ پر پڑی اور اس مجمع میں کسی کو اعتراض نہ ہوا، حالانکہ اس وقت اہل بیت سیدنا علی وسیدنا عباس **رضی اللہ عنہما** بھی یقیناً موجود ہوں گے، مگر ان کے واسطے امامت کی پیشکش نہیں ہوئی اور نہ حضور ﷺ نے ان کا انتخاب فرمایا، نہ خود اہل بیت کو اس امامت پر کبھی اعتراض ہوا، اس سے ہر وہ شخص جو اپنے کاسۂ سر میں ذرا بھی عقلی صلاحیت رکھتا ہوگا سمجھ سکتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کرام کی نگاہ میں متفقہ طور امامت کے اہل یہی دونوں بزرگ تھے، چنانچہ مذکورہ بالا روایت میں مزید یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن زمعہ کو ٹوکا کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ یہ حضور کا حکم ہے، جو تم مجھ سے نقل کر رہے ہو، اگر میرا یہ گمان نہ ہوتا تو میں ہرگز امامت کے

لئے آگے نہ بڑھتا۔ اس کا جو جواب حضرت عبداللہ بن زمعہ نے دیا وہ سننے کے قابل ہے، فرمایا:

واللہ ماأمرني رسول اللہ ﷺ ولٰكن حين لم أر أبابكر رأيتك أحق من حضر بالصلوٰة	واللہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیانہیں دیا تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر موجود نہیں ہیں تو میں نے سمجھا کہ اس مجمع میں آپ سے زیادہ امامت کا حقدار کوئی نہیں۔

حضور ﷺ کا آخری دیدار:

پھر حضور ﷺ کی وفات تک حضرت ابوبکر ہی نمازیں پڑھاتے رہے، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں آخری نماز جو حضرت ابوبکر کی امامت میں ادا کی گئی ہے وہ دوشنبہ کے روز فجر کی نماز ہے، اسی روز چاشت کے وقت آپ ﷺ کا وصال ہوا، علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں بخاری کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> ”حضور اکرم ﷺ کے خصوصی خادم اور صحابی حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مرض الوفات میں حضرت ابوبکر ؓ امامت کیا کرتے تھے، دوشنبہ کا دن تھا لوگ فجر کی نماز میں صف بستہ تھے، حضرت ابوبکر مصلیٰ پر تھے کہ یک بیک حجرہ مبارکہ کا پردہ اٹھا، اور رسول اللہ ﷺ سامنے کھڑے نظر آئے، آپ ہمیں دیکھ رہے تھے اور چہرۂ اقدس ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قرآن کھلا ہوا ہو، آپ مسکرا رہے تھے، ہمیں حضور ﷺ کے روئے انور کے دیدار سے ایسی مسرت ہوئی کہ ہم بے خود ہوئے جا رہے تھے، حضرت ابوبکر فوراً اُلٹے پاؤں کھسکے تا کہ صف میں شامل ہو جائیں، انھوں نے سمجھا کہ حضور بنفس نفیس خود تشریف لا کر نماز پڑھائیں گے، آپ نے اشارہ سے فرمایا کہ نماز پوری کرلو اور پردہ گرالیا۔

وفات شریف:

یہ جمال جہاں آراء کی آخری تابانی تھی جو صحابہ کرام نے دیکھی، پھر اسی روز چاشت کے وقت حضور ﷺ کا وصال ہوگیا، دوشنبہ کے روز حضور اکرم ﷺ کی طبیعت ہشاش بشاش تھی، نماز سے فارغ ہو کر حضرت ابوبکر نے عرض کیا:

يا نبي الله اني اراک قد أصبحت بنعمة من الله وفضل كما تحب

والیوم یوم بنت خارجة افآتیها قال نعم ثم دخل رسول الله ﷺ وخرج ابو بکر الیٰ أهله بالسخ (السیرة النبویة لابن هشام، ج:۴،ص:۲۲۲)

اے اللہ کے نبی ! آج اللہ کے فضل وکرم سے آپ کی طبیعت بہتر ہے اور آج بنت خارجہ کی باری ہے (حضرت ابوبکر کی اہلیہ) کیا میں ہو آؤں؟ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے، پھر حضور اندر تشریف لے گئے اور ابوبکرؓ اپنی اہلیہ کے پاس مقام سنح چلے گئے۔

یہ وقت ہم ایسا پاتے ہیں کہ جب سیدنا ابوبکر صدیق﷜، حضور اکرم کے پاس موجود نہ تھے، لیکن یہ عدم موجودگی کسی طرح قابل مواخذہ نہیں ہے کیونکہ وہ جہاں گئے تھے حضور کی اجازت ورضامندی سے گئے تھے، دوسرے یہ کہ گو حضرت صدیقؓ موجود نہ تھے مگر ان کی صاحبزادی ام المومنین حضرت عائشہ تو موجود تھیں، بلکہ صحیح روایات اس پر متفق ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی آغوش ہی میں حضور اقدس ﷺ تھے کہ آپ کی روحِ مبارک رفیق اعلیٰ کے حضور حاضر ہوئی۔

قالت عائشة توفی رسول الله ﷺ بین سحری ونحری۔ (طبقات ابن سعد، ج:۲،ص:۲۶۲، البدایہ والنہایہ، ج:۵،ص:۲۳۹ بحوالہ بخاری شریف)	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی وفات میری گود میں ہوئی۔

البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ عین حالت وفات کے وقت حضرت عمرؓ مسجد میں موجود ہیں، چنانچہ حضرت عائشہ کی روایت یہی ہے کہ جونہی حضور ﷺ کی وفات ہوئی، اور میں نے چارپائی پر لٹایا اور آپ کو چادر اُڑھائی تھی کہ:

فجاء عمر والمغیرة بن شعبة فاستاذنا فاذنت لهما۔	حضرت عمر اور مغیرہ بن شعبہ آئے اور دونوں نے اندر آنے کی اجازت چاہی، میں نے اجازت دے دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت حضرت عمرؓ وہیں تھے، پھر آگے سنئے ! کہنے والے کے منہ کو کون پکڑے، وہ تو کہہ دیتے ہیں کہ ان حضرات کو آپ کی وفات کا رنج نہ تھا، لیکن دل تھام کر سوچیں کہ جن لوگوں نے اپنی پوری زندگی، تمام تر مال وجان جس ذات والا صفات پر قربان کردی

تھی، انھیں اس کی جدائی پر کیا کچھ محسوس ہو رہا ہوگا، جگر پھٹ جاتا، قلب کے ٹکڑے اڑ جاتے، حواس بکھر جاتے، مگر اسی ذات نے جس کی رِحلت کا آج غم مسلط ہے، اسی نے مصائب وآلام پر صبر وضبط اور رضا بالقضا کا سبق اتنی تکرار اور اتنی کثرت کے ساتھ پڑھا اور یاد کرا رکھا تھا اور حق تعالیٰ کی ذات حی وقیوم کے ساتھ ایسا ربط وتعلق قائم کر دیا تھا کہ اس نے جزع وفزع، نوحہ وشیون اور نالہ وفریاد کی تمام صدائیں بند کر دی تھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حزن:

تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن کی صلابت وشجاعت اور مضبوطیٔ قلب ودماغ شہرۂ آفاق ہے، دیکھئے کہ اس جانگداز حادثہ سے کس درجہ متاثر ہیں، آج بھی جب حضرت عمرؓ کی عظمت اور بلندیٔ حوصلہ کا تصور آتا ہے اور اس کے ساتھ وفاتِ نبوی کے وقت ان کی کیفیتِ حزن وملال کا تذکرہ ہم پڑھتے ہیں تو دونوں حالتوں کی تطبیق میں عقل حیران ہو جاتی ہے۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے بھی اور ابن سعد نے بھی یہ تذکرہ کیا ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت عمر اور حضرت مغیرہ بن شعبہ حجرۂ اقدس میں داخل ہوئے تو جونہی روئے انور پر ان کی نگاہیں پڑیں بے ساختہ حضرت عمر گھبرا کر پکار اُٹھے:

واغشياه! ما أشد غشى رسول الله ﷺ	ہائے غشی! رسول اللہ ﷺ پر کس شدت کی غشی طاری ہے۔

پھر یہ دونوں حضرات پلٹے، تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے دروازہ کے قریب جا کر حضرت عمرؓ کو بتایا کہ حضور بے ہوش نہیں ہیں آپ کا وصال ہو گیا ہے، حضرت عمر کو فرطِ رنج سے یہ سننے کی تاب نہ تھی، بگڑ کر بولے: مغیرہ تم عجیب فتنہ جو آدمی ہو، جھوٹ بولتے ہو، حضور ﷺ کا انتقال اس وقت تک نہ ہوگا، جب تک منافقین کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۳۲ بحوالہ مسند احمد)

یہ کہتے ہوئے وہ مسجد میں آ گئے، حضور ﷺ کے وفات کی خبر مدینہ میں بجلی کی طرح کوند گئی، مسجد تو پہلے سے بھری ہوئی تھی، اب مزید اطراف وجوانب سے لوگ سوگوارانہ کھنچ کھنچ کر آنے لگے، آپ کے وصال کے متعلق ایک دوسرے کو ابھی بتا ہی رہے تھے کہ حضرت عمرؓ کو جلال

آ گیا، انھوں نے پکار پکار کر کہنا شروع کر دیا کہ اگر کسی کی زبان پر حضور کے وصال کی بات آئی تو میں اس کی زبان کاٹ دوں گا، قتل کر ڈالوں گا، سب لوگوں پر ہیبت طاری ہوگئی، زبانیں خاموش ہوگئیں، لیکن جو واقعہ ہو چکا تھا اسے کون رد کر سکتا تھا، اب یہ مشکل آن پڑی کہ حضرت عمرؓ کو سمجھائے کون؟ حضرت عباسؓ تشریف لائے۔ وہ لوگوں سے دریافت کرتے رہے کہ کسی کو حضور کی وفات سے متعلق کوئی حدیث معلوم ہے؟ لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی، انھوں نے حضرت عمرؓ سے بھی دریافت کیا، ان کا جواب بھی نفی میں تھا۔ غالبًا انھوں نے سوچا ہوگا کہ اگر حضور ﷺ کے حوالہ سے کوئی بات مل جاتی تو اختلاف آسانی سے ختم ہو جاتا، لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ اس باب میں لوگوں کو کوئی بات معلوم نہیں تو پھر انھوں نے ازخود فرمایا کہ سب لوگوں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حضور کا وصال ہوگیا ہے، (ﷺ) لیکن چونکہ یہ بات انھوں نے اپنے اجتہاد سے کہی تھی اس لئے حضرت عمرؓ کو غالبًا اطمینان نہیں ہوا، تاہم حضرت عباسؓ کی بزرگی اور حضور ﷺ سے قرابت مندی کی وجہ سے انھوں نے کچھ کہا بھی نہیں۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۴۳ بحوالہ بیہقی)

یہ اختلاف کیوں؟:

اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ عظیم وبرگزیدہ شخصیات جن کا ربط حق تعالیٰ کے ساتھ بہت قوی ہوتا ہے، اور لوگوں کے قلوب ان کی وقعت ومحبت سے لبریز ہوتے ہیں، ان کی وفات کا ان کی زندگی میں تصور تک نہیں آتا، پھر جب واقعہ ہو جاتا ہے تو اہل تعلق کو اس کا یقین کرنا دشوار ہو جاتا ہے، یہ تاریخ انسانی کا ایسا باب ہے کہ اَبطال ومشاہیر کی تاریخ سے جو بھی واقفیت رکھتا ہوگا، اس کے نزدیک یہ مسئلہ محتاج دلیل نہ ہوگا، خود قرآن میں اسی قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام عصا بدست کھڑے ہو کر مسجد اقصیٰ کی تعمیر کرا رہے تھے، اجنّہ اور شیاطین تعمیری منصوبہ کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے کہ خدا کا حکم آپہونچا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام اسی حالت میں اعلیٰ علیین میں پہونچ گئے، لیکن جسد اقدس اسی طرح کھڑا رہا، اور ایک مدت تک کھڑا رہا، کسی کو خیال بھی نہ گذرا کہ آپ تشریف لے جا چکے ہیں، البتہ اس پر حیرت ضرور رہی ہوگی کہ عرصہ گذر گیا اور حضرت اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر رہے ہیں، پھر ایسا ہوا کہ ان کے عصاء مبارک میں دیمک لگ گئی اور آہستہ آہستہ دیمک نے اندر اندر پورے عصا کو

چاٹ ڈالا، پھر اچانک ایک دن وہ ٹوٹ گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا بدن زمین پر آ رہا۔ جب کہیں احساس ہوا کہ حضرت کی وفات ہو چکی ہے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ
مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖ إِلَّا دَابَّةُ
الْاَرْضِ تَاكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا
خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَّوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَالَبِثُوْا فِى
الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (سورہ سبا:۱۴)

پھر جب ہم نے ان پر موت کا حکم جاری کر دیا
تو کسی چیز نے ان کے مرنے کا پتہ نہ بتلایا مگر
گھن کے کیڑے نے کہ وہ سلیمان کے عصا کو
کھاتا تھا سو جب وہ گر پڑے تب جنات کو
حقیقت معلوم ہوئی کہ اگر وہ غیب جانتے
ہوتے تو اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے۔
(بیان القرآن)

پھر اگر اسی طرح کی بات حضور ﷺ کے سلسلے میں بھی پیش آئی تو تعجب کیا ہے؟ نزول وحی کے وقت رسول اللہ ﷺ پر ایک خفیف سی غشی کا مشاہدہ ہوتا رہتا تھا، ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیال ہوا ہو کہ یہ غشی ذرا شدید قسم کی ہے، عجب نہیں حضور کی یہ غیبت درحقیقت حق تعالیٰ کے دربار میں آپ کی روح مبارک کا کوئی مخصوص عروج ہو، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کے لئے اپنی قوم سے جدا ہوکر کوہِ طور پر تشریف لے گئے تھے اور لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ان کا انتقال ہوگیا، پھر وہ چالیس روز کے بعد تورات لے کر آئے، اسی طرح حضور ﷺ بھی واپس تشریف لائیں گے۔

لما توفی رسول الله ﷺ قام عمر بن الخطاب فقال: إن رسول الله ﷺ مامات ولكنه ذهب إلىٰ ربه كما ذهب موسىٰ بن عمران فقد غاب عن قومه أربعين ليلة ثم رجع إليهم بعد أن قيل قد مات، والله ليرجعن رسول الله ﷺ كما رجع موسىٰ. (سیرۃ ابن ہشام، ج:۴، ص:۲۳۴)

جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی، تو حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے، کہا کہ حضور کی وفات نہیں ہوئی ہے، آپ ﷺ اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ بن عمران گئے تھے، وہ بھی تو اپنی قوم سے چالیس رات کے لئے غائب ہوگئے تھے، اور پھر لوٹے تھے، حالانکہ یہ

کہا جانے لگا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا، خدا کی قسم حضور اقدس ﷺ بھی لوٹیں گے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آمد:

ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ کوئی ایسی طاقتور اور مستحکم شخصیت ہوتی جو سب کو مطمئن کر دیتی اور سب کا اعتماد حاصل ہوتا۔ حضرت عباسؓ نے لوگوں کو مطمئن کرنا چاہا مگر ان کی پیش نہ گئی، اس مجمع میں کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو اس ہیجان میں **وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ** کی تلاوت کر رہے تھے، (البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۴۳) یعنی (محمد ایک رسول ہی تو ہیں، ان سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں) مگر اس کی طرف کسی کو دھیان نہ ہوا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کمی اس وقت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی، لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے ہوئے ہیں؟ اس لئے ایک صاحب سالم بن عبید فوراً مقام سنح کی جانب دوڑے گئے (البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۴۴) اور حضرت صدیق کو حادثۂ فاجعہ کی خبر سنائی، حضرت صدیق اکبر پر جو بیتنی تھی وہ بیت گئی، لیکن جب انھوں نے یہاں آ کر نقشہ ملاحظہ فرمایا تو خود کو قابو میں رکھا، اس وقت یہ مناسب نہ تھا کہ مجمع عام میں صدمہ کا اظہار کیا جاتا بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ دلوں کی ڈگمگاتی کشتی کو سنبھالا جاتا، انھوں نے مسجد میں لوگوں کو روتے بلکتے دیکھا، مدہوش و متوالا پایا، بے خود و وارفتہ پایا، حضرت عمر کو تلوار لے کر دھمکاتے دیکھا، ان سب مناظر پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے وہ سیدھے حجرۂ اطہر میں پہونچے، حضرت عائشہ صدیقہؓ وہاں موجود تھیں، اور دیگر امہات المومنین بھی حلقہ باندھے بیٹھی تھیں۔

امام بیہقی کے حوالے سے صاحب البدایہ والنہایہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آمد کی روایت تفصیل سے نقل کی ہے۔ ہم اس کا ترجمہ ذیل میں نقل کئے دیتے ہیں، اس سے حضرت صدیق اکبر کے مزاج و مذاق، اور دین اسلام میں ان کے رسوخ و پختگی، نیز ان کی توحید میں استقامت کا صحیح اندازہ ملتا ہے۔

’’حضرت صدیقؓ مسجد کے دروازے پر سواری سے اترے، وہ نہایت محزون و رنجیدہ تھے، حجرۂ اقدس کے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت چاہی، اجازت ملنے پر اندر تشریف لے

گئے، حضور اکرم ﷺ کا جسد اطہر بستر پر تھا، امہات المومنین حلقہ باندھے بیٹھی تھیں۔ آپ کی آمد پر سب نے پردہ کرلیا، حضرت عائشہ چونکہ بیٹی تھیں انھیں پردہ کرنے کی حاجت نہ تھی، حضرت صدیق اکبر نے حضور اکرم ﷺ کے روئے انور سے چادر ہٹائی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پیشانی کو بوسہ دیا اور بے ساختہ رونے لگے، پھر فرمایا: وہ بات نہیں جو عمر کہہ رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، آپ پر اللہ کی رحمت ہو، یا رسول اللہ! آپ زندگی میں بھی پاکیزہ تر تھے، اور وفات کے بعد بھی پاکیزہ تر ہیں۔ پھر چادر اوڑھا دی، اور تیزی سے مسجد کی طرف پلٹے (ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ سے دوبار ارشاد فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، مگر وہ ایسے بے خود تھے کہ نہ بیٹھے، جب حضرت صدیقؓ نے یہ رنگ دیکھا تو سیدھے آگے بڑھے) اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے منبر کے پاس پہونچ گئے، اب حضرت عمرؓ بھی بیٹھ گئے، حضرت صدیق اکبرؓ نے منبر کے کنارے کھڑے ہوکر لوگوں کو آواز دی، سب لوگ خاموش ہوگئے اور سمٹ کر بیٹھ گئے، حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ مسنونہ پڑھا، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جب وہ حیات تھے جبھی موت کی اطلاع دے دی تھی، اور تم لوگوں کو بھی مطلع کردیا ہے، خدائے عزوجل کے علاوہ اور کوئی باقی رہنے والا نہیں ہے، ارشادِ ربّانی ہے: **وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ** (محمد ایک رسول ہی تو ہیں، ان سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں) حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا یہ آیت قرآن میں ہے؟ واللہ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے آج سے پہلے یہ آیت اتری ہی نہ تھی (پھر فرمایا) اور سنو! حق تعالیٰ فرماتے ہیں: **إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ** (بلاشبہ تم بھی مرنے والے ہو، اور یہ لوگ بھی مرجائیں گے) اور حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ** (ہر شئی ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے، حکم تو اسی کا ہے اور اسی کی جانب تم واپس لے جائے جاؤ گے) اور سنو! **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ** (زمین پر جو بھی ہے فنا ہوجانے والا ہے، اور صرف تمہارے رب کی ذات ذوالجلال والاکرام باقی رہے گی) اور ارشاد ہے: **كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ** (ہر نفس موت کا مزا چکھنے والا ہے، اور تمہیں قیامت کے دن پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

پھر فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ایک عمر بخشی اور آپ کو زندہ رکھا، انھوں نے اللہ کے دین کو قائم و مستحکم کیا، خدا کے امر کو ظاہر کیا، اللہ کا پیغام پہونچایا، اس کی راہ میں جہاد کیا، پھر اللہ نے انھیں وفات دے دی، وہ تمہیں راستہ پر لگا کر چلے گئے، اب جو ہلاک ہوگا دلیل واطمینان کے بعد ہلاک ہوگا، تو جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے جو اس کا پروردگار ہے، تو وہ خوب سمجھ لے کہ خدا زندہ ہے، اسے موت کبھی نہیں آئے گی، اور جو شخص محمد کی عبادت کرتا تھا اور انھیں کو معبود بنا رکھا تھا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا معبود انتقال کر گیا۔

اے لوگو! اللہ سے ڈرو، اپنے دین کو مضبوطی سے تھامو، اپنے رب پر بھروسہ کرو، اللہ کا دین قائم ہے، اللہ کی بات مکمل ہے، جو خدا کی مدد کرے اور اس کے دین کو عزت دے اللہ تعالیٰ اس کا حامی وناصر ہے، بلاشبہ اللہ کی کتاب ہمارے درمیان ہے، وہ نور ہے، وہی شفاء ہے، اسی سے اللہ نے حضرت محمد (ﷺ) کو ہدایت بخشی، اس میں حلال وحرام کی تفصیل ہے، واللہ ہم کو اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ مخلوق کی جانب سے کیا حالات پیش آئیں۔ اللہ کی تلواریں بے نیام ہیں، ہم نے ابھی انھیں ہاتھ سے رکھا نہیں ہے، جو ہماری مخالفت کرے گا ہم اس سے اسی طرح جہاد کریں گے جیسے حضور ﷺ کے ساتھ رہ کر کرتے تھے، اس لئے جو کوئی بغاوت کرے گا اپنے آپ سے بغاوت کرے گا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۴۳)

اس تقریر کے بعد سکون ہوا۔

سقیفہ بنی ساعدہ:

جب اس بات کا فیصلہ ہوگیا، اور لوگ متفق ہوگئے کہ حضرت کی وفات واقعۃً ہوچکی ہے تو قدرۃً ذہنوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ امت کی شیرازہ بندی جو آپ نے فرمائی تھی، اور اسلامی ریاست جو آپ کے ہاتھوں نشو ونما پا رہی تھی اس کے تحفظ وبقاء کا کیا انتظام ہو؟ اس سلسلے میں حضراتِ شیخین کے خلاف غوغا مچایا جاتا ہے کہ انھیں خلافت کی طلب تھی، اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس پر قابض ہوجائیں، لیکن تاریخی روایات کی چھان بین سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات اس وقت تک اپنی خلافت کے تصور سے خالی تھے، اس کے برخلاف اگر ہم اس کا کچھ خیال واہتمام دیکھتے ہیں تو یا تو حضرات انصار میں، یا حضراتِ اہل بیت کے یہاں۔ حالانکہ سیدنا ابوبکر صدیق

رضی اللہ عنہ کو اس کا تصور ہوتا تو بجا تھا، کیونکہ وہ حضور ﷺ کے نامزد کردہ امام تھے، حضور فرما چکے تھے کہ اللہ اور مومنین کو ابوبکر کے علاوہ کسی کی امامت منظور نہیں ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۳۲ بحوالہ مسند احمد)

نیز تمام مسلمانوں کی نگاہیں بھی آپ ہی کی جانب ملتفت تھیں، اور پہلا معرکۃ الآراء مرحلہ یعنی وفات النبی کا قضیہ آپ ہی کے قول پر سرانجام ہوا تھا، پھر اگر وہ کچھ سوچتے اور دوسرے مسلمان تجویز کرتے کہ خلیفہ انھیں کو ہونا چاہئے تو عین فطری بات تھی، مگر جتنی معتبر تاریخی روایتیں ہیں وہ کسی گوشہ سے اس بات کا تاثر نہیں دیتیں کہ حضرت صدیق کو اپنی خلافت کا کوئی واہمہ تھا، ہاں حضرت عباسؓ کو حضور ﷺ کی حیات ہی میں اس کا خیال تھا کہ خلافت کا مسئلہ حضور سے طے کرالینا چاہئے، چنانچہ وفات سے دو تین روز پہلے کا قصہ ہے کہ:

أن عباساً وعلياً لما خرجا من عند رسول الله ﷺ فقال رجل كيف أصبح رسول الله ﷺ فقال عليٌّ أصبح بحمد الله بارئاً فقال العباس إنک والله عبد العصا بعد ثلاث إنى لأعرف فى وجوه بنى هاشم الموت وإنى لارىٰ فى وجه رسول الله ﷺ الموت فاذهب بنا اليه فنسأله فيمن هذا الامر فإن كان فينا عرفناه وإن كان فى غيرها أمرناه فوصاه بنا فقال على إنى لا أسأله ذٰلک والله إن منعناه لا يعطينا ها الناس بعده ابداً ۔

ایک روز جب حضرت عباس اور حضرت علی حضور ﷺ کے پاس سے نکل کر باہر آ رہے تھے، تو ایک شخص نے حضور کا حال دریافت کیا، حضرت علی نے فرمایا الحمدللہ اب تندرست ہیں، حضرت عباس نے فرمایا واللہ تم تین روز کے بعد ڈنڈے کے ماتحت ہوگے، میں بنی ہاشم کے رُخ پر موت کے آثار پہچانتا ہوں، اور میں رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور پر بھی موت کے آثار دیکھ رہا ہوں، چلو حضور کے پاس چل کر پوچھ لیں کہ یہ کام (خلافت) کن لوگوں کے سپرد ہوگا، اگر ہمارے سپرد ہوتا ہے تو ہمیں معلوم ہوجائے گا، اور اگر کسی دوسرے کو ملنے والا ہے تو ہم گذارش کریں گے کہ اس کو ہمارے حق میں کچھ وصیت کردیں، حضرت علی نے جواب دیا کہ میں تو ہرگز نہیں پوچھوں گا، واللہ اگر حضور نے ہم سے انکار کردیا تو لوگ پھر کبھی ہمیں یہ کام سپرد نہ کریں

گے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۵۱ بحوالہ بخاری شریف)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباس کے دل میں اس کا اہتمام تھا، اور حضرت علی بھی اس کے تصور سے خالی نہ تھے اور جو گروہ حضراتِ شیخین پر معترض ہے، اس کی روایت کے مطابق تو حضرت علی ہمیشہ اپنے کو اس کا مستحق سمجھتے رہے، اور اس کے آرزومند رہے، اگر خلافت کا آرزومند ہونا ایسا ہی برا ہے تو حضرت علی کے پاس پہونچ کر یہ برائی بھلائی سے کیوں کر تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ نہج البلاغہ میں سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک خطبہ بنام شقشقیہ منقول ہے، وہ اسی شکایت سے لبریز ہے کہ میں خلافت کا حقدار تھا، لیکن فلاں نے اس پر قبضہ کرلیا، پھر اس نے فلاں کے حوالے کردیا، میں صبر کا تلخ گھونٹ پیتا رہا۔

أما واللہ لقد تقمصها فلان وإنه ليعلم أن محلی منها محل القطب من الرحیٰ ....فرأيت أن الصبر علیٰ هاتا أجحی وفصبرت وفی العين قذی وفی الحلق شجی أریٰ تراثی نهباً۔ (نہج البلاغہ، ج: ۱، ص: ۳۰)

خدا کی قسم خلعت خلافت کو فلاں نے پہن لیا، حالانکہ وہ خوب جانتا تھا کہ خلافت کے مسئلے میں میرا مقام وہی ہے جو چکی میں اس کی کھونٹی کا ہوتا ہے، پھر میں دیکھا کہ صبر ہی مناسب ہے، اس لئے صبر کیا، حالانکہ یہ تنکا میری آنکھ میں کھٹکتا رہا اور یہ اُچھو حلق میں پھنسا رہا، میں دیکھ رہا تھا کہ میری میراث لوٹ کا مال بن گئی ہے۔

دور تک حکایت وشکایت سے لبریز تقریر پھیلتی چلی گئی ہے، اور اس طرح کے متعدد خطبے ہیں، جن سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت علیؓ کو اس پر بہت تاسف تھا کہ انھیں ابتداء میں خلافت سے کیوں محروم کردیا گیا۔ (اہل سنت کے نزدیک حضرت علی اس آرزومندی اور حکایات وشکایات کی بے معنی کہانیوں سے بَری ہیں)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور خطبہ:

پھر اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ مشہور خطبہ دیکھئے، جسے اکثر سیر کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے، جو آپ نے اپنے زمانۂ خلافت کے آخری حج سے واپسی پر مدینہ طیبہ میں تمام مہاجرین وانصار کے مجمع عام میں دیا تھا، اور حکم دیا تھا کہ جو لوگ میری باتوں کو اچھی طرح سمجھ گئے

ہوں وہ جہاں جائیں وہاں میرے اس خطبہ کو پہنچا دیں۔ اس خطبہ کا حضرت عمرؓ کو بڑا اہتمام تھا، یہ خطبہ آپ منیٰ میں دینا چاہتے تھے، جہاں تمام عالمِ اسلام کا مجمع اکٹھا تھا۔ وہیں کسی نے آپ کو یہ اطلاع دی تھی کہ فلاں شخص کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد میں فلاں شخص سے بیعت کرلوں گا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے مشورہ دیا کہ یہاں ہر طرح کا مجمع ہے نہ جانے لوگ کیا سے کیا سمجھ جائیں، اس لئے یہاں مناسب نہیں ہے، مدینہ واپس چلیں، وہاں اہل حل وعقد اور سمجھداروں کا اجتماع ہوگا، آپ کی ہر بات صحیح محل پر رکھی اور سمجھی جائے گی، چنانچہ واپسی پر آپ نے طویل خطبہ دیا، اس میں بہت سے اہم امور کو بیان کرتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا:

> ’’مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ایک شخص نے کہا ہے کہ اگر عمرؓ مر گئے تو میں فلاں سے بیعت کرلوں گا، اس کو یہ بات دھوکے میں نہ ڈالے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت اچانک اور بے شان وگمان ہوگئی تھی، یہ صحیح ہے ایسا ہی ہوا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے تمام شرور وفتن سے حفاظت فرمائی، اور آج تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کی جانب سواریوں کو تھکا تھکا کر لایا جائے، جیسے کہ حضرت ابوبکرؓ تھے، بس جو کوئی مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی سے بیعت کرے گا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۴۵ بحوالہ مسند احمد، سیرۃ ابن ہشام، ج:۴، ص:۲۲۶)

اس عبارت کے بین السطور میں غور کیجئے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات خلافت صدیقی سے خالی الذہن تھے، جو کچھ ہوا بس اچانک ہوا۔ پھر آگے حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا:

انہ کان من خبرنا حین توفی رسول اللہ ﷺ أن علیاً والزبیر ومن کان معھما تخلفوا فی بیت فاطمة بنت رسول اللہ ﷺ وتخلف عنھا الانصار بأجمعھا فی سقیفه بنی ساعدہ واجتمع المھاجرون إلیٰ ابی بکر۔

جب حضور ﷺ کا وصال ہوا تو علی اور زبیر اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے، حضرت فاطمہ کے گھر اکٹھا ہوئے، اور انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے، اور مہاجرین حضرت ابوبکرؓ کے پاس مجتمع ہوگئے۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۴۵ بحوالہ مسند احمد)

حضرت عمرؓ نے اس وقت یہ نہیں بتایا کہ مہاجرین کا یہ مجمع کہاں تھا لیکن قرائن سے پتہ

چلتا ہے کہ یہ لوگ کسی ایسی جگہ نہ تھے، جو کسی فرد یا قوم کے ساتھ مخصوص رہی ہو، بلکہ ان کا اجتماع حسب سابق مسجد ہی میں تھا، حضرت علیؓ تو اپنے گھر چلے گئے، حضراتِ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہوئے، لیکن مہاجرین جہاں تھے وہیں رہے، یعنی مسجد نبوی میں، حجرۂ مطہرہ کے آس پاس۔ کیونکہ روایات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس لوگوں کی عمومی آمد ورفت تھی، اور ایسی جگہ جہاں عمومی آمد ورفت ہو، مسجد ہی ہو سکتی ہے، نیز کسی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ لوگوں کے درمیان حضرت صدیقؓ پہلا خطبہ دے کر (جس کا اوپر ذکر ہوا) کہیں گئے ہوں، پھر انصار کے بارے میں تو صراحتاً یہ وارد ہے کہ وہ مسئلۂ خلافت پر ہی غور کرنے کے لئے مجتمع تھے، لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر جو لوگ جمع تھے، اس کی تصریح روایت میں نہیں ہے کہ وہ کس مقصد سے جمع تھے، تاہم صورتحال کی نزاکت اور حضرت عمرؓ کا اندازِ گفتگو صاف بتا رہا ہے کہ مقصد وہاں بھی یہی تھا بلکہ اگر نہج البلاغہ میں ذکر کردہ وہ خطبہ جو حضرت علیؓ نے حضرت عباس اور حضرت ابوسفیان کی درخواست بیعت کے جواب میں دیا ہے، اسی وقت کا مان لیا جائے جبکہ یہ حضرات حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر اکٹھا ہوئے تھے، تب تو اس اجتماع کا مقصد وضاحت کے ساتھ متعین ہو جائے گا۔ علامہ رضی نے ذکر کیا ہے کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عباسؓ اور حضرت ابوسفیانؓ نے حضرت علیؓ سے درخواست کی کہ ہم آپ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لیں، اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا:

ھٰذا ماء آجن یغص بھا أکلھا مجتنی الثمرة لغیر وقت ایناعھا کالزارع بغیر أرضه فإن أقل یقولوا أحرص علی الملک وإن أسکت یقولوا جزع من الموت ھیھات بعد اللتیا واللتی واللہ لابن أبی طالب اٰنس بالموت من الطفل ثدی أمه. (نھج البلاغة، ج: ۱، ص: ۴۰)

یہ ایک بدمزہ پانی ہے اور حلق میں پھنس جانے والا لقمہ ہے، (اس کا طالب) ناوقت پھل توڑنے والا ہے جیسے کوئی شخص دوسرے کی زمین میں کھیتی کرے، اگر میں کچھ کہوں تو لوگ کہیں گے کہ حکومت کی حرص میں پڑ گئے اور خاموش رہوں تو کہیں کہ موت سے گھبرا گئے، لیکن یہ

سب کچھ نہیں۔ واللہ ابن ابی طالب موت کے ساتھ ایسا مانوس ہے کہ بچہ اپنی ماں کے پستان کے ساتھ بھی ایسا مانوس نہ ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وفات سرورکائناتﷺ کے بعد حضرت علیؓ کو خلافت کی پیش کش ہوئی تھی لیکن انھوں نے اسے ٹال دیا۔

اب سنئے! جہاں مہاجرین جمع ہیں، وہاں کیا بات ہورہی تھی، ابن اسحاق کی روایت کہ:

فأتیٰ اٰتٍ إلیٰ ابی بکر وعمر فقال إن ھٰذاالحی من الانصار مع سعد بن عباده فی سقیفه بنی ساعدة قد انحازوا إلیه فإن کان لکم بأمر الناس حاجة فادرکوا قبل أن یتفاقم أمرهم ۔(سیرۃ ابن ہشام، ج:۴،ص:۲۲۵)

ایک آدمی حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا انصار کا قبیلہ سعد بن عبادہ کے پاس سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہے، آپ حضرات کو اگر عوام کا کچھ خیال ہو تو معاملہ خراب ہونے سے پہلے وہاں پہونچ جائیں۔

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ انصار کے پاس چلنا چاہئے۔ چنانچہ دونوں حضرات انصار کی جانب چل پڑے۔ حضرت کے خطبہ اور ابن اسحاق کی روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مہاجرین کا مجمع مشورۂ خلافت کے لئے نہ تھا، ورنہ اس سادگی سے دونوں بزرگ انصار کے مجمع کی جانب نہ چل دیتے، بلکہ اپنے ساتھ مجمع لے جاتے یا پہلے مسجد میں موجود حضرات سے بیعت لے لیتے پھر وہاں جاتے، مگر ایسا کچھ نہ ہوا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شیخین کے ذہن میں ابھی امارت وخلافت کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں پہونچنے کے بعد صورتحال خدا نے ایسی پیدا کردی کہ اچانک حضرت ابوبکر کی بیعت کا انعقاد ہوگیا اور ایک بڑے فتنہ سے خدا نے بچالیا۔

حضرت عمرؓ کا مذکورہ بالا خطبہ مجمع عام میں ہوا تھا، اس میں مدینہ کے اندر موجود تمام مہاجرین وانصار شریک تھے، اگر اس میں کوئی غلطی ہوتی تو صحابہ کرام بالخصوص حضرت علیؓ ضرور اس کا اظہار کرتے۔

حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کی بیعت:

جب سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت ہوچکی، تو چونکہ یہ بیعت عامہ نہ تھی، اس لئے یہ

حضرات پلٹ کر مسجد میں آئے اور مسجد میں بیعت عام شروع ہوئی، حضرت ابوبکر کو حضرت علی اور حضرت زبیر...... جو حضور کے پھوپھی زاد بھائی اور حضرت ابوبکر کے داماد تھے...... کا خیال تھا، چنانچہ اسی وقت وہ منبر پر چڑھے اور مجمع پر ایک نگاہ ڈالی تو حضرت علی اور زبیر کو نہ پایا، فوراً آدمی بھیج کر دونوں حضرات کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ اے علی! آپ حضور ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد ہیں، اور اے زبیر! آپ حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، کیا مسلمانوں میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں، دونوں بزرگوں کا جواب ایک تھا: **لاتثریب یا خلیفة رسول الله**، اے خلیفۂ رسول آپ پر کچھ مواخذہ نہیں ہے، یہ کہہ کر حضرت علی وزبیر نے اسی وقت بیعت کرلی، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حافظ ابوعلی نیشاپوری نے بیان کیا کہ مشہور محدث ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ میرے پاس امام مسلم تشریف لائے اور اس حدیث کے متعلق مجھ سے دریافت کیا، میں نے یہ حدیث لکھ کر انھیں پڑھ کر سنادی، وہ بیحد خوش ہوئے۔ (البدایہ اوالنہایہ، ج:۶، ص:۳۰۲)

حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد:

اس بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ دیا، بیعت کے بعد یہ پہلا خطبہ ہے، البتہ وفات نبوی کے بعد کا دوسرا خطبہ ہے، پہلا خطبہ سطورِ بالا میں گذر چکا ہے۔ اس میں فرمایا کہ:

و الله ما كنت حريصاً على الامارة يوماً و لا ليلةً و لا سألتها الله فى سر و علانية۔	خدا کی قسم میں امارت کا حریص کبھی نہیں رہا، نہ کسی دن اور نہ کسی رات، اور نہ کبھی کھلے اور چھپے (مخلوق تو درکنار) خدا سے اس کا سوال کیا۔

مشہور امام مغازی موسیٰ بن عقبہ نقل کرتے ہیں کہ:

فقبل المهاجرون مقالته۔

حضرات مہاجرین نے ان کی یہ بات تسلیم کی۔

ظاہر ہے کہ مہاجرین میں حضرت علی وزبیر بھی تھے، پھر بات اتنے میں ہی ختم نہیں ہوجاتی، آگے دیکھئے حضرت علی وزبیر فرماتے ہیں:

ماغضبنا إلا لأننا أخرنا عن المشورة و ان نرىٰ أبابكر أحق الناس بها

وإنه صاحب الغار وإنا لنعرف شرفه وخيره ولقد أمره رسول الله ﷺ بالصلوٰة بالناس وهو حي ۔(البدایہ اوالنہایہ، ج:۵،ص:۲۵)

ہمیں صرف اس کا رنج تھا کہ ہمیں مشورہ میں شریک نہیں کیا گیا، ورنہ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ خلافت کے حقدار سب سے بڑھ کر ابوبکر ہی ہیں، وہ رفیق غار ہیں، ان کی عظمت وشرافت ہم جانتے ہیں۔ حضور ﷺ نے انھیں اپنی حیات میں نمازوں کا امام بنایا تھا۔

حضرت علیؓ کے ارشادات:

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہج البلاغہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھی چند کلمات ذکر کردیئے جائیں، یہ کتاب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات ورسائل اور مقالات وملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے مشہور شیعی عالم علامہ شریف رضی نے جمع کیا ہے، اوراہل تشیع کے نزدیک صحیح ترین کتاب ہے، اس میں ایک خطبہ میں سیدنا علیؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

لله بلاء فلان فقد قوم الادد وداوى العبد وأقام السنة وخلف البدعة وذهب نقي الثوب قليل العيب أصاب خيرها وسبق شرها أدى إلى الله طاعته وأتقاه بحقه. (نهج البلاغه ، ج: ۲،ص: ۲۲۲)

فلاں صاحب بھی خوب تھے، انھوں نے کجی کو درست کیا، بیماری کا مداوا کیا، سنت کو قائم کیا بدعت کو پیچھے چھوڑا، پاک دامن اور قلیل العیب گئے، خلافت کی خوبیاں حاصل کیں، اور خرابیوں سے دامن بچا کر آگے بڑھ گئے۔ اللہ کی طاعت کا حق ادا کیا اور پورے طور پر تقویٰ برتا۔

یہ الفاظ سیدنا ابوبکر صدیق کی شان میں ہیں گوکہ علامہ رضی نے اپنے مذہب کی پاسداری میں لفظ ابی بکر اُڑا کر لفظ فلاں رکھ دیا ہے، اور ایسا انھوں نے کئی جگہ کیا ہے، لیکن عبارت خود بولتی ہے کہ وہ کس کے حق میں ہے۔ سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس نے سنت کو اہتمام سے قائم کیا، بدعت کو پس پشت ڈال دیا، دنیا سے پاک دامن اور قلیل العیب گیا، جس نے خلافت کی بھلائیاں سمیٹیں اور شر وفساد سے محفوظ رہا، اس کے بارے میں کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ خلافت وامارت کا حریص رہا ہوگا؟ یہ حرص تو سخت مذموم ہے، پھر وہ سنت کا قائم کرنے والا اور پاک دامن کیونکر ہوسکتا ہے؟۔

مدعی! لاکھ پہ بھاری گواہی تیری

اور سنئے !اسی نہج البلاغہ میں حضرت علی ؓ کا ایک خط بنامِ حضرت امیر معاویہ ؓ مذکور ہے، اسے بھی ملاحظہ کرتے چلئے ، اس میں حضرت علی ؓ اپنے خلافت کے انعقاد پر خلفاءِ ثلٰثہ کی خلافت سے استدلال کیا ہے۔

أما بعد ! فإن بيعتى لزمتك وأنت بالشام فإنه بايعنى القوم الذين بايعوا أبابكر وعمر وعثمان على مابايعوهم عليه فلم يكن للشاهد أن يختار ولا للغائب أن يردوا إنما الشورىٰ للمهاجرين والانصار فإن اجتمعوا علىٰ رجل وسموه إماماً كان لله رضى فإن خرج منهم خارج بطعن أو بدعة ردوه إلىٰ ماخرج منه فإن أبىٰ قاتلوه علىٰ إتباعه غير سبيل المومنين ولى الله ماتولىٰ۔

امابعد! بلاشبہ میری بیعت تمہیں لازم ہے گوکہ تم ملک شام میں ہو، کیونکہ مجھ سے وہ لوگ بیعت کر چکے ہیں جنھوں نے ابوبکر وعمر وعثمان سے بیعت کی تھی ، اور اسی بات پر بیعت کی ہے، جس پر ان سے بیعت کی تھی ، اب نہ موجود کے لئے گنجائش ہے کہ دوسرے کو چنے اور نہ غائب کو حق ہے کہ اسے رَد کرے، شوریٰ تو مہاجرین وانصار کی معتبر ہے، اگر وہ حضرات کسی شخص پر متفق ہو جائیں اور اسے امام متعین کر دیں تو اسی میں اللہ کی رضا ہے، پھر اگر ان سے کوئی شرارت یا بدعت کی وجہ سے خروج کرے، تو اسے وہیں لوٹا دیں جہاں سے وہ نکلا ہے پس اگر نہ مانے تو اس سے لڑیں، کیونکہ اس نے مومنین کی راہ سے انحراف کیا ہے، اور اللہ اس کے سر وہی چیز ڈال دیں، جو اس نے اپنے سر لی ہے۔ (نہج البلاغہ، ج:۳، ص:۷)

اس مراسلہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے نہ صرف یہ کہ خلفاء ثلٰثہ کی خلافت کو برحق ثابت کیا ہے، بلکہ اپنی خلافت کے ثبوت کے لئے ان حضرات کے دستور کو معیار گردانا ہے، اور اس کے ساتھ ہی شوریٰ اور مشاورت کو مہاجرین وانصار کے حلقہ میں مخصوص کر دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ مہاجرین وانصار اگر کسی شخص پر متفق ہو جائیں، اور اس کو امام متعین کر دیں تو اللہ کی رضا اسی میں ہے، اور جو شخص اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر ہو اس کو لوٹانا ضروری ہے، اگر نہ مانے تو اس سے جنگ کرنی ناگزیر ہے۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکر ؓ کی خلافت کس قدر ثابت برحق اور طریقِ مستقیم پر قائم تھی، اور حضرت علی نہ صرف یہ کہ اس سے خود راضی

تھے بلکہ اسی میں رضاءِ الٰہی کو مضمر سمجھتے تھے۔ کتنے ستم ظریف ہیں وہ لوگ جو حضرت علی کے اس صاف ارشاد کے باوجود ان پر خلافت صدیقی کی مخالفت کا الزام تھوپتے ہیں، اور ان کی جانب شکوہ وشکایت اور جزع وفزع کا دفترِ لایعنی منسوب کرتے ہیں۔

حضرت علیؓ کی دوسری بیعت:

یہاں ایک سوال ممکن ہے کہ ذہنوں میں کھٹکے، گو وہ ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہے مگر تکمیل گفتگو کے لئے اس کی وضاحت بھی مناسب ہے، سوال یہ ہے کہ حضرت علی اوّل روز ......اور بروایتے دوسرے روز......(البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۴۸) بیعت کر چکے تھے، تو پھر بخاری کی اس روایت کا کیا مطلب ہے، جس میں ذکر ہے کہ حضرت علی نے حضورﷺ کے وصال کے چھ ماہ بعد جب حضرت فاطمہ کی وفات ہوگئی تھی، اس وقت بیعت کی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ بیعت ہونے کے باوجود کچھ خانگی حالات، کچھ وفاتِ نبوی پر رنج وملال اور کچھ حضرت فاطمہ کی علالت کی وجہ سے، اس وقت تک دربارِ خلافت سے ایسا ربط وتعلق قائم نہ کرسکے تھے، جیسا کہ ان جیسی صاحب حیثیت وعظمت شخصیت کے شایان شان تھا۔ اس لئے کچھ لوگوں کے دلوں میں شاید کھٹک تھی کہ یہ خلیفۂ رسول سے کچھ کٹے کٹے سے رہتے ہیں، حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد جب بکثرت لوگوں سے ملنا جلنا ہوا تو انھوں نے محسوس کیا کہ بعض لوگ انھیں دوسری نظر سے دیکھتے ہیں، اس غلط فہمی کے ازالے کے لئے حضرت علیؓ نے مجمع عام میں دوبارہ بیعت کی، چونکہ یہ بیعت خصوصی تھی، اس لئے فوراً مشہور ہوگئی اور لوگوں کے دلوں میں جو گرانی تھی وہ دور ہوگئی۔

تجہیز وتکفین اور تدفین:

سقیفہ بنی ساعدہ کا قصّہ، پھر دوبارہ بیعت، مذکورہ بالا مرحلہ وفات ہی کے دن یا اس کے دوسرے دن مکمل ہو چکا تھا۔ اب مسلمان مطمئن تھے، شیرازہ بکھرنے سے بچ گیا تھا، خلافت کا انتخاب ہو چکا تھا، اب غسل اور تجہیز وتکفین کا مرحلہ درپیش تھا، اس میں پہلا سوال یہ تھا کہ غسل کون دے؟ انتخاب خلافت کے فوائد وثمرات اسی مرحلے سے ظاہر ہونے شروع ہوگئے۔ فطری بات ہے کہ اعزہ واقرباء غسل دینے کے زیادہ مستحق تھے، چنانچہ حضرت علی، حضرت عباس، حضرت فضل

بن عباس، حضرت قثم بن عباس، حضرت اسامہ بن زید اور حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت صالح ؓ غسل کی تیاریاں کرنے لگے، باہر انصار ومہاجرین جمع تھے، ہر ایک کی خواہش تھی اور بجا تھی کہ اپنے محبوب نبی اور جان سے زیادہ عزیز پیغمبر کی آخری خدمت سے بہرہ اندوز اور سعادت مند ہوں، ایسے نازک وقت میں اہل محبت کا تعلق جیسا کچھ جوش جنون دکھائے عین فطرت ہے، لیکن ظاہر ہے کہ حجرۂ مبارکہ میں نہ اتنی جگہ تھی، اور نہ یہ کسی طرح مناسب تھا کہ غسل کے وقت بھیڑ کی بھیڑ جمع رہے، اِدھر جوشِ محبت کہہ رہا تھا کہ کسی طرح یہ سعادت حاصل کرلو، ادھر حجرہ کی تنگ دامانی اور جناب نبی اکرم ﷺ کی عظمت پکار رہی تھی کہ حدِ ادب سے باہر نہ نکلو، پھر کیا ہوا؟ حضرت علی ؓ کی زبانی سنئے! فرماتے ہیں کہ:

> ’’جب ہم حضور اکرم ﷺ کی تجہیز وتکفین میں مصروف ہوئے تو ہم نے دروازہ بند کرلیا۔ باہر مجمع لگا ہوا تھا، انصار نے پکارا کہ ہم حضور ﷺ کے نانیہالی رشتہ دار ہیں اور ہمارا مقام دین اسلام میں جو کچھ ہے ظاہر ہے، قریش نے آواز دی کہ ہم حضور ﷺ کے دادھیالی قرابت دار ہیں۔‘‘

ان درخواستوں اور تمناؤں سے ہوسکتا تھا کہ حضراتِ اہل بیت مغلوب ہوجاتے اور انھیں دروازہ کھولنا پڑتا، لیکن ہر موقع کی طرح یہاں بھی حضرت ابوبکر ہی کی انتظامی صلاحیت اور ان پر اعتماد کام آیا۔ چنانچہ حضرت علی فرماتے ہیں کہ:

> ’’اتنے میں حضرت ابوبکر کی آواز سنائی دی جو پکار کر کہہ رہے تھے کہ ہر قوم اپنے جنازہ کی زیادہ حقدار ہے، میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تم ہرگز نہ جاؤ، اگر تم اندر پہونچ گئے تو خاص قرابت داروں کو پیچھے کردوگے، کوئی نہ جائے، ہاں جسے بلایا جائے وہ جاسکتا ہے‘‘
> (طبقات ابن سعد، ج:۲، ص:۲۷۸)

چنانچہ مسند احمد کے حوالے سے علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت علی نے انصار میں سے حضرت اوس بن خولی کو اندر بلا لیا تھا۔ ملاحظہ فرمایا! غسل کے وقت نہ صرف حضرت ابوبکر موجود تھے بلکہ باہر رہ کر انتظامات میں مصروف تھے۔ وہ بروقت موجود نہ ہوتے تو شوروشغب اور انتشار کا امکان تھا۔

نمازِ جنازہ:

غسل اور تجہیز وتکفین سے فراغت کے بعد نمازِ جنازہ پڑھنے کا وقت آیا۔ بعض روایات

سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ آپ کی نمازِ جنازہ ہر ہر شخص علیحدہ پڑھے۔ اس بنیاد پر سب سے پہلے انھیں حضرات نے نماز ادا کی جو غسل دے رہے تھے، ان کے فارغ ہونے کے بعد اوّلاً جو لوگ حجرۂ مبارکہ میں داخل ہوئے وہ حضراتِ شیخین تھے۔

لما كفن رسول الله ﷺ ووضع علیٰ سريره دخل ابوبكر وعمر ومعهما نفر من المهاجرين والانصار بقدر مايسع البيت ...... ثم صفوا صفوفا لايؤمهم أحد۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۶۵، طبقات ابن سعد، ج:۲، ص:۲۹۰)

جب رسول اللہ ﷺ کو کفن پہنایا گیا، اور آپ ﷺ چارپائی پر لٹا دئے گئے، تو حضرت ابوبکر وعمر مہاجرین وانصار کی ایک مختصر سی جماعت...... جس کی حجرہ اطہر میں گنجائش تھی...... کے ساتھ اندر داخل ہوئے، پھر بغیر امام کے صف بندی کی۔ (آگے دعا وغیرہ کا تذکرہ ہے)

تدفین:

نمازِ جنازہ سے پہلے لوگوں نے رائے دی کہ مسجد میں آپ کی تدفین ہو، بعضوں نے کہا کہ جہاں آپ کے اصحاب مدفون ہیں، وہیں آپ بھی دفن کئے جائیں، اس اختلاف میں بھی جو شخصیت فیصل بنی وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی تھی، انھوں نے فرمایا:

إنی سمعت رسول الله ﷺ يقول	میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے
ماقبض نبی إلا دفن حيث قبض	سنا ہے کہ نبی کی جہاں وفات ہوتی ہے
(سیرۃ ابن ہشام، ج:۴، ص:۲۳۰)	وہیں دفن کیا جائے۔

چنانچہ اسی فیصلہ پر عمل ہوا۔

ان تفصیلات پر نظر کرنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ حضراتِ شیخین بالخصوص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کی تجہیز وتکفین میں شریک نہ تھے، شریک ہونا کیا معنی، آپ تو مرض الموت سے لے کر تدفین تک ہر ہر مرحلہ میں حضور ﷺ کے جانشین اور امت کے سچے رہنما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اور تمام صحابہ پر اپنی خصوصی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆

کتب شیعہ کی شہادت

کتابچہ مکمل کر کے خاکسار نے کاتب کے حوالے کر دیا تھا اور کتابت تقریباً مکمل ہوچکی کہ ایک رسالہ ’’جنازۃ الرسول‘‘ ملا، جو علامہ مولانا عبد الستار صاحب تونسوی صدر مناظر تنظیم اہل سنت پاکستان کا تالیف کردہ ہے، موصوف نے یہ رسالہ ہمارے ہی زیر بحث موضوع پر مرتب کیا ہے، اگر یہ رسالہ پہلے مل جاتا تو ہمیں محنت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، موضوعِ زیر نظر پر یہ بہت مکمل اور جامع ہے، ہمیں شیعہ کتب دستیاب نہ تھیں، اس لئے حوالہ میں ان سے استفادہ نہ کیا جاسکا۔ یہ رسالہ شیعہ کی کتب معتبرہ کے حوالجات سے بھرپور و مالامال ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس رسالہ کے اقتباسات نقل کر دئے جائیں۔ (اعجاز احمد اعظمی)

(۱) شیعہ حضرات کی معتبر کتاب ’’حیات القلوب‘‘ جلد دوم ص:۶۶۴ پر ہے:

شیخ طبری از حضرت امام محمد باقر روایت کردہ است کہ دَہ دَہ نفر داخل شدند و چنیں برآں حضرت نماز می کردند بے امامے، در روز دوشنبہ وشب سہ شنبہ تا صبح و روز سہ شنبہ تا شام تا آنکہ خورد و بزرگ مرد و زن از اہل مدینہ و اہل اَطراف ہمہ برآں جناب چنیں نماز ادا کردند۔

شیخ طبری نے امام محمد باقر سے روایت کی ہے کہ دس دس آدمی حجرۂ مبارکہ میں داخل ہوتے تھے اور اس طرح آنحضرت ﷺ پر نماز جنازہ ادا کرتے رہے بغیر کسی امام کے، سوموار کے دن اور منگل کی رات صبح تک اور منگل کے دن شام تک، یہاں تک کہ سب چھوٹے بڑے مرد عورت اور اطراف مدینہ کے لوگوں نے اسی طرح آنحضرت ﷺ پر نماز جنازہ ادا کی۔

(۲) شیعہ حضرات کی معتبر کتاب ''حق الیقین''، فارسی جلد اوّل ص: ۱۳۲ پر آنحضرت ﷺ کے جنازہ کے متعلق مرقوم ہے:

وایشاں صلوٰۃ فرستادند ومی رفتند تا آنکہ مہاجران وانصار داخل شدند وصلوات فرستادند

اور یہ لوگ درود وسلام پڑھتے اور حجرۂ مبارکہ سے نکلتے رہے حتیٰ کہ مہاجرین وانصار داخل ہوئے اور صلوٰۃ وسلام پڑھا۔

(۳) ''اصول کافی'' شیعہ حضرات کی معتبر ترین کتاب ہے، اس کے ص: ۲۸۶ پر مرقوم ہے:

عن أبی جعفر علیه السلام قال لما قبض رسول الله ﷺ صلت علیه الملائکة والمهاجرون والانصار فوجاً فوجاً۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ پر ملائکہ، اور تمام مہاجرین وانصار نے گروہ در گروہ جنازہ پڑھا۔

(۴) شیعہ حضرات کی معتبر کتاب مرآۃ العقول، جلد اوّل ص: ۳۷۱ پر مرقوم ہے کہ:

دس دس مہاجرین اور انصار آنحضرت ﷺ کا جنازہ (صلوٰۃ وسلام) پڑھتے تھے اور باہر آتے تھے۔

حتیٰ لم یبق أحد من المهاجرین والانصار إلا صلیٰ علیه۔

یہاں تک کہ مہاجرین وانصار میں سے کوئی ایک بھی نہ رہ گیا کہ جس نے آنحضرت ﷺ کا جنازہ نہ پڑھا ہو۔

ایسی واضح اور صریح روایت کے باوجود نہایت ہی حیرت کا مقام ہے کہ کس طرح صحابۂ کرام کی وفادار اور جاں نثار جماعت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرات آنحضرت ﷺ کے جنازے پر حاضر نہ تھے۔

(۵) شیعہ حضرات کی کتاب ''حیات القلوب'' جلد دوم ص: ۶۶۴ پر ہے:

وکلینی بسند معتبر از امام محمد باقر روایت کردہ است کہ چوں حضرت رسالت رِحلت فرمود نماز کردند بر وجمیع ملائکہ ومہاجران وانصار فوج فوج۔

کلینی نے نہایت معتبر سند کے ساتھ امام محمد باقر سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت

رسالت نے رِحلت فرمائی تو آپ ﷺ کی نماز جنازہ سب فرشتوں اور مہاجروں اور انصار نے فوج فوج ہوکر پڑھی۔

(۶) ضمیمہ جات مقبول ترجمہ ص: ۴۵۰ پر آنحضرت ﷺ کے جنازے کے متعلق لکھا ہے:

جناب سردارِ دوعالم ﷺ نے وفات پائی تو جوق در جوق مہاجرین وانصار اور ملائکہ نے آنحضرت ﷺ درود بھیجا۔

(۷) شیعہ کی معتبر تفسیر صافی کے ص: ۴۶۲ پر امام محمد باقر کا فرمان مذکور ہے:

لما قبض رسول الله ﷺ صلت عليه الملائكة والمهاجرون والانصار فوجاً فوجاً۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ پر ملائکہ، اور تمام مہاجرین وانصار نے فوج فوج ہوکر جنازہ پڑھا۔

(۸) احتجاج طبرسی مطبوعہ نجف اشرف ص: ۱۵۲ پر آنحضرت ﷺ کے جنازے میں انصار ومہاجرین کی شرکت کے متعلق مرقوم ہے:

ثم أدخل (عليٌّ) عشرة من المهاجرين وعشرة من الانصار فيصلون ويخرجون حتىٰ لم يبق أحد من المهاجرين والانصار إلا صلىٰ عليه۔

پھر حضرت علی دس دس مہاجرین اور انصار کو حجرۂ مبارکہ میں جنازہ کے لئے داخل کرتے رہے، پس وہ لوگ نمازِ جنازہ پڑھتے اور نکلتے رہے یہاں تک کہ مہاجرین وانصار میں سے کوئی ایک بھی نہ رہ گیا کہ جس نے آنحضرت ﷺ کا جنازہ نہ پڑھا ہو۔

(۹) شیعہ مجتہد علامہ باقر مجلسی نے بھی اپنی مشہور کتاب ”جلاء العیون“ کے ص: ۳۶ پر آنحضرت ﷺ کے جنازہ میں تمام مہاجرین وانصار، مردوں عورتوں، چھوٹوں بڑوں، اہل مدینہ واطرافِ مدینہ کی شمولیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

تا آنکہ خورد و بزرگ مرد وزن از اہل مدینہ واہل اَطراف ہمہ بر آں حضرت چنیں نماز ادا کردند و کلینی بسند معتبر از امام محمد باقر روایت کردہ است کہ چوں حضرت رسالت رِحلت فرمود نماز کردند برو جمیع ملائکہ ومہاجران وانصار فوج فوج۔

یہاں تک کہ سب چھوٹے بڑے مرد و عورت اور اطراف مدینہ کے لوگوں نے اسی طرح آنحضرت ﷺ پر نماز جنازہ ادا کی۔ کلینی نے نہایت معتبر سند کے ساتھ امام محمد باقر سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت رسالت نے رِحلت فرمائی تو آپ ﷺ کی نماز جنازہ سب فرشتوں اور مہاجروں اور انصار نے فوج فوج ہوکر پڑھی۔

اہل سنت اور شیعہ حضرات کی اس قدر واضح اور معتبر روایات سے بخوبی ثابت ہے کہ مہاجرین اور انصار سارے کے سارے حتیٰ کہ ان کے بیوی بچے تک آنحضرت ﷺ کے جنازۂ مبارک میں شریک ہوئے، کوئی غیر حاضر اور اس سعادت سے محروم نہ رہا۔ اب ایسی معتبر اور صحیح روایات کی موجودگی میں تربیت یافتگانِ درسِ نبوی ﷺ و نجومِ ہدایت و نمونۂ اخلاقِ نبوت، شاگردانِ رسول، صحابۂ کرام ؓ کے متعلق کیسے یہ فضول و بے حقیقت بات کہی اور سنی جاسکتی ہے، کہ جو حضرات مشکل سے مشکل اوقات میں آنحضرت ﷺ پر پَروانہ وار فدا اور قربان ہوتے رہے۔ العیاذ باللہ انھوں نے اخیر وقت میں اس محبوب ترین ہستی اپنے پیارے رسول ﷺ کا جنازہ تک نہیں پڑھا۔

سوال: اگر تمام مہاجرین و انصار آنحضرت ﷺ کے جنازے پر موجود تھے، تو پھر آپ کا جنازہ دو دن تک کیوں رکھا رہا؟

جواب: روایات اہل سنت و شیعہ میں واضح طور پر موجود ہے کہ چونکہ امام الانبیاء ؑ کا جنازہ تھا، جس پر ہزاروں کی تعداد مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی بوجہ اپنے عشق و محبت کے موجود تھی، اور آنحضرت ﷺ کا جنازہ حجرۂ مبارکہ سے باہر نکالنا مصلحت نہ سمجھی گئی۔ اس وجہ سے دس دس آدمی باری باری سے داخل حجرہ ہوتے رہے، جس کی وجہ سے دو دن تک تاخیر ہوئی، جیسا کہ شیعہ کی معتبر کتاب ''جلاء العیون'' ص: ۳۶، اور ''حیات القلوب'' جلد دوم، ص: ۶۶۴ پر لکھا ہے کہ:

از حضرت امام محمد باقر روایت کردہ است کہ دَہ دَہ نفر داخل شدند و چنیں بر آں حضرت نماز می کردند بے امامے، در روز دوشنبہ و شب سہ شنبہ تا صبح و روز سہ شنبہ تا شام تا آنکہ خورد و بزرگ مرد و زن از اہل مدینہ و اہل اَطراف ہمہ بر آں حضرت چنیں نماز ادا کردند۔

حضرت امام محمد باقر سے روایت ہے کہ دس دس آدمی حجرۂ مبارکہ میں داخل ہوتے تھے اور اس طرح آنحضرت ﷺ پر نماز جنازہ ادا کرتے رہے بغیر کسی امام کے، سوموار کے دن اور منگل کی رات صبح تک اور منگل کے دن شام تک ، یہاں تک کہ سب چھوٹے بڑے مرد عورت اور اطراف مدینہ کے لوگوں نے اسی طرح آنحضرت ﷺ پر نماز جنازہ ادا کی۔

اہل سنت کی معتبر کتاب البدایہ والنہایہ جلد خامس ص: ۲۶۵ پر مرقوم ہے:

قد قيل إنهم صلوا عليه من بعد الزوال يوم الاثنين إلىٰ مثله من يوم الثلاثاء	تحقیق کہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی سوموار کے دن زوال کے بعد نمازِ جنازہ شروع کی اور منگل کے دن زوال کے بعد تک ادا کرتے رہے۔

یہ روایات واضح طور ثابت کرتی ہیں کہ صحابۂ کرام کے عشق ومحبت کی وجہ سے متواتر دو دن رات صبح وشام آنحضرت ﷺ کے جنازے پر مہاجرین وانصار مردوں عورتوں کا اِزدحام رہا۔ جس کی وجہ سے جنازہ دو دن تک بصد مشکل پورا ہوسکا۔ مخفی نہ رہے کہ اس دیر وتاخیر کے باعث عام اموات کی طرح آنحضرت ﷺ کے جسم اقدس واطہر میں کسی قسم کے تغیر کا اندیشہ نہ تھا، کیونکہ انبیاء **علیہم السلام** کے اجسامِ مبارکہ تو قبروں میں قیامت تک محفوظ ہیں۔ قرآن مجید میں موجود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کا وجود مسعود عبادت خانہ میں بہت دنوں تک رہا، مگر کسی قسم کا ذرا بھی تغیر نہ ہوا۔

(۲) حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی شرکتِ جنازہ کی تصریح:

شیعہ حضرات کی معتبر روایات میں ثابت ہے کہ حضرت علیؓ ابھی تک جناب رسول اللہ ﷺ کو غسل دے رہے تھے کہ مہاجرین وانصار مسجد نبوی میں آ کر حضور ﷺ کے جنازہ اور دفن وغیرہ کے متعلق باہم مشورہ کررہے تھے، جس کی اطلاع حضرت عباسؓ نے آ کر حضرت علی کو دی، چنانچہ حیات القلوب جلد دوم ص: ۶۶۴ پر حضرت امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ:

عباس بخدمت امیر المومنین آمد وگفت کہ مردم اتفاق کردہ اند کہ حضرت رسول را در بقیع دفن کنند وابوبکر پیش بایستد وبرآں حضرت نماز کند۔

حضرت عباس جناب امیر المومنین حضرت علی کی خدمت میں آئے اور کہا کہ لوگوں نے اتفاق کیا ہے کہ حضور ﷺ کو جنت البقیع میں دفن کریں اور ابوبکر حضور کے جنازہ کا امام بنے۔

اور مرآۃ العقول جلد اوّل پر بھی اسی مضمون کی روایتیں موجود ہیں، نیز احتجاج طبرسی ص:۵۴ پر مرقوم ہے، حضرت سلمان کہتے ہیں کہ:

وقلت لعلى حين يغسل رسول الله ﷺ إن القوم فعلوا كذا وكذا وأن أبابكر الساعة لعلى منبر رسول الله ﷺ۔

میں نے حضرت علیؓ کو اس وقت کہا جب کہ جناب رسول اللہ ﷺ کو وہ غسل دے رہے تھے کہ تحقیق لوگوں نے اس اس طرح کرلیا اور اب ابوبکر جناب رسول اللہ ﷺ کے منبر پر ہیں۔

تو شیعہ حضرات کی ان معتبر روایات سے ثابت ہوا کہ حضرت علی اب تک غسل رسول اللہ ﷺ سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ صحابۂ کرام مہاجرین وانصار اور ابوبکر صدیق جنازۂ رسول وکفن ودفن کا انتظام اور مشورہ کررہے تھے حتیٰ کہ بعض لوگ ابوبکر صدیق کو امام جنازہ بنانے کا باہم تذکرہ کررہے تھے، لیکن چودہ سو برس بعد آنے والے کس جرأت سے آنحضرت ﷺ کے جنازہ پر صدیق اکبر کی شمولیت کا انکار کرتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

☆☆☆☆☆☆

تصوف اور علمائے دیوبند

اللہ تعالی نے آسمان سے ایک امانت اتاری، یہ امانت خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر نازل کی گئی، یہ امانت دین اسلام ہے، یہ علم وعمل اور فکر واعتقاد کی ایک سیدھی راہ ہے، جسے دین سے، شریعت سے، صراط مستقیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی دین ہے، جسے اللہ تعالی نے اپنی آخری کتاب اور آخری کلام میں پسندیدگی کی سند دی ہے۔ **ورضیت لکم الاسلام دیناً.**

اسلام ایک مجموعۂ احکام وارشاد کا نام ہے، اس کے کچھ احکام انسان کے ظاہر پر نافذ ہوتے ہیں، اور کچھ احکام کا تعلق قلب وباطن سے ہوتا ہے، شریعت کے دائرے میں دونوں طرح کے احکام داخل ہیں، نماز کی ایک ظاہری شکل ہے جس کی تشکیل انسان کے بدن سے ہوتی ہے، اور ایک اس کی باطنی صورت ہے جس کا تعلق آدمی کے قلب سے ہے، یعنی خشوع وخضوع، یکسوئی اور دربار الہی میں حاضری کا دھیان وخیال۔

یہی حال دوسری عبادات کا بھی ہے، ہر ایک کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے، دونوں کا مجموعہ شریعت ہے، لیکن ان دونوں احکام کے الگ الگ نام بھی بطور شناخت کے استعمال کئے گئے ہیں۔ ظاہری احکام کے مجموعہ کو فقہ کہا گیا ہے اور باطنی احکام کا مجموعہ تصوف کہلایا۔

علم فقہ سے انسان کی ظاہری زندگی دین اسلام پر گامزن ہوتی ہے، اور تصوف سے انسان کا باطن خوبصورت ہوتا ہے، اور سنورتا ہے، ایک زمانہ میں بعض ستم ظریفوں نے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے کے بالمقابل تصور کیا تھا، یہ ایک بڑی گمراہی تھی،

شریعت کل کا مجموعہ ہے، اور تصوف اس کا ایک جز اور اسے خوبصورتی اور رونق بخشنے والا ایک ضروری حصہ ہے۔

ہر زمانے میں علماء محققین نے اور صوفیاء اہل حق نے اس غلط فہمی اور گمراہی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ہندوستان جن دنوں ایک نئے انقلاب سے دوچار ہو رہا تھا، یورپ سے ایک دین بیزار قوم ہندوستان سے تخت وتاج چھین کر ایک نیا نظام ودستور نافذ کر رہی تھی، اس وقت دین وملت کی حفاظت کے لئے اللہ نے کچھ ایسے حضرات کو کھڑا کیا جو ظاہر وباطن کے جامع تھے، اگر ایک طرف وہ قرآن وسنت کے اور فقہ وکلام کے ماہر تھے تو دوسری طرف قلب وباطن کے تاجدار تھے۔ یہ حضرات جیسے علوم ظاہری میں باکمال تھے اسی طرح علوم باطن میں بھی باکمال تھے، ان کے وجود سے شریعت کے دونوں پہلوؤں کا کمال ظاہر ہوا۔

یہ حضرات ہندوستان کے مشہور خاندان علم وفضل اور خانوادۂ تصوف وسلوک سیدنا حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے وابستہ تھے، اس خاندان میں جہاں علم وفضل اپنے عروج کمال پر تھا وہیں تصوف وسلوک کی بلندیاں بھی اسے حاصل تھیں، حدیث کا علم اگر شاہ صاحب مدینہ طیبہ سے لائے تھے تو تصوف وسلوک کا ذوق سرہند کے مرد درویش اور صاحب علم و فضل مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد علیہ الرحمہ کے گھرانے سے انہوں نے پایا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور ان کے رفیق خاص حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، دونوں نے علم ظاہر کا اکتساب شاہ ولی اللہ صاحب کے خانوادۂ علم وفضل سے کیا، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دونوں، استاذوں نے اسی خرمن علم سے خوشہ چینی کی تھی۔

پھر تصوف وسلوک کے لئے انہوں نے زانوئے ارادت تھانہ بھون کے مشہور بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کے سامنے تہ کیا، حضرت حاجی صاحب ابتداء مولانا نصیر الدین صاحب سے بیعت ہوئے، جو خانوادۂ مجدد سرہندی کے گل سرسبد تھے، ان کی شہادت کے بعد آپ نے حضرت میاں جی نور محمد جھن جھانوی علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے جو بیک وقت حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی اور امیر المومنین حضرت سید احمد شہید علیہما الرحمۃ کے فیض

یافتہ اور مجاز وخلیفہ تھے، اس طرح وہ سلسلۂ چشتیہ ونقشبندیہ مجددیہ کے مجمع البحرین تھے۔

اس وقت جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تھا، کوئی تصور نہ تھا کہ دارالعلوم سے وابستہ کوئی بھی فرد تصوف کا ذوق آشنا نہ ہو، مہتمم سے لے کر ایک آخری درجہ کی ملازمت رکھنے والا ہر ایک نام خدا کا لذت یاب تھا۔

حضرت نانوتوی کے رفقا میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت گنگوہی بھی، حضرت حاجی صاحب کے دامن گرفتہ، ان کے علاوہ حاجی عابد حسین صاحب، مولانا فضل الرحمان صاحب والد محترم حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب، اور مولانا ذوالفقار علی صاحب والد محترم حضرت شیخ الہند، حضرت حاجی صاحب کے دامن فیض سے وابستہ تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اول حضرت شاہ رفیع الدین صاحب، خانقاہ مظہریہ کے گل سر سبد حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی محدث، استاذ گرامی حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی کے خلیفہ تھے، اور بڑے صاحب نسبت اور پرتاثیر بزرگ تھے۔

دارالعلوم کا دور آغاز شریعت وطریقت کا ایک سدا بہار گلستاں تھا، دارالعلوم کے پہلے صدرالمدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی بھی حضرت حاجی امداداللہ صاحب کے فیض یافتہ اور خلیفہ تھے، یہ حضرات علم وفضل کے مقام بلند پر فائز تھے، حضرت گنگوہی تفقہ وحدیث کے امام تھے، ان کا فیضان درس وتدریس، فتوی نویسی اور تالیف وتصنیف ہر اعتبار سے رواں دواں تھا، اس کے ساتھ سلوک ومعرفت کی عظیم خانقاہ بھی آپ کے وجود کے ساتھ قائم تھی، بڑے بڑے علما اور خصوصی لوگ اس بحر معرفت سے فیض پاتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے اس وقت اساتذہ وطلبہ اور اہل انتظام سب گنگوہ کے چشمۂ معرفت کے جرعہ نوش تھے، اس وقت تقریباً پورے ہندوستان میں علم ومعرفت کا نور خانقاہ گنگوہ سے پھیل کر اطراف واکناف کو روشن کر رہا تھا۔ ایک طرف درس حدیث کا سلسلہ جاری تھا، دوسری طرف تصوف وسلوک کی تابانیاں قلوب کو جگمگا رہی تھیں۔ اس چشمۂ فیض سے جو نفوس قدسیہ سیراب وسرشار ہوئے وہ بجائے خود ایک امت تھے، ان فضیلت وروحانیت سے ہندوستان میں بھی اور بیرون ہند بھی دین وملت کے بلند مینار تعمیر ہوئے۔

یہ وہ حضرات ہیں جو براہ راست دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہے، ان کا ہر فرد بجائے خود ایک امت تھا، ایک ملت تھا، ان سے علم وحکمت کے ساتھ سلوک ومعرفت کے بحر ذخار جاری ہوئے، جن سے ایک دنیا کی دنیا سیراب ہوئی۔

حضرت گنگوہی کے متوسلین وخلفا میں دو نام اس قدر ممتاز ہیں اوران کا فیض اس درجہ عام ہوا کہ اس کا احاطہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں، تاہم اجمال واختصار کے ساتھ ان کا قدرے تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اول شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، دوسرے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری۔ حضرت شیخ الہند براہ راست بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے شاگرد تھے، چنانچہ ان کے علوم اوران کی تصنیفات پر حضرت نانوتوی کا رنگ چھایا ہوا ہے، لیکن تصوف وسلوک کے لئے وہ اپنے خواجہ تاش حضرت گنگوہی کی خدمت میں لوگوں کو بھیج دیا کرتے تھے، اسی نسبت سے حضرت شیخ الہند نے حضرت گنگوہی کے دامن فیض سے تربیت پا کر طریقت وسلوک کا میدان طے کیا، خود حضرت شیخ الہند باوجود اعلیٰ نسبت کے حامل ہونے کے بیعت وارشاد کی ذمہ داریوں سے حتی الامکان بچتے تھے، مگر ان کے تلامذہ میں اتنے بڑے اصحاب نسبت اور بزرگ ہوئے ہیں کہ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ استاذ کا مرتبہ ومقام کیا ہوگا؟۔

حضرت تھانوی، علامہ انورشاہ کشمیری، مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت سید اصغر حسین صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ یہ وہ آفتاب وماہتاب ہیں، ان میں ہر فرد تنہا سارے عالم کو روشن کرنے کے لئے کافی ہے۔

پھر حضرت شیخ الہند نے حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں بھی خوب حصہ لیا، اور ایک عرصہ تک اس کی قیادت کرتے رہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب جامعہ مظاہر علوم سہارن پور کے صدر، شیخ الحدیث اور سرپرست رہے، انہوں نے طریقت ومعرفت کی بڑی عظیم الشان خدمت انجام دی، تفصیلات

دیکھنی ہوتو ''تذکرۃ الخلیل'' یا ''حیات خلیل'' پڑھئے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کے فیض تربیت سے جو باکمال اٹھے ان میں ایک نام حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی کا ہے، یہ بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے، اور اللہ تعالی نے تجدد دین وملت کا اتنا بڑا کام لیا ہے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی، آج جو سارے جہاں میں تبلیغی جماعت کے وفود دین کے نام پر چلتے پھرتے ہیں، یہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب ہی کی برکت ہے۔

دور حاضر کے مشہور روحانی شیخ اور زبردست عالم ومحدث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نے انہیں کی خدمت میں تربیت پائی، آج دنیا کا ایک بڑا حصہ ان کے خلفا و متوسلین سے فیض پا رہا ہے۔

حضرت شیخ کے خلفا کی ایک بڑی تعداد ہے، ان میں نامورترین بزرگ حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ تھے، ان کا فیض ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور یورپ وافریقہ میں عام ہے۔

حضرت گنگوہی کے دامن تربیت میں ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو بظاہر دارالعلوم دیوبند کے احاطے میں نہیں ہیں، لیکن ان کے فیضان روحانی سے ایک دنیا متاثر ہوئی۔ لکھنو کے شیخ وارث حسن صاحب علیہ الرحمہ حضرت گنگوہی کے خلفا میں ہیں، ان سے جدید تعلیم یافتہ نئی نسل کی اصلاح بہت ہوئی۔

حضرت گنگوہی کے خلفا ومتوسلین میں ایک عظیم الشان ہستی حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی ہے، یہ ابتداء ایک دوسرے بزرگ جو انہیں کے ہم نام تھے، یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہارن پوری کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے، وہاں سے تکمیل واجازت کے بعد گنگوہ میں حاضر ہوئے، اور طریقت وسلوک کے اعلی مراتب پر فائز ہوئے۔ شاہ صاحب کا فیض مغربی یوپی اور پنجاب وہریانہ کے علاقوں میں بہت عام ہوا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے خلفا میں نامورترین بزرگ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری تھے، ان کے ذریعے سے تصوف وسلوک کی عمومی اشاعت ہوئی، اور ایک دنیا

کی دنیا نام خدا کی حلاوت آشنا ہوئی۔ دور حاضر کے دو بڑے ممتاز اصحاب علم وقلم نے تزکیہ وباطن کا فیض انہیں بزرگ سے پایا، ایک حضرت مولانا منظور نعمانی جنہوں نے کبھی میدان مناظرہ میں قدم رکھا تو فرق باطلہ کے قدم اکھاڑ دیئے، پھر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو احسان وسلوک کے اعلی مرتبوں پر فائز ہوئے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی کی خدمت میں رہ کر دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا، اور زندگی کے ہر دور میں اپنے مفید اور بافیض قلم سے دینی موضوعات پر امت کی خدمت کرتے رہے، ماہنامہ ''الفرقان'' کے ذریعے پوری زندگی امت کی رہنمائی کرتے رہے۔

دوسرے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی، جن کی علمی ودینی اور دعوتی خدمات کا فیض عرب وعجم کو محیط ہے، اردو اور عربی میں اتنی مفید اور طاقت ور کتابیں تصنیف فرمائیں، دین اسلام اور تصوف وسلوک کا ایسا تعارف کرایا کہ بھٹکے ہوئے دماغوں نے راہ راست کا سراغ پایا۔

حضرت گنگوہی کے خلفا میں ایک عظیم الشان اور بابرکت نام شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی علیہ الرحمہ کا ہے، حضرت شیخ الاسلام جہاں بہت بڑے محدث، بہت بڑے عالم، بہت بڑے مجاہد تھے، وہیں بہت بڑے صاحب نسبت درویش تھے، دن کے مجاہد اور رات کے عبادت گزار، دن قومی وتعلیمی مجاہدوں میں گزرتا، اور راتیں عبادت وریاضت کے سوز وگداز سے معمور ہوتیں، ہزاروں افراد کی تربیت کر کے انہیں اللہ والا بنایا، دارالعلوم میں عرصۂ دراز تک شیخ الحدیث رہے، اور اللہ جانتا ہے کہ کتنے پاکیزہ نفوس نے ان کے قدموں کے نیچے رہ کر سلوک وطریقت کے مراتب طے کئے، ان کے خلفا کی بڑی تعداد ہوئی جن سے معرفت وحقیقت کا راستہ روشن ہوا۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی کے دو خلفا حضرت گنگوہی وحضرت نانوتوی کے بعد ان کے تیسرے عظیم الشان خلیفہ کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ یہ بزرگ ہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔

زبان پہ بارالٰہا یہ کس کا نام آیا   کہ نطق نے مرے، بوسے مری زباں کے لئے

حضرت تھانوی کی ہمہ جہت دینی خدمات سے برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش کا کون صاحب علم ناواقف ہوگا، حضرت تھانوی تصوف وطریقت کے زبردست شہسوار تھے، اوران کے دامن تربیت میں رہ کراتنے عظیم اصحاب نسبت پیدا ہوئے جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

حضرت نے جہاں صوفیہ پاک نہاد کی ایک جماعت تیار کی جنہوں نے مسلمانوں میں ہرعنوان سے دین کی خدمت کی، عقائد کی درستگی، اعمال کی اصلاح، خیالات کی تربیت، معاشرہ کی رہنمائی، لوگوں کو اللہ کا مخلص بندہ بنایا، وہیں انہوں نے قلم کے ذریعے ہر موضوع کو اس طرح روشن کیا کہ کسی کو کوئی التباس نہ رہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے بعد حضرت تھانوی دین وملت کے زبردست مجدد تھے، ان کے خلفا ومتوسلین کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اب تک رواں دواں ہے۔

اللہ تعالی اسے باقی رکھے، اورامت کی آبیاری ہوتی رہے۔

☆☆☆☆☆☆

بہار کا ایک مرد عظیم۔ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

وفات کا ایک ایمان افروز اور دلآویز منظر

ساتویں صدی ہجری کا نصف آخر ہے، ۶۶۱ھ میں بہار کی سرزمین شرق سے، علم وفضل زہد وورع، تقوی وطہارت اور عبادت وریاضت کا ایک آفتاب تازہ طلوع ہورہا ہے، اللہ تعالی نے اپنے آخری پیغمبر سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کو خیر امت بنایا ہے، یہ امت اپنے افراد کی خوبی اور برگزیدگی کے لحاظ سے بڑی زرخیز امت ہے، اللہ نے اس امت کے دامن میں ایمان وعمل کے ایسے گراں بہا نمونے عطا فرمائے ہیں جن کے فضل وکمال کی برکتیں صدیوں اور قرنوں پر محیط ہیں، ایسے ہی فضل وکمال کا آفتاب عالمتاب بہار کے افق پر روشن ہورہا ہے، یہ بزرگ ہیں مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ۔

ان بزرگ کی ولادت موجودہ بہار شریف کے مضافات میں قصبہ منیر میں شعبان ۶۶۱ھ کے آخری جمعہ کو ہوئی، یہ دور ہندوستان کے مشہور انصاف پرور اور عابد وزاہد بادشاہ سلطان ناصر الدین محمود کی حکومت کا تھا، بادشاہ کی نیک نیتی اور عبادت وتقوی کا نور پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا، مخدوم الملک پایۂ سلطنت دہلی سے دور مشرق میں پیدا ہوئے، دہلی شہر اس وقت علم وفضل اور مشیخت وبزرگی کا مرکز تھا، چنانچہ مخدوم خود فرماتے ہیں:

> ”در دہلی از ہر چہ پرسی ہمہ بسیار، عابداں وزاہداں بسیار، بزرگان دین بسیار، صاحبان سجادہ وصاحبان کرامت بسیار“۔ (سیرۃ الشرف ۵۷)

دہلی میں جس چیز کو پوچھو سب کچھ بہت زیادہ ہے، عابد وزاہد بہت! بزرگان دین بہت! صاحب سجادہ بہت! اصحاب کرامت بہت!

شیخ دلی سے دور تھے، اور علم وفضل کا مرکز دہلی شہر تھا، حق تعالی کے غیبی انتظامات بھی عجیب ہوتے ہیں، شیخ کا ابتدائے عمر میں دہلی پہونچنا مشکل، اور وہاں پہونچے بغیر علم کی تکمیل دشوار! دہلی انقلاب سلطنت کی شکار ہوئی، غالباً غیاث الدین بلبن کا دور تھا، دہلی کے ناموراور قدیم شہرت یافتہ اساتذہ اور مدرسین میں ایک بلندرتبہ بلکہ شاید سب سے بلند مرتبہ استاذ شیخ شرف الدین ابوتوامہ اس انقلاب کی ہلچل سے متأثر ہوئے، ان سے دہلی چھڑائی گئی، شاید عتاب شاہی نے انہیں ملک کے آخری مشرقی سرحد پر جانے کا حکم صادر کیا، اس دور میں اسلامی سلطنت کی آخری سرحد پر ایک بڑا شہر سنارگاؤں تھا، جواب ڈھاکہ کے علاقے میں پنیام کے نام سے ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے، یہ شہر اس عہد میں مشرقی بنگال کا دارالحکومت تھا، حضرت شیخ شرف الدین ابوتوامہ کے بارے میں خود مخدوم الملک فرماتے ہیں:

> ''مولانا شرف الدین ابوتوامہ ایں چنیں دانشمندے بود کہ در تمامہ ہندوستان مشار الیہ بودند و ہیچ کس را در علم ایشاں شبیہ نہ بود''۔ (خوان پرنعمت)
>
> مولانا شرف الدین ابوتوامہ ایسے عالم تھے کہ تمام ہندوستان میں ان کی طرف انگلیاں اٹھتی تھیں، اور علم میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ج ۲ ص ۱۸۱)

مولانا دلی سے روانہ ہوئے، راستے میں جہاں مختلف جگہوں پر ان کا ٹھہرنا ہوا، وہیں چند دنوں کے لئے یہ بزرگ حضرت مخدوم کے وطن منیر میں بھی ٹھہرے، شیخ یحییٰ، مخدوم کے والد نے ان کی بڑی مدارات کی، حضرت مخدوم اس وقت نوعمر تھے، مولانا کی صحبت کی برکت یہ ہوئی کہ مخدوم الملک کے دل میں شوق علم موجزن ہوا، انہوں نے والد گرامی سے اجازت چاہی کہ مولانا کے ساتھ سنارگاؤں جاکر ان کی خدمت میں تحصیل علوم کریں، باپ نے بیٹے میں جو یہ شوق دیکھا تو فوراً منظور کرلیا، مولانا نے بھی ایک جوہر قابل پاکر ہاتھوں ہاتھ لیا، اور دامن تربیت میں رکھ کر سنارگاؤں لے گئے، وہ سنارگاؤں پہونچ کر تعلیم میں مشغول ہوگئے، مخدوم نے ایک زمانۂ دراز تک مولانا کی خدمت میں رہ کر تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام، منطق، فلسفہ، ریاضی اور تمام علوم متعارفہ کی تحصیل کی، اور اچھی طرح کی۔ (سیرۃ الشرف ص ۴۷، ۴۸)

حق تعالی کی ایک بندۂ خاص پر یہ خصوصی عنایت ومہربانی تھی کہ دہلی کا علم وفضل خود اٹھ

کر طالب کے گھر آ گیا، اور اپنے فیوض وبرکات سے مالا مال کر گیا، ایک عرصہ کے بعد جب تحصیل علوم سے فراغت ہوئی تو گھر تشریف لائے، والد محترم کا انتقال ہو گیا تھا، والدہ محترمہ کی قدم بوسی کی۔

کچھ دنوں گھر پر ماں کے دامن شفقت میں وقت گزرا مگر آتش عشق الٰہی جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، اب شعلہ بن کر بھڑکنے لگی تھی، والدہ مکرمہ سے اجازت لے کر مرکز اولیا ومشائخ حضرت دہلی کی طرف روانہ ہو گئے، دہلی میں سلطان الاولیا محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین قدس سرہ کے رشد وہدایت کا آفتاب نیم روز ہر طرف تابانی پھیلا رہا تھا، حضرت مخدوم بھی حاضر خدمت ہوئے، اس وقت خواجہ صاحب کی مجلس میں کچھ مذاکرہ علمی ہوا، حضرت نے اس نو وارد کا اعزاز واکرام کیا مگر فرمایا:

’’سی مرغیست کہ نصیب دام ما نیست‘‘۔ ایک شاہین بلند پرواز ہے لیکن ہمارے جال کی قسمت کا نہیں۔ یہ فرما کر ایک بیڑا پان دے کر رخصت کر دیا۔

بعد میں دہلی کے ایک دوسرے بڑے مگر گمنام شیخ ومرشد حضرت خواجہ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت سے مشرف ہوئے۔

سلسلۂ فردوسیہ:

مشائخ طریقت کے چار سلسلے مشہور ہیں، ان میں ایک سلسلہ سہروردیہ ہے، جو شیخ الشیوخ سیدنا شہاب الدین عمر سہروردی، صاحب عوارف المعارف کی جانب مشہور ہے، ان بزرگ کے خواجہ تاش، مشہور بزرگ خواجہ نجم الدین کبری علیہ الرحمہ تھے، یہ دونوں بزرگ خواجہ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی علیہ الرحمہ متوفی ۵۶۳ ھ کے خلفا میں تھے، خواجہ نجم الدین کبری خوارزم کے رہنے والے تھے، تصوف وطریقت میں اس کا پایہ بہت بلند تھا۔

ان کے شیخ خواجہ ضیاء الدین ابوالنجیب قدس سرہ نے جب انہیں خلافت عطا فرمائی تو فرمایا:

’’شما مشائخ فردوس ہستید‘‘۔ تم مشائخ فردوس ہو۔

خواجہ نجم الدین کبری کے ایک زبردست خلیفہ خواجہ سیف الدین باخرزی تھے، ان کے

خلیفہ خواجہ بدرالدین سمرقندی تھے، یہ بزرگ ہندوستان تشریف لائے، اور دہلی میں قیام فرمایا، خواجہ بدرالدین سمرقندی کے خلیفہ خاص خواجہ رکن الدین فردوسی تھے، انہیں کے عہد سے یہ سلسلہ فردوسیہ کے لقب سے معروف ہوا۔

خواجہ نجیب الدین فردوسی انہیں خواجہ رکن الدین فردوسی کے بھتیجے تھے، وہ چچا کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے، اور انہیں سے خلافت پائی، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ انہیں خواجہ نجیب الدین صاحب سے بیعت ہوئے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

> ”(انہوں نے) سلسلہ فردوسیہ کی اشاعت واستحکام اور توحید وعشق الٰہی کی تبلیغ و اشاعتِ عام کے لئے ایک ایسے محقق، مجتہد الفن، امام اور بانی طریقہ کی تربیت کی جس نے نہ صرف پیران عظام کے نام کو زندہ اور تابندہ رکھا بلکہ نصف صدی سے زائد تک مشرقی ہندوستان کو اپنے روحانی فیض اور حرارتِ عشق سے گرم اور معمور رکھا، اور اپنی تحقیقات عالیہ، مقامات علمیہ اور علوم نادرہ کی بنا پر عین القضاۃ ہمدانی، خواجہ فریدالدین عطار اور مولانا جلال الدین رومی کی یاد تازہ کردی“۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ج ۳ ص ۱۹۴)

اجازت وخلافت:

حضرت مخدوم جب شیخ نجیب الدین کی خدمت میں پہونچے اور بیعت کی درخواست کی تو شیخ نے بیعت لی، اور ایک اجازت نامہ اسی وقت لاکر دیا، مخدوم نے عرض کیا کہ میں نے تو ابھی شیخ کی خدمت میں رہ کر کچھ سیکھا نہیں ہے؟ فرمایا کہ بارہ برس قبل میں نے حضور ختمی مآب ﷺ کے حکم سے یہ اجازت نامہ لکھ کر رکھ لیا تھا، تم کو کچھ اندیشہ نہیں کرنا چاہئے، نبوت تمہاری تعلیم کرے گی، اور پیروں کی ولایت حامی رہے گی، پھر طریقت کی روشن تعلیم فرمائی اور چند نصیحتیں لکھ کر مخدوم کو دیں، اور قدرے اپنے پاس رکھ کر رخصت فرمایا، اور یہ بھی فرمایا کہ اگر راہ میں تم کوئی خبر ملے تو نہ لوٹنا۔ مخدوم اپنے بھائی اور چند رفقا کے ساتھ دہلی سے سوئے وطن روانہ ہوئے، ابھی دو تین منزل گئے ہوں کہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے وصال کی خبر ملی، مخدوم نے حسب ہدایت سفر جاری رکھا، مگر دل کا جو حال ہوا اسے اللہ ہی جانتا ہے، البتہ اس کی طرف حضرت مخدوم کے ایک

ملفوظ سے اشارہ ملتا ہے، اور آگے کے حالات اس کے شاہد بین ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ”من چوں بخواجہ نجیب الدین فردوسی پیوستم حزنے در دل من نہادہ شد کہ ہر روز آں حزن زیادہ می شد“۔
>
> میں جب خواجہ نجیب الدین فردوسی سے ملا تو ایک حزن اور درد میرے دل میں بیٹھ گیا، جو دن بدن بڑھتا ہی رہا۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ج ۳ ص ۱۹۷)

پھر اس کا کامل ظہور اس وقت ہوا جب حضرت مخدوم منزل بمنزل راستہ طے کرتے ہوئے وطن کے قریب ایک جگہ ”بتھیا“ پہونچے، وہاں ایک جنگل کے کنارے سے گزر ہو رہا تھا کہ ایک مور کے چنگھاڑنے کی آواز سنی، دل درد و حزن سے بھرا ہوا تو تھا ہی، اسے سن کر دل میں ہوک سی اٹھی، اور صبر وضبط کا یارا نہ رہا، گریبان چاک جنگل میں گھس گئے، اور اللہ جانے کہاں روپوش ہو گئے، بھائی نے اور رفقاء سفر نے بہت تلاش کیا مگر کچھ خبر نہ ملی، آخر اجازت نامہ اور خواجہ صاحب کے تبرکات لے کر گھر آ گئے، اور یہ سب چیزیں والدہ صاحبہ کے حوالے کیں۔ (مناقب الاصفیاء ۳۴)

حضرت مخدوم اس جنگل میں بارہ برس تک اس طرح عزلت نشیں رہے کہ نہ کسی نے انہیں جانا اور نہ کسی سے ملاقات ہوئی، غیبی طریقہ پر سلوک وطریقت کی منزلیں طے ہوتی رہیں، بارہ برس کے بعد راجگیر کے جنگلوں میں وقت گزرا، یہاں کچھ کچھ خبر واثر کے نشانات ملتے ہیں، تیس سال صحرانشینی کے بعد حق تعالی کی حکمت ومصلحت نے انہیں آبادیوں کی جلوت میں پہونچایا، اور اذن اقامت دی، پھر بہار شریف میں آپ کی سکونت کا انتظام کیا گیا، تیس سال کے مجاہدات شاقہ کے بعد آپ تقریباً ساٹھ سال ہدایت وارشاد خلائق میں سرگرم رہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب لکھتے ہیں:

> ”کم سے کم ۷۲۴ھ سے لے کر ۷۸۲ھ تک، جس میں آپ کی وفات ہوئی ہے، نصف صدی سے زائد کا زمانہ خلق خدا کی ہدایت وارشاد اور طالبین کی تعلیم وتربیت میں گزرا، شیخ حسین معز بلخی کے بقول اس عرصے میں ایک لاکھ سے زائد انسان آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، جن میں بعض اقوال کے مطابق کم سے کم تین سو آدمی عارف کامل اور واصل بحق

ہوئے، متعدد ہندو فقیروں اور مرتاض جوگیوں کے قبول اسلام اور آپ کے ہاتھوں تکمیل وتحقیق تک پہونچنے کے واقعات بھی نقل کئے گئے ہیں‘‘۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ج۳ ص۲۰۲)

وفات:

تقریباً ساٹھ سال مخلوق خدا کی نفع رسانی اور ہدایت سامانی میں زندگی گزار کر ۱۲۱ر سال کی عمر میں جس شان کے ساتھ اپنی روح وجان، جہان آفریں پروردگار کے سپرد کی ہے، وہ ان کی عظمت وبزرگی اور مذہب اسلام کی حقانیت کی ایک عظیم دلیل ہے، موت برحق مگر انسانی افتاد ومزاج اور لذت وخواہش کے برعکس ایک تلخ حقیقت ہے، یہ تلخ حقیقت جب اللہ کے مخلص بندوں تک پہونچتی ہے تو وہی تلخی جو عام انسانوں کے کام ودہن کو ہر ناگوار سے بڑھ کر ناگوار محسوس ہوتی ہے، اللہ والوں کے لئے ایک جام نوشیں ثابت ہوتی ہے، وہ بڑھ کر اس استقبال کرتے ہیں، اور اس کے آثار وعلائم کو محسوس کر کے مسرت وشادمانی سے مست وسرشار ہوجاتے ہیں۔

حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰ منیری علیہ الرحمہ کی وفات کے حالات اس درجہ ایمان پرور، دل افروز اور نشاط انگیز ہے کہ انہیں پڑھنے سے ایمان میں تازگی، آخرت کی محبت اور اللہ کی رحمت کی امید کا ایک زندہ سماں بندھ جاتا ہے، یہ حالات ان کے خلیفہ خاص، ہمہ وقت کے حاضر باش حضرت زین بدر عربی نے ایک رسالہ میں لکھے ہیں، ہم انہیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے حوالے سے من وعن نقل کرتے ہیں، شیخ زین بدر عربی فرماتے ہیں:

’’چہار شنبہ کا دن تھا اور ۵ر شوال ۷۸۲ھ کی تاریخ تھی، میں حاضر خدمت ہوا، نماز فجر کے بعد اس نئے حجرے میں جس کو ملک الشرق نظام الدین خواجہ ملک نے تعمیر کیا تھا، سجادہ پر تکیہ سے سہارا لگائے بیٹھے تھے، شیخ خلیل الدین حقیقی بھائی اور خادم خاص اور بعض دوسرے احباب اور خادم جو متواتر کئی راتوں سے آپ کی خدمت کے لئے جاگتے رہے تھے، جن میں قاضی شمس الدین، مولانا شہاب الدین، (جو خواجہ مینا کے بھانجے تھے) مولانا ابراہیم، مولانا آموں قاضی، میاں ہلال وعقیق اور دوسرے عزیز حاضر تھے، آپ نے زبان مبارک سے فرمایا ’’**لاحول ولا قوة الا بالله العظيم**‘‘ پھر حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا: سبحان اللہ، وہ ملعون اس وقت

بھی مسئلہ توحید میں لغزش دینا چاہتا ہے، خدا کا فضل وکرم ہے، اس کی طرف کیا توجہ ہوسکتی ہے، پھر آپ نے **لاحول ولاقوۃ الا باللہ العظیم** پڑھنا شروع کیا، اور حاضرین سے فرمایا: تم بھی پڑھو، اس کے بعد آپ اپنے ادعیہ ووظائف میں مشغول ہوگئے، چاشت کے وقت ان سے فارغ ہوئے، کچھ دیر کے بعد اللہ تعالی کی حمد وثنا میں مشغول رہے، بآواز بلند **الحمد للہ الحمد للہ** کہنے لگے، فرماتے تھے: خدا نے کرم فرمایا **المنۃ للہ المنۃ للہ**، کئی بار دل کی خوشی اور اندرونی فرحت کے ساتھ اسی کو بار بار دہراتے رہے۔ **الحمد للہ الحمدللہ، المنۃ للہ المنۃ للہ**

بعد ازاں آں مخدوم حجرہ سے صحن حجرہ میں تشریف لائے، اور تکیہ کا سہارا لیا، تھوڑی دیر کے بعد دست مبارک پھیلائے، جیسے مصافحہ فرمانا چاہتے ہوں، آپ نے قاضی شمس الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور دیر تک لئے رہے، پھر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا، خدام کو رخصت کرنے کا آغاز انہیں سے ہوا، پھر قاضی زاہد کا ہاتھ پکڑ کر سینہ مبارک پر رکھا اور فرمایا: ہم وہی ہیں ہم وہی ہیں۔ پھر فرمایا: ہم وہی دیوانے ہیں، ہم وہی دیوانے ہیں۔ پھر تواضع وخاکساری کی کیفیت طاری ہوئی، اور فرمایا: نہیں، بلکہ ہم ان دیوانوں کی جوتیوں کی خاک ہیں، پھر حاضرین میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ فرمایا اور ہر ایک کے ہاتھ، داڑھی کو بوسہ دیا، اور اللہ تعالی کی رحمت ومغفرت کے امیدوار رہنے کی تاکید فرمائی، اور بلند آواز سے پڑھا "**لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً**"۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

خدایا رحمت دریائے عام است   ازانجا قطرے برما تمام است

اس کے بعد حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا: کل تم سے سوال کریں گے تو کہنا "**لا تقنطوا من رحمۃاللہ**" لائے ہیں، اگر مجھ سے پوچھیں گے تو میں بھی یہی کہوں گا، اس کے بعد کلمۂ شہادت بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا "**اشھد ان لا الہ الااللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ**"۔ یہ الفاظ بھی ادا کئے۔ **رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمدﷺ نبیا وبالقرآن اماما وبالکعبۃ قبلۃ وبالمومنین اخوانا وبالجنۃ ثوابا وبالنار عذابا.**

میں اللہ کو رب مانتا ہوں، اسلام کو دین، محمدﷺ کو نبی، قرآن کو اپنا پیشوا، کعبہ کو قبلہ، اہل

ایمان کو اپنا بھائی، جنت کو اللہ کا انعام اور دوزخ کو اللہ کا عذاب تسلیم کرتا ہوں، اور اس عقیدے پر مطمئن ہوں۔

اس کے بعد آپ نے مولانا تقی الدین اودھی کی طرف متوجہ ہو کر اپنا ہاتھ پھیلایا اور فرمایا: عاقبت بخیر ہو، اور ان کے حال پر بڑی عنایت و مہربانی فرمائی، پھر زبان مبارک سے فرمایا، آموں! مولانا آموں حجرے کے اندر تھے، وہ سن کر لبیک کہتے ہوئے دوڑتے ہوئے آئے، آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور چہرۂ مبارک پر ملنے لگے، فرمایا: تم نے بڑی خدمت کی، تمہیں نہیں چھوڑوں گا، خاطر جمع رکھو، ایک ہی جگہ رہیں گے، اگر قیامت کے دن پوچھیں گے کہ کیا لائے؟ تو کہنا" **لاتقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً**"، اگر مجھ سے پوچھیں گے تو میں بھی یہی کہوں گا، دوستوں سے کہو خاطر جمع رکھیں، اگر میری آبرو رہے گی تو میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا، اس کے بعد ہلال اور عقیق کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تم نے ہم کو بہت خوش رکھا، ہماری بڑی خدمت کی، جیسے ہم تم سے خوش رہیں گے، تم بھی خوش ہو گے اور ہمیشہ خوش رہو گے، تین مرتبہ اپنا ہاتھ میاں ہلال کی پیٹھ پر رکھا اور فرمایا: بامراد ہو گے، اس وقت آپ کے دونوں پاؤں میاں ہلال کی گود میں تھے، اور ان کے حال پر بڑی عنایت تھی۔

اس عرصہ میں مولانا شہاب الدین ناگوری آئے، آپ نے کئی بار ان کے سر، چہرہ، داڑھی اور دستار کو بوسہ دیا، آپ آہ آہ کرتے جاتے تھے، اور الحمدللہ الحمدللہ کہتے جاتے تھے، آپ نے ہاتھ نیچے کر لیا، اور درود پڑھنے لگے، مولانا شہاب الدین کی بھی آپ کے چہرۂ مبارک پر نظر تھی، اور درود پڑھ رہے تھے، اس کے بعد آپ نے مولانا شہاب الدین خوہر زادہ خواجہ معین الدین کا نام لیا، اور فرمایا: میری بڑی خدمت کی، مجھ سے بہت اتحاد تھا، بڑی خوبی کے ساتھ میری صحبت اٹھائی، عاقبت بخیر ہو، اس وقت مولانا شہاب الدین نے مولانا مظفر بلخی اور مولانا نصیر الدین جونپوری کا نام لیا، اور فرمایا کہ ان دونوں کے باب میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ آپ نے بہت خوش ہو کر مسکراتے ہوئے اور اپنی تمام انگلیوں سے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا مظفر میری جان ہے، میرا محبوب ہے، مولانا نصیر الدین بھی اسی طرح ہیں، خلافت اور مقتدائی کے لئے جو شرائط و اوصاف ضروری ہیں، وہ ان دونوں میں موجود ہیں۔

اس موقع پر مولانا شہاب الدین نے کچھ ہدیہ پیش کیا اور عرض کیا، مخدوم! اسے قبول فرمائیں، فرمایا میں نے قبول کیا، یہ کیا ہے میں نے تو سارا گھر قبول کیا، اس کے بعد ان کو کلاہ عطا ہوئی، انہوں تجدید بیعت کی درخواست کی، آپ نے قبول فرمایا، اس دوران قاضی مینا حاضر خدمت ہوئے، میاں ہلال نے تعارف کرایا، اور عرض کیا کہ یہ قاضی مینا ہیں، فرمایا: قاضی مینا! قاضی مینا! قاضی مینا نے کہا، حضرت حاضر ہوں، اور ہاتھ کو بوسہ دیا، آپ نے ان کا ہاتھ اپنے چہرہ وریشِ مبارک اور رخسار پھیرا، اور فرمایا: خدا کی تم پر رحمت ہو، باایمان رہو، اور باایمان دنیا سے جاؤ، از راہ شفقت یہ بھی فرمایا: مینا ہمارے ہیں۔ اس دوران میں مولانا ابراہیم آئے، آپ نے اپنا دایاں ہاتھ ان کی داڑھی پر پھیرا، اور فرمایا: تم نے میری اچھی خدمت کی ہے، اور پورا ساتھ دیا، باآبرو ہوگے، مولانا ابراہیم نے عرض کیا: مخدم مجھ سے راضی ہیں؟ فرمایا ہم سب سے راضی ہیں، تمہیں بھی ہم سے راضی ہونا چاہئے، جو کچھ ہے میری طرف سے ہے، اس کے بعد قاضی شمس الدین کے بھا قاضی نورالدین حاضر ہوئے، آپ نے قاضی نورالدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور بڑی شفقت کے ساتھ ان کی داڑھی، چہرہ، رخسار اور ہاتھ کو کئی بار بوسہ دیا، آپ آہ آہ کرتے جاتے، آپ نے ان سے فرمایا کہ تم ہماری صحبت میں بہت رہے ہو، اور ہماری بڑی خدمت کی ہے، ان شاء اللہ کل ایک ہی جگہ رہیں گے، اس کے بعد مولانا نظام الدین کو ہی حاضر ہوئے، فرمایا غریب اپنا وطن چھوڑ کر ہمارے جوار میں آ گیا تھا، یہ کہہ کر کلاہ مبارک اپنے سے سر اتار کر ان کو عطا فرمائی، اور حسن عاقبت کی دعا فرمائی، اور فرمایا حق تعالی مقصود تک پہونچائے، پھر سب حاضرین کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: دوستو! اپنے دین وایمان کا غم کھاؤ، اور اسی میں مشغول رہو۔

اس کے بعد کاتب سطور زین عربی نے دست مبارک کو بوسہ دیا، اپنی آنکھ، سر اور بدن پر پھیرا، ارشاد ہوا کون ہے؟ میں نے عرض کیا، گدائے آستانہ توجہ چاہتا ہے، اور عرض کرتا ہے کہ مجھے از سر نو غلامی میں قبول فرمایا جائے، فرمایا جاؤ، تم کو بھی قبول کیا، تمہارے گھر اور اہل خاندان کو قبول کیا، خاطر جمع رکھو، اگر میری آبرو رہی تو کسی کو چھوڑنے والا نہیں ہوں، میں نے عرض کیا: مخدوم تو مخدوم ہیں، مخدوم کے غلاموں کی بھی آبرو ہے، فرمایا امیدیں تو بہت ہیں۔ قاضی شمس الدین آئے اور حضرت مخدوم کے پہلو میں بیٹھ گئے، مولانا شہاب الدین وہلال وعقیق نے عرض

کیا کہ مخدوم! قاضی شمس الدین کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ فرمایا قاضی شمس الدین کے بارے میں مَیں کیا کہوں؟ قاضی شمس الدین میرا فرزند ہے، کئی جگہ میں اس کو فرزند لکھ چکا ہوں، خط میں مَیں نے اس کو برادرم بھی لکھا ہے، ان کو علم درویشی کے اظہار کی اجازت ہوچکی ہے، انہیں کے خاطر اتنے کہنے اور لکھنے کی نوبت آئی، ورنہ کون لکھتا؟۔

اس کے بعد برادر اور خادم خاص شیخ خلیل الدین نے جو پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا، آپ نے ان کی طرف رخ کیا، اور فرمایا: خلیل! خاطر جمع رکھو، تم کو علما و درویش چھوڑیں گے نہیں، ملک نظام الدین خواجہ ملک آئے گا، اس کو میرا اسلام ودعا پہونچانا، میری طرف سے بہت معذرت کرنا اور کہنا کہ میں تم سے راضی ہوں، اور راضی جارہا ہوں، تم بھی راضی رہنا، فرمایا کہ جب تک ملک نظام الدین ہے تم کو نہیں چھوڑے گا، شیخ خلیل الدین بہت متأثر تھے، آنکھوں میں آنسو تھے، حضرت مخدوم نے جب ان کی دل شکستگی دیکھی تو بڑی شفقت سے فرمایا: خاطر جمع رکھو، اور دل کو مضبوط رکھو، اس کے بعد فرمایا کون ہے؟ ہلال نے عرض کیا کہ ملا محمود صوفی ہیں، آپ نے بڑے گہرے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ بیچارہ غریب ہے، مجھے اس کی بڑی فکر ہے، بیچارے کا کوئی نہیں، اس کے بعد ان کے لئے حسن عاقبت کی دعا فرمائی، اس کے بعد قاضی خاں خلیل حاضر خدمت ہوئے، فرمایا: بیچارہ قاضی ہمارا پرانا دوست ہے، ہماری صحبت میں بہت رہا ہے، اللہ تعالی اس کو جزائے خیر دے، اور عاقبت بخیر کرے، اس کے فرزند بھی ہمارے دوست ہیں، سب کی عاقبت بخیر ہو، اور حق تعالی دوزخ سے رہائی دے۔

اس کے بعد خواجہ معز الدین مشرف بخدمت ہوئے، فرمایا عاقبت بخیر ہو، پھر مولانا فضل اللہ نے قدم بوسی کی، فرمایا بھلے بھلے، اللہ عاقبت بخیر کرے، فتوح باورچی روتا ہوا آیا، اور قدموں میں گر گیا، فرمایا: بیچارہ فتوحا، جیسا کچھ تھا میرا ہی تھا، اس کے حق میں بھی دعائے عاقبت فرمائی، اس کے بعد مولانا شہاب الدین صاحب نے شرف قدم بوسی حاصل کی، ہلال نے تعارف کرایا کہ مولانا شہاب الدین حاجی رکن الدین کے بھائی ہیں، فرمایا: انجام بخیر ہو، ایمان کا غم کھاؤ، اور رحمت حق کے امیدوار ہوکر پڑھو **لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً.**

کچھ دیر کے بعد نماز ظہر کے قریب سید ظہیر الدین اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے، آپ نے سید ظہیر الدین کو بغل میں لے لیا، اور بڑے لطف وشفقت کے ساتھ فرمایا: میں جو عاقبت عاقبت کہتا تھا، یہی عاقبت ہے، اس کے بعد تین مرتبہ ان کو بغل میں لیا اور آخری بار یہ آیت پڑھی، **لاتقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً**، اور حاضرین کو رحمت ومغفرت خداوندی کا امیدوار بنایا، اس کے بعد وہاں سے اٹھے اور حجرے میں تشریف لے گئے، اور سید ظہیر الدین کے ساتھ کچھ دیر بیٹھے، اور ان سے کچھ دیر باتیں فرمائیں، اس کے بعد سلطان شاہ پرگنہ دار راجگیر اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر خدمت ہوا، ایک روغن کا سر ریاح پیش کیا، ارشاد ہوا کہ مولانا نظام الدین بھی لائے تھے، پھر شربت اور پان دے کر معذرت کی، اس کے بعد خلیل کے بھائی منور نے عرض کیا کہ توبہ وبیعت کرنا چاہتا ہوں، فرمایا آؤ، اس کی جانب ہاتھ بڑھا کر توبہ وبیعت سے مشرف فرمایا، پھر قینچی طلب کی، قینچی سے بال تراشے اور کلاہ پہنائی، اور فرمایا جاؤ دوگانہ ادا کرو اس طرح اس کے بیٹے نے بھی بیعت کی، اس کو بھی یہی حکم ہوا۔

اسی اثنا میں قاضی عالم احمد مفتی، مولانا نظام الدین مفتی کے بھائی جو مریدان خاص میں سے ہیں، آئے، اور ادب کے ساتھ آپ کے سامنے بیٹھ گئے، اسی درمیان ملک حسام الدین کے بھائی امیر شہاب الدین اپنے لڑکے کے ساتھ حاضر ہوئے اور آکر بیٹھ گئے، آپ کی نظر مبارک لڑکے پر پڑی، آپ نے فرمایا: پانچ آیتیں پڑھ سکتے ہو؟ حاضرین نے عرض کیا، ابھی چھوٹا ہے، سید ظہیر الدین مفتی کا لڑکا بھی حاضر تھا، میاں ہلال نے جو دیکھا کہ آپ کو اس وقت کلام الٰہی سننے کا ذوق ہے، تو انہوں نے اس لڑکے کو بلایا اور پانچ آیت پڑھنے کی ہدایت کی، سید ظہیر الدین نے جب محسوس کیا کہ طبیعت مبارک پر قرآن مجید سننے کا تقاضا ہے تو اپنے لڑکے کو ارشاد کیا کہ قرآن مجید کی پانچ آیتیں پڑھو، لڑکا سامنے آیا اور مؤدب بیٹھ گیا، اس نے سورہ فتح کے آخری رکوع کی آیتیں **محمد رسول الله والذين معه الخ** پڑھنی شروع کی، حضرت مخدوم تکیہ کے سہارے آرام فرما رہے تھے، اٹھ بیٹھے، اور معمولِ قدیم کے مطابق باادب دوزانو بیٹھ گئے، اور بڑی توجہ سے قرآن سننے لگے، لڑکا "**ليغيظ بهم الكفار**" پر پہونچا تو مرعوب ہوگیا، اور اس سے پڑھا نہ جاسکا، آپ نے اس کو آگے کے لفظ کی تلقین فرمائی، جب لڑکے نے قرأت ختم کی

تو آپ نے فرمایا: اچھا پڑھتا ہے اور خوب ادا کرتا ہے، لیکن مرعوب ہوجاتا ہے، اس موقع پر آپ نے ایک مغربی درویش کا ذکر کیا کہ کبھی اس کی طبیعت حاضر ہوتی تھی اور قرآن مجید سننے کا ذوق ہوتا تھا، کبھی اس طبیعت حاضر نہیں ہوتی تھی اور قرآن مجید سننے کا ذوق نہیں ہوتا تھا۔

اس کے بعد قاضی عالم کو شربت اور پان دینے کا ارشاد ہوا، اور معذرت فرمائی، آپ نے پیراہن جسم سے اتارنا چاہا اور وضو کے لئے پانی طلب فرمایا، اور آستین سمیٹی، مسواک طلب فرمائی، آواز سے بسم اللہ پڑھی، اور وضو شروع فرمایا، اور ہر موقع کی ادعیہ پڑھیں، کہنیوں تک دونوں ہاتھ دھوئے، منھ دھونا بھول گئے، شیخ فریدالدین نے یاد دلایا کہ منھ دھونا رہ گیا، آپ نے ازسرنو وضو کرنا شروع کیا، اور بسم اللہ اور وضو کی دعائیں جس طرح آئی ہیں، بڑی احتیاط کے ساتھ پڑھتے تھے، مفتی سید ظہیرالدین اور حاضری مجلس دیکھتے تھے، اور تعجب کرتے تھے، اور آپس میں کہتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ احتیاط! قاضی زاہد نے پاؤں دھونے میں مدد کرنا چاہی، حضرت مخدوم نے ان کو روک دیا، اور فرمایا، کھڑے رہو، اس کے بعد خود سے وضو پورا کیا، وضو مکمل کرنے کے بعد کنگھی طلب فرمائی، اور داڑھی میں کنگھی کی، اس کے بعد مصلیٰ طلب فرمایا، نماز شروع کی، اور دو رکعت پر سلام پھیرا، تکان ہوجانے کی وجہ سے کچھ دیر آرام فرمایا، شیخ خلیل الدین نے عرض کیا کہ حضرت سلامت حجرہ میں تشریف لے چلیں، ٹھنڈک کا وقت ہوگیا ہے، آپ کھڑے ہوئے، جوتیاں پہنیں اور حجرہ کی طرف چلے، آپ کا ایک ہاتھ مولانا زاہد کے کاندھوں پر تھا، دوسرا مولانا شہاب الدین کے کاندھوں پر، حجرہ میں آپ ایک شیر کی کھال پر لیٹ گئے، میاں منور نے بیعت وتوبہ کی درخواست کی، آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا، اور ان کو توبہ وبیعت سے مشرف فرمایا، اور ان کے سر کے بال دونوں جانب سے تھوڑے تھوڑے تراشے، ان کو کلاہ پہنائی اور فرمایا جاؤ دوگانہ ادا کرو، یہ آخری بیعت وتوبہ تھی جو آپ نے کرائی، اس موقع پر ایک عورت اپنے دولڑکوں کو لے کر حاضر ہوئی، اور شرف قدم بوسی حاصل کیا، نماز عصر کے بعد مغرب کی نماز کے نزدیک خدام نے عرض کیا کہ حضرت چارپائی پر آرام فرمائیں، آپ چارپائی پر تشریف لے گئے اور آرام فرمایا۔

نماز مغرب کے بعد شیخ خلیل الدین، قاضی شمس الدین، مولانا شہاب الدین، قاضی

نورالدین، ہلال وعقیق اور دوسرے احباب وخدام جو خدمت میں مصروف تھے، چارپائی کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے، حضرت مخدوم نے کچھ دیر کے بعد بآواز بلند بسم اللہ کہنی شروع کی، کئی بار بسم اللہ کہنے کے بعد زور زور سے پڑھا **لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین** ، اس کے بعد بار بار بلند آواز سے بسم اللہ الرحمان الرحیم پڑھا، پھر کلمہ شہادت **اشهد ان لاالہ الاالله وحده لا شریک له واشهد ان محمدا عبده ورسوله**، اس کے بعد فرمایا: **لاحول ولاقوة الا بالله العلی العظیم** ، پھر کچھ دیر تک کلمہ شہادت زبان پر جاری رہا، پھر کئی بار **بسم الله الرحمان الرحیم، بسم الله الرحمان الرحیم، لا اله الا الله محمد رسول الله** ، اس کے بعد بڑے اہتمام سے اور دل کی بڑی قوت اور بڑے ذوق وشوق سے **محمد، محمد، محمد اللهم صل علی محمد وعلیٰ آل محمد الخ** ، پھر یہ آیت پڑھی، **ربنا انزل علینا مائدة من السماء الخ** پھر **رضیت بالله ربا وبالاسلام دینا وبمحمد** ﷺ **نبیا** ، اس کے بعد تین مرتبہ کلمہ طیبہ کا ورد فرمایا، پھر آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے اور بڑے ذوق وشوق کے ساتھ جیسے کوئی دعا اور مناجات کرتا ہے، فرمایا: **اللهم اصلح امة محمد اللهم ارحم امة محمد اللهم اغفر لامة محمد اللهم تجاوز عن امة محمد اللهم اغث امة محمد اللهم انصر دین محمد اللهم فرج عن امة محمد فرجاً عاجلاً اللهم اخذل من خذل دین محمد ، برحمتک یا ارحم الراحمین** ۔ ان الفاظ پر آواز بند ہوگئی، اس وقت زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے، **لاخوف علیهم ولاهم یحزنون لااله الا الله**، اس کے بعد ایک بار بسم اللہ الرحمان الرحیم کہا اور جاں بحق تسلیم ہوئے، یہ واقعہ شب پنج شنبہ ۶/شوال ۷۸۲ھ عشا کی نماز کے وقت کا ہے، اگلے روز پنج شنبہ کے دن نماز چاشت کے وقت تدفین عمل میں آئی۔

جنازہ وتدفین:

نماز جنازہ شیخ اشرف جہانگیر سمنانی نے پڑھائی، جو انتقال کے بعد پہونچے تھے، لطائف اشرفی میں حضرت مخدوم صاحب کی خود وصیت اور پیش گوئی فرمانے، اور شیخ جہانگیر کے وہاں پہونچنے اور حسب وصیت نماز پرھانے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ مخدوم صاحب کی وصیت واطلاع کے مطابق جنازہ تیار کر کے راستہ پر رکھ دیا گیا تھا، اوران کا انتظار تھا، شیخ اشرف جہانگیر دہلی سے بنگالہ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ علاؤ الدین علاؤ الحق لاہوری پنڈوی کی خدمت میں تشریف لے جارہے تھے، راستہ میں بہار شریف عین اس وقت میں پہونچے جب حضرت کا جنازہ تیار کر کے راستہ پر رکھ دیا گیا تھا، اورامام کا انتظار تھا، آپ نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبر میں اتارا، قبر کچی ہے اوراس پر کوئی گنبد نہیں ہے، سوریوں کے عہد سلطنت میں اس کے گرد وپیش مکانات، مسجد اور حوض وفوارہ بنا، لیکن بخیال اتباع شریعت جس کا حضرت مخدوم کو بڑا اہتمام تھا قبر اپنی حالت پر چھوڑ دی گئی۔

☆☆☆☆☆☆

نصیحت نامہ پیرومرشد

حضرت شیخ نجیب الدین فردوسی علیہ الرحمہ نے بیعت واجازت کے بعد چند نصیحتیں لکھ کر حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری کو دی تھیں، ہم انھیں ''سیرۃ الشرف'' کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ ان سے حضرات مشائخ صوفیہ کے انداز تربیت کا پتہ چلتا ہے، اور یہی نصیحتیں ہیں جن کے بنائے ہوئے خطوط پر حضرت مخدوم زندگی بھر استقامت وپختگی کے ساتھ چلتے رہے۔

(۱) بعد از تامل وتفکر بسیار روشن شد کہ مشغول شدن، بہر چہ باشد گو خطاست، جز مشغول شدن بحق تعالیٰ کہ بہ ترک است از جملہ!

بہت غور وفکر کے بعد یہ بات روشن ہوئی ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ مشغولیت کے علاوہ کسی بھی چیز اور کام میں مشغول ہونا، خواہ وہ کوئی مشغولیت ہو، غلطی ہے، اور حق تعالیٰ کے ساتھ مشغولیت، ہر ماسوا کے ترک سے ہوتی ہے۔

(۲) واصلاً والبتہ چپ وراست نہ بیند وہوشیار باشد تا بہ غفلت چپ وراست نظر نہ کند۔

دائیں بائیں ہرگز نہ دیکھے، اور ہمیشہ ہوشیار اور باخبر رہے کہ غفلت کی وجہ سے دائیں بائیں نگاہ نہ پڑے۔

(۳) واصلاً والبتہ سخن کسے گوش نہ کند، البتہ قصد شنیدن آں نہ کند کہ چہ می گوید۔ قصد دل بچیزے مشغول نہ کند، تا اگر سخن ضروری در گوش می افتد نافتد وفہم نشود۔

اور ہرگز کسی کی بات پر کان نہ لگائے، اور اس کے سننے کا قصد نہ کرے کہ کیا کہتا ہے، دل کا قصد کسی چیز میں مشغول نہ کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی بات کان میں پڑ بھی جائے تو نہ پڑے اور نہ سمجھ

میں آئے۔

(۴) وجز نان خشک وآب کہ وقت ضرورت مقرر ومعہود کردہ است اصلاً والبتہ نخورد کہ آں محض اتباع ہوئی است ومحض خودی است۔

اورسوائے سوکھی روٹی اور پانی کے، جو وقت ضرورت متعین ہو، ہرگز کچھ نہ کھائے کہ وہ محض نفس کی خواہش کی پیروی ہے اور محض خودی ہے۔

(۵) وہر روز یکبار میانہ روز متوضی رود، واگر بسبب قلت طعام ہر روز احتیاج نہ شود خود بہتر باشد، واما ازیں زیادہ نرود وقت بگرداند، اگرچہ تقاضا پیدا شود وضو مشوش باشد تا بدیں عادت شود۔

اور ہر روز ایک بار بیت الخلا جائے، اور اگر قلت طعام کی وجہ سے ہر روز ضرورت نہ پڑے تو یہ زیادہ بہتر ہے، مگر ایک مرتبہ سے زیادہ نہ جائے، اگر تقاضا پیدا ہو تو ٹال دے، خواہ وضو میں تشویش ہو، تا کہ اس کی عادت ہو جائے۔

(۶) وہمہ وقت جز یک خرقہ گلیم ہیچ نہ پوشد، مگر در سرما لبادۂ کہنہ بپوشد بالائے خرقہ..... بریں زیادہ نہ کند۔

اور ہمہ وقت بجز ایک کملی کے خرقہ کے اور کچھ نہ پہنے، ہاں جاڑے کے موسم میں ایک پرانا لبادہ خرقہ کے اوپر پہن لے، اس سے زیادہ نہ کرے۔

(۷) واصلاً والبتہ نہ درروز ونہ درشب از آمدن کسے وکار کسے ناخوش نشود واعتراض نہ کند ونہ گزارد کہ در ظاہر وباطن بر ہیچ کس ودر ہیچ چیز انکارے واعتراضے وچون وچرائے ولم وکیفے بگزرد، اگرچہ ہمہ آتش برسر بارد، تا مقام وحدت با کمال ذوق حاصل شود۔

اور کسی کے آنے اور کسی کے کام سے کبھی ناخوش نہ ہو، نہ دن میں، نہ رات میں، نہ کبھی اعتراض کرے، اور اپنے کو اس حال پر ہرگز نہ چھوڑے، کسی شخص پر اور کسی چیز پر ظاہر وباطن میں انکار واعتراض، چون وچرا اور لم وکیف (کیوں اور کیسے) کا گزر ہو، تا کہ کمال ذوق کے ساتھ مقام وحدت حاصل ہو۔

(۸) ودر وقت سماع تا آنگہ کہ تواند وممکن باشد اصلاً والبتہ نگزارد کہ آب از چشم یا حرکت در وجود آید، وبقدر المقدار دریں باب بکوشد، مگر آنگہ کہ مغلوب شود ونگاہ نتواند داشت نہ پراچہ در ظاہر

شدن احوال آفات بسیار است وکتمان آن از حد مہمات ست۔

اور بوقت سماع جہاں تک ممکن ہو اور طاقت واختیار ساتھ دے، ہرگز آنکھ سے آنسو بہنے نہ پائے یا بدن میں حرکت نہ ہونے پائے، بقدر مقدور اس کا اہتمام ضروری ہے، البتہ اگر بالکل مغلوب ہو جائے اور طاقت واختیار باقی نہ رہے تو گنجائش ہے، احوال کے ظاہر ہونے میں آفات بہت ہیں، اور ان کا چھپانا کارِ اہم ہے۔

تشریح

(۱) مشغولیت بحق کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری ہو، اس کا ذکر ظاہر وباطن اور لسان وقلب سے ہو، اس کے خوف وہیبت کا دل پر تسلط ہو، اس کی خشیت سے گناہوں اور ممنوعات کا ترک ہو۔ اس کی قضا وتصرف پر دل وجان سے رضا وخوشی ہو، یا اس کے حکم کے تحت صبر وسکون ہو، غرض زندگی کا کوئی کام ہو، کوئی تصرف ہو، کوئی حرکت وسکون ہو، وہ سب اس خیال اور جذبہ کے ماتحت ہو کہ حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں، جب یہ جذبہ ہوگا تو ہر اس چیز سے اعراض ہوگا جو انسان کے دامن دل کو حق تعالیٰ سے غفلت کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہی ہو، یہ نصیحت تفسیر ہے اس آیتِ قرآنی کی: قُلْ إِنَّ صَلاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَأَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ. (سورۃ الانعام: ۱۶۳) تم کہہ دو کہ بلاشبہ میری نماز، میری قربانی وعبادت، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے، اللہ کے حکم کے ماتحت ہے، جو سارے جہاں کا پروردگار ہے، اس کے ساتھ کوئی بھی شرکت رکھنے والا نہیں ہے اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا ماننے والا ہوں

(۲) سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا مرکز نگاہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ اور رضائے الٰہی کو بنائے، اس کے دائیں بائیں بہت سی خواہشیں ہیں، بہت سے تقاضے ہیں، بہت سے بلانے والے، بہکانے والے، ترغیب دلانے والے، ڈرانے والے، اندیشوں میں مبتلا کرنے والے ہیں، شیطان ہے، لذت نفس ہے، نفسانی اور جذباتی تعلق کے مراکز ہیں، معاش اور روزی کے بہت سارے پھندے ہیں، مگر سالک ان سب سے صرفِ نظر کرکے اپنی نگاہ صرف سامنے خالق تعالیٰ وتقدس پر جمائے رکھے، اور اس سلسلے میں بہت ہوشیار رہے، ورنہ ذرا سی غفلت

، دائیں بائیں کی کھائیوں اور خندقوں میں گرا کر ہلاک کردے گی۔ إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفاً وَّمَاأَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (سورۃ الانعام:۷۹) میں نے اپنا رخ اسی ذات واحد کی طرف یکسو کرلیا ہے، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے، اور میں مشرکین میں نہیں ہوں۔ ابراہیم کی یہ صدائے ایمانی اور ندائے وحدانی، اس کا عقیدہ وعمل اور نظریۂ وخیال ہونا چاہیئے، اگر وہ دائیں بائیں متوجہ ہوگا تو شرک میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوگا۔

(۳) بجز ذکر الٰہی کے، بجز تلاوت کلام الٰہی کے، بجز اوامر ونواہیٔ خداوندی کے کسی اور بات اور کسی کے کلام پر ہرگز کان نہ لگائے، اس کے علاوہ اور اس سے الگ جو کچھ ہے سب باطل ہے، ان باطل باتوں کو نہ سنے اور نہ سننے کا ارادہ کرے، اگر کسی مجبوری کے تحت کان میں یہ باتیں پڑ جائیں تو ایسا ہو جیسا کہ نہ سنا، نہ سمجھا، کیونکہ حق کے بعد بجز گمراہی کے اور کچھ نہیں ہے، اور گمراہی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے سننے کا ارادہ کیا جائے، فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (سورۃ یونس:۳۲) پس حق کے ماسوا، گمراہی کے علاوہ اور کیا ہے؟ پس تم کدھر متوجہ کئے جارہے ہو؟

جدھر بھی متوجہ کئے جاؤ گے، تمام گمراہی ہوگی۔

(۴) کھانا پینا جسم کی ایک ضرورت ہے، اور ضرورت کی چیز استعمال میں لانی اتنی ہی روا ہے جتنی سے ضرورت پوری ہوجائے، پس کھانا پینا بھی اتنا ہی روا ہے جس سے جسم کی اور زندگی کی ضرورت پوری ہوجائے، انسان اگر اپنے کھانے اور پینے پر غور کرے، تو اسے صاف محسوس ہوگا کہ زیادہ تر اس کا کھانا پینا، اس کی ضرورت سے زائد، محض خواہش نفس، تحصیل لذت اور خود پسندی ہے، اپنی اپنی پسند کے پیچھے دوڑتے رہنا ہے، انسان کے لئے اتنا کھانا پینا کافی ہے، جو اس کی کمر سیدھی رکھ سکے اور اسے طاعت وعبادت الٰہی کی طاقت حاصل رہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ ضرورت سوکھی روٹی اور تھوڑے سے پانی سے پوری ہوجاتی ہے، تو سالک اپنے کو اسی قدر کا پابند بنائے رکھے۔ انسانوں کے تمام طبقات میں جس طبقے نے کھانے اور پینے کو سب سے کم استعمال کیا ہے، وہ وہی طبقہ ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے برگزیدہ اور معصوم طبقہ ہے، یعنی انبیاء کرام علیہم السلام، ان کے روزانہ کے کھانے پینے کو اگر کوئی تلاش کرے، تو چند

لقموں سے زیادہ نہ پائے گا، اور تلاش کرنے والوں کو یہ بھی ملے گا اور بہت ملے گا، کہ متعدد روز گزر جاتے اور ان کے شکم چند لقموں سے بھی آشنا نہ ہوتے تھے، ایسا نہ تھا کہ یہ لوگ غربت کی مجبوری میں تھے، انھوں نے منشاء الٰہی کو پایا اور اپنا یہ شعار اختیار کیا۔

کھاتے رہنا اور طرح طرح کی لذتوں میں ڈوبے رہنا کن کا حال ہے؟ اس کی خبر کتاب الٰہی دیتی ہے: وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاکُلُوْنَ کَمَا تَاکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ (سورۃ محمد:) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہی لذتوں میں پڑے رہتے ہیں، اور اس طرح کھاتے پیتے ہیں جیسے چوپائے کھانے میں لگے رہتے ہیں، اور جہنم ہی ان کا ٹھکانا ہے۔

سالک کا حال وہ نہیں ہونا چاہئے جو کفار کا حال ہے۔

(۵) کھانے پینے کی مقدار بس اتنی ہی رکھے کہ دن میں صرف ایک بار قضائے حاجت کی ضرورت پڑے، اور اگر قلت طعام کی وجہ سے ایک دن سے زائد کا وقفہ ہو تو بہتر ہے، اور اگر بے وقت ضرورت پڑ جائے تو حتی الامکان اسے ٹالے، خواہ اس کی وجہ سے تشویس ہی کیوں نہ پیدا ہو، تا کہ ایک ہی وقت کا عادی ہو جائے۔ یہ بھی ایک ضرورت ہے، ضرورت کی حد سے اس کو بھی متجاوز نہ ہونا چاہئے۔

(٦) پوشاک میں بھی اس کا اہتمام رکھنا چاہئے، کہ بس موٹے جھوٹے کپڑے کے ایک جوڑے سے زیادہ نہ ہو، اتنا انسانی بدن کے لئے حاجت کے لحاظ سے بھی اور شرعی ضرورت کے لحاظ سے بھی کافی ہے، ہاں سردیوں میں ایک اور معمولی لبادہ بدن پر ڈال لے تو حرج نہیں، لباس میں بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت یہی ہے کہ بدن پر کم سے کم کپڑا استعمال کیا ہے، عام طور سے ایک لنگی اور ایک چادر کی خبر ملتی ہے، اور سر پر صافہ ہوتا تھا، اس سے زیادہ کو تعیش اور تنعم میں شمار کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تھا، تو انھیں نصیحت فرمائی تھی کہ:

إیاک والتنعم فان عباد اللہ لیسوا بالمتنعمین (رواہ احمد کذا فی المشکوٰۃ)

خبردار! تعیش اور تنعم سے بچو، اللہ کے نیک بندے ناز و نعم والے نہیں ہوتے۔

(۷) تمہارے پاس بہت سے لوگ دن میں بھی اور رات میں بھی آئیں گے، اور بہت سے الٹے سیدھے کام بھی ان سے صادر ہوں گے، ان کے آنے سے، اور ان کی حرکات سے دل تنگ نہ ہونا، نہ ان پر اعتراض کرنا، تمہارا حوصلہ بلند ہونا چاہئے، تمہارے اخلاق بہت وسیع ہونے چاہئیں۔ وہ سب لوگ اگر تمہارے سر پر آگ بھی برسائیں، تب بھی تمہارے دل کو جنبش نہ ہونی چاہئے، نہ تمہارے اخلاق میں فرق پڑنا چاہئے۔ مخلوق اور مخلوق کے تصرفات تمہاری نگاہ سے ساقط ہونے چاہئیں، تمہارے دل کا ربط اور تعلق محض حق تعالیٰ شانہ سے ہو، ہر تصرف کا منشا اور مصدر وہی ہیں، اللہ سے محبت وتعلق کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ہر تصرف اور ہر فیصلے میں تمہارا دل لذت یاب ہو اور راحت پائے، پس نہ مخلوق کچھ ہے اور اس کا عمل کچھ ہے، جو کچھ ہے اللہ کی جانب سے ہے، بس جو بھی حال ہو تمہارے دل کو ناگواری اور تغیر نہ ہونا چاہئے، تاکہ تمہیں مقام وحدت یعنی محض اور بلا شرکت غیرے اللہ کے تعلق کا ذوق حاصل ہو۔

واضح ہو کہ اس حال کی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تربیت کے فریضہ میں کوتاہی نہ ہوگی، کیونکہ اس کا بجالانا امر الٰہی کے ماتحت ہوگا، اس کے لئے ناگواری اور طبیعت کا تغیر ضروری نہیں ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تربیت میں اگر غصۂ نفس اور ناگواری طبع شامل ہے تو اس میں اخلاص کہاں رہا؟

(۸) سالک کے لئے سب سے بڑی مصیبت، جو اس کے لئے سخت مہلک ہوتی ہے، خود نمائی اور ریاکاری کا جذبہ ہوتا ہے، آدمی قصد کرتا ہے کہ اپنا اچھا عمل اور اچھا حال لوگوں کو دکھائے، تاکہ ان پر اچھا تاثر قائم ہو، وہ اس کے معتقد ہوں، اس کے اثر کے دباؤ میں رہیں، عبادت کا موضوع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کی غرض وغایت اللہ کو راضی کرنا ہے، اگر آدمی نے اپنے اچھے حال، اچھے عمل اور عبادت کو مخلوق پر اثر ڈالنے کے لئے استعمال کرے، تو یہ ایک طرح کا شرک ہوگا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ أَحَداً (سورۃ الکہف: ۱۱۰) جو کوئی اس کا یقین رکھتا ہے کہ اسے حق تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے، اسے چاہئے کہ عمل صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

سالک کے احوال میں ایک بہترین حال اللہ تعالیٰ کی محبت کے غلبہ کا حال ہوتا ہے، دل پر جب اللہ تعالیٰ کی محبت غلبہ کرتی ہے تو بے تحاشا آنکھیں برسنے لگتی ہیں، بدن حرکت میں آجاتا ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اَلَّذِیْنَ إِذَا ذُکِرَا اللهُ وَجَلَتْ قُلُوْبُھُمْ (سورۃ الانفال:) اہل ایمان کے سامنے جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے، تو ان کے دل خشیت سے ہل جاتے ہیں، اور ارشاد ہے: وَإِذَا سَمِعُوْا مَااُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰیٓ اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (سورۃ المائدۃ: ۸۳) جو کتاب رسول کے پاس اتاری گئی ہے، جب اسے وہ سنتے ہیں تو حق کی معرفت ومحبت میں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ پڑتی ہیں۔

سالک کا یہ حال بہت عمدہ ہے، مگر کم ظرف لوگ اسے دوسروں پر اثر ڈالنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، آدمی جب محبت الٰہی کے موضوع پر خوش آوازی کے ساتھ اشعار سنتا ہے تو دل بے اختیار ابلتا ہے، بالخصوص وہ لوگ جو اللہ کی محبت میں مرتے کھپتے ہیں، انھیں تو قابو نہیں رہتا، ان پر بے تکلف وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جسے ''وجد'' کہتے ہیں، مگر بے نصیب لوگ اس سے متاثر نہیں ہوتے تو تکلف کرتے ہیں اور محبت کی کیفیات سے اپنا لبریز ہونا ظاہر کرتے ہیں۔

شیخ نے منع فرمایا کہ جب تک قابو چلے ہرگز آنکھ کے آنسو اور بدن کی حرکت ظاہر مت کرنا، یہ تمہارے لئے ایک فتنہ ہوگا، اخفائے حال کی کوشش بہت اہم ہے، ہاں بالکل مجبوری اور بے اختیاری ہو تو البتہ معذوری ہے۔

حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری علیہ الرحمہ کی پوری زندگی، جو کہ خاصی طویل ہے، ان کے ملفوظات وارشادات اور ان کے مکاتیب ومضامین، سب شاہد ہیں کہ انھوں نے پیر ومرشد کی ان نصیحتوں کو استقامت کے ساتھ اپنے عمل میں رکھا، اور اپنے مریدین ومتوسلین کو ان کا پابند بنائے رکھا۔

سالکین ان کا حرف حرف پڑھیں، راستہ آج بھی وہی ہے جو کل تھا۔

وفی ذالک فلیتنافس المنافسون

☆☆☆☆☆☆

قصۂ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام
معارف وحقائق

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک سفر کی سرگزشت ذکر کی ہے، اس سرگزشت کا آغاز حدیث میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے (پیغمبر تھے، پیغمبرانہ حقائق ومعارف کا ظہور ہو رہا ہے) کسی نے ان سے دریافت کیا کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے؟ فرمایا کہ میں، اس پر حق تعالیٰ نے مواخذہ فرمایا کہ اس کا علم اللہ کے حوالے کیوں نہیں کیا؟ اللہ نے وحی بھیجی کہ میرا ایک بندہ مجمع البحرین کے پاس ہے، وہ تم سے بڑا عالم ہے، عرض کیا: میرے وہاں تک پہونچنے کی کیا صورت ہوگی؟ حکم ہوا کہ ایک مچھلی لے کر اسے ٹوکری میں رکھ لو، اور دیکھتے رہو، جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہیں وہ بندہ ملے گا، انھوں نے ایک مچھلی لے لی اور اسے تل کر ٹوکری میں رکھ لیا، انھوں نے اپنے ساتھ اپنے ایک شاگرد حضرت یوشع کو بھی لے لیا، اور فرمایا کہ مجمع البحرین تک چلنا ہے، خواہ کتنی ہی مدت لگے، یہ لوگ اس کی تلاش میں نکل پڑے، یہاں تک کہ مجمع البحرین کے علاقے میں پہونچے، وہاں انھوں نے ایک چٹان کے پاس دم بھر قیام کیا، اور موسیٰ علیہ السلام سو گئے، حضرت یوشع بھی سوئے، مگر وہ پہلے اٹھ گئے، انھوں نے ایک حیرتناک منظر دیکھا کہ مچھلی زندہ ہوگئی، بعض روایات میں ہے کہ وہاں ایک چشمہ تھا، حضرت یوشع اس سے وضو کرنے لگے، پانی کا چھینٹا اڑ کر مچھلی پر پڑا اور وہ زندہ ہوگئی، اور زندہ ہوتے ہی تڑپ کر اچھلی تو پانی میں جا پہونچی، اور پانی میں جیسے ہی وہ گئی اس کے گھسنے کی جگہ

پانی منجمد ہوتا چلا گیا اور سرنگ جیسا سوراخ بنتا گیا، انھیں بڑی حیرت ہوئی، سوچا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھیں گے تو ان سے ذکر کروں گا، مگر جب بیدار ہوئے تو وہاں سے کوچ کرنے کے اہتمام میں انھیں مچھلی کا یہ عجیب حال یاد نہ رہا۔ پھر یہ دونوں حضرات دن بھر، رات بھر چلتے رہے، دوسرے دن صبح کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تو تھکان ہوگئی، لاؤ کچھ کھا پی لیا جائے، اب انھیں یاد آیا کہ مچھلی تو غائب ہے، کہنے لگے حضرت! دیکھئے اس جگہ جہاں ہم نے چٹان کے پاس قیام کیا تھا، وہاں میں مچھلی کا تذکرہ بھول گیا، اور یہ شیطان کی حرکت تھی کہ مجھے بالکل بھلا دیا، مچھلی تو ایک عجیب وغریب راستہ بنا کر پانی میں غائب ہوگئی تھی۔ فرمایا اوہو! اسی جگہ تو ہمیں پہونچنا تھا، اچھا واپس چلو، وہ دیکھتے بھالتے وہیں پہونچ گئے، وہاں دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب چادر لپیٹے ہوئے موجود ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں سلام کیا، انھوں نے پوچھا اس جگہ سلام کرنے والا کون ہے؟ فرمایا کہ میں موسیٰ ہوں، کیا بنی اسرائیل کے موسیٰ؟ فرمایا ہاں، ان صاحب کا تعارف حق تعالیٰ نے اس طرح کرایا ہے کہ وہ ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ہے، ہم نے اسے اپنے پاس سے خصوصی رحمت عطا فرمائی تھی، یعنی نبوت، اور بہت سے لوگوں نے ولایت قرار دیا ہے، اور ہم نے اسے کچھ خاص قسم کا علم بھی عطا فرمایا تھا، حدیث میں اس خصوصی بندے کا نام خضر بتایا گیا ہے، انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تشریف آوری کی وجہ پوچھی، انھوں نے بتایا کہ مجھے اللہ نے بھیجا ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی صحبت میں رہ کر ان خصوصی علوم کو سیکھوں جو آپ کو حق تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوئے ہیں، حضرت خضر نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے جو علم مجھے عطا فرمایا ہے وہ آپ کے علوم سے علیٰحدہ ہے، آپ کا علم آپ کے منصب کے لحاظ سے ہے، اس لئے میں جب اپنے علم کے مطابق کچھ کروں گا تو آپ اسے برداشت نہ کرسکیں گے، اور یہ بات تو واقعی ہے کہ جس حقیقت کا علم اور اس کی اطلاع آپ کو نہ ہو، اسے کیونکر گوارا کرسکیں گے، اور آپ کے علم کی شان کچھ اور ہے، وہاں تک میری رسائی نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ، ان شاء اللہ میں برداشت کرلوں گا، اور آپ کے کسی امر کی نافرمانی نہ کروں گا۔ ان شاء اللہ اس لئے کہا کہ عارفین کو اپنے اوپر ایک لمحے کے لئے اعتماد نہیں ہوتا، وہ خدا کی مشیت کے سامنے اپنے ارادہ واختیار کو فنا سمجھتے ہیں، حضرت خضر نے فرمایا، اچھا

اگر ساتھ ہی رہنا ہے تو آپ مجھ سے کسی چیز کے بارے میں کچھ نہ پوچھئے گا، میں خود ہی بتادوں گا، اس شرط وقرار کے بعد دونوں دریا کے کنارے چل پڑے، ایک جگہ کشتی چل رہی تھی، یہ دونوں حضرات بھی اس پر سوار ہوگئے، کشتی والوں نے ان کی بزرگانہ شان کو محسوس کیا اور اپنی عزت وسعادت سمجھ کر بغیر کسی کرایہ کے بیٹھالیا، کشتی جب گہرائی میں پہونچی تو حضرت خضر نے تصرف کیا اور کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ کر اس میں دراڑ پیدا کردی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے دیکھ لیا، ان کو منصب نبوت کی وجہ سے جلال آیا، اور ٹوکا کہ کیا آپ نے اس کو اس لئے پھاڑا ہے کہ لوگ ڈوب جائیں، یہ تو بہت بری حرکت ہے، حضرت خضر نے جواب دیا کہ میں نے تو کہا ہی تھا کہ آپ برداشت نہ کرسکیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی، کہ مجھ سے بھول ہوگئی، اس پر مواخذہ نہ فرمائیے، اور سختی نہ کیجئے۔ روایت میں ہے کہ کشتی میں دراڑ تو ضرور پڑی مگر پانی اندر نہیں آیا۔

کشتی سے اتر کر دونوں بزرگ ایک طرف چلے، ایک جگہ چند بچے کھیل رہے تھے، ان میں ایک بچہ بڑا صاحب جمال تھا، حضرت خضر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس نے دم توڑ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پھر جلال آیا، فرمانے لگے، بلاوجہ ایک بے گناہ بچے کو مار ڈالا، کیا اس نے کسی کو قتل کیا تھا؟ یہ تو بہت ہی غلط کام آپ نے کیا۔ حضرت خضر نے مزید پختہ لہجے میں فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے پہلے ہی نہیں کہا کہ آپ کو میرے ساتھ صبر نہ ہوگا؟ موسیٰ علیہ السلام نے پھر معذرت کی، اچھا اب درگزر کیجئے، لیکن اگر اس کے بعد میں نے آپ سے کچھ پوچھا تو میرا کوئی عذر نہ ہوگا، آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے گا۔

اس واقعہ کے بعد وہ لوگ ایک شہر میں پہونچے، انھوں نے شہر والوں سے کہا کہ ہم مہمان ہیں، ہمارے لئے کچھ انتظام کرو۔ اس شہر والوں نے ضیافت سے انکار کردیا، یہ وہاں سے نکل رہے تھے، تو ایک دیوار پر نظر پڑی جو ایک طرف جھک گئی تھی اور گرنا ہی چاہتی تھی، حضرت خضر نے اس پر ہاتھ لگایا تو سیدھی ہوگئی، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اتنا بڑا کام ہوگیا، اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لے لیتے۔

حضرت خضر نے فرمایا، بس اب جدائی کا وقت آگیا، اب میں وہ ساری باتیں بتائے

دیتا ہوں، جن پر آپ صبر نہیں کر سکے۔ سنئے! وہ کشتی جسے میں نے عیب دار بنایا، وہ کچھ غریب مزدوروں کی تھی، وہ اس سے دریا میں کچھ محنت مزدوری کر کے معاش حاصل کرتے تھے، ان کے پیچھے ایک ظالم بادشاہ ہے، وہ ہر اچھی کشتی کو زبردستی چھین لیتا ہے، اس لئے میں نے چاہا کہ اس میں نمایاں عیب پیدا کر دوں، جس سے یہ اس کے دستبرد سے بچ جائے۔

اور ہاں لڑکے کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے ماں باپ مومن ہیں، اور اس میں کفر وطغیان کا مادہ غالب ہے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ بڑا ہو کر ماں باپ کو بہت پریشان کرے گا، ہم نے چاہا کہ حق تعالیٰ اس کے بدلے ایک نیک اور فرمانبردار ورحمدل اولاد عنایت فرمائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لڑکا تو مر گیا، اس کے بعد ان کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی، اس کا نکاح ایک نبی سے ہوا، اور اس کی اولاد بھی نبی ہوئی، اور بہت سے لوگوں کو ان سے ہدایت ملی۔

اور رہی دیوار! تو وہ شہر میں دو یتیم بچوں کی تھی، اور اس کے نیچے دونوں یتیم بچوں کا خزانہ تھا، اور ان کا باپ نیک صالح تھا، اس کی نیکی کی برکت تھی کہ رب تعالیٰ نے چاہا کہ یہ دونوں سمجھدار ہو کر اپنا خزانہ نکال لیں، اگر دیوار گر جاتی تو شہر کے لوگوں کی جیسی طبیعت ہے، سب لوٹ لیتے، یہ جو کچھ ہوا میرے اختیار وارادہ سے نہیں ہوا ہے، بلکہ حق تعالیٰ کے امر سے ہوا۔

☆☆☆☆☆

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی سرگزشت جو قرآن کریم میں ہے، اور جس کی قدرے تفصیل صحیح حدیث میں ہے آپ نے پڑھ لی، یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، اس کا جواب انھیں آیات میں ہمیں تلاش کرنا ہے، ممکن ہے ان سے کچھ ایسے حقائق سامنے آئیں، جن سے حضرات صوفیہ کے بعض مکاشفات ونظریات کی تائید ہو سکے۔

سوال یہ ہے کہ شریعت کے احکام ہر مکلّف پر لازم ہیں، پھر کسی بشر کے لئے خواہ وہ کسی بھی علم کا حامل ہو شریعت کی خلاف ورزی کب جائز ہے؟ کشتی دوسروں کی! لڑکا بے گناہ! پھر حضرت خضر کے لئے کیونکر جائز ہوا کہ حکم شریعت کے خلاف کشتی میں سوراخ کر دیں، یا بچے کو قتل کر دیں؟ کیا کسی آئندہ مصلحت کے لئے وقت سے پہلے کوئی ایسا کام کرنا جائز ہے جو غیر شرعی ہو؟ اور کیا کسی کو علم ہو جائے کہ فلاں آدمی آگے چل کر ڈاکو، باغی اور کافر ہو جائے گا تو اس کے لئے

درست ہے کہ موقع پا کر اسے قتل کردے؟ اگر ایسا جائز ہوتا، تو ہمارے پیغمبر علیہ السلام کو بعض لوگوں کے بارے میں متعین طریقے سے معلوم تھا کہ یہ کافر ہی مریں گے، اور وہ حربی بھی تھے، مگر انھیں نہ قتل کیا نہ کرایا، ہاں جنگ میں جب وہ برسر پیکار ہوئے تو مارے گئے۔ پھر حضرت خضر علیہ السلام نے خواہ کچھ بھی حقیقت بیان کی ہو، کیا ظاہر شریعت کے خلاف کرنا، ان کے لئے جائز تھا؟

اس سوال کا اجمالی جواب یہ ہے کہ جب قرآن کریم نے ان سارے تذکروں کو بطور مدح کے بغیر انکار کے ذکر کیا ہے، تو ضرور جائز ہیں۔ جن کا فرمان جواز وعدم جواز کا معیار ہے، وہی اگر اس کی مدح کریں تو کون سی شریعت اسے ناجائز کہہ سکتی ہے، لیکن اس جواب پر ایک اور سوال پیدا ہوگا کہ یہ بات حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے، یا کسی اور کے حق میں بھی اس کی گنجائش نکل سکتی ہے؟۔

اس کے جواب کے لئے حضرت خضر کی شخصیت کو سمجھنا ہوگا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام بشر تھے، ایک ضعیف قول یہ ہے کہ وہ فرشتہ تھے، اور مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں اسی کو ترجیح دی ہے، لیکن اگر وہ فرشتہ ہوتے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی اعتراض وانکار کی گنجائش نہ ملتی، اس لئے صحیح یہی ہے کہ وہ بشر تھے، مگر انھیں جو رحمت خصوصی ملی تھی اور جو علم لدنی ملا تھا، جس کا قرآن میں مجمل ساذکر ہے، اور حدیث میں صراحت ہے: **یا موسیٰ انی علیٰ علم من علم الله علمنیه لاتعلمه أنت وأنت علیٰ علم من علم الله علمکه الله لا اعلمه** (بخاری شریف) اے موسیٰ! مجھے اللہ کے علوم میں سے ایک علم حاصل ہے جو اللہ نے مجھے دیا ہے، آپ اسے نہیں جانتے، اور آپ کو اللہ کے علوم میں سے ایک علم حاصل ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے، اسے میں نہیں جانتا۔

یہ خصوصی علم ورحمت کیا چیز ہے؟ حضرت موسیٰ صاحب شریعت تھے، انھیں اللہ کی پسند وناپسند اور احکام کا پورا علم تھا، یہ تو بالکل ظاہر ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر کو اس علم سے سرفراز نہیں فرمایا گیا تھا، لیکن حضرت خضر کو کون سا علم دیا گیا تھا، اس کی تفصیل قرآن وحدیث میں واضح طور پر نہیں بیان کی گئی ہے، ہاں مذکورہ تینوں واقعات کے ضمن میں اس کا سراغ ملتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ احوال ووقائع وجود میں آتے ہیں، ان میں ایک حصہ وہ ہے جو انسان کے دائرۂ اختیار وارادہ میں ہے، یہ بنی آدم کے اعمال اختیار یہ ہیں، خواہ ان کا تعلق انسانی ذہن ودماغ سے ہو یا اس کے اعضائے جسمانی سے ہو، انبیاء علیہم السلام کا موضوع انسان کے یہی اعمال اختیار یہ ہیں، حق تعالیٰ کے اوامر واحکام اور نواہی ومناہی کے مورد یہی ہیں۔ ان کے نتائج، ان کی تفصیلات کا علم، حق تعالیٰ کی خوشنودی وناراضگی کی معرفت، اللہ کی رحمت وغضب کا عرفان، اسماء الٰہیہ وصفات خداوندی سے بندوں کے ربط وتعلق کے حقائق، یہ وہ چیزیں ہیں جن کی تفصیلات کا علم حضرات انبیاء کو دیا جاتا ہے، اور انسان جب تک دنیا میں بعقل وہوش وحواس موجود ہے، ان احکام کا مکلّف ہے۔ اوامر کی اطاعت، نواہی سے اجتناب، اس کی ذمہ داری ہے، انھیں اصطلاح میں ’’علم شریعت‘‘ یا ’’تشریعیات‘‘ کہا جاتا ہے۔ دنیا وآخرت کی فلاح کا مدار اسی پر ہے، حق تعالیٰ کے قرب ورضا کا حصول اسی پر موقوف ہے، کفر وشرک اور معصیت وبغاوت کا طوفان اسی کی خلاف ورزی سے اٹھتا ہے، جنت کا وعدہ اور جہنم کی وعید اسی علم شریعت سے وابستہ ہے۔

اور دنیا کے احوال ووقائع کا ایک اور بہت بڑا حصہ وہ ہے جو انسان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، مثلاً خود انسان کا پیدا ہونا، اس کا مرنا، بیمار ہونا، گورا ہونا، کالا ہونا، عقلمند ہونا، بیوقوف ہونا، اور انسان کے باہر، مثلاً بارش ہونا، طوفان آنا، موسم کا بدلتے رہنا، رات ودن کا یکے بعد دیگرے آنا، اور اسی قیاس پر دنیا کے بے شمار احوال ذہن میں حاضر کر لیجئے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کے کرنے نہ کرنے اور جن کے وجود وعدم کا مخاطب انسان نہیں ہے، نہ ان امور پر حق تعالیٰ کے قرب ورضا کا مدار ہے، ایسا نہیں ہے کہ جو فلاں زمانے میں پیدا ہوگا، وہ قرب ورضا سے سرفراز ہوگا اور جو فلاں وقت میں وجود میں آئے گا وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔ حضرات انبیاء کو جو علم عطا کیا گیا ہے، یہ امور اس کے موضوع سے خارج ہیں، یہ انتظام عالم کی قبیل سے ہے، اس میں حق تعالیٰ کی مشیت کی کارفرمائی ہے، اس انتظام پر حق تعالیٰ نے ایک غیبی مخلوق فرشتوں کو مامور فرمایا ہے، ان امور سے حرمت وحلت کا کوئی تعلق نہیں، اس انتظام کو ’’تکوین‘‘ کہا جاتا ہے، اس انتظام کو عالم غیب سے کنٹرول کیا جاتا ہے، دیکھئے بارش کے لئے فرشتے مامور ہیں، ہواؤں پر

فرشتوں کو متعین کیا گیا ہے، جانداروں کی موت کے لئے فرشتوں کی جماعت کام کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ألاله الخلق و الامر** ، اللہ ہی کے لئے خلق بھی ہے اور امر بھی ہے۔ خلق کا تعلق تکوین سے ہے اور امر کا تعلق تشریع سے ہے، نیکی و بدی اور ثواب و عقاب کا تعلق تشریع سے ہے، حیات و موت اور صحت و مرض کا تعلق تکوین سے ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے تینوں کاموں میں غور کیجئے، ان تینوں کا تعلق تکوین سے ہے تشریع سے ہوتا تو بجائے کشتی میں سوراخ کرنے کے وہ کشتی والوں کو منع کرتے کہ فلاں جگہ کشتی کو مت لے جانا، کہیں وہ ظالم بادشاہ چھین نہ لے، یا اس بادشاہ کو فہمائش کرتے کہ یہ غلط حرکت نہ کرو اس کے بجائے انھوں نے کشتی میں عیب پیدا کر دیا جو بظاہر تشریع کے اعتبار سے غلط ہے، مگر تکوین کے لحاظ سے عین مصلحت کے مطابق ہے۔

اسی طرح بچے کے قتل کا تعلق بھی تکوین سے تھا، اگر تشریع کے طور پر عمل کرنا ہوتا تو بچے کو نصیحت کرتے، اس کے والدین کو اس کے نیک بنانے کی تدبیریں بتاتے، اس کا قتل تشریع کی نظر میں غلط تھا، مگر تکوین میں یہ ناگزیر عمل تھا۔

یہی حال دیوار کا بھی تھا کہ وہ گرتی تو خزانہ کھل جاتا، تو بجائے اس کے کہ شہر والوں کو نیکی کی تلقین کرتے دیوار ہی سیدھی کر دی، یہ سارے معاملات تکوین کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اوپر بتایا جا چکا ہے کہ امورِ تکوینیہ میں تصرف کرنا احکام شرع سے برکنار ہے، اس کا تعلق ثواب و عذاب اور خطا و صواب سے نہیں، وہ سب مصالح تکوین کے عین موافق ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیوں کیا؟ جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگاہ تشریع پر تھی، اور انھیں اس علم کا امام بنایا گیا تھا، وہ اس علم کے تقاضوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے، پس انھیں خلاف تشریع کاموں کو ایک بشر کے ارادہ و عمل سے دیکھ کر غیرت آئی۔ (مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ انھیں اور ان کے کاموں کو دیکھ رہے تھے، جو صاف صاف خلافِ شرع تھے، اس لئے ٹوکنا ان کا فرض تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ اور اس سے ملتا جلتا ہے، وہ یہ کہ ملک الموت ان کے پاس پیغام وصال لے کر بصورت بشر تشریف لائے تھے، انھوں نے اسی بشری صورت میں ان سے قبض روح کی اجازت مانگی، تو موسیٰ علیہ السلام نے انھیں تھپڑ رسید

کر دیا تھا، کیونکہ انھیں اس تکوینی حقیقت پر مطلع نہیں کیا گیا تھا) اور یہی وہ بات تھی جو حضرت خضر نے پہلے ہی بتادی تھی۔

اخیر میں حضرت خضر علیہ السلام نے یہ جو فرمایا کہ **ومافعلته عن امری**، یہ سب میں نے اپنے امر سے نہیں کیا ہے، بلکہ یہ سب امر ربی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر تکوینیات پر مامور تھے، اور اس باب میں وہ فرشتوں کے مثل تھے، جیسے فرشتے پروردگار کے حکم سے کسی کو زندگی دیتے ہیں، کسی کو موت دیتے ہیں، وہ فرشتے ہی تھے جنھوں نے قوم لوط کی بستیاں الٹ دی تھیں، وہ فرشتے ہی تھے جنھوں نے قوم ثمود پر چنگھاڑ ماری تھی، وہ فرشتے ہی ہیں جو روزانہ بے شمار آدمیوں کی روح نکال کر مردہ بنادیتے ہیں، وہ فرشتہ ہی تھا جس نے حضرت مریم عذرا کے گریبان میں پھونک ماری تھی، اور انھیں جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بننے کا شرف حاصل ہوگیا۔

حق تعالیٰ نے بشر کی تخلیق مختلف استعدادوں پر کی ہے، بعض میں جسمانیت اور اس کے تقاضے غالب ہوتے ہیں اور ان کی روحانیت ضعیف اور کالعدم ہوتی ہے، ایسے لوگوں کو ملکوت سے اور عالم غیب سے کوئی مناسبت نہیں، کیونکہ جسم عناصر سے مرکب ہے، اور بعض میں روحانیت اور اس کے آثار وثمرات طاقتور اور غالب ہوتے ہیں، ان کا جسم بھی بحکم روح ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا جسم جسمانی تقاضوں سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا عام آدمی کا جسم متاثر ہوتا، انبیاء اور اولیاء وصالحین کے بے شمار احوال وواقعات اس پر شاہد ہیں، ان لوگوں کو ملکوت سے بہت مناسبت ہوتی ہے، حق تعالیٰ انھیں میں سے کچھ لوگوں کو منتخب کر کے تکوینیات پر مامور فرمادیتے ہیں، یہ چونکہ بشر ہوتے ہیں اور بشری ضروریات کو سمجھتے اور ان سے مناسبت رکھتے ہیں، اس لئے یہ غیبی طور پر انسانوں کے خوب کام آتے ہیں۔ حضرت خضر کا ذکر اور ان کے احوال واوصاف کا ذکر ایک نمونہ ہے، جس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ تکوینی مصلحتوں کے لئے انسانوں کو بھی عامل وکارندہ بناتے ہیں، لیکن اس قسم کے حضرات اپنے اوصاف وافعال کے ساتھ عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے جیسے فرشتے مخفی ہوتے ہیں، چونکہ یہ ان سے بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں، اور انھیں کے مثل تکوینی امور پر مقرر ہوتے ہیں، اس لئے عام حالات میں ان کو اور ان کے کاموں کو

بھی پوشیدہ رکھاجاتا ہے ، ہاں جولوگ اصحاب کشف ہوتے ہیں وہ کبھی کبھی باذن اللہ مطلع ہوجاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر ہیں، ان سے زیادہ صاحب کشف کون ہوسکتا ہے، مگر وہ خضر کونہیں جانتے تھے، ان کی جگہ بتادی گئی، وہاں پہونچے اور گزر بھی گئے، مگر نہیں پاسکے، کیونکہ ابھی اذن الٰہی نہ تھا۔ واپس لوٹ کے آئے تو دیکھا بھی اور ملے بھی! اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ جولوگ تکوینیات پر مامور ہوتے ہیں وہ نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، حق تعالیٰ ہی کسی پر ظاہر فرمادیں تو وہ دیکھ سکتا ہے۔ یہیں سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضرت خضر علیہ السلام سے جوتینوں کام صادر ہوئے تھے وہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مکشوف ہوئے تھے، باقی اورلوگوں پر نہ وہ منکشف تھے اور نہ ان کا کام تھا! عام لوگوں نے تو بس یہ دیکھا کہ کشتی میں سوراخ ہوگیا، اور بچہ زمین پر گرا اور اچانک مرگیا، دیوار جھکی تھی مگر خود بخود سیدھی ہوگئی، اللہ کے دکھانے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا، اور باقی لوگوں نے نہیں دیکھا، غالبًا یہی وجہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا ساتھ ملنے کے بعدان کے شاگرد کا بھی ذکر کہیں نہیں ہوا، کیونکہ وہ حضرت خضر سے بیگانہ تھے، وہ انھیں یا ان کے کام کونہیں دیکھ رہے تھے۔

چنانچہ امام ابوحاتم رازی نے اپنی تفسیر میں حضرت ابوالعالیہ اور حضرت شعیب بن حجاب کاارشادنقل کیاہے کہ: **كان الخضر عبداً لاتراه الاعين إلامن ارادالله أن يريه ، فلم يره القوم إلا موسىٰ ولوراٰه القوم لحالوا بينه وبين خرق السفينة وبين قتل الغلام** (ج:۶،ص:۱۵۸) حضرت خضر ایسے بندے تھے جنھیں عام نگاہیں نہیں دیکھ سکتی تھیں، ہاں کسی کو اللہ تعالیٰ ہی دکھانا چاہیں تو ہوسکتا ہے، اس لئے بجز حضرت موسیٰ کے انھیں کسی نے نہیں دیکھا، اگرلوگ دیکھ لیتے، تو نہ انھیں کشتی میں سوراخ کرنے دیتے، اور نہ لڑکے کو قتل کرنے دیتے۔

ہماری اس تشریح سے یہ بات بھی معلوم ہورہی ہے کہ ان کا نبی ہونا کچھ ضروری نہیں ہے، ممکن ہے کہ نبی نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء انھیں نبی نہیں قرار دیتے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اب تک حیات ہوں، کیونکہ زمرۂ ملکوت میں شامل ہیں۔ دیکھئے صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک بڑی ملکوتی شان کے پیغمبر ہیں کہ وہ صرف ماں کی طرف سے انسانوں میں شامل ہیں تو وہ آج تک زندہ ہیں، اور اگر ان خضر کا جن کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی

انتقال ہو چکا ہو، تو یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے حضرات تکوین کے اس منصب پر فائز ہوں، اور اس منصب کی وجہ سے وہ بھی خضر کہلاتے ہوں۔ اس طرح کے لوگ اربابِ کشف کی اصطلاح میں صاحب خدمت کہلاتے ہیں، ان کے مختلف درجات ہوتے ہیں، اصحاب کشف نے ان درجات کے نام بھی بتائے ہیں۔

مشائخ صوفیہ جو ارباب کشف ہیں، ان کے یہاں ''صاحب خدمت'' ایک بدیہی حقیقت ہے، لیکن چونکہ عام مشاہدہ سے اس کا تعلق نہیں، اور تشریعیات میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے نصوص شرعیہ ان کے تذکرے سے خاموش ہیں، بس ایک جگہ کچھ اشارۃً کچھ صراحۃً بتادیا گیا ہے، اس لئے یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہو، بس جتنا قرآن میں ذکر ہے اس پر ایمان لانا ضروری ہے، باقی اس کی جو توجیہات وتاویلات ذکر کی گئی ہیں، ان پر اعتقاد واجب نہیں ہے، اور نہ انکار سے کوئی کفر وفسق لازم آئے گا، پس اس کو اسی حد پر رکھنا چاہئے۔

☆☆☆☆☆☆

امیر المومنین وسید المجاہدین حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کا ارادۂ حج

امیر المومنین وسید المجاہدین حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے سفر حج کا تذکرہ عجیب و غریب روشن حالات سے معمور ہے، یہ تذکرہ ہم حضرت سید صاحب کے حالات و واقعات پر مشتمل کتاب ''وقائع سید احمد شہید'' سے اخذ کر کے مرتب کر رہے ہیں، یہ کتاب اسی جماعت کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ہے جس کو سید صاحب کے مسترشد خاص نواب وزیر الدولہ مرحوم (والی ریاست ٹونک) نے سید صاحب کی وقائع نگاری اور تاریخ نویسی کے لئے مقرر کیا تھا، اس میں سید صاحب کے بعض اعزہ آپ کے رفقاء سفر و جہاد اور آپ کے خدام تھے، ہر ایک اپنی معلومات اور چشم دید واقعات بیان کرتا اور کاتب اسے لکھ لیتا، یہ مجموعہ حضرت سید صاحب اور ان کی دعوت وتحریک سے متعلق مراجع میں سب سے وسیع ذخیرہ ہے۔ (اعجاز احمد اعظمی)

ایک دن حضرت سید صاحب اپنے وطن تکیہ رائے بریلی کی مسجد کی چھت پر اکیلے بعد نماز اشراق تشریف فرما تھے، زینہ پر عبدالرحیم صاحب کاندھلہ والے تھے، آپ نے پکارا، یہاں کوئی ہے؟ عبدالرحیم صاحب حاضر خدمت ہوئے، فرمایا نیچے جو لوگ موجود ہوں انہیں بلا لاؤ، انہوں نے نیچے کی طرف دیکھا، حضرت کے خادم 'دین محمد' صاحب نظر آئے، ان سے کہا کہ حضرت بلا رہے ہیں، تم آؤ، اور جو لوگ وہاں ہوں انہیں بھی بلا لاؤ۔

دین محمد صاحب کہتے ہیں کہ میں پہلے حاضر ہوا، حضرت کو دیکھا کہ چھت کی منڈیر پر

ہاتھ ٹیکے ہوئے سئی ندی کی طرف دیکھ رہے ہیں، مجھے دیکھ کر فرمایا:

''دین محمد تمہارا خواب مبارک ہو''

میں نے عرض کیا، کون سا خواب؟ فرمایا جو بیت اللہ شریف جانے کا تم نے کئی ماہ پہلے دیکھا تھا[۱] مجھے جناب الٰہی سے الہام ہوا ہے کہ تم پہلے حج کرنے جاؤ، وہاں سے آ کر جہاد کرنا۔

اس وقت تک حضرت سید صاحب کے پاس متعدد اصحاب آ چکے تھے، حضرت نے سب سے کہا، اور اس وقت خوشی آپ کے چہرۂ مبارک سے ظاہر ہو رہی تھی، آپ نے فرمایا:

''بھائیو! اب اپنے اپنے سامان کی تیاری کرو''

حاجی عبدالرحیم صاحب نے عرض کیا کہ ''آپ تو سفر ہجرت و جہاد کی تیاری میں تھے؟ بیچ میں یہ معاملہ کیا آ گیا؟''

آپ نے فرمایا ''منظور الٰہی یوں ہی ہے، اس میں بڑی حکمت اور اسرار الٰہی کے معاملات ہیں، کسی وقت ہم آپ سے اسے بیان کریں گے''۔

اس گفتگو کے بعد آپ گھر تشریف لائے، اور رفقا و حاضرین حج کی بشارت سن کر بہت مسرور ہوئے، اور ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا، سب خوش ہو رہے تھے کہ بیت اللہ شریف کی حاضری اور حج و عمرہ کی سعادت حاصل ہونے والی ہے۔

خطوط:

چند روز کے بعد حضرت سید صاحب نے ارادہ کیا کہ دہلی، سہارن پور، پھلت، رام پور بانس بریلی وغیرہ کے اہل تعلق اور متوسلین کو اس ارادہ سے آگاہ کریں، اس وقت حضرت کے پاس آپ کی مرضی کے مطابق کوئی کاتب نہ تھا، آپ نے اپنے بھانجے سید احمد علی صاحب کے نوعمر فرزند سید زین العابدین سے فرمائش کی کہ ''تم خطوط لکھو'' انہوں نے معذرت کی کہ مجھے خوب لکھنا نہیں آتا، آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کی، اور دعا کی، اور ساتھ ہی بشارت بھی سنائی کہ دعا قبول ہو گئی ہے، تمہیں خوب لکھنا آ جائے گا۔ چنانچہ دو تین روز کی مشق میں انہوں نے لکھنے کی مہارت حاصل کر لی۔ حضرت نے جو خطوط لکھوائے تھے، ان کا مضمون یہ تھا:

''ہم واسطے ادائے حج بیت اللہ شریف جاتے ہیں، جن صاحبوں کو حج کرنا منظور ہو ان کو

> اپنے ہمراہ لائیے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے، نہ خزانہ، محض اللہ پر توکل کر کے جاتے ہیں، اور ہم کو اس ذات پاک سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے ہماری مراد پوری کرے گا، اور جہاں کہیں راستے میں حاجات ضروری کے لئے خرچ نہ ہوگا وہاں ٹھہر کر ہم لوگ محنت ومزدوری کریں گے، جب بخوبی خرچ جمع ہوجائے گا تب وہاں سے آگے روانہ ہوں گے، اور جو عورتیں اور مرد ضعیف مزدوری کے قابل نہ ہوں گے، وہ اپنے ڈیروں کی نگہبانی پر رہیں گے، اور خرچ میں کمانے والے اور ڈیروں پر رہنے والے سب برابر کے شریک ہوں گے“۔

اس مضمون کے خطوط آپ نے قصبہ بڑھانہ میں مولانا عبدالحی صاحب کو، دہلی میں مولانا محمد اسماعیل صاحب کو، پھلت میں مولوی وحید الدین صاحب اور ان کے بھائی حافظ قطب الدین صاحب اور ان کے والد حافظ معین الدین صاحب کو، اور ان کے علاوہ سہارن پور میں مولوی وجیہہ الدین صاحب، حافظ عبدالرب صاحب اور حکیم مغیث الدین صاحب اور ان کے بھانجے شہاب الدین وغیرہ کو لکھے۔

کچھ دنوں کے بعد ان مکاتیب کے جواب آنے لگے، سب کا مضمون ایک ہی طرح تھا کہ:

> ”آپ کا بشارت نامہ آیا، ان شاء اللہ عنقریب آپ کی خدمت سراپا برکت میں ہم لوگ حاضر ہوتے ہیں، اور جناب کے ارشاد کے مطابق جو لوگ بیت اللہ شریف کا عزم سفر رکھتے ہوں گے، ان کو اپنے ہمراہ لائیں گے“۔

سفر حج کی تیاریاں ہونے لگیں، اسی دوران کانپور اور اس کے اطراف کے لوگوں کی دعوت پر ایک تبلیغی اور اصلاحی دورہ فرمایا، وہاں سے واپسی پر مولانا عبدالحی صاحب اور ان کے قافلے سے راستے میں ملاقات ہوئی، وہ لوگ قصبہ پھلت، بڑھانہ اور اسی کے اطراف سے آئے

جس زمانے میں سید صاحب نے بیت اللہ شریف کا عزم سفر کیا تھا، حالات کے لحاظ سے یہ حیرت کا معاملہ تھا، سفر کی وہ سہولتیں جو آج میسر ہیں اس دور میں ان کا نام ونشان نہ تھا، پانی کا جہاز، انجن سے محروم، صرف بادبان کے سہارے چلتا، ہوا موافق ہوتی اور سمندر میں طغیانی نہ ہوتی تو خیر، ورنہ ہوا کی مخالفت کی تاب نہ لا کر جہاز مدتوں سمندر میں چکر کاٹتے رہتے، کبھی طغیانی

ہوتی تو غرق بھی ہو جاتے، پھر اس سفر میں وقت بھی بہت لگتا، دشواریاں، دقتیں، کھانے پینے کے مسائل اور پھر مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ! ایک پاسپورٹ اور ویزا کا دردِ سر تو نہ تھا مگر پھر دردِ سر ہی دردِ سر تھا۔ انہیں دشواریوں کی وجہ سے سہولت پسندوں نے فتوی صادر فردیا تھا کہ ہندوستانیوں پر حج فرض نہیں، کیوں کہ راستہ ہلاکت سے محفوظ و مامون نہیں۔

ان حالات میں سید صاحب نے اکیلے نہیں، جو ساتھ جانا چاہے سب کو ساتھ لے کر حج بیت اللہ کے لئے جانے کا اعلان کر دیا۔ قریبی لوگوں نے بھی اسے ایک مذاق سمجھا، وہ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ آج کسی جوش میں حج بیت اللہ کا ارادہ کر لیا ہے مگر کل جب حقائق کی سنگینیاں سدِ راہ نظر آئیں گی تو خود ہی ارادہ بدل جائے گا۔

مگر جب یہ دیکھا کہ مولانا عبدالحی صاحب جیسے بڑے عالم ربانی اس آواز پر لبیک کہہ کر پورے قافلہ کے ساتھ وارد ہو گئے تو وہی جو کل تک اسے ایک مذاق سمجھ رہے تھے، سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ سید صاحب جو کہتے ہیں کر گزریں گے۔

ایک روز حضرت نے مولانا سے دریافت کیا کہ ’’آپ تو آ گئے، دوسرے لوگوں کے آنے کا بھی کچھ حال معلوم ہے؟‘‘ مولانا نے عرض کی کہ ’’آنے والے تو بہت تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ آپ کے ساتھ ہم بھی چلیں گے، میں نے دل میں سوچا کہ جب تک میں کوچ نہ کروں گا یہ لوگ تردد میں رہیں گے، اور جلد نکل نہ پاویں گے، اس لئے میں اتنے لوگوں کو لے کر چل پڑا یقین ہے کہ اب وہ لوگ بھی چلے ہوں گے، یا اب چلیں گے، مگر آئیں گے ضرور‘‘!

آپ نے فرمایا کہ مولانا! ’’آپ خطوط لکھ کر جابجا اطلاع بھیج دیں کہ جن لوگوں کو ہمارے ساتھ چلنا منظور ہو وہ جلد آ جاویں، اگر دیر کریں گے تو ہمارا قافلہ یہاں سے کوچ کر دے گا پھر راستے میں جہاں مل سکیں گے وہاں آنا ہو گا، مگر شرطیں وہی ہیں جن کا ذکر پہلے خط میں ہوا ہے، جن لوگوں کو یہ شرطیں منظور ہوں وہ ہزار بھی ہوں تو ہم انہیں اپنے ہمراہ لے چلیں گے، اور جن کو ہماری یہ شرطیں منظور نہ ہوں وہ ہرگز نہ آئیں‘‘۔

مولانا نے حکم کی تعمیل میں متعدد خطوط لکھے اور انہیں اپنے وطن کے اطراف و نواح میں بھیجا۔ ادھر تو یہ ہوا، دوسری طرف حضرت سید صاحب نے اپنے خاندان والوں کو ترغیب دینی

شروع کی کہ آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ حج کی تیاری شروع کردیں، ان کو تو ابتدا ہی سے حضرت سید صاحب کے ارادے پر اشکال تھا، وہ اسے ایک انہونی بات سمجھ رہے تھے، اب جب حضرت نے براہ راست ان کو دعوت دی تو دل کی بات زبانوں پر آنے لگی کہ ’’جو لوگ ہندوستان میں مالدار اور صاحب مقدور ہیں، ان پر حج فرض ہو تو ہو، بعض علما نے ایسے مالداروں پر بھی حج کی فرضیت سے اختلاف کیا ہے، کیوں کہ حج کی فرضیت کے لئے جیسے زادوراحلہ کی قدرت شرط ہے اسی طرح امن راہ بھی شرط ہے، اور امن کا حال یہ ہے کہ بغیر جہاز کے وہاں جانا محال ہے، اور سمندر میں جان و مال دونوں کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، اس لئے اہل ہند پر حج کی ادائیگی فرض نہیں ہے اگرچہ کتنا ہی مالدار ہو، اور آپ کے پاس تو ایک روز کا بھی خرچ نہیں، اس بے سروسامانی کے باوجود آپ خطوط بھیج بھیج کر لوگوں کو سفر حج کی دعوت دے رہے ہیں، اور ہم سے بھی فرماتے ہیں، تو شاید اپنے ساتھ ان کو بھی حیران و پریشان کریں گے، ہم لوگ آپ کے ساتھ نہ جائیں گے، اگر آپ جاتے ہیں تو جائیں، مگر ہمارے بھائی بہنوں کو اپنے ساتھ لے جاکر تباہ نہ کریں‘‘۔

حضرت سید صاحب ان سے فرماتے ہیں:

> ’’ان شاء اللہ ہم اور تم ساتھ ہوں گے، راستے میں چل کر دیکھنا کہ اللہ تعالی کس طرح اپنی قدرت اور عنایت سے کھانا پینا پہونچاتا ہے، اور اپنی طرح طرح کی نعمتوں سے پرورش کرتا ہے، اور اللہ تعالی کی ذات پاک سے یہ یقین کامل ہے کہ ہم سب اپنے عاجز محتاج بندوں کو یہاں سے حرمین شریفین تک بآرام تمام پہونچادے گا اور پھر وہاں سے ساتھ خیروعافیت کے یہاں لاوے گا‘‘۔

اسی طرح آپ سمجھاتے رہے مگر وہ اپنے انکارواشکال پر جمے رہے، البتہ آپ کے قرابت داروں میں سے کچھ لوگ آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار تھے، اسی دوران مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید کا خط سید صاحب کے نام آیا، اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ:

’’یہاں ہمارے ہمراہ حکیم مغیث الدین صاحب، مولوی وجیہ الدین صاحب وغیرہ سہارن پور کے اور مولوی وحید الدین صاحب وغیرہ قصبہ پھلت کے اور ان میں اکثر صاحب مع اہل وعیال، عورت مرد ملا کر قریب ڈھائی سو آدمیوں کے ہیں، اور ہم سب گڈھ مکتیشر کے گھاٹ

سے کشتیوں پر سوار ہو کر روانہ ہو چکے ہیں‘‘۔

اس خط کے ملنے کے بعد اسی دن صبح کو حضرت سامان سفر ڈلمٹو کو روانہ کرنے لگے، گویا تیاری مکمل ہو چکی تھی۔

خاندان والوں کو آخری تلقین:

جب روانگی کا قصد پختہ ہو گیا اور اسباب بھیجے جانے لگے تو ایک مرتبہ پھر آپ نے اہل خاندان کو جمع کیا اور ان سے ارشاد فرمایا:

’’ہم تم سب صاحبوں کو اتنے روز سے سمجھا رہے ہے کہ ہمارے ساتھ اس سفر باظفر میں تم بھی شریک ہو، مگر کسی صاحب کے خیال شریف میں نہیں آیا، اور اب یہ اخیر سمجھانا ہے کہ تم سب محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر توکل و اعتماد کر کے اپنا اپنا اسباب سفر لاؤ کہ ڈلمئو بھیج دئے جائیں اور اس امر میں اپنی رائے ناقص کو دخل نہ دو اور ہمارے ساتھ ہو جاؤ‘‘۔

انہوں نے جواب دیا کہ ’’ہمارا اسباب تو نہیں آسکتا اور نہ ہم آپ کے ساتھ جاسکتے، اور نہ آپ کو منع کر سکتے، خیر ہم نے آپ کو اللہ کے سپرد کیا، آپ تشریف لے جائیں‘‘۔ حضرت نے اس جواب کے بعد ایک مبسوط تقریر فرمائی، وہ من وعن درج کی جاتی ہے۔

سید صاحب کی ایمان افروز تقریر:

’’جب سے میں سفر دہلی سے آیا ہوں، کچھ کم ڈیڑھ برس کا عرصہ گزرا ہے، تب سے میں تم سب صاحبوں کی خیر خواہی دنیا و آخرت کی بوجھ کر اکثر اوقات بطور نصیحت کے کہتا رہا، اور تم صاحبوں کے خیال شریف میں نہ آیا، اور ان روزوں واسطے سفر حج کے طرح طرح سے سمجھا کر کہتا رہا، اور اس کو بھی تم نے افسانہ سمجھ کر باتوں میں اڑا دیا، اور انکار کیا، مجھ پر جو حق قرابت، برادری اور اسلام کا تھا وہ میں نے حتی الامکان ادا کیا، اور اسی طور پر تمہارے جو بھائی بریلی، جہان آباد، نصیر آباد اور جائس وغیرہ کے ہیں، بہ نسبت دور والوں کے ان کا حق مجھ پر زیادہ ہے، جہاں تک ہو سکا ان کو بھی میں نے وعظ و نصیحت سے سمجھایا، اس میں جنہوں نے مانا، مانا، اور نہ مانا، نہ مانا، مگر میں نے ان کا حق مجھ پر تھا، ادا کیا۔

اور سبب تم صاحبوں کے نہ ماننے کا سبب تمہاری ہی گفتگو سے دریافت ہوا کہ تمہارے

ذہنوں میں یہ ہے کہ یہ ایک مفلس بے سروسامان محتاج نان ہے، چند لوگ مفلس محتاج اپنے پاس جمع کرر کھے ہیں، ہم اس کے ہمراہ کیوں جاویں؟ اور مفت کا رنج اٹھاویں، سو بات حقیقت میں یوں ہے کہ جو لوگ غربا، ضعفا اور مسکین محتاج میرے ہمراہ ہیں، اور انہوں نے ساتھ اخلاص کے فی سبیل اللہ کمر ہمت کی میرے ہمراہ باندھی ہے، ان کے واسطے اس رزاق مطلق اور قادر برحق نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس سفر باظفر میں تیرے ہمراہ ایک سے ہزاروں تک جتنے ہوں گے، تجھ سے کچھ سروکار نہیں، وہ سب میرے مہمان ہیں، اور ان میں سے جن کی اسی سفر میں موت ہے وہ مریں گے، اور باقی سب کو بامراد ان کے گھر پہونچادوں گا۔

سو جب تک میں اس بریلی کے علاقے میں ہوں تب ہی تک ان سب پر تنگی وافلاس ہے، ان شاء اللہ جس وقت میں ان کو ساتھ لے کر اس علاقے سے باہر ہوا تب ان کا حال دیکھنے والے دیکھیں گے کہ پروردگار عالم بے سان وگمان اپنے بندوں کے ہاتھوں (روزی) کیوں کر پہونچاتا ہے، اور خدمت کراتا ہے۔

اور جو میں نے لوگوں کو خطوط میں لکھ لکھ کر بھیجا کہ ”ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے نہ خزانہ، صرف اللہ تعالی کی ذات پاک پر توکل واعتماد کر کے واسطے ادائے حج کے کمر باندھی ہے اور جہاں کہیں خرچ راہ ضروری نہ ہوگا، وہاں ٹھہر کر محنت ومزدوری کریں گے، پھر جب خرچ جمع ہوگا تب وہاں سے آگے چلیں گے“ اس میں بڑی بڑی مصلحتیں ہیں، یہ خلاف، توکل کے نہیں ہے، اور یہ بھی اللہ کی طرف سے مجھے معلوم ہے، جب ہم لوگ یہاں سے بیت اللہ شریف کو جاویں گے، تب پیچھے سے مخالف لوگ موافق لوگوں کے رنجیدہ کرنے کی طرح طرح کی خبریں اڑادیں گے، کوئی کہے گا جہاز تباہ ہوگیا، اس میں ڈوب گئے، کوئی کہے گا، ہوائے مخالف خدا جانے ان کے جہاز کو کہاں لے گئی؟ کوئی کہے گا، ان کو فرنگی پکڑ لے گئے، کوئی کہے گا، عرب میں ترکوں نے مار ڈالا۔ سو ان باتوں پر تم یقین نہ کرنا، ان شاء اللہ یہ کچھ نہ ہوگا، جس طرح اللہ تعالی ہم لوگوں کو ساتھ خیر کے لے جاوے گا، اسی طرح بعافیت تمام پھیر لاوے گا، بلکہ اللہ تعالی ہمارے ان غریب لوگوں کو ایسا خوشحال صاحب مال کر کے لاوے گا کہ لوگ دیکھ تعجب کریں گے کہ یہ وہی محتاج لوگ ہیں؟ یا کوئی اور ہیں؟ اور از روئے حسرت کہیں گے کہ ہزار افسوس! کیا شامت دامن گیر تھی جو ہم

نہ گئے''۔

اس تمام گفتگو کے بعد سید صاحب نے انہیں سلام کیا اور وہاں سے چلے آئے۔

سید محمد جامع کی بیعت:

جس دن حضرت کو اپنے مستقر تکیہ رائے بریلی سے روانہ ہونا تھا، اس سے ایک روز پہلے عصر کی نماز کے بعد حضرت مسجد میں تشریف فرما تھے کہ خاندان کے ایک بزرگ سید محمد جامع صاحب نے ایک آدمی کے ذریعے پیغام بھیجا کہ آپ ایک لحظہ کے لئے فرش مسجد کے شرقی شمالی گوشے پر تشریف لائیں، میں وہیں حاضر ہوتا ہوں، مجھے کچھ کہنا ہے۔ سید صاحب وہاں تشریف لے گئے، دوسری طرف سے سید محمد جامع بھی آ گئے، وہ بڑے جسیم قدآور اور فربہ بدن کے تھے، آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مسجد کے چبوترے پر اپنے پاس بیٹھایا، اور پوچھا کیا ارشاد ہے؟۔

انہوں نے کہا، اس وقت اللہ تعالی کی مجھ پر عنایت ہوئی، میں آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے آیا ہوں، سچ بات تو یوں ہے کہ جب سے آپ دہلی سے تشریف لے آئے ہیں، آپ کی ذات برکات سے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کو فضل الہی سے ہدایت اس ملک میں ہوئی، ہم اپنے نفس وشیطان کی شامت اور شرارت سے محروم اور بے نصیب رہے کہ آپ کے فیض سے بہرمند ہوتے، سو آگے جو قصور ہم سے ہوا، سو ہوا، اس سے ہماری توبہ ہے، اور اب ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، ہمارا کہا سنا آپ معاف کریں۔

یہ بات سن کر آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

> ''الحمدللہ کہ اللہ تعالی نے شیطان ملعون کو پشیمان کیا، اور آپ کو توفیق خیر عطا فرمائی''۔

اس وقت آپ کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم تھا، اس بات سے خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، پھر آپ نے ان سے بیعت لی، اور ان کے لئے ایسی مؤثر دعا فرمائی کہ تمام مجمع کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، کم لوگ ہوں گے جو روئے نہ ہوں۔

پھر اسی روز سید محمد جامع کے منجھلے بھائی سید غلام جیلانی نے اپنا قصور معاف کرایا، اور حلقۂ ارشاد میں شامل ہوئے، اور ان کے لئے بھی دعا کی۔

گھر سے روانگی:

شوال ۱۲۳۶ھ کی آخری تاریخ تھی، کوچ کی تیاری مکمل ہوچکی ہے، حضرت سید صاحب دولت خانہ میں تشریف لے گئے، اندر والوں سے رخصت ہوکر آپ باہر تشریف لائے، یہاں لوگوں کا انبوہ گراں تھا، ساتھ چلنے والے بھی اور رخصت کرنے والی بھی، باہر نکلے تو اپنے دست مبارک سے مستحقین اور خدام کو حسب لیاقت رقوم تقسیم کئے، اس سے فارغ ہوکر لوگوں کو ساتھ لے کر سئی ندی کو پار کیا، اور وہیں کنارے آموں کا ایک باغ تھا، اس میں ٹھہرے، وہاں سید محمد جامع صاحب کے چھوٹے بھائی اور حضرت سید صاحب کے بہنوئی نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی، ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات بیعت سے مشرف ہوئے۔

کچھ دیر اس باغ میں ٹھہر کر آگے روانہ ہوئے، ایک میل کے فاصلے پر اور ایک باغ آموں کا تھا، وہاں جا کر آپ ذرا اطمینان سے ٹھہرے کہ بعد میں آنے والے بھی آجائیں، اس باغ میں بھی بہت سے افراد نے بیعت کی۔

توکل کی کیفیت:

حضرت سید صاحب کے مالیات کے منتظم قصبہ پھلت کے مولانا محمد یوسف صاحب جو خود ولی کامل تھے، گھر سے نکلتے وقت حضرت نے ان سے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس کتنی رقم ہے؟ انہوں نے کچھ اوپر سو روپئے بتائے، آپ نے ان سے لے کر لوگوں میں تقسیم کر دیئے تھے (مخزن احمدی ص ۶۲) جب آپ اس دوسرے باغ میں پہونچے تو پھر ان سے پوچھا کہ کچھ خرچ آپ کے پاس ہے؟ انہوں عرض کی کہ سات روپئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ:

''اتنے روپیوں سے تو ایک دن کا بھی خرچ پورا نہ ہوگا، اللہ پر توکل کر کے یہ بھی سات روپئے محتاج لوگوں کے حوالے کر دیجئے، ہمارے لئے اللہ تعالی کا خزانہ معمور ہے، اور اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ آپ ہم عاجز محتاج بندوں کی پرورش کرے گا''۔

مولانا موصوف نے وہ ساتوں روپئے ایک شخص کے حوالے کر دیئے، اور فرمایا کہ انہیں بھنا کر تم سب آپس میں برابر تقسیم کر لو۔

اس کے بعد حضرت نے برہنہ ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا اور کہا:

"اے کریم کارساز! تو اپنی اتنی مخلوق اپنے اس ذلیل بندے کے سپرد کر رکھا ہے، آپ ہی چارہ سازی فرمایئے، اور بخیر وخوبی اپنی مہربانی سے اس پورے قافلے کو منزل مقصود پر پہونچایئے"۔ (مخزن احمدی ص۶۲)

حضرت سید صاحب کے دعا کرنے کا یہ خاص انداز تھا، سر پر سے عمامہ اتار دیتے، اور انتہائی تذلل اور خشوع وخضوع کے ساتھ دربار الٰہی میں ہاتھ اٹھاتے، سید صاحب نہایت مستجاب الدعوات بزرگ تھے، اس سفرنامے میں قدم قدم پر آپ حضرت کی دعاؤں کا ظہور دیکھیں گے۔

رحمت الٰہی کا ظہور:

حضرت سید صاحب اس باغ میں تشریف فرما تھے، خلقت کا ایک ہجوم تھا، وہ بھی تھے جو قافلے میں شریک تھے، اسی باغ میں ان کو شمار کیا گیا، تو وہ چار سو پانچ یا سات تھے، ایک کثیر تعداد رخصت کرنے والوں اور اس مقدس اور نرالے قافلہ کو دیکھنے والوں کی تھی، کئی لوگ قصبہ ڈلمئو کے بھی آگئے تھے، کیوں کہ سید صاحب نے اس قافلہ کے لئے دریا کا سفر تجویز کیا تھا، ڈلمئو دریائے گنگا کے کنارے ہے، وہاں سے دریائی سفر کشتیوں سے شروع ہونے والا تھا، تو اس سفر میں پہلی منزل آپ کی یہی قصبہ ڈلمئو ہونے والا تھا، اس لئے وہاں کے متعدد لوگ اس ارادے سے یہاں آگئے تھے کہ حضرت کی روانگی ہو تو وہ آگے بڑھ کر قافلے کی مہمان نوازی اور دعوت کا انتظام کریں، انہوں نے حضرت کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ ہم نے اپنے یہاں کا قلعہ خالی کر رکھا ہے، اور پانی گھڑے اور فرش اور دوسرے ضرورت کے سامان اس میں جمع کر دیئے ہیں، آپ کے ہمراہ جو عورتیں ہوں گی وہ بھی وہیں اتریں، آپ نے فرمایا:

"یہ کام تم نے خوب کیا، مگر کھانا ہم لوگوں کے واسطے تب پکانا کہ جب ہم یہاں سے چل کر وہاں داخل ہوں، اور تم کو اجازت دیں، اور جو اسباب ہم لوگوں کا یہاں سے جاوے اس کو حفاظت سے وہیں رکھو"۔

یہ فرما کر انہیں رخصت کر دیا، اور باقی لوگوں کو بھی وہیں سے رخصت کرنے لگے، اور اپنے بھانجے سید عبد الرحمان صاحب اور اپنے خصوصی خادم اور حاضر باش میاں دین محمد کو تکیہ مکان پر بھیج دیا کہ وہاں کا انتظام مکمل کر کے حج میں جانے والی مستورات کو لے کر ڈلمئو پہونچیں، ان

لوگوں کو ادھر بھیجا اور خود قافلہ لے کر ڈلمئو کی طرف روانہ ہوئے۔

شوق دعوت:

ڈلمئو سے چار میل پہلے آپ نے آموں کے ایک باغ میں تھوڑی دیر کے لئے پڑاوٗ ڈالا وہیں ڈلمئو سے دو بھائی آپس میں کش مکش کرتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے، دونوں بھائی اپنے اپنے گھر دعوت کرنا چاہتے تھے، ہر ایک کی آرزو تھی کہ حضرت پہلے اس کی دعوت قبول فرمائیں، آپ نے دونوں کو سمجھا کر راضی کیا، اور چھوٹے بھائی سے کہا کہ یہ تمہارے بڑے بھائی ہیں، ان کا حق تم پر ہے، جو یہ کہتے ہیں وہی سہی، پہلے یہ دعوت کریں، پھر دوسرے دن تم کرنا، خدا چاہے گا تو ہم دونوں کی ضیافت کھائیں گے۔

چنانچہ جب حضرت ڈلمئو پہونچے تو پہلے بڑے بھائی کے یہاں، پھر چھوٹے بھائی کے یہاں پورے قافلے کی ضیافت ہوئی، پھر تو دعوتوں کا سلسلہ چل پڑا۔

اسی اثنا میں حضرت کے گھر کی مستورات کا قافلہ بھی آ گیا، حضرت نے اپنے خادم میاں دین محمد صاحب سے دریافت کیا کہ وہاں سے فراغت کر آئے ہوں، انہوں نے عرض کیا، ہاں سب کچھ تو ہوگیا ہے مگر بار برداروں کے بائیس روپے دینے ابھی باقی ہیں، فرمایا الحمد للہ وہ بھی دیدیئے جائیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد حضرت نے انہیں پچیس روپے عطا فرمائے، اور فرمایا کہ تین روپے جو زائد ہیں، انہیں بھی بار برداروں کو بطور انعام کے عطا کر دو، اب تو ہم بیت اللہ کو جاتے ہیں، جب اللہ تعالی لاوے گا تب آئیں گے، چنانچہ وہ سارا روپیہ انہیں بخش دیا گیا۔

مواعظ:

چار پانچ روز ڈلمئو میں قیام رہا، بیعت کرنے والوں کا سلسلہ رہا، لوگ اپنے گھروں میں حضرت کو لے جاتے اور گھر کے تمام افراد بیعت سے مشرف ہوتے، ان چار دنوں میں حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے مواعظ ہوتے رہے، جن میں وہ شرک وبدعت کی برائی، توحید وسنت کی خوبی اور حج وعمرہ کے فضائل بیان فرماتے۔

حضرت سید صاحب کا وعظ:

ایک روز حضرت سید صاحب نے فجر کی نماز کے بعد ایک مؤثر وعظ فرمایا، فرمایا کہ

”بھائیو! اگر تم سب اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر واسطے ادائے حج وعمرہ کے اس نیت سے جاتے ہو کہ اللہ تعالی ہم سے راضی ہو، تو تم کو لازم ہے کہ آپس میں مل کر ایسا اتفاق اور خلق رکھو جیسے ایک ماں باپ کے نیک بخت بیٹے ہوتے ہیں، ہر ایک کی راحت کو اپنی سی راحت اور ہر کسی کے رنج کو اپنا سا رنج جانو، اور ایک دوسرے کے کاروبار میں بلا انکار حامی ومددگار رہو، اور ایک دوسرے کی خدمت کو ننگ وعار نہ جانو، بلکہ عزت وافتخار سمجھو، یہی کام اللہ کی رضامندی کے ہیں، اور جب ایسے اخلاق تمہارے اندر ہوں گے تو اور غیر لوگوں کو شوق ہوگا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، ان میں شریک ہونا چاہئے، اور اللہ پر کامل توکل کرو، کسی مخلوق سے کسی چیز کی آرزو ہرگز نہ رکھو، رزاق مطلق اور حاجت روائے برحق وہی پروردگار عالم ہے، وہی ماں کے شکم میں روزی پہونچاتا ہے، پھر وہی وہاں سے ساتھ آسانی کے باہر لاتا ہے، اور باہر لانے سے پہلے ماں کی پستان میں روزی تیار رکھتا ہے، پھر وہ لڑکا اسی کی تعلیم سے دودھ پیتا ہے، اور جتنا چاہتا ہے اتنا پی لیتا ہے، باقی مکھی، بال، گرد وغبار سے محفوظ تازہ بتازہ ماں کے پستان میں رہتا ہے، پھر وسرے وقت پیتا ہے، یہ اسی پروردگار کی روزی رسانی ہے، پھر چند مدت میں دودھ چھڑا کر اور غذا کھانے کی تعلیم فرماتا ہے، اسی طور سے پرورش کر کے جوان اور جوان سے بوڑھا کرتا ہے، اور جو کچھ اس نے جس کی تقدیر میں روزی لکھی ہے وہ بہرصورت اس کو بلاشک وشبہہ پہونچے گی، اور یہاں ایک ادنی آدمی جو ہم لوگوں کی دعوت کر جاتا ہے اور چاہے جھوٹ ہی کر جاوے، مگر ہم لوگ اس کے اعتماد پر اپنے گھر میں منع کر دیتے ہیں کہ ہمارے واسطے کھانا نہ پکانا، فلانے کے یہاں ہماری دعوت ہے، یا مثلاً غازی الدین حیدر والی لکھنؤ اس بات کا وعدہ کرے کہ میرے فلاں امیر کے ہمراہ کہ بیت اللہ شریف کو جاتا ہے، جو کوئی جاوے زاد وراحلہ اس کو میں دوں گی، تو ہزاروں آدمی خوشی باخوشی جانے پر مستعد ہو جائیں، کچھ بھی اس کی وعدہ خلافی کا شک وشبہہ اپنے دل میں نہ لاویں، اور مجھ سے اس شاہنشاہ عالم پناہ قادر برحق رزاق مطلق نے وعدہ کیا ہے کہ جو تیرے ساتھ لوگ اس سفر میں ہیں، ان کے کھانے، کپڑے کا کچھ اندیشہ نہ کرو، وہ سب میرے مہمان ہیں، اور وہ اپنے وعدے کا سچا ہے کہ جس میں کسی صورت وعدہ خلافی کا احتمال بھی نہیں ہے، پھر میں کیوں کر نہ سچ جانوں؟ اور کس بات کا اندیشہ کروں؟ وہ آپ ہم سب بھائیوں کی پرورش کرے گا۔

سو حاصل کلام یہ ہے کہ جن بھائیوں کو یہ سب باتیں منظور ہوں اور میرے کہنے کو سچ

مانتے ہوں وہ میرے ساتھ چلیں، میں ان کے رنج وراحت کا شریک ہوں، اور وہ میری یہی باتیں اپنی اپنی عورتوں کو سمجھا کر کہہ دیں ورنہ ابھی مکان نزدیک ہے، تکلیف سفر کی اٹھانے کی موقوف کریں، سفر میں ہرطرح کی تکلیف اور مصیبت ہوتی ہے، والا پھر کوئی بھائی گلہ شکوہ کسی بات کا زبان پر نہ لاویں، اور مجھ کو عنایت الٰہی سے امید قوی ہے کہ اس سفر باظفر میں اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ سے لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کرے گا، اور ہزاروں لوگ کہ دریائے شرک وبدعت اور فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے اور شعار اسلام سے مطلق ناواقف ہیں، وہ یکے موحد اور متقی ہوں گے۔

اور جناب الٰہی میں مَیں نے بہت سی واسطے اہل ہند کے دعا کی کہ الٰہی! ہندوستان سے راہ تیرے کعبہ کی مسدود ہے، ہزاروں مالدار صاحب زکوٰۃ مر گئے اور بہکانے نفس وشیطان کے کہ رستہ امن کا نہیں ہے، حج سے محروم رہے، اور ہزاروں صاحب ثروت اب جیسے ہیں اسی وسوسہ سے نہیں جاتے، سو اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کر لے بے دغدغہ چلا جاوے، اس نعمت عظمیٰ سے محروم نہ رہے۔

سو میری یہ دعا اس ذات پاک نے مستجاب کی اور ارشاد ہوا کہ تیرے حج سے آنے کے بعد یہ رستہ علی العموم ہم کھول دیں گے، سو ان شاء اللہ جو بھائی زندہ رہیں گے وہ یہ حال بچشم خود دیکھیں گے‘‘۔

ڈلمئو سے کوچ:

ڈلمئو میں چار پانچ روز قیام رہا، اس اثنا میں حضرت کے گھر لوگ اور دوسرے رفقا اور مستورات ڈلمئو پہونچ گئے، ڈلمئو والوں نے ایسا انتظام واہتمام کر رکھا تھا کہ قافلہ والوں کو کسی وقت کھانا پکانے کی نوبت نہیں آئی، حق تعالیٰ کا وعدۂ مہمانی یہیں سے جلوہ گر ہونے لگا تھا، دعوتوں پر دعوتوں کا سلسلہ تھا، قیام کا انتظام بھی بہت عمدہ کر رکھا تھا، یہاں سے سفر دریائی راستے سے طے تھا، آپ نے ڈلمئو میں رہ کر پانچ کشتیاں کرائے پر لیں، جمعہ کی نماز ڈلمئو میں پڑھی۔

نصرت حق:

ادھر قافلہ کے کوچ کی تیاریاں ہورہی تھیں، ادھر دھلئی اور دھمدہ کے لوگوں کو حضرت

کے عزم وارادہ کی اطلاع ہوئی تو وہاں سے کئی لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کی کہ بہت دور دور سے لوگ آ کر بستی میں جمع ہیں، وہ سب آپ سے بیعت ہونے کے لئے آئے ہوئے ہیں، آپ جب یہاں سے چلیں تو ہماری بستی کے کنارے پڑاؤ کریں، وہاں دعوت کا کافی انتظام ہم لوگوں نے کر رکھا ہے، آپ نے فرمایا: ہم ان شاء اللہ تمہاری بستی میں ضرور اتریں گے، مگر دعوت کی تکلیف ہمارے لئے نہ کرو، انہوں نے اصرار کیا کہ ہماری خوشی اور راحت اسی میں ہے، آپ نے فرمایا خیر تمہاری خوشی ہم کو منظور ہے۔

جمعہ کے بعد وہاں سے روانگی تھی، قافلہ بڑا تھا، کشتیوں میں سب کی گنجائش نہ تھی، حضرت نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کو جن کے ساتھ عورتیں نہیں ہیں، خشکی کے راستے سے لے چلیں، اور موضع دھلئی میں چل کر ٹھہریں، وہاں وعظ ونصیحت کریں، ہم بھی ان شاء اللہ وہیں آتے ہیں، چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب تقریباً ڈیڑھ سو آدمیوں کے ہمراہ براہ خشکی ادھر روانہ ہوئے۔

شان دل نوازی:

حضرت کے رفقا کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے، اسباب لادے جا رہے تھے، اسی دوران قصبہ ڈلمئو کے ایک شخص نے آ کر آپ کی خدمت میں عرض کی کہ چند لوگ بیعت کرنے کو میرے یہاں باقی رہ گئے ہیں، اگر آپ وہاں تک قدم رنجہ فرمائیں تو بہتر ہو، فرمایا، بہت خوب چلو، پھر آپ اس کے مکان پر گئے، اور ان لوگوں سے بیعت لی۔ حضرت سید صاحب کی یہ خاص ادا تھی کہ معمولی سے معمولی آدمی کی کمال درجہ دل نوازی فرماتے۔

برکت کے روپئے:

وہاں سے حضرت تشریف لائے تو آپ نے اپنے خزانچی مولانا یوسف صاحب کو سات روپئے دیئے اور فرمایا، ان کو کسی کپڑے میں باندھ کر بحفاظت تمام اپنے پاس رکھئے، یہ ہمارا راہ کا خرچ ہے، اور یہ برکت کے روپئے ہیں ان شاء اللہ ان میں بہت برکت ہوگی۔

کشتیاں ڈلمئو سے روانہ ہوئیں، مغرب کی نماز کشتیوں میں پڑھی گئی، نماز کے بعد آپ نے سورہ الحمد کا وعظ کہنا شروع کیا، آہستہ آہستہ اندھیرا بڑھتا گیا، دریا میں طغیانی تھی، ملاحوں نے

خیال نہیں کیا، کشتیاں پانی کے بہاؤ میں ڈھلئی سے آگے نکل گئیں، وہاں گھاٹ پر لوگ انتظار کر رہے تھے، انہیں جب اندازہ ہوا کہ کشتیاں گھاٹ سے آگے چلی گئی ہیں تو وہ پکارنے لگے کہ گھاٹ پیچھے رہ گیا، کشتیاں واپس لاؤ، موسم برسات کا تھا، دریائے گنگا چڑھا ہوا تھا، جب تک ملاح کشتیوں کو واپس لاتے پانی کے ریلے میں دور نکل گئیں، پھر رسوں سے باندھ کر بڑی دیر میں کنارے گھاٹ تک لا سکے۔

حضرت اور آپ رفقا اترے، عورتیں کشتیوں میں رہیں، حضرت کے لئے ایک ہنس کا انتظام ان لوگوں نے کر رکھا تھا، حضرت اپنے رفقا کے ساتھ گاؤں میں تشریف لے گئے، مولانا عبدالحی صاحب کا قافلہ آچکا تھا، حضرت اور آپ کے قافلہ نے وہاں کھانا کھایا، عورتوں کے لئے کشتی پر کھانا بھیج دیا گیا۔

بہت سے لوگوں نے رات ہی میں آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی، پھر دوسرے دن دیر تک بیعت کا سلسلہ رہا، بیعت سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے سب لوگوں سے خطاب فرمایا کہ:

’’بھائیو! حاصل بیعت کرنے کا یہ ہے کہ جو تم شرک وبدعت کرتے ہو، تعزیہ بناتے ہو، جھنڈے نشان کھڑے کرتے ہو، پیروں شہیدوں کی قبریں پوجتے ہو، ان کی نذر ونیاز مانتے ہو، ان سب کاموں کو چھوڑ دو، اور سوائے خدا کے کسی کو اپنے نفع وضرر کا مالک نہ جانو، اور اپنا حاجت روا نہ پہچانو، اور اگر یہ نہ کرو گے تو فقط بیعت کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا‘‘۔

آپ کے مختصر کلمات کا یہ اثر ہوا کہ اسی وقت لوگوں نے اپنے اپنے تعزیوں کے چوک کھول کر نکال دیئے، اور نشان اور پنجوں میں جو چاندی تھی اسے نکال کر حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا کہ اپنے صرف میں لائیں۔

موضع ڈگڈگی:

یہاں سے آپ رخصت ہوئے، جب کشتیاں موضع ڈگڈگی کے قریب پہونچی تو وہاں ایک صاحب شیخ محمد پناہ نامی انتظار میں کھڑے تھے، ان کی درخواست پر حضرت نے کشتیاں رکوائیں، انہوں نے سلام ومصافحہ کے بعد عرض کی کہ میں نے کئی روز سے آپ کی مہمانی کا سامان

تیار کر رکھا ہے، آپ کے آنے کی خبر سن کر سینکڑوں لوگ اس نواح کے بیعت کے واسطے میرے غریب خانے پر جمع ہیں، آپ وہاں تشریف لے چلیں، حضرت نے ان کی درخواست قبول فرمائی، کشتیاں وہیں کنارے باندھ دی گئیں، آپ اپنے رفقا سمیت اتر گئے، عورتیں کشتی پر رہیں، آپ ان کے گھر تشریف لے گئے، شام سے رات گئے تک بیعت کا سلسلہ رہا۔

وہاں بھی تعزیوں کے چوک بہت تھے، آپ نے تعزیہ داری کے بارے میں انہیں نصیحت کی، شرک وبدعت کی برائی بیان کی، چنانچہ اسی وقت چوک کھودوائے گئے، اور نشان اور جھنڈے توڑ دیئے گئے، لوگوں نے تمام برائیوں سے توبہ کی۔

انوکھی میزبانی:

رات کا قیام وہیں رہا، صبح وہاں سے کشتیاں روانہ ہوئیں، اور شام تک چلتی رہیں، شام کو ملاحوں نے کشتیاں ایسی جگہ لنگر کیں جہاں آس پاس آبادی کا کوئی نشان نہ تھا، آسمان پر غلیظ ابر چھایا ہوا تھا، ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، آپ نے کھانا پکانے کا حکم دیا، لیکن دیکھا تو دریا کے کنارے بہت دور تک کیچڑ اور دلدل تھی، کھانے پکانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، سب کو یقین ہوا کہ آج فاقہ ہی کرنا ہوگا، اس وقت حال کچھ ایسا ہی تھا کہ فاقہ کر لینا آسان تھا مگر کھانا پکانا بہت دشوار تھا، بارش بھی ہو رہی تھی اور ہوا بھی تیز چل رہی تھی، کہیں سے دعوت کی بھی امید نہ تھی، قافلہ نے عشا کی نماز ادا کی۔

اتنے میں کوئی میل آدھ میل کے فاصلے پر کچھ روشنی دکھائی دی، غور سے دیکھا گیا تو کچھ لوگ ادھر ہی آتے ہوئے محسوس ہوئے، لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ اللہ جانے یہ کون لوگ ہیں؟ اتنے میں دیکھا کہ ایک انگریز گھوڑا پر سوار کشتیوں کے قریب آیا، اس کے ساتھ کئی لوگ تھے، اس نے قریب آ کے پوچھا کہ تمہارے پادری صاحب کہاں ہیں؟ حضرت نے پکارا ہم یہاں ہیں، اس طرف آؤ، وہ گھوڑے سے اتر کر خدمت میں حاضر ہوا، ٹوپی اتار کر آداب بجالایا، کہنے لگا کہ کئی روز سے میں نے آدمی لگا رکھے ہیں کہ آپ آئیں تو مجھے خبر ملے، آج آپ کی خبر ملی تو آپ کے لئے کھانا پکوا کے لے آیا ہوں۔

حضرت نے حکم دیا کہ وہ کھانا اپنے برتنوں میں لے لیں، اور باہم بانٹ کر کھالیں، وہ

کھانا کافی تھا، سب نے آسودہ ہو کر کھایا، پھر ملاحوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ انگریز نیل کا سوداگر تھا۔

اس رات کو اللہ تعالی نے اس طرح اپنی قدرت کاملہ سے روزی پہونچائی، جس کا کوئی وہم وگمان بھی نہ تھا، رات کو وہیں قیام رہا، صبح کو کشتیاں روانہ ہوئیں، دن بھر کشتیاں چلتی رہیں، شام کو ایک ایسی جگہ قافلہ پہونچا جہاں گنگا کی دھارائیں دو ہو گئیں، بڑا دھارا گڑھی مانک جا رہا تھا اور چھوٹا دھارا گتنی کی جانب جا رہا تھا، قافلہ کو گتنی کی طرف جانا تا تھا، مگر ادھر پانی کم تھا، رات میں ادھر کشتیوں کو لے جانا مشکل تھا، اس لئے وہیں کشتیاں باندھ دی گئیں، کل رات کا کھانا قدرے بچا ہوا تھا، اور اس کے ساتھ حضرت کے حکم سے کھچڑی پکا لی گئی، اور سب لوگ کھا کے فارغ ہو گئے، اسی دوران موضع گتنی سے کچھ لوگ آئے اور عرض کرنے لگے، حضرت! آپ نے یہاں پڑاؤ ڈال دیا ہے حالانکہ آپ کی دعوت کی تیاری ہمارے یہاں بڑے اہتمام سے ہو رہی ہے، اب ہم لوگ کیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ اس دھارے میں پانی کم ہے، اندھیری رات میں اس میں کشتیاں لے جانا مشکل ہے، ان شاء اللہ کل سویرے تمہارے یہاں آئیں گے۔

صبح سویرے وہاں سے کشتیاں چلیں، دن چڑھے قافلہ موضع گتنی ساحل دریا پہونچ گیا عورتیں کشتیوں پر رہیں مرد سب اتر کر حضرت کے ساتھ بستی میں آصف زماں خاں رسالدار کے گھر گئے، وہاں دعوت کا سامان تھا، وہاں تین روز قیام رہا، ان تین دنوں میں بہت سے مردوں اور عورتوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، برائیوں سے توبہ کی، از سر نو زندگی کا عہد باندھا۔

الہ آباد میں قدرے قیام اور اس کے برکات:

الہ آباد میں شیخ غلام علی صاحب مہاراجہ بنارس کے مختار عام تھے، اور حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کے نہایت مخلص ارادت مندوں میں تھے، اور ساتھ ہی ساتھ نہایت صاحب ثروت تھے، انہوں نے حضرت کے قافلے کے استقبال کی خاص تیاریاں کر رکھی تھیں، سید صاحب گنگا کے دوسرے کنارے الہ باد کے بالمقابل ساحل پر فروکش تھے، وہیں شیخ غلام علی صاحب کے فرستادہ اصحاب پہونچے، رات کا قیام اسی ساحل پر رہا، یہاں سے الہ باد خشکی کے راستے سے ڈیڑھ کوس اور دریا کے راستے ڈھائی کوس ہے، کشتیاں دریا کے راستہ سے روانہ ہوئیں، قافلے کے

بعض لوگ خشکی کے راستے سے چلے، سید صاحب کشتی پر تھے، شہر الٰہ باد میں شیخ غلام علی کی تجویز کے مطابق بلوہ گھاٹ پر کشتیاں رکیں، آپ کے استقبال کے لئے دریا کے کنارے شیخ غلام علی اور ان کے بیٹے، پوتے وغیرہ، مولوی کرامت علی، صدر امین، حافظ اکرام الدین دہلوی، شیخ محمد تقی قصاب ان کے بھائی شیخ عبداللہ اور وہاں کے نامور پیرزادے شاہ محمد اجمل کے بیٹے شاہ ابوالمعالی وغیرہ موجود تھے، ان کے علاوہ قلعہ الٰہ آباد کے داروغہ بسنتی میاں، رنجیت خان میواتی اور دوسرے بہت سے امرا وغربا کھڑے تھے، کشتی کنارے لگی اور حضرت اترے تو سب نے مصافحہ ومعانقہ کیا

شیخ غلام علی صاحب:

شیخ غلام علی صاحب الٰہ آباد کے رئیس اعظم تھے، شاہانہ کارخانہ اور امیرانہ ٹھاٹ رکھتے تھے، سو تو فقط خدمت گار تھے جو اپنی نوکری پر حاضر ہوتے، وہ دونوں وقت شیخ صاحب کے دسترخوان پر کھانا بھی کھاتے، کئی طبیب ملازم تھے، اور الگ دواخانہ تھا اور یہ اذن عام تھا کہ غریب محتاج جس دوا کے لئے آئیں لے جائیں۔

شیخ صاحب موصوف کا تعلق حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ سے اس وقت ہوا جب سال ڈیڑھ سال پیشتر آپ پہلی مرتبہ الٰہ آباد تشریف لائے تھے، اس وقت شیخ غلام علی دوسرے حال میں تھے، عام امرا ورؤسا کی طرح شراب، تاڑی، حقہ، مدک اور چرس وغیرہ کے عادی تھے، ہر طرح کی شراب اور اس کے لئے طرح طرح کے ظروف اور پیالے صراحی وغیرہ ان کے یہاں موجود رہتے تھے، مختلف طرز کے سنہرے اور روپہلے حقے، بیش قیمت نیچے وغیرہ استعمال ہوتے تھے، حضرت جب پہلی مرتبہ الٰہ آباد میں تشریف لائے اور انہوں نے خدمت میں حاضری دی تو آپ کے دست حق پرست پر تمام منہیات شرعیہ سے تائب ہوئے، اور مخلص ارادت مندوں میں شامل ہوئے، مرید ہونے کے بعد شراب اور حقے کے ساز وسامان کو توڑ پھوڑ کر دریا میں ڈلوادیا، بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ انہیں ضائع کرنے کے بجائے بیچ ڈالئے، فرمانے لگے: نعوذ باللہ میں برا جان کر بیچ ڈالوں اور دوسرے لوگ اس بلا میں مبتلا ہوں، مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا، جو برتن چاندی کے تھے انہیں توڑ کر اپنے توشک خانے میں داخل کرلیا، باقی سب دریا میں پھنکوا دیا۔

وقائع احمدی میں ہے:

> ”حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے معتقد صادق اور مخلص بے ریا اور محبّ باوفا تھے کہ میں نے تو آج تک کسی کو نہیں دیکھا“۔ (ص ۶۳۳)
>
> ”مرید ہونے کے بعد انہوں نے ہمیشہ موٹا کپڑا استعمال کیا، بغیر بستر بچھائے کھلی چارپائی اور چھوٹی چارپائی پر کہ پیر نہ پھیلائے جاسکیں، سونے لگے“۔ (کاروان ایمان و عزیمت ص ۱۰۸)

شیخ کا بنگلہ دریائے جمنا کے ساحل پر تھا، اس بنگلہ سے ساٹھ ستر قدم کے فاصلے پر راجہ بنارس اودت نرائن کی دومنزلہ وسیع وعریض کوٹھی تھی، شیخ صاحب حضرت کو اپنے بنگلہ پر لے آئے، پھر کوٹھی دکھانے لے گئے، اسی کوٹھی میں حضرت کے قافلہ کے قیام کا انہوں نے انتظام کر رکھا تھا، اس میں مردانہ مکانات الگ تھے، اور زنانہ مکانات علیحدہ تھے، یہ دومنزلہ کوٹھی تھی، حضرت نے نیچے اوپر سب ملاحظہ کیا، اور خوشی ظاہر فرمائی، شیخ صاحب نے ہر ایک کمرے اور مکان میں پلنگ اور فرش وغیرہ پہلے ہی بچھوادیئے تھے، اور ضروری اسباب رکھوادیئے تھے، کوٹھی کو دیکھ کر آپ بنگلہ پر آئے، کچھ دیر کے بعد قافلہ کی باقی ماندہ کشتیاں بھی ساحل پر بنگلہ کے نیچے آگئیں، وہ پورا قافلہ مرد وعورت سمیت مذکورہ کوٹھی میں حضرت کی ہدایت وتقسیم کے مطابق فروکش ہوگیا، مردانہ حصہ کا ایک حصہ آپ کے تصرف میں رہا، شیخ صاحب نے پورے قافلہ کی ضیافت کی، کھانے میں پلاؤ اور بریانی تھی، حضرت کا قیام وہاں پندرہ روز سے زیادہ رہا، دن میں دوبار کھانا شیخ صاحب کی طرف سے آتا، دن میں پلاؤ کی دیگیں آتیں اور پورانی ہرروز شام کو خمیری روٹیاں، گوشت اور دہی وغیرہ مٹھائی بہت افراط سے ہوتی، اس وقت قافلہ میں سات سو افراد ہوچکے تھے، ان کے علاوہ شہر کے غربا بھی دسترخوان پر ہوتے، روزانہ ڈیڑھ دوہزار آدمیوں کا کھانا پکتا تھا۔

شیخ غلام علی سے الہ آباد کے بعض اصحاب ثروت نے عرض کیا کہ حضرت سید صاحب آپ کے یہاں اترے ہیں اور ہرروز آپ ہی طرف سے دعوت ہوتی ہے، ہم لوگوں کی بھی آرزو ہے کہ ہم بھی حضرت کو اپنے مکان پر لے جائیں، اور خدمت کریں، کھانا کھلائیں، شیخ نے ان سے بہت خوشامد کے ساتھ کہا کہ ”بھائیو! ضیافت کا احسان تو میرے ہی اوپر رہنے دو، تم کوئی تکلیف نہ کرو، اور جو تمہاری خوشی ہو تو کچی دعوت کرو۔ وہ یہ کہ اپنے گھر لے جاؤ، نذر پیش کرو،

پان کھلاؤ، عطر لگاؤ، گھر والوں کو بیعت کراؤ۔ شیخ صاحب کی بات سب نے قبول کی، پھر لوگ ایک ایک کر کے سید صاحب کو اپنے گھر لے جاتے، اپنے اہل وعیال کو مرید کراتے، کچھ نذرانہ پیش کرتے، نذرانہ کے علاوہ اگر کسی کو دعوت ہی کرنی منظور ہوتی تو دعوت کے لئے رقم پیش کرتے، کسی نے دوسو، کسی نے سو، کسی نے پچاس اور کسی نے پچیس روپے پیش کئے۔

کچی دعوت:

چنانچہ مولوی کرامت علی صدر امین، شیخ محمد تقی، بستی میاں اور نجیب خان نے دو دو سو روپے پیش کئے، کچھ لوگ وہاں جوتوں کے سوداگر تھے، جیسے حافظ نجابت علی، محمد حسین اور عبدالقادر وغیرہ انہوں نے آپس میں مل کر دوسو روپے حاضر کئے، قلعہ کے میگزین کے خلاصیوں نے دوسو روپے جمع کر کے پیش کئے، دعوت اور نذر کے یہ تمام روپے حضرت نے اپنے خزانچی مولانا یوسف صاحب کے پاس رکھوا دیئے۔

برکت کی انتہاء:

ایک روز مولانا یوسف صاحب نے حضرت سے کہا کہ میرے پاس روپیوں کی جو تھیلی ہے وہ بھر گئی ہے، باقی پیسے میں نے دوسروں کے پاس رکھ دیئے ہیں، اب اس کی کیا تدبیر کی جائے؟ آپ نے فرمایا سب روپے جمع کر کے ایک صندوق میں رکھ دیجئے اور وہ سات روپے جو آپ کے پاس کپڑے میں بندھے ہوئے ہیں، وہ بھی اسی میں رکھ دیں، اور کچھ رقم بقدر خرچ کرنے کے اپنے پاس رکھو، چنانچہ مولانا نے ایسا ہی کیا۔

حضرت کی دعا کی برکت:

الہ آباد میں رنجیت خاں میواتی حضرت کے بڑے معتقد تھے، اور بڑے سوداگر اور صاحب ثروت تھے، وہ بھی حضرت کی خدمت میں پیش پیش تھے، پہلے وہ بہت غریب اور مفلوک الحال تھے، حضرت سال ڈیڑھ سال پہلے جب الہ آباد تشریف لائے تھے، اس وقت وہ نہایت مفلس اور پریشان حال تھے، اور شیخ محمد تقی صاحب جو الہ آباد کے بڑے رؤوسا میں تھے، ان کے یہ دوست بھی تھے، اور ان کے یہاں ملازمت بھی کرتے تھے، شیخ محمد تقی کئی بار اس موقع پر حضرت سے درخواست کی کہ رنجیت خان کے لئے دعا فرمادیں، حضرت نے وعدہ فرمایا کہ ہم ان شاء اللہ

ضرور دعا کریں گے۔

اب سنئے کہ رنجیت خاں کے لئے دعا کیوں کر ہوئی؟ اور اس کی قبولیت کس شان سے ہوئی؟ واقعہ یہ ہوا کہ انہیں دنوں حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ ایک روز بستی میاں کے گھر تشریف لے گئے، شیخ محمد تقی بھی ہمراہ تھے، ایک شخص نے بستی میاں کو اطلاع دی کہ دھومن خان رافضی کئی ہتھیار بند لوگوں کے ساتھ سید صاحب کی واپسی کی راہ پر بیٹھا ہوا ہے کہ جب سید صاحب ادھر سے آئیں گے تو میں اپنے لوگوں سے تبرا کہلاؤں گا، بستی میاں کو غصہ آیا، انہوں نے اپنا آدمی بھیجنا چاہا کہ دھومن خاں سے کہہ دے کہ تم نے جو فساد کا ارادہ کیا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے، سید صاحب ہمارے پیر و مرشد ہیں، اور ہمارے مہمان ہیں، اگر فساد ہی کرنا منظور ہو تو جواب دو، پھر جو کچھ ہوگا ہم بھی دیکھ لیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ بے جا بات ہے، فساد کرنا کچھ ضرور تو نہیں، ہم وہ راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے سے چلے جائیں گے، انہوں نے عرض کی کہ حضرت سلامت! یہ بات ہرگز نہ ہوگی، ہم اسی راستے سے چلیں گے، اگر آج اس سے ہم دب جائیں گے تو ہمیشہ دبایا کرے گا، آپ کچھ دیر یہیں ٹھہریں، ہم خود ہی بندوبست کر لیتے ہیں۔ اب انہوں نے بجائے دھومن خان کے انگریز جنرل کے پاس آدمی بھیجے، اور ساری صورت حال اسے بتا دی اور کہا کہ اندیشۂ فساد ہے، آپ اس کا کچھ انتظام کریں، جنرل کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ دھومن خان پر بہت خفا ہوا، حالانکہ دھومن خان انگریزی حکومت میں بڑا معزز تھا، کیوں کہ یہ بستیوں کا اجارہ دار اور حاصل گزار تھا، جنرل نے بستی میاں کو پیغام کہلایا کہ آپ بے فکر رہیں، ہم انتظام کئے دیتے ہیں، پھر جنرل نے اپنا چپراسی کوتوال کے پاس بھیجا کہ رائے بریلی کے سید صاحب جو شاہ اجمل کے دائرے میں ٹھہرے ہیں، اور آج وہ بستی میاں کے گھر ہیں، دھومن خان اپنے کچھ سپاہیوں کے ساتھ فلاں راستے پر فساد کی نیت سے بیٹھا ہوا ہے، تم اس کا انتظام کرو، اور شہر کے ہر تھانے کو ہدایت کر دو کہ سید صاحب جس وقت اور جہاں چاہیں، آتے جاتے رہیں، شہر میں کوئی مزاحمت نہ کرے۔ کوتوال کو جب یہ حکم ملا تو اس نے فوراً ایک جمعدار اور دس سپاہیوں کو دھومن خان کے پاس بھیجا کہ راستہ خالی کر کے وہ اپنے مکان پر چلا جائے، اس کے چلے جانے کے بعد پھر بستی میاں کو اس انتظام کی خبر کر دو، اور سید صاحب کو بتا دو کہ شہر میں وہ کہیں بھی بے تکلف آ جا سکتے ہیں،

کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

حضرت وہاں سے اٹھے، ساتھ یہ دسوں سپاہی مع جمعدار کے تھے، بستی میاں کے گھر سے ابھی نکلے ہی تھے کہ دیکھا کہ رنجیت خاں پندرہ بیس بندوقچیوں کے ساتھ آپ کی حفاظت کے ارادے سے آرہے ہیں، آپ نے ان سے فرمایا کہ گھر جاؤ، اور ہتھیار کھول دو، شام کو شیخ تقی کے مکان پر ہم سے ملنا۔

شام حضرت نے مغرب کی نماز چوک کی مسجد میں پڑھی، رنجیت خان اپنے لوگوں کے ساتھ وہاں حاضر تھے، نماز کے بعد آپ سب کو لے کر شیخ تقی کے مکان پر آئے، حضرت نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ اس وقت جب رنجیت خان اپنے لوگوں کے ساتھ ہماری حفاظت کے لئے آئے تھے، اور ہتھیار باندھے ہوئے تھے، تو ایک بلوے کی صورت ہوگئی تھی، یہ بات ہم کو پسند نہیں آئی، مگر ان کی ہوشیاری، دلیری اور خیر خواہی سے ہمیں بہت خوشی ہوئی، آپ شیخ بھائی ان کے لئے ہم سے کیا کہتے ہو؟ انہوں نے عرض کی کہ یہ بھائی بھتیجے بھی حاضر ہیں، اور میں بھی امیدوار ہوں، آپ میرے لئے اور سب بھائیوں کے لئے دعا فرمادیں، اس مجلس میں شیخ تقی کے بھائی شیخ عبداللہ بھی آگئے، ایک لڑکا جوان کا بھتیجا یا بھانجا تھا، قادر بخش اسے بھی بلایا، اور عرض کیا یہ یتیم ہے، اس کے واسطے بھی دعا کریں، حضرت نے اسے اپنے پاس بٹھالیا، اس مجلس میں تیس چالیس آدمی تھے، آپ کا دعا میں ایک خاص انداز تھا، وہ یہ کہ سر سے صافہ اتار دیتے، اور ننگے سر نہایت الحاح وزاری کے ساتھ دعا فرماتے، چنانچہ اسی شان سے آپ نے دعا فرمائی اور سامعین نے آمین کہی۔

دعا سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے ایک دستار منگائی، اور رنجیت خان کے سر پر باندھ دی، اور خلافت نامہ لکھ کر دیا، اور روزی کی فراخی اور کشائش کے لئے برکت کے پانچ روپئے دیئے، ایک روپیہ ان کے بھائی کو دیا، اور دستار خلافت بھی دی، اور بھی متعدد لوگوں کو ایک ایک روپیہ دیا، اور قادر بخش کے واسطے فرمایا کہ ابھی تو یہ نابالغ لڑکا ہے، مگر جب بالغ ہوگا تب ان شاء اللہ اس کا حال دیکھنا کہ کیا خیر وبرکت اس کے نصیب میں ہوتی ہے۔

حضرت کی اس دعا کے بعد رنجیت خان کا حال بدلا، اللہ نے دینداری کے ساتھ مال

ودولت سے خوب نوازا۔

الٰہ آباد اوراس کے اطراف ونواح کا انتظام:

موضع جھنی میں حضرت نے وعدہ کیا تھا کہ شیخ لعل محمد کو الٰہ آباد میں کچھ تعلیم کریں گے، کچھ تدبیر بتائیں گے، چنانچہ شیخ لعل محمد، شیخ محمد وزیر، ان کے چاروں بیٹے اور موضع چھری کے دونوں بھائی زمیندار خدمت میں حاضر ہوئے، اور ہر ایک کے ساتھ ان کی بستیوں کے کافی لوگ تھے، ان میں جن لوگوں نے ابھی تک بیعت نہیں کی تھی، وہ بیعت ہوئے، حضرت نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ ان بھائیوں کو نماز روزہ، حج وزکوٰۃ وغیرہ کے ضروری مسائل تعلیم فرمائیں، پھر ہمارے پاس لایئے، جو کچھ ہم کو کہنا ہوگا ہم کہیں گے۔

مولانا نے سب کو اکٹھا کر کے مسائل سمجھائے، پھر حضرت کی خدمت میں لے گئے، آپ نے شیخ لعل محمد کو، شیخ محمد وزیر اور ان کے دونوں بیٹوں کو اور چھری کے دونوں بھائیوں کو خلافت نامہ دیا، اور اپنا خلیفہ بنایا، اور جو لوگ آنے والوں میں مناسب تھے انہیں بھی خلافت سے نوازا، کسی کو کرتا دیا، کسی کو عمامہ، کسی کو ٹوپی عطا فرمائی، اور سب کے لئے دعا کی، اور شیخ وزیر کو ایک روپیہ برکت کا دیا۔

پھر سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

’’بھائیو! کچھ مدت للہ فی اللہ اپنے نواح اور اطراف کی بستیوں میں دورہ کرو، اور مسلمانوں کو توحید اور طریق اسلام سکھاؤ، اور شرک وبدعت سے بچاؤ، اللہ تعالیٰ تم کو اجر عظیم عطا کرے گا‘‘۔

حضرت کا یہ کلام سن کر سب نے عرض کی کہ آپ کا فرمانا سچ ہے، مگر ہم کو عذر یہ ہے کہ ہم اقسام شرک وبدعت سے واقف نہیں کہ کن کاموں کو شرک کہتے ہیں؟ اور کن کو بدعت؟ دوسرے یہ کہ عموماً لوگ شعائر اسلام سے محض ناواقف ہیں، ان کو ہدایت کی باتیں سکھانا اور راہ راست پر لانا، ہم لوگوں کے لئے بہت دشوار ہے۔ آپ نے فرمایا:

’’ان کی ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، نہ میرے اختیار میں ہے نہ تمہارے اختیار میں، جو تم اس امر میں للہ فی اللہ چند مدت کوشش کروگے تو اس کا اجر عظیم خدا سے پاؤگے، اور مفت

میں جنت کماؤ گے"۔

یہ بشارت سن کر وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آپ کا فرمان قبول ہے، پھر عصر کا وقت ہوگیا، نماز پڑھ کر آپ شیخ غلام علی صاحب کے بنگلے پر تشریف لے گئے، پیچھے سے وہ لوگ بھی حاضر خدمت ہوئے، شیخ صاحب نے پوچھا کہ آپ نے ان لوگوں رخصت کرنے کی کیا تدبیر کی ہے؟ آپ نے فرمایا، کچھ باتیں تعلیم کرنی ان کو باقی ہیں، وہ تعلیم کر کے ایک دو روز میں رخصت کر دیں گے، ان لوگوں نے عرض کی کہ لوگوں کو تعلیم و تلقین کرنے کو جو آپ نے فرمایا، اگر اس کے لئے شیخ صاحب کو بھی مقرر فرما دیں تو ان کی وجہ سے ہم لوگوں بڑی قوت حاصل ہوگی، اس لئے وہ یہاں کے نامی سردار ہیں، اور بڑے علاقہ دار اور صاحب اقتدار ہیں، آپ نے فرمایا کہ میرا بھی یہی ارداہ تھا، مگر تم نے اس وقت کہا تو خوب کہا، اور شیخ صاحب سے فرمایا کہ شیخ بھائی! تمہارے علاقے کی بستیوں میں جو مسلمان بستے ہیں ان کی تعلیم و تلقین کے لئے ہم نے تم کو مقرر کیا، شیخ صاحب نے کہا کہ آپ کا فرمانا بجا ہے مگر میں ابھی خود آپ کی تعلیم اور تلقین کا محتاج ہوں، اور مزید اس علاقے کے لوگ طریق اسلام سے محض نابلد ہیں، کوئی ان کو کیوں کر تعلیم کرے گا؟۔

حضرت نے فرمایا کہ شیخ بھائی! اک ذرا تم پس وپیش نہ کرو، ان کو ہدایت تو اللہ اپنے فضل وکرم سے کرے گا، تم جو چند روز ان کو دین اسلام سکھاؤ گے تو اجر عظیم پاؤ گے۔ اور اس کی تدبیر بہت آسان ہے، وہ یہ ہے کہ ان زمیندار لوگوں کا اکثر کاروبار سرکار ودربار سے تعلق رکھتا ہے، تم ان کے حامی ومددگار رہو، وہ تمہاری سرکار کے مال گزار ہیں، اس میں جس قدر تم سے ہو سکے حسب استطاعت روپے لینے میں تخفیف کرو، تمہارا یہ احسان جب ان پر ہوگا تو جو کچھ تم ان سے کہو گے، سب بغیر انکار کے مانیں گے۔

شیخ صاحب نے کہا "اگر یہی بات ہے تو بہت آسان ہے، ان شاء اللہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔[۲]

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) میاں دین محمد نے حضرت سید صاحب سے اس وقت ایک خواب بیان کیا تھا جب حضرت مغربی یو پی کے دورے سے واپس تشریف لا رہے تھے، راستے میں میاں دین محمد حضرت سے ملے تھے، وہ دہلی سے حضرت کی طلب پر آئے تھے، حضرت نے ان سے دہلی کی خیر و عافیت دریافت کی، انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی علیہ الرحمہ کی خیریت اور اپنے احوال بیان کئے، حضرت نے مکرر فرمایا کہ ہم یہ نہیں پوچھتے، اس کے سوا اور جو تم پر گزرا ہو بیان کرو، تب ان کو ایک معاملہ یاد آیا، جسے انہیں کی زبان میں سنئے، کہتے ہیں:

’’میں ایک روز دہلی میں مغرب کی نماز میں گیا، دو رکعت نماز ہو چکی تھی، میں تیسری رکعت میں شریک ہوا، اسی دوران میرے کان میں آواز آئی کہ تو حج کی تیاری کر اور جلد آ، میں سن کر متفکر سا ہوا کہ یہ کون کہتا ہے؟ پھر امام کے سلام پھیرنے کے بعد باقی نماز کے لئے اٹھا، تو پھر وہی آواز آئی کہ ہم تجھ سے کہتے ہیں کہ تو حج کو جا، پھر تیسری رکعت میں بھی آواز آئی کہ تو کس بات کی فکر کرتا ہے؟ اپنے حج کی تیاری کر اور جا۔

جب میں نماز پڑھ چکا تو میرے دل میں تشویش پیدا ہوئی کہ الٰہی یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے ان تینوں آوازوں کا مضمون خوب نہیں سمجھا، جو کچھ حال ہو مجھ کو آج خواب میں معلوم ہو جائے، پھر اسی رات کو مجھ سے کسی نے خواب میں کہا کہ تو حج کو جانے کی تیاری کر، پھر میں جگ گیا۔

اس کے بعد پھر ایک رات میں نے خواب میں آپ کو دیکھا کہ فرماتے ہیں، دین محمد! خاطر جمع رکھ، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو سب کام تیرا درست ہوگا، کسی بات کا اندیشہ نہ کر‘‘۔

آپ نے فرمایا، میں اسی کو پوچھتا تھا، سو خوب کیا کہ تم ہمارے پاس چلے آئے۔

(۲) سید صاحب کا یہ سفرنامۂ حج مکمل نہیں ہے، والد صاحب کے مسودے میں ہم کو اتنا ہی ملا، سو ہم نے اسے نقل کر دیا کہ اتنے سے بھی سید صاحب کی عزیمت و رفعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ترجمہ مقدمہ ’’الیاقوت والمرجان فی لغات القرآن‘‘

تعارف ’’الیاقوت والمرجان فی لغات القرآن‘‘:

رب یسر ولاتعسر وتمم بالخیر یافتاح بک نستعین

الحمدللہ الذی جعل القرآن العظیم سراجا وھاجا فانقشت ظلمات الکفر وھدی بہ الناس فدخلوا فی دین اللہ افواجا وبعث محمداً خاتم النبیین نبیاھادیا ورسولا فانا ربہ سبلاً فجاجا صلی اللہ علیہ وبارک وسلم وعلیٰ الہ وصحبہ الذین تدفقت النھارجدودھم امواجا فامواجا۔ اما بعد!

کتاب اللہ کے معانی ومطالب کو سمجھنے کے لئے بنیادی چیز قرآن کریم کی زبان کو جاننا ہے، کتاب الٰہی کی تفسیر وتاویل کو جاننے اور سمجھنے کے لئے یہ پہلا مرحلہ ہے، اس کے بعد دوسرے مرحلے آتے ہیں، جیسے علم نحو، صرف اور علم بلاغت، علم ادب کی باریکیاں، لغت کے حقائق ودقائق وغیرہ، اس لئے علماء اسلام میں لغت عربی کے ائمہ نے، لغات قرآن کے حل کرنے، اس کے نادر الفاظ کی شرح کرنے، اور اس کے مشکلات کی تشریح وتوضیح کرنے کا ہر چیز سے پہلے اہتمام کیا ہے، چنانچہ حسب ذیل ائمہ لغت کی تالیفات معروف ہیں۔

(۱) امام ابوعبیدہ معمر بن مثنی بصری متوفی ۲۱۰ھ انہوں نے اس موضوع پر پہلے ایک مختصر سی، پھر ایک بڑی کتاب تصنیف کی، غالباً وہ ’’مجاز القرآن‘‘ نامی کتاب ہے اور وہ طبع ہو چکی ہے۔

(۲) ابوالحسن نضر بن شمیل مازنی متوفی ۲۰۴ھ۔

(۳) ابوسعید عبدالملک بن قریب اصمعی متوفی ۲۱۶ھ۔

(۴) محمد بن مستیز (قطرب) متوفی (۲۰۶)

(۵) امام ابوعبید قاسم بن سلام بغدادی متوفی ۲۲۴ھ

انہوں نے قرآن کے مشکل اور نادر الفاظ کے ساتھ حدیث کے الفاظ بھی ذکر کیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو۔ مقدمہ النہایہ لابن الاثیر وکشف الظنون)

(۶) امام ابومحمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ھ۔

امام سیوطی الاتقان کی چھتیسیویں نوع معرفۃ غریب القرآن میں لکھتے ہیں:

غریب قرآن کے موضوع پر بکثرت علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً ابوعبیدہ، ابوعمر زاہد بین درید اور ان میں مشہور تر عزیزی کی کتاب ہے جس کی ترتیب وتالیف میں وہ اور ان کے استاد ابوبکر بن الانباری پندرہ سال تک مشغول رہے اور اس موضوع پر عمدہ ترین کتاب راغب اصفہانی کی المفردات ہے ابوحیان اندلسی نے بھی اس موضوع پر ایک مختصر سی کتاب دو جزء میں تالیف کی ہے۔

ابن صلاح فرماتے ہیں کہ تفسیر کی کتابوں میں جہاں کہیں یہ لکھا دیکھو کہ ''اہل معانی کا قول ہے'' تو اس سے مراد وہ اہل علم ہوتے ہیں جنہوں نے قرآن کے معانی پر کتابیں لکھی ہیں۔ جیسے زجاج، فراء، اخفش اور ابن الانباری۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ ائمہ لغت ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے غریب اور نادر کلمات کو حل کرنے کا اہتمام کیا، کیونکہ کتاب الٰہی کے سمجھنے کا یہی پہلا مرحلہ ہے اس اہتمام وکاوش سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالص اہل عرب جو اہل زبان ہیں وہ بھی قرآن کریم کے مشکل الفاظ اور نادر وکمیاب کلمات کے حل کرنے سے مستثنیٰ نہیں۔ پھر سمجھا جاسکتا ہے کہ اہل عجم کو اس کی کس قدر ضرورت ہوگی۔

دورِ حاضر میں متعدد اہل علم حضرات نے قرآن کریم کے مفردات کو اردو زبان میں حل کرنے اور ان کی توضیح وتشریح کا اہتمام کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے بہت نفع پہونچایا، ان کی تصنیفات طبع ہوچکی ہیں اس دور اخیر میں جس بزرگ عالم نے لغات قرآن کے حل کرنے کے لئے خاص توجہ کی ہے اور ان کی اچھی شرح کی ہے وہ دور حاضر کے زاہد، بلاد سندھ کے عارف باللہ اور فقیہ ومحدث حضرت شیخ مولانا حمّاد اللہ بن محمود بن حمّاد اللہ ہالیجوی سندھی رحمہ

اللہ ہیں، انہوں نے کتب لغت کی ترتیب کے مطابق لغات قرآنی کی تفہیم وتشریح کے لئے ایک بیش قیمت کتاب تالیف فرمائی ہے، انہوں نے اپنی اس کتاب میں صرف اس پر اکتفاء نہیں کیا ہے کہ امام راغب اصفہانی کی مفردات جیسی کتابوں سے حل وتشریح کے لئے عبارتیں نقل کردیتے۔ بلکہ انہوں نے کتب لغت کو بھی پیش نظر رکھا۔ جیسے قاموس صراح اور منتہی الادب اور لغت کی بعض جدید کتابیں، اسی طرح کتب تفسیر مثلاً زمخشری کی کشاف، امام رازی کی تفسیر کبیر، علامہ ابن کثیر کی تفسیر سے بھی استفادہ کیا ان کتابوں سے بلند مضامین، عمدہ کلام اور اہم وضروری تحقیقات نقل کی ہیں۔

پھر مزید یہ کہ اتنے ہی ماخذ پر بس نہیں کیا، نحو کی کتابوں سے بھی بحثیں اخذ کی، اور اہم مسائل کو ذکر کیا۔ چنانچہ الف لام کی بحث ’’الا‘‘۔ ہمزہ کے فتحہ اور لام تخفیف کے ساتھ۔ اور ’’اِلَّا‘‘ حرف استثناء کی بحث، حروف جارہ میں ’’اِلیٰ‘‘ کی بحث اور جو چیزیں اہمیت کی حامل ہیں، انہیں موقع موقع پر ذکر کیا ہے۔

ان تحقیقات اور بحثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موصوف کو علم ادب میں خصوصی مہارت تھی اور مسائل وتحقیقات کے انتخاب میں ان کا ذوق کس قدر بلند تھا۔

پھر حضرت نے صرف حل لغات پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ قرآن کریم کے اندر آئے ہوئے ہر کلمہ کی شرح کی ہے، خواہ وہ ماضی ہو، مضارع ہو، فاعل ہو، مفعول ہو، مثبت ہو، منفی ہو۔ پھر ان کے صرف ذکر پر قناعت نہیں کی بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہ لفظ کس پارے اور کس رکوع میں آیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ اپنی اصلی صورت میں کیا معنی رکھتا ہے اس طرح یہ فقط قرآن کی کتاب لغت نہیں ہے بلکہ الفاظ قرآنی کی فہرست بھی ہے جو بتاتی ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ کہاں کہاں آیا ہے۔ پس یہ کتاب ان دونوں عظیم فائدوں کی جامع ہے۔

اس کتاب سے ناظرین بیک وقت یہ بھی معلوم کرسکیں گے کہ یہ کلمہ کہاں کہاں مذکور ہے اور اسی کے ساتھ اس کی شرح بھی معلوم ہوجائیگی اور جہاں جہاں یہ لفظ مذکور ہے اگر ان جگہوں میں معانی کے اندر کچھ فرق واختلاف ہے تو وہ بھی معلوم ہوجائیگا، پھر حضرت موصوف نے عموماً ثلاثی مجرد کے ابواب ذکر کرنے کا التزام فرمایا ہے۔ یہ ایک عظیم لغوی فائدہ پر مشتمل ہے، جس کی قدر وہی کرسکتا ہے جسے عربی زبان میں معانی کے فرق واختلاف جاننے کا اہتمام ہو، اور وہ جانتا ہو کہ

ابواب کے بدل جانے سے معانی میں کچھ تغیر آ جاتا ہے اسی طرح مصدر کے بدلنے سے بھی معنی بدلتا ہے۔ یہ ایک ادبی اور لغوی مرحلہ ہے۔

یہ اور اس طرح کے التزامات واختیارات بتاتے ہیں کہ عارف سندھی کا ادبی اور لغوی ذوق بہت بلند تھا جیسا کہ اہل زبان کا ذوق ہوتا ہے۔

حیرت انگیز معاملہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو عرب سے دور بلاد سندھ میں پیدا ہوتا ہے اور یہیں کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتا ہے، اور ایسے لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے جنہیں ذوق ادب سے مس تک نہیں، اور نہ وہ زبان کے حقائق ودقائق کی کچھ خبر رکھتے پھر اس شخص کا ادبی کتابوں سے کچھ خاص اشتغال بھی نہیں، وہ اس درجہ اور خصوصیت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے یہ کیسی منفرد اور کامل عبقری شخصیت ہے۔ **وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم.**

خصوصیات کتاب:

اس کتاب کی چند خاص خصوصیات ملخصاً ہم ذکر کرتے ہیں۔

(۱) قرآن کریم کے الفاظ کی لغوی مادہ مجردہ کے لحاظ سے حروف تہجی کی ترتیب سے معجم مفہرس ہے۔

(۲) بجائے سورتوں کی ترتیب کے کتب لغت میں رائج ترتیب کے مطابق قرآن عزیز کے الفاظ کی شرح ہے۔

(۳) قرآن کریم کے الفاظ کی شرح بیک وقت لغت کے اعتبار سے بھی اور تفسیر کی کتابوں سے بھی۔

(۴) صرف حل لغات پر اکتفاء نہیں کی ہے بلکہ بہت سے اہم نحوی اور لغوی فوائد بھی ضمناً درج کردیئے ہیں۔

(۵) ثلاثی مجرد کے ابواب کو عموماً بالالتزام ذکر کیا ہے یہ اس کتاب کی خاص خصوصیت ہے

(۶) کسی لفظ کی شرح میں کئی اقوال ہیں تو ان سب کو ذکر کرکے معتبر اور قابل اعتماد تفسیری کتابوں سے ان میں سے کسی ایک کی ترجیح ذکر کی ہے۔ مثلاً ابن جریر طبری، ابن کثیر اور کشاف

زمخشری۔

(۷) صلہ کے اختلاف سے معانی میں جو تبدیلی آتی ہے اس کی وضاحت بھی کی ہے چنانچہ استویٰ کی شرح دیکھئے۔

(۸) کسی نادر لفظ کی شرح میں اگر کسی اعتقادی پہلو کو اختیار کرنا ہوتا ہے، تو اس کی صراحت فرماتے ہیں وہ عقیدہ میں سلف صالحین کے تابع ہیں، متاخرین کی تاویلات کو اہمیت نہیں دیتے۔ چنانچہ استویٰ کی مسئلہ میں اسکی تصریح کی ہے، نہ تکیف کو اختیار کیا نہ تشبہ کو، بلکہ تفویض کا راستہ اختیار کیا۔ جو ایک بے غبار راستہ ہے، لفظ کے ظاہر کو بھی نہیں اختیار کیا جیسا کہ بہت سے اہل ظاہر نے کیا ہے، بس وہ تشبہ میں یا اس کے قریب جا پڑے۔

یہ چند خصوصیات میں نے عاجلانہ اور طائرانہ نگاہ میں اخذ کئے ہیں ممکن ہے اور بھی خصائص ہوں جنہیں میں عجلت میں نہ پاسکا ہوں اور اگر اتنی ہی خصوصیات ہوں جب بھی فضل و امتیاز کے لئے بہت ہیں اور مجھے امید ہے کہ اس تالیف کی قدر و قیمت سمجھنے کے لئے یہ خصوصیات کافی ہیں اور اتنے ہی سے اصحاب علم و فضل کی توجہ اس کی طرف ہو جائیگی اور انہیں اس سے استفادہ کی رغبت ہوگی۔ میں اس کتاب کا نام ''الیاقوت والمرجان فی شرح لغات القرآن'' رکھتا ہوں۔

امام مؤلف کے حالات:

وہ شیخ عارف زاہد محدث فقیہ حماد اللہ بن محمود بن حماد اللہ ہالیجوی ہیں، ہالیجوی ایک چھوٹے سے گاؤں ہالیجی کی طرف نسبت ہے جو صوبہ سندھ کے ضلع سکھر میں واقع ایک شہر پنو عاقل کے مضافات میں ہے، یہی گاؤں شیخ کی جائے اقامت اور آبائی وطن ہے، یہیں انہوں نے ایک مسجد اور خانقاہ بنائی۔

تعلیم وتدریس کے ابتدائی دور میں آپ کے عالمانہ مزاج وطبیعت کو صوفیاء کے اذواق ورجحانات سے مناسبت نہ تھی، پھر جاذبہ توفیق الٰہی نے وقت کے مشہور بزرگ ایک بڑے عارف باللہ حضرت مولانا تاج محمود امروٹی کی حدمت میں پہونچا دیا، صوبہ سندھ کے ضلع سکھر میں امروٹ ایک بستی ہے، امروٹی کی نسبت اسی گاؤں کی طرف ہے۔

حضرت مولانا تاج محمود امروٹی علیہ الرحمہ اپنے دور میں سلسلہ قادریہ کے کامل ترین مشائخ میں سے تھے، حضرت مؤلف علیہ الرحمہ کو ان کی خدمت میں قرب وتوجہ کا بہت قوی رابطہ حاصل ہوا، اور ان کی نسبت کا عکس تمام وکمال حضرت مؤلف کے قلب وباطن میں اتر آیا، اس طرح وہ ان کے بہترین جانشین ہوئے، اور حضرت شیخ امروٹی نے انہیں بیعت وارشاد کی اجازتِ عامہ فرمائی، چنانچہ اپنے شیخ کی حیات میں ہی مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے، اور لوگ شیخ کے حکم سے ان کے ہاتھوں پر بیعت ہونے لگے۔

حضرت مولانا امروٹی فرماتے تھے کہ ”گھی تو سارا حماد اللہ لے گئے اور لوگوں کے لئے چھاچھ چھوڑ دیا“۔

حضرت موصوف چالیس سال تک اپنے گاؤں میں استقامت کے ساتھ بیٹھے اور مسلسل عبادت وریاضت، وعظ وارشاد، افتا اور لوگوں کی دینی وروحانی رہنمائی میں مشغول رہے، یہاں تک کہ ۱۳۸۱ھ میں جوار رحمت حق میں پہونچ گئے۔

شیخ کبھی اپنی کنیت ابو السعاد لکھتے ہیں، کبھی اپنا نام محمد حماد تحریر فرماتے ہیں۔

تالیفات:

حضرت شیخ نے متعدد کتابوں پر حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں، چنانچہ علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف پر، مشہور مجموعۂ قصائد ”سبع معلقات“ پر آپ کے حواشی ہیں، نیز صحابی جلیل حضرت کعب بن زہیر کے مشہور قصیدہ ”بانت سعاد“ اور شیخ بوصیری کے قصیدہ بردہ کی شرح فرمائی ہے۔

سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ کی طرف اللہ کے اسماء حسنی بصورت نظم منسوب ہیں، حضرت نے اس کی بھی شرح لکھی ہے اور یہ ساری تحریریں عربی میں ہیں، لغات القرآن کی ایک شرح سورتوں کی ترتیب سے بھی عربی زبان میں تالیف فرمائی ہے اور سورتوں کی ہی ترتیب پر سندھی زبان میں ایک شرح تحریر فرمائی ہے اور ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں آٹھ مسائل کے متعلق لکھا ہے۔

(۱) علم غیب کے متعلق کہ وہ حضرت حق جل مجدہ کے ساتھ مختص ہے اور جو کوئی غیر اللہ کے لئے غیب کلی کا دعویٰ کرے وہ کفر کا مرتکب ہوا۔

(۲) جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ کے ماسوا، خواہ انبیاء ہو یا اولیا، نفع ونقصان کے مالک ہیں، وہ کافر ہے۔

(۳) غیر اللہ سے استعانت اس اعتقاد سے کہ وہ مدد کرنے میں مستقل اور خود قادر ہیں کفر و شرک ہے۔

(۴) رقص وتواجد جو بعض صوفیا کرتے ہیں، حرام ہے۔

(۵) غیر اللہ کے لئے نذر ماننا یا، اس کے تقریب کے لئے منت ماننا حرام ہے اور جس چیز پر یہ نذر مانی گئی ہے، اس کا کھانا حرام ہے، فقرا کے لئے بھی درست نہیں ہے۔

(۶) "**مااهل به لغیر الله**" کی تحقیق اور یہ کہ ہر وہ جانور جو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا گیا ہو حرام ہے، اس کا کھانا حرام ہے اگرچہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

ہاں اس جگہ ایک بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اکرام ضیف اور تقرب الی غیر اللہ میں فرق ہے، اکرام صیف کے لئے جانور ذبح کرنا جائز ہے، وہ "**مااهل به لغیر الله**" میں داخل نہیں ہے، البتہ اگر تقرب وبندگی کی نیت ہو تو حرام ہے۔

(۷) یہ کہ گانے بجانے کے سب سامان حرام ہیں، سوائے دف کے، جو نکاح کے وقت اعلان کے لئے بجایا جائے یا جنگ کے لئے بجایا جائے۔

میں نے اس رسالہ کا نام "**الینابیع الصافیه فی حکم المسائل الثمانیه**" رکھا ہے۔

ان مسائل کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کا فقہی ذوق کس قدر صحیح اور بلند تھا، اور آپ کے صاف ستھرے، پاکیزہ ذہن میں جاہل صوفیہ کی کدورتوں کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

انہوں نے ان جاہل صوفیہ پر اور ان کی ان تحقیقات پر جو اس قسم کے مسائل میں بطور ادعا کے پیش کرتے ہیں، سب پر خط نسخ پھیر دیا ہے، وہ بلا شبہہ سنت کے سچے متبع تھے، اور ان کا فقہی ذوق بالکل درست اور بصیرت کا حامل تھا۔

آثار وباقیات:

حضرت شیخ ہالیجوی نے اپنے قریبی قصبہ پنو عاقل میں ایک دینی مدرسہ ۱۳۵۳ھ میں

قائم کیا، اس کا نام ''مدینۃ العلوم'' ہے، یہ ایک عمدہ اور قابل اعتماد مدرسہ ہے، اس کے نگران اور مدرس ہمارے دوست مولانا محمد امین اللہ بھاولپوری ہیں، وہ آپ کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہیں، اللہ نے انہیں اخلاص کی دولت سے نوازا ہے خود حضرت شیخ بھی دوسرے مدرسین کے ساتھ تدریسی اور تعلیمی خدمت میں حسبۃً للہ بغیر کسی تنخواہ کے مشغول رہتے ہیں، ان کے اخراجات ان کی ذاتی کاشتکاری سے پورے ہوتے ہیں۔

مزید یہ کہ شیخ نے وصیت کی تھی ان کی وفات کے بعد ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس کے اخراجات ان کی کاشت کے حصے سے پورے کئے جائیں۔

چنانچہ ان کے صاحبزادے اور خلیفہ محمود اسعد (**بارک اللہ فی حیاتہ وجھودہ**) نے پوری کی، اللہ تعالی انہیں ہر خیر وسعادت کی توفیق عطا فرمائے۔ (صاحبزادے محترم بھی جوار رحمت میں پہونچ چکے ہیں)

مزاج وشمائل:

حضرت مولانا شیخ حماد اللہ صاحب بڑے عالم وعابد، حلیم وزاہد اور باوقار بزرگ تھے، ریا اور دکھاوا سے بہت دور تھے، میں نے جن اہل صلاح وفلاح کو دیکھا ہے ان میں سب سے بڑھ کر زاہد تھے، اور اہل بیعت وارشاد میں مَیں نے ان سے زیادہ حلیم اور بردبار نہیں دیکھا۔

بڑے صاحب کشف تھے، آپ کا کشف نہایت صحیح اور صریح ہوتا مخلوق کی نفع رسانی کا بڑا جذبہ رکھتے تھے، علما ودرویشوں سے خاص محبت رکھتے تھے، مالداروں کا اثر ان کی مالداری کی وجہ سے یا اصحاب حکومت کا اثر ان کے عہدہ ومنصب کی وجہ سے ان کے قلب پر مطلق نہ ہوتا تھا۔

تکلیفوں اور ناگواریوں پر بہت صابر تھے، ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، ان کے گذر بسر کا کوئی تعلق لذیذ اور پر تکلف کھانے پینے سے قطعاً نہ تھا۔

وہ روزانہ فجر کی نماز پڑھانے کے بعد وہیں تشریف رکھتے، لوگ آپ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوتے، آپ انہیں بیعت کرتے، اذکار تلقین فرماتے، مسنون دعاؤں کی ہدایت فرماتے، اور لوگ دوسری حاجات کے لئے بھی آتے، اور آپ سب کی ضرورتوں کے پورا کرنے کا اہتمام فرماتے، لوگوں کو دعائیں تعلیم فرماتے اور دوائیں بھی بتاتے۔

آپ طبیب حاذق بھی تھے، آپ کی مجرب دوائیں ہوتیں، علاج کے مفید طریقے ہوتے تھے، آپ کے پاس دیہات کا ایک اکھڑ اور بے سلیقہ بدو آتا، وہ درخواست کرتا کہ میں بیمار ہوں میرے لئے دعا فرما دیجئے، آپ ہاتھ اٹھاتے اور دعا کرتے، اور دیر تک دعا کرتے، پھر وہ کہتا میرے لئے تعویذ لکھ دیجئے، آپ اسے لکھتے، پھر وہ کہتا میرے لئے دوا تجویز کر دیجئے، آپ اسے دوا بتاتے، اور دیر تک سمجھاتے کہ کیسے بنائے گا، اور کیسے استعمال کرے گا، پھر وہ کہتا میرے پاس پیسے نہیں ہیں کہ دوا خریدوں تو آپ اسے دواؤں کے بقدر رقم بھی دیتے اور اس سوال و جواب اور گفتگو میں خاصا وقت لگ جاتا لیکن ہم نے نہیں دیکھا کہ چہرے پر تکدر یا ملال کا کوئی اثر آتا ہو، یہ سب خوشی خوشی خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل لیتے۔ یہ میں نے خود دیکھا ہے، مجھے آپ کے اخلاق، قوت برداشت دیکھ کر حیرت ہوتی اور مزید حیرت اس وقت ہوتی جب اسی وقت میں فضل اور کرم کی بارش بھی ہونے لگتی۔ دوپہر تک آپ اس مشغولیت میں مسلسل رہتے، پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے گھر میں تشریف لے جاتے، پھر ظہر کی نماز کے لئے آتے اور خود ہی امامت فرماتے، نماز ظہر کے بعد عصر تک قرآن کی تلاوت کے لئے یکسو ہو جاتے، عصر کے بعد خطوط ملاحظہ فرماتے اور ان کے جواب تحریر فرماتے۔

آپ مسائل اور فتاوی بھی صادر فرماتے، کبھی دوسرے حضرات افتا کے فتوؤں کو ملاحظہ فرماتے، ان پر تصدیقی دستخط فرماتے یا تصحیح کی ضرورت ہوتی تو وہ کرتے، یہ سلسلہ نماز مغرب تک چلتا، مغرب کی نماز کے بعد آپ مصلی پر قوم کی جانب متوجہ ہو کر بیٹھ جاتے، اور لوگ بھی حلقہ بنا لیتے، پھر سلسلہ قادریہ کے طریقے پر اجتماعی ذکر فرماتے، لوگ پوری توجہ اور استحضار کے ساتھ ذکر میں شریک ہوتے، آپ کی توجہ نہایت مؤثر تھی، پھر عشا کی نماز پڑھاتے اگر مہمان وغیرہ ہوتے تو ان کی خاطر داری کا اہتمام فرماتے، کھانے اور بستر کا انتظام کرواتے، پھر گھر میں تشریف لے جاتے۔ یہ دستور آپ کے آخری دنوں تک رہا، آپ کی پوری زندگی عبادت، ارشاد، خدمت خلق سے عبارت تھی، اس سے نہ آپ کو اکتاہٹ ہوتی اور نہ چہرے پر کلال وملال کا کوئی اثر ہوتا۔ **سبحان الله! ذالک فضل الله یوتیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم.**

ارشادت کے نمونے:

حق تعالی کا ارشاد ہے۔ **فاولئک مع الذین انعم الله علیهم من النبیین**

والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقاً.

اس آیت کے سلسلے میں حضرت نے ارشاد فرمایا:

’’حضرات انبیاء وہ ہیں جن کے قلوب کو حق تعالی نے وحی الٰہی کا مورد اور محل بنایا ہے، ان حضرات پر اللہ تعالی وحی بھیجتے ہیں‘‘۔

’’صدیقین وہ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے وحی الٰہی کا مخزن اور برتن بنایا ہے، یہ حضرات وحی کی حفاظت کرتے ہیں‘‘۔

’’شہدا وہ ہیں جو وحی الٰہی کی حفاظت میں اپنی جان اور اپنا مال قربان کرتے ہیں‘‘۔

’’صالحین وہ ہیں جو وحی الٰہی کے احکام پر عمل کرتے ہیں‘‘۔

پس چاروں میں بلند مرتبہ ان کا ہے جن کو اللہ نے اپنی وحی اور کلام کا مورد اور مرکز بنایا، یہی حضرات اس کے حقائق کو خوب سمجھتے ہیں۔ یہ انبیاء کرام ہیں۔ **علیھم الصلوٰۃ والسلام**

پھر وہ ہیں جن کے قلوب وحی الٰہی کی حفاظت کے لئے مخزن بنائے گئے، پس وحی کا کوئی حصہ فراموش یا ضائع نہیں ہوتا، یہ صدیقین ہیں، پھر شہدا کا رتبہ ہے، پھر صالحین کا۔

راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ نے تفسیر فتح العزیز میں لکھا ہے:

’’نبی بارگاہ الٰہی کے نور سے قوت علمیہ کی جہت سے اثر قبول کرتا ہے پس اس کے سامنے اشیا اور ان کے حقائق کما حقہ واضح ہو جاتے ہیں اس طرح کہ اس میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا‘‘۔

نیز وہ قوت عملیہ کی جہت سے بھی اثر قبول کرتا ہے، اس سے اس کی طبیعت اور مزاج کو وہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے کہ اعمال صالحہ بغایت محبت اور رضا کے ساتھ بے تکلف صادر ہوتے ہیں، اور طبعی طور سے ناپسندیدہ اعمال سے انہیں تنفر ہو جاتا ہے، پھر جب ان کے جسمانی قویٰ درجۂ کمال کو پہونچ جاتے ہیں اور عقل تجربات سے گزر کر کامل اور پختہ ہو جاتی ہے تو انہیں مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث اور مامور کیا جاتا ہے، اور معجزات اور عقلی نشانیوں سے ان کی تائید کی جاتی ہے، ان عقلی نشانیوں کی وضاحت نبی کے اخلاق کریمہ، ان کے علام صادقہ، دلائل واضحہ،

بیان واضح اور مخلوق کے اندران کے انوار صحبت کی تاثیر سے ہوتی ہے، یہ نشانیاں اہل فضل وکمال کے لئے مفید ومرشد بنتی ہیں۔ اور دوسرے معجزات سے عام لوگ استدلال کرتے ہیں۔

صدیق وہ ہے جو اپنی قوت علمیہ میں تو نہیں لیکن قوت نظریہ میں نبی کے قریب تر ہوتا ہے، اور شہید وہ ہے جسے نبی کی لائی تعلیمات واحکام پر اس درجہ شرح صدر ہوتا ہے گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، ایسا شرح صدر کہ ان تعلیمات واحکام کے لئے اپنی جان اور اپنے مال کی قربانی کے لئے تیار رہتا ہے، گویا وہ اپنی قوت عملیہ میں نبی کے قریب تر ہوتا ہے۔

اور صالحین وہ ہیں جو اپنی ان دونوں قوتوں یعنی قوت نظریہ اور قوت علمیہ میں نبی کے قریب تر تو نہیں ہوتے لیکن وہ اپنی زندگی میں نبی کا اتباع کرتے ہیں، گناہوں سے اجتناب میں بھی، صحیح عقائد کے ساتھ انصاف میں بھی اور دوسرے احوال زندگی میں بھی۔

عرف میں ولی کا اطلاق صالحین پر ہوتا ہے گو کہ یہ لفظ تینوں گروہوں کو عام اور ان چاروں ''انبیاء، صدیقین، شہدا، صالحین'' میں قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ تعالی ان سب سے محبت فرماتے ہیں اور زمین میں ان کی مقبولیت عام فرمادیتے ہیں اور عام لوگوں سے علیحدہ ان کی روزی اور ضروریات کا تکفل فرماتے ہیں، ان کا حوصلہ بلند ہوتا ہے دنیاوی ساز وسامان سے انہیں تعلق نہیں ہوتا، ان کے قلوب روشن ہوتے ہیں، ان کے سامنے وہ حقائق روشن ہوتے ہیں جن تک عام عقلوں کی رسائی نہیں ہوتی۔

فائدہ ''حسنات الابرار سئیات المقربین'' کی شرح:

حضرت شیخ ہالیجوی نے فرمایا: ''ابرار وہ نیک لوگ ہیں جو جنت اور اس کی نعمتوں کی طلب میں اعمال صالحہ بجالاتے ہیں، ان کا مطمح نظر جنت کا وہ عیش وآرام ہے جو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ان کے لئے مہیا کر رکھا ہے، جو نعمتیں کہ دائمی ہیں اور جنت ابدی ہے۔

اور مقربین وہ ہیں جن کا مقصود صرف رضائے الہی ہے، وہ اللہ تعالی کی ذات پاک کو نگاہ میں رکھتے ہیں، حق تعالی کی ہستی کے سامنے ان کے ارادے اور ان کی خواہشیں فنا ہوتی ہیں، وہ ''محبت ذات'' کے درجے میں پہونچے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ابرار صفات کی محبت میں ہوتے ہیں، اس سے آگے ان کا عروج نہیں ہوتا، بس وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اللہ کی حمد کرتے ہیں تاکہ

انہیں وہ خدواندی نعمتیں حاصل ہوں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کسی شخص کے دو بیٹے ہوں، ایک بیٹا باپ کی خدمت اور اس کے ساتھ حسن سلوک اور محبت اس لئے کرتا ہے کہ باپ نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اس کی خدمت کے صلے میں وہ اسے فلاں فلاں انعام دے گا، بس اسے یقین ہے کہ اگر میں خدمت گزاری میں مستعد رہوں گا اور حسن سلوک کرتا رہوں گا تو وعدے کا استحقاق ہوگا، اور اگر نافرمانی کروں گا تو محرومی ہاتھ آئے گی تو ایسے شخص کی جب مراد پوری ہو جائے گی تو اس کی خدمت گزاری سست پڑ جائے گی، بلکہ ختم بھی ہو سکتی ہے، یا کسی وجہ سے اگر اسے مایوسی ہو جائے اور اپنی محرومی کا یقین ہو جائے جب بھی وہ خدمت سے ہاتھ اٹھا لے گا۔

اور ایک بیٹا وہ ہے جو باپ کی خدمت محض اس کی شخصیت اور ذات کی وجہ سے کرتا ہے اس کے دل میں وہ اغراض و مقاصد نہیں جو پہلے بیٹے کے سامنے تھے، اس کا حسن سلوک اور اس کی وفاداری کبھی ختم نہیں ہوگی، خواہ اسے کچھ نفع حاصل ہو یا نہ ہو۔ پہلا بیٹا ابرار کے درجے میں ہے، اور دوسرا مقربین کے درجے میں ہے۔

پس کوئی شبہہ نہیں کہ وہ نیک عمل جو ابرار مادی عوض کے غرض سے بجالاتے ہیں وہ ان مقربین کی نگاہ میں بڑا گناہ ہے جو صرف ذات الٰہی کی رضا کو غرض بناتے ہیں، ان کی محبت میں مادی اغراض کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ مقربین کا تعلق بہت مضبوط اور قوی تعلق ہوتا ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا، اور ابرار کا تعلق کمزور ہوتا ہے، وہ حصول مقصود کے بعد ساقط ہو سکتا ہے۔

ان دونوں میں فرق عمل کا نہیں نیت کا ہے، یہ دونوں ظاہر عمل میں متفق ہیں لیکن نیت میں مختلف ہیں، اعمال کا مدار نیتوں پر ہی ہے، اور آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔

فائدہ ''اللہ تعالیٰ کی معرفت'':

حضرات صوفیہ نے جو اللہ کی معرفت سے بہرور ہیں، ذکر کے چار طبقات بیان کئے ہیں۔ (۱) ناسوت (۲) ملکوت (۳) جبروت (۴) لاہوت۔

ناسوت:

انسان کا اس دنیاوی زندگی میں وجود و ظہور کا نام ہے، آدمی جب اس مرتبہ میں ہوتا ہے

تو وہ دو ساتھیوں کے ساتھ ہوتا ہے، نفس اور شیطان۔ نیز وہ بہت سی حاجات میں گھرا ہوا ہوتا ہے، مثلاً نفقہ، رہائش وغیرہ تو نفس دنیا کی لذتوں اور شہوتوں پر فریفتہ ہوتا ہے، چنانچہ حق تعالی کا ارشاد فرماتے ہیں:

زین للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة.

لوگوں کے لئے عورتوں اور بچوں، ڈھیروں سارے سونے اور چاندی کی خواہش مزین کردی گئی ہے۔

اور شیطان نفس انسانی کے لئے ان لذائذ اور شہوات کو، فسق وفجور کے گندے اعمال کو مزین کرتا رہتا ہے، حق تعالی نے متعدد آیتوں میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: **وزین لهم الشيطان.** شیطان نے ان کے لئے مزین کر دیا ہے۔ اور فرماتے ہیں: **فزین لهم الشيطان.** شیطان نے ان کے لئے مزین کر دیا ہے۔ اور حاجات بشریہ کا یہ حال ہے کہ آدمی خود اپنی طبیعت سے ان کی چاہت رکھتا ہے ان سب کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ محبوب وپسندیدہ ہوں، اور ان کی محبت دل کی گہرائیوں میں جمی ہوئی ہو، اور اس پر پورے طور سے مسلط ہو تو جب اللہ کے اسم ذات کو ذاکر اپنی زبان وقلب سے دہراتا ہے تو اس کا دھیان ہونا چاہئے کہ یہ سب محبتیں اس کے دل سے نکل جائیں اور صرف اللہ کی محبت دل کی گہرائیوں میں قائم ہوجائے تو جب وہ اللہ اللہ کہتا ہے تو گویا نفس وشیطان کو جواب دیتا ہے کہ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں، میں صرف اللہ سے محبت رکھتا ہوں، سوائے اللہ کے مجھے اور کسی سے محبت نہیں، بس اسی کو دہراتا رہتا ہے۔ یہ ذکر مرتبہ ناسوت ہے۔

پھر سالک اس مرتبہ سے ملکوت کے مرتبہ میں عروج کرتا ہے (ملکوت مَلَک سے صیغہ مبالغہ ہے) اب فرشتوں کے یہاں نفس کی دخل اندازی نہیں ہے اور نہ شیطان کی، اور نہ طبیعت بشری اور حاجات بشریہ کی، اور فرشتوں کا مقصد محض رضائے الٰہی ہے، پس اس مرتبہ میں جو ذکر ہے وہ محض رضائے الٰہی کے لئے ہے، لہٰذا اللہ اللہ کا تکرار محض اللہ کو راضی کرنے کے لئے ہے۔

پھر اس مرتبہ سے آگے بڑھتا ہے اور جبروت کے مرتبہ پر پہونچتا ہے، جبروت کا مرتبہ

اللہ تعالی کے اسماء وصفات کا مرتبہ ہے، اس مقام میں ذکر کرتے ہوئے سالک حق تعالی کے صفات بلند وبرتر، جلال وکبریائی، عظمت واحسان، مہربانی، رحمت وغیرہ کا لحاظ رکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اللہ تعالی کی صفات جلال وجمال کا مراقبہ کرتا ہے اور اسی میں غرق ہوکر اللہ اللہ کرتا ہے، کہ وہ اس جہت سے ذکر کا مستحق ہے۔ پھر دومرتبہ اللہ تبارک وتعالی کی ذات عالی کے دھیان میں اللہ اللہ کہتا ہے، یہاں صرف ذات کی نیت رکھتا ہے، اس طرح اللہ کا نام وہ آٹھ مرتبہ لیتا ہے اور ہر مرتبہ میں علیحدہ نیت رکھتا ہے، گویا نیتوں کے بدل جانے سے ہر مرتبہ تاثیر بدلتی رہتی ہے۔

اور شریعت میں اس کی نظیریں ہیں کہ ایک شے میں متعدد نیتیں ہوسکتی ہیں، اور نیت کے بدلنے سے اس کے اثرات بدل جاتے ہیں۔ اس طرح سو مرتبہ کہے، ہر مرتبہ آٹھ مرتبہ اسم ذات کو شامل ہوگا، گویا ایک تسبیح ذکر کرے گا تو آٹھ سو مرتبہ اسم ذات کا ذکر ہوگا، پس ذاکر کو ہر روز کم از کم ایک تسبیح اسی کیفیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہئے۔ (حضرت عارف سندھی سے میں نے یہ استفادہ کیا ہے)

فائدہ ''اہل معرفت کے طریقے پر ذکر کے متعلق افادہ'':

ذاکر کے لئے مناسب ہے کہ اسم ذات کا ذکر تین تصورات کے ساتھ کرے۔

اول یہ ہے کہ اس کا دھیان کرے کہ اللہ سبحانہ تعالی ہی محبوب حقیقی ہیں، کیوں کہ وہی خالق ورزاق ہیں اور وہی تمام نعمتیں بخشنے والے ہیں، انہیں کے دربار سے تمام الطاف واحسانات ہیں، پس یہ خیال رکھے کہ اس کا قلب اللہ تبارک وتعالی سے محبت کرتا ہے اور وہی محبوب حقیقی ہے، اس خیال اور مراقبہ کے ساتھ اسم ذات اللہ اللہ کا ذکر کرے۔

دوسرے یہ خیال رکھے کہ وہ اللہ سبحانہ تعالی سے مخاطب ہے، کیوں کہ ہر کمال وجمال کے منبع ومصدر وہی ہیں، اس لئے سارے کمالات انہیں کے لئے ہیں، اور اپنی ذات سے وہ ہر کمال اور ہر صفت کی نفی کرتا ہے، پس وہ اللہ کے کمال کا مراقبہ کرتا ہے، پھر اسے پکارتا ہے اور حرف ندا کے واسطے کے بغیر اسے ندا دیتا ہے۔ یہ حرف ندا لفظ میں تو نہیں ہے مگر اس کے ذہن اور تصور میں ہے اور مسلسل پکارتا ہے۔ اللہ اللہ اللہ اللہ

تیسرے یہ کہ اس بات کا دھیان رکھے کہ حقیقۃً موجود وہی ہے، اور اس کے ماسوا ہر چیز

گویا کہ وہ موجود نہیں ہے، کیوں کہ ہر ماسوی فانی، زائل ہے اور بقا سے محروم ہے، اس ذات عالی کے سوا ہر شے فانی اور ہالک ہے، پس اس تصور سے اللہ اللہ کرے۔

انہیں تینوں دھیان اور انہیں تینوں مراقبات کے ساتھ اسی ترتیب کے مطابق دیر دیر تک ذکر کرتا رہے، اور مناسب یہ ہے کہ کم از کم آٹھ ہزار مرتبہ دس تسبیح ذکر کرے اور کسی وجہ سے وقت میں گنجائش نہ ہو تو وسعت کے مطابق کرے اور کم از کم روزانہ سترہ مرتبہ تو کر ہی لیا کرے، اور ذکر خفی میں تلفظ جیسے چاہے کرسکتا ہے یا انشراح ہو تو جہر کے ساتھ بھی کرسکتا ہے۔

یہ طریقہ مجھے عارف باللہ الشیخ مولانا حماد اللہ سندھی ہالیجوی نے بتایا ہے جو شیخ عارف حضرت مولانا تاج محمود امروٹی سندھی کے خلفا میں ہیں، جو سلاسل تصوف میں طریقہ قادریہ سے وابستہ ہیں، اور ذکر قلبی میں حضرات مشائخ نقشبندیہ کا طریقہ معروف ہے، وہ یہ کہ دھیان کرے کہ لطیفۂ قلب جو قلب کے ماتحت ہے، اس پر نور کے حرفوں سے اللہ لکھا ہوا ہے، اور یہ کہ وہ بڑی محبت کے ساتھ اللہ کا نام بغیر تلفظ کے لے رہا ہے، گویا وہ اللہ کی محبت میں والہ وشیدا ہو رہا ہے، اسی طرح ہزار ہا ہزار مرتبہ نام لیتا ہے۔

یہ وہ فوائد ہیں جنہیں میں نے آپ کی مجالس میں سنا ہے، ان کا خلاصہ میں نے ایک مدت کے بعد اپنی یادداشت میں لکھ لیا تھا، بعض باتیں اس وقت مجھے مستحضر نہیں ہیں، اس لئے اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں لیکن دیکھئے کہ اس کلام میں کتنا زبردست علم پنہاں ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معرفت الٰہی اور فضل وکمال کے کس مرتبہ پر آپ فائز تھے۔ **ذالک فضل الله توتیه من یشاء والله ذوالفضل العظیم**

حاصل یہ ہے کہ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ عارف وعالم تھے، عابد وزاہد تھے، اپنے علوم ومعارف میں محقق تھے، ذکر الٰہی کے خواص واسرار سے واقف تھے، بہت کم علما اور اولیاء اس باب میں آپ کے ہمسر ہوں گے۔

اسی کے ساتھ آپ طبیب حاذق بھی تھے، مرشد وہادی بھی تھے، سنت نبوی کے نہایت متبع بھی تھے، اتباع شریعت میں کمال استقامت رکھتے تھے، آپ کا مرتبہ تجلیٔ صفات سے آگے بڑھ کر تجلیٔ ذات کے مقام بلند پر اس درجہ راسخ تھا کہ آپ اس بات سے قطعی بے نیاز ہوگئے تھے

کہ آپ کو کوئی پہچانے یا آپ سے کسب فیض کرے۔ میں نے آپ کے خصائص میں کسی کو آپ کا مثل نہیں دیکھا۔

البتہ ہمارے شیخ عارف دیوبندی مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب نقشبندی رحمہ اللہ کا بھی یہی رنگ وحال تھا، حضرت عارف دیوبندی کا وصال ۱۳۴۷ھ میں ہوا تھا، ان کے انتقال کے بعد ہمارے استاذ امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ نے فرمایا تھا کہ:

''ہماری جماعت میں جو سب سے افضل عند اللہ تھے چل بسے''۔

میں کہتا ہوں کہ عارف سندھی کو ان کے معاصرین میں کم کسی نے پہچانا، اور جیسا کہ میرا خیال ہے کہ ان کے باطنی کمالات سے پورے طور پر کسی نے استفادہ نہیں کیا، اور نہ ان سے کسی نے کما حقہ مراتب سلوک طے کیا۔

پس اللہ ان پر اپنی رحمتیں نچھاور کریں، ان سے راضی ہوں، اور انہیں راضی کریں، اور جنت ان کا مستقر بنائیں۔

وصلی اللہ علی سید الاولین والآخرین وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ ومن تبعھم الی یوم الدین.

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

محرم الحرام ۱۳۹۳ھ

☆☆☆☆☆☆

فقہی اختلافات رحمت ہیں

احکام اسلامی کی تعمیل کی جو مختلف شکلیں رائج ہیں، ان سب کو چھوڑ کر امت کو کسی ایک شکل پر جمع کرنا ممکن نہیں، یہ جمع کرنا نہیں انتشار پیدا کرنا ہے، بعض لوگ علمائے امت کے ان فقہی اختلاف کو بہت بھیانک بنا کر پیش کرتے ہیں، اور دعوت دیتے ہیں کہ سب کو چھوڑ کر حدیث پر آجاؤ، ہم نے مفصل اس پر بحث کی ہے، اتفاق سے کاغذات کی الٹ پلٹ میں رابطۂ عالم اسلامی کے ماتحت **مجمع الفقهی الاسلامی** کے ایک اجلاس میں طے شدہ ایک قرارداد اسی موضوع پر مل گئی، مناسب معلوم ہوا کہ اس کا ترجمہ شائع کردیا جائے تاکہ بصیرت کا باعث ہو۔ (اعجاز احمد اعظمی)

الحمدللہ وحده والصلوٰة والسلام علیٰ من لانبی بعده، سيدنا ونبينا محمد صلی اللہ علیه وعلیٰ آله وسلم، أمابعد!

رابطۂ عالم اسلامی کی **مجمع الفقهی الاسلامی** کا دسواں اجلاس مکہ مکرمہ میں ۲۴/ صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷/ اکتوبر ۱۹۸۷ء بروز ہفتہ سے ۲۸/ صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۱/ اکتوبر ۱۹۸۷ء بروز چہارشنبہ تک منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مشہور فقہی مذاہب (حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنبلیہ) کے اختلافات زیر بحث آئے، اور بعض لوگوں نے اپنے مسلک کے سلسلے میں جو شدید اور ناروا تعصب اختیار کر رکھا ہے، جس کی بنیاد غلو، اور حد اعتدال سے خروج ہے، اور اس کی وجہ سے دوسرے مذاہب کو اور ان کے علماء کو طعن کا نشانہ بناتے ہیں، اجلاس نے اس کی وجہ سے پیدا شدہ ان مشکلات اور پیچیدگیوں کا بھی جائزہ لیا، جس میں نئی نسل (جوان فقہی اختلاف کی بنیادوں اور

ان حکمتوں سے واقف نہیں ہے) مبتلا ہو رہی ہے ، اور انھیں گمراہ کیا جا رہا ہے کہ جب شریعت اسلامی ایک ہے، اس کے اصول ، جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں، ایک ہیں تو پھر مذاہب فقہیہ کا یہ اختلاف کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ تمام اہل اسلام ایک مذہب اور ایک فہم و اجتہاد کے پیرو ہو جاتے ۔

اجلاس نے اس تعصب اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ان دشواریوں پر بھی غور کیا، جس کا سبب آج کل کے بعض نومولود افکار و نظریات بن رہے ہیں، ان افکار و نظریات کے حاملین عام مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اسی نئے مسلک کو اختیار کریں، اور وہ مذاہب اور طریقے جو صدیوں سے قائم اور رائج ہیں، جنھیں ابتداء ہی سے امت میں قبول عام حاصل ہے، ان پر اور ان کے ائمہ پر وہ طعنہ زنی کرتے ہیں، اور بعض تو انھیں گمراہ قرار دے کر لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرتے ہیں۔

اجلاس نے اس موضوع پر بسط وتفصیل سے تبادلۂ خیال کیا، اور اس کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے واقعات و حوادث، عواقب و نتائج اور تضلیل وفتنہ اندازی کا تفصیلی جائزہ لیا، اور ان متعصب اور گمراہ کن فرقوں کے حق میں درج ذیل قرار داد منظور کی ۔

(۱) اختلاف مذاہب

فکری و نظریاتی مذاہب کے اختلاف ، جو ممالک اسلامیہ میں موجود ہیں، وہ دو قسم کے ہیں۔

(الف) اعتقادی مذاہب کا اختلاف ۔ (ب) فقہی مذاہب کا اختلاف ۔

اعتقادی اختلافات در حقیقت مصیبت ہیں جو ممالک اسلامیہ میں ہولناک حوادث کے سبب بنے ہیں، ان سے مسلمانوں کی صف میں انتشار پیدا ہوا ہے، ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوا ہے یہ اختلاف افسوسناک ہے، اور نہیں ہونا چاہئے ، اس باب میں ضروری ہے کہ امت اہل سنت والجماعت کی راہ پر قائم رہے ، جو اس صاف ستھرے افکار و نظریات اسلامی کی نمائندہ ہے ، جو رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اور حضرات خلفاء راشدین کے عہد میں تھے، خلفاء راشدین ؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا اعلان ہے کہ ان کی سنت، خود رسول اکرم ﷺ کی سنت میں داخل ہے،

فرمایا: **علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ** ، تم میری سنت کو اور میرے بعد خلفاء راشدین کو لازم سمجھو، اس پر مضبوطی سے جمے رہو اور دانتوں سے پکڑ لو۔

اور رہا دوسرا اختلاف یعنی مختلف فقہی مذاہب کا بعض مسائل میں اختلاف! تو اس کے کچھ علمی اسباب ہیں، جن کی وجہ سے یہ اختلاف ہوا ہے، اور اس میں حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ ہے، اس میں بندگان خدا پر رحمت کا سامان ہے، اور نصوص سے استنباط احکام کی توسیع ہے، علاوہ ازیں یہ ایک زبردست فقہی نعمت وثروت ہے، جس سے امت اسلامیہ کو دینی وشرعی امور میں بڑی وسعت اور گنجائش حاصل ہوتی ہے، اس اختلاف کی وجہ سے امت کو یہ آسانی ہے کہ سب کو کسی ایک مکتب فکر کا پابند ہونا ضروری نہیں ہے کہ اس سے ادھر ادھر ہٹنا قطعاً جائز نہ ہو، بلکہ یہ سہولت حاصل ہے کہ جب کسی وقت کسی خاص معاملہ میں کسی ایک طریقۂ فکر میں تنگی اور دشواری ہوتی ہے، تو دوسرے مذاہب فکر واجتہاد میں سہولت اور گنجائش دستیاب ہوجاتی ہے، خواہ عبادات میں ہو یا معاملات میں، عائلی مسائل ہوں، یا عدالتی اور جنایات کے معاملات! دلائل شرع کی روشنی میں سہولت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

اختلاف کی یہ دوسری قسم نہ کوئی عیب ہے، اور نہ ہمارے دین میں اس سے کوئی تناقض لازم آتا ہے، اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ اختلاف نہ ہوتا، کوئی بھی امت ہو جس میں شریعت کا کامل نظام ہو اور اس میں فقہ واجتہاد کا دخل ہو، ممکن نہیں کہ اس میں اجتہادی اختلافات نہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان اجتہادی اختلافات کا نہ ہونا ممکن ہی نہیں، کیونکہ قرآن وسنت کے بنیادی نصوص، بسا وقات ایک معنی سے زیادہ کا احتمال رکھتے ہیں، اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ نصوص، تمام محتمل وقائع کا احاطہ نہیں کرتے، کیونکہ نصوص محدود ہیں اور وقائع غیر محدود ہیں…… چنانچہ علماء نے اس کی تصریح کی ہے……اس لئے ناگزیر ہے کہ قیاس سے کام لیا جائے، احکام کی علتوں پر غور کیا جائے، شارع کی غرض کو سمجھا جائے، شریعت کے مقاصد عامہ کا لحاظ کیا جائے، اور بدلتے ہوئے حالات اور نئے نئے واقعات میں ان کی طرف رجوع کیا جائے، اسی مقام پر علماء کی فہم میں اور متعدد احتمالات کے درمیان کسی ایک کو ترجیح دینے میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، پھر ایک ہی موضوع میں احکام مختلف ہوجاتے ہیں، جبکہ ہر ایک بجائے خود حق وصداقت کا ہی ارادہ

کرتا ہے، اور اسی کو تلاش کرتا ہے، تو جو شخص صحیح فیصلے پر پہونچا، اس کے لئے دو اجر ہیں، اور جو شخص چوک گیا، اس کے لئے ایک اجر ہے، اور اس بنیاد پر احکام میں گنجائش ملتی ہے، اور تنگی ختم ہوتی ہے، تو اس فقہی اختلاف میں عیب کیونکر ہے، جبکہ ہم نے اس کے اندر جو خیر ہے اسے واضح کر دیا ہے، اور واقعہ یہی ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے اہل ایمان پر ایک رحمت ہے اور اسی کے ساتھ ایک بڑا شرعی وفقہی سرمایہ ہے، جس پر امت اسلامیہ فخر کرے تو بجا ہے۔

لیکن وہ دشمنان دین (یہود ونصاریٰ) جو ملت اسلامیہ کو گمراہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، جن کے پاس ہماری ملت کے نوجوان جدید تعلیم حاصل کرنے کیلئے پہونچتے ہیں، ان کا منصوبہ یہی ہے کہ ان نوجوانوں کا تعلق اسلامی تہذیب سے کمزور سے کمزور تر کر دیں، وہ مذاہب فقہیہ کے اختلاف کو اس طرح بیان کرتے ہین جیسے وہ اعتقادی اختلاف ہوں، اور غلط سلط نتائج کا استنباط کر کے احکام شرعیہ میں تناقض اور تضاد کو ظاہر کرتے ہیں، وہ اس نکتہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ تضاد نہیں تنوع ہے۔

رہی اس فرقہ کی بات جو تمام مذاہب فقہیہ کو ترک کر کے ایک نئے نقطۂ اجتہاد پر سب کو آنے کی دعوت دیتا ہے اور مشہور فقہی مسالک پر زبان طعن دراز کرتا ہے اور ان ائمہ کے بارے میں نامناسب باتیں کرتا ہے تو ہم نے ابھی مذاہب فقہیہ اور ان کے ائمہ کے امتیازات و خصوصیات میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس کی روشنی میں ضروری ہے کہ وہ اس برے لب ولہجہ سے باز آئے جس میں وہ مبتلا ہے اور جس سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرتا ہے اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرتا ہے، جبکہ موجودہ دور میں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دشمنان اسلام کی طرف سے اسلامی احکام وتعلیمات پر جو مسلسل حملے ہو رہے ہیں ان کے مقابلے کے لئے زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا کیا جائے نہ کہ تفرق وانتشار کی یہ خطرناک دعوت دی جائے۔

ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (نائب صدر) عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (صدر مجلس) محمد بن جبیر ڈاکٹر بکر عبداللہ ابوزید۔ عبداللہ عبدالرحمٰن البسام۔ صالح بن فوزان بن عبداللہ الفوزان۔ محمد بن عبداللہ سبیل۔ مصطفیٰ احمد الزرقاء۔ محمد محمود الصواف۔ ابوالحسن علی الحسنی الندوی۔ محمد رشید راغب قبانی

☆☆☆☆☆☆

سبیل المومنین سے انحراف

دین اسلام ایک مکمل اور نا قابل ترمیم دین ہے، علم کے اعتبار سے بھی اور عمل کے اعتبار سے بھی، نہ اس کے علمی حصار میں کسی اجنبی نظریہ اور اجنبی علم کے گھسنے کی کوئی راہ ہے، اور نہ اس کے عملی احاطہ میں کوئی دوسرا عمل دراندازی کرسکتا ہے، یہاں ہر علم اور نظریہ واضح اور منقح ہے، نیز ہر عمل معلوم اور متعین ہے، علم اور اعتقاد کی راہ سے اگر کوئی چیز اس میں گھسنے کی کوشش کرتی ہے تو اس پر بدعت اور ضلالت کی مہر لگ جاتی ہے، اور اسے نکال باہر کیا جاتا، اور اگر عمل کی راہ سے کوئی اجنبی داخل ہوتا ہے تو وہ بدعت اور فسق قرار پاکر رد ہو جاتا ہے۔ حق تعالی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولی ونصله جهنم وساء ت مصیراً (سورہ نساء: آیت: ۱۱۵)

اور کوئی رسول کے خلاف چلے جب کہ اس کے سامنے سیدھی راہ کھل چکی، اور سب مسلمانوں کی راہ سے ہٹ کر چلے تو ہم اس کے حوالے وہی راہ کر دیں گے جس پر وہ چلا ہے، اور اسے جہنم میں ڈال دیں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول کے واسطے سے اللہ تعالی نے دین کی جو علمی اور عملی راہ متعین کر دی ہے اور جس پر سب اہل ایمان چل رہے ہیں، اس سے انحراف کرنا خطرناک ہے، اگر کسی نے کہیں کہیں انحراف کیا، تھوڑی بہت کجی اختیار کی، وہ بھی خطرے سے خالی نہیں ہے، قرآن وسنت اور جمہور امت سے ہلکا سا انحراف بھی آدمی کے لئے سخت اندیشے کا باعث ہے۔ گناہ کو گناہ سمجھتے ہوئے اگر اس میں کوئی ملوث ہوتا ہے تو وہ نہ گمراہ ہوتا ہے اور نہ دوسرے اس سے دھوکہ کھاتے ہیں، وہ بھی جانتا ہے اور لوگ بھی جانتے ہیں کہ وہ گناہ کر رہا ہے، لیکن اگر کوئی شخص علم

وتحقیق کے نام پر صراط مستقیم سے انحراف کرتا ہے، اور اپنے زور دماغ سے اسے دین حق کی ترجمانی اوراس کی شرح قرار دینے کی سعی کرتا ہے تو وہ خود بھی گمراہی کا شکار ہوتا ہے اور دوسرے لوگ بھی دھوکہ کھاتے ہیں، کیوں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے یا کر رہا ہے، اسے دین کی ترجمانی اوراس کی شرح قرار دے رہا ہے۔ گناہ سے نکلنا آسان ہے مگر اس ''جہل'' سے نکلنا مشکل ہے، اس لئے صاف ستھری راہ یہ ہے کہ جس راہ پر تمام امت چلی ہے، علما وصلحا چلے ہیں، فقہا ومحدثین چلے ہیں، جو راہ روشن اور نمایاں ہے، جس کا ایک ایک مرحلہ اور ایک ایک منزل متعین ہے، جسے سب پہچانتے ہیں، اس پر اپنے قلب اور قدم کو استوار رکھا جائے، ورنہ زندگی کا کارواں اور علم وعمل کا قافلہ کہاں جا پہونچے گا؟ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ انحراف خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، وہ انحراف ہے اور پرخطر ہے۔

ہم اپنے اس دور میں فتنوں کے تماشے دیکھ رہے ہیں، ایک ذہین اور صاحب دماغ آدمی اٹھتا ہے، اس کی طبیعت تقلید واتباع سے انکار کرتی ہے، اسے وہ اپنے رتبے سے کمتر سمجھتا ہے تو اپنی ایک نئی راہ نکالتا ہے، اور عام مسلمانوں کے طریقے سے قدرے ہٹ جاتا ہے، بعض اوقات وہ نئی راہ معصوم اور بے ضرر معلوم ہوتی ہے، دیدہ ور علما بھی اسے نظر انداز کردیتے ہیں، لیکن وہ راہ جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے احساس ہوتا ہے کہ دین سے الگ راہ بنتی جارہی ہے، پھر اس پر ٹوکتے ہیں تو ایک فتنہ کی صورت برپا ہوتی ہے، اور اس فتنے کی نسبت اس شخص اور اس طبقہ کی طرف کردی جاتی ہے، جس نے انحراف کو انحراف کہا، کج روی کو کج روی بتایا، حالانکہ کجی دوسری طرف ہے، اور یہ دنیا کی پرانی ریت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک عرصہ کے جمے جمائے کفر وشرک پر قوم کو ٹوکا تو قوم نے آپ ﷺ کی دعوت کو فتنہ اور قطع رحمی سے تعبیر کیا، اور اس کے ماننے والوں کو ''فتنہ زدہ اور بے وقوف'' قرار دیا، لیکن اس سے قطع نظر جو صحیح راہ ہے اسے واضح کردینا ضروری ہے، ورنہ دین اور بدعت میں ایسا التباس ہوگا کہ کچھ امتیاز نہ ہوسکے گا کہ دین کیا ہے؟ اور بدعت کیا ہے؟۔

دین اسلام چونکہ آخری دین ہے، اس لئے اس کے اردگرد ایسے اصول وقواعد کا حصار ہے کہ ہر اجنبی علم وعمل کی حیثیت یہاں متعین ہوجاتی ہے، ورنہ دوسرے آسمانی مذاہب انہیں فکری وعملی بدعات اور گمراہیوں میں پھنس کر غلطیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئے ہیں، عام علمی اور عملی گمراہیوں

کوتو چھوڑ دیئے، شرک جیسی نا قابل معافی معصیت ان مذاہب کا بنیادی جز بن گئی ہیں۔

دین اسلام میں بھی یہ تماشے چلتے رہتے ہیں لیکن ہر زمانے میں علماء اہل حق گمراہی اور بدعت کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتے ہیں، خواہ وہ معمولی حیثیت کی گمراہی ہو یا غیر معمولی!

ابھی کچھ دنوں پہلے ایک ذہین وذکی صاحب علم اور نامور اور غیر معمولی خطیب مولانا سید سلمان صاحب ندوی کی زبان سے اسی طرح کا علمی اور فکری انحراف سننے میں آیا، جوان کے زور زبان اور بظاہر علمی واستدلالی رنگ میں ہونے کی وجہ سے لوگوں کو بھلا معلوم ہوا، مگر واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اب تک جس راہ پر چلتے آرہے ہیں، اس سے ہٹا ہوا راستہ انہوں نے دکھانے اور اس پر چلانے کی کوشش وسعی کی ہے، انہوں نے دعوی کیا کہ ''علم دین'' صرف وہی نہیں ہے جسے اب تک علما علم دین قرار دیتے چلے آرہے ہیں، یعنی قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ کا علم! بلکہ علم دین کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس دائرے میں وہ علوم بھی آتے ہیں جنہیں لوگ غلط فہمی سے ''علم دنیا'' سمجھتے ہیں، انجینئری، ڈاکٹری، سائنس اور اس کے مختلف شعبے حتی کہ صنعتیں مثلاً بڑھئی گری، لوہاری، سناری، معماری، وغیرہ کی صنعتیں یہ سب علم دین کے زمرے میں آتی ہیں۔ اس کی تائید میں انہوں نے قرآن کی آیتیں پیش کیں، لیکن ان آیتوں نے ان کے دعوی کی جب تصدیق نہیں کی تو تفسیر بالرائے کے ذریعے ان سے اپنے دعووں کی تصدیق حاصل کرنی چاہی، کہیں آیت کے ترجمہ میں طبع زاد اضافہ کر دیا، بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ قرآن سے استدلال کر رہے ہیں مگر فی الحقیقت ان کا استدلال ان کی اپنی رائے ہوا ہے۔

انہوں نے ہمارے مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور اعظم گڑھ کے سالانہ جلسے میں ایک مجمع کثیر میں ''گل افشانیٔ گفتار'' کا نمونہ دکھایا، انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز اس نکتہ سے کیا کہ یہ مدرسہ ''احیاء العلوم'' ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس مدرسہ کو ''العلوم'' کے احیاء کے لئے قائم کیا گیا ہے، ''العلوم'' سے مراد ہے دینی اور انبیائی علوم، انہیں زندہ کرنا ہے، پھر انہوں نے بتایا کہ ''دین'' کی تشریح مشہور حدیث جبریل سے ہوتی ہے، حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کے وصال سے کچھ پہلے اجنبی بن کر آپ کی مجلس میں آئے، اور پوچھا۔ ما الاسلام؟ اسلام کیا ہے؟ ما الایمان؟ ایمان کیا ہے؟ ما الاحسان؟ احسان کیا ہے؟ آپ نے تینوں سوالوں کے

جواب بہت وضاحت کے ساتھ دیئے، وہ چلے گئے تو آپ نے فرمایا کہ پوچھنے والے کو واپس بلاؤ، لوگوں نے تلاش کیا تو نہیں ملے، فرمایا وہ جبرئیل تھے، تم کو تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایمان اور احسان کے مجموعے کا نام ’’الدین‘‘ ہے، اس دین تک پہونچنے کا راستہ کیا ہے؟ اللہ تعالی نے اس کی راہنمائی ان آیات میں کی ہے جو بالکل آغاز نبوت میں نازل ہوئی تھیں۔ یعنی

اقرأ باسم ربک الذی خلق ،خلق الانسان من علق،اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم ،علم الانسان مالم یعلم.

پڑھو اپنے رب کے نام سے لگ لپٹ کر، جس نے پیدا کیا انسان کو جونک جیسے جمے ہوئے خون سے، پڑھ اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اور دوسری جگہ اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کے کارہائے نبوت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلو علیکم آیاتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمة ویعلمکم ما لم تکونوا تعلمون.

جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہارے ہی درمیان سے بھیجا، وہ تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے، اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے، اور تم کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور وہ سب کچھ تم کو سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ جو کچھ انسان نہیں جانتا تھا، اللہ تعالی نے اسے وہ سب کچھ سکھا دیا ہے، اب اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ جو کچھ پڑھے اللہ کے نام سے لگ لپٹ کر پڑھے، جو کچھ بھی اس طرح پڑھا جائے گا وہ سب ’’العلوم‘‘ میں داخل ہوگا۔

دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبر ﷺ کا منصب جہاں یہ ہے کہ وہ ’’تلاوت آیات‘‘ کریں، ’’تزکیہ نفوس‘‘ کریں، کتاب وحکمت کی تعلیم دیں، اسی طرح ان کا منصب یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں وہ سب کچھ سکھائیں جو تم نہیں جانتے، یعنی دنیوی علوم وفنون، جن کا تعلق اسباب دنیا سے

ہے، جن کی ضرورت انسانی زندگی میں ہوتی ہے، آلاتِ جنگ وغیرہ بنانے کا علم، جن سے اقوام و ممالک کو فتح اور زیر کیا جائے وغیرہ۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ علوم دین صرف اتنے ہی میں منحصر نہیں ہیں جو ہمارے مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں، ہم نے ایک عرصہ کی غلامی کے نتیجے میں 'العلوم' کو تفسیر و حدیث اور فقہ میں محدود کر دیا ہے، ورنہ انبیائی علوم کا دائرہ بہت وسیع ہے، ہم نے اس وسیع دائرہ کے ایک بہت مختصر جز کو لے لیا اور باقی علوم کو اس دائرے سے خارج کر دیا ہے۔

موصوف نے مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کی ذات گرامی کو پیش کیا کہ انہیں اللہ تعالی نے کشتی بنانے کا حکم دیا، چنانچہ وہ ایک ماہر کاریگر تھے، وہ کشتی بنانے کا فن جانتے تھے، انہوں نے اللہ تعالی کی نگرانی میں ایک عظیم الشان کشتی بنائی، معلوم ہوا کہ یہ فن بھی انبیائی علوم کے دائرے میں آتا ہے، مگر ہم نے اسے بھی دوسروں کے حوالے کر رکھا ہے۔

پھر انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کا اسم گرامی پیش کیا، اللہ تعالی نے فرمایا۔ ''**وَ اَلَنَّا لہ الحدید**'' ہم نے ان کے لئے لوہا نرم کر دیا۔ موصوف نے کہا کہ لوہے کو نرم کرنے کا مطلب شعبداتی ذہن اور کراماتی مزاج رکھنے والوں کے نزدیک یہ ہے لوہا ان کے ہاتھ میں آکر موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا، اور وہ اسے جس طرح چاہتے تھے موڑ دیتے تھے۔ مگر یہ غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے بڑی بڑی بھٹیاں لوہے کو تپانے اور گلانے کے لئے بنا رکھی تھیں، ان میں لوہا گلا کر زرہیں بنائی جاتی تھیں، اور ہتھیار ڈھالے جاتے تھے، یہ فن حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالی نے نازل فرمایا تھا، پس یہ انبیائی علوم میں شامل ہے جس کا احیاء کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

پھر انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر چھیڑا کہ وہ جناتوں سے بڑی بڑی بلڈنگیں، مجسمے، کوہ پیکر دیگیں اور لگن بنوایا کرتے تھے، ان کے پاس ایک زبردست بحری بیڑہ تھا جس کی رفتار صبح و شام ایک ایک ماہ کی مسافت کے بقدر تھی۔ **غدوها شهر ورواهها شهر**

بلڈنگوں کی تعمیر، مجسموں کی صنعت، لگن اور دیگیں بنانے کا فن اور بحری بیڑے بنانے کی تکنیک یہ سب انبیائی علوم میں شامل ہیں، پھر آخر میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا کہ آپ کے پاس وہ سب ہتھیار تھے جو دوسروں کے پاس تھے، بلکہ وہ ہتھیار بھی تھے جو اوروں کے پاس نہ تھے

چنانچہ منجنیق اور دبابہ کو آپ نے غزوہ طائف میں استعمال کیا تھا، یہ ہتھیار عربوں کے پاس نہ تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلحہ سازی کا فن انبیائی علوم میں داخل ہے، ہم نے غلطی سے اپنا دائرہ محدود کر کے علوم دینیہ کو چند علوم میں منحصر کر دیا ہے، یہ بہت بڑی غلطی ہے، انہیں علوم کے فقدان نے ہم کو دنیا میں ذلیل اور شکست سے دوچار کر رکھا ہے، ہمارے علما نے غلطی سے علوم دینیہ کو صرف انہیں چیزوں میں محدود کر دیا ہے جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں، حالانکہ وہ علوم بھی انبیائی علوم ہیں جنہیں ہم نے کالجوں، یونیورسٹیوں کے حوالے کر دیا ہے، اور جنہیں ہم دنیاوی علوم کہتے ہیں، ان سب کو ہمارے دائرۂ عمل میں آنا چاہئے، ہماری ذلت کا ایک بڑا سبب یہ علوم دین اور علوم دنیا کی تفریق ہے۔

یہ ہے ندوی صاحب کی تقریر کا حاصل جس کو انہوں نے تفصیل کے ساتھ خطیبانہ آہنگ میں بیان کیا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ ندوی صاحب کا دعویٰ بھی غلط ہے اور ان کا استدلال بھی غلط در غلط ہے، اختصار کے ساتھ قدرے تفصیل ملاحظہ ہو۔

(۱) یہ دعوی کے انبیائی علوم اور دینی علوم کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں دنیاوی علوم وفنون بھی شامل ہیں، ایک ایسا دعوی ہے جو علمائے امت میں اب تک کسی نے نہیں کیا ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ انبیاء علیہ السلام جو علوم اللہ کے پاس لائے ہیں اور جس کی انہوں نے دعوت دی ہے، وہ علوم ہیں جن سے بندوں کا ربط اللہ تعالی کے ساتھ درست اور استوار ہو، چنانچہ حدیث جبرئیل علیہ السلام میں رسول اللہ ﷺ نے تینوں سوالات کے جو جوابات دیئے ہیں جن کے مجموعے کو موصوف نے بھی ''الدین'' ہونے کا اعتراف کیا ہے، اس میں کہیں دنیاوی علوم کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں ہے۔

اسلام کیا ہے؟ کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرو، اور زکوۃ ادا کرو، رمضان کا روزہ رکھو، اور اگر استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو''۔

(الاسلام ان تشهد ان لااله الا الله وان محمداً رسول الله، وتقيم الصلوٰة، وتوتي الزكوٰة، وتصوم رمضان، وتحج البيت ان استطاع اليه سبيلاً)

اور ایمان کیا ہے؟ کے جواب میں آپ نے فرمایا: ’’اللہ پر ایمان لاؤ، اور اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ، نیز تقدیر پر اس کے خیر وشر پر ایمان لاؤ‘‘۔ (**ان تومن بالله وملئكته وكتبه ورسله واليوم الآخر وتومن بالقدر خيره وشره**)

اور احسان کیا ہے؟ کے جواب میں فرمایا: کہ ’’اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے‘‘۔ (**ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك**)

اس مجموعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین کا مقصد یہ ہے کہ بندوں کا اللہ سے ربط صحیح ہو، اس مقصد سے متعلق جو علوم ہوں گے وہی علوم دین ہوں گے، اس پر تمام امت کا اجماع ہے، اب تک امت میں کسی معتبر عالم نے ان علوم دنیا کو جنہیں موصوف نے علوم دین میں داخل کرنا چاہا ہے، اور جن کے اختیار نہ کرنے کو علما کی غلطی قرار دیا ہے، دینی علوم میں شامل نہیں کیا ہے، پس یہ بنیاد اور مقصد ہی سرے غلط ہے، بلکہ گمراہ کن ہے۔

رہی یہ بات کہ **علم الانسان مالم يعلم** (انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا) اور **يعلمكم مالم تكونوا تعلمون** (تم کو وہ سب کچھ سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے) تو یہ قرآن کے ترجمے میں اپنی رائے سے بغیر کسی دلیل کے ایک بے جا اضافہ ہے، ان دونوں آیتوں میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ ’’سب کچھ‘‘ کیا جائے، اسی ’’سب کچھ‘‘ سے موصوف نے استدلال کیا ہے کہ تمام علوم وفنون انبیائی علوم کے دائرے میں آتے ہیں، یہ ’’سب کچھ‘‘ قرآن میں نہیں ہے، کیوں کہ ’’ما‘‘ اگر چہ عام ہے، مگر وہ اثبات میں استغراق کے لئے نہیں آتا، یعنی ’’سب کچھ‘‘ اس کے عموم میں شامل نہیں ہوتا، اور موصوف کے استدلال کی بنیاد یہی ’’سب کچھ‘‘ ہے، پس یہ استدلال قرآن سے نہیں، ان کی اپنی رائے سے ہے، مگر ان کے بیان سے ایسا تأثر ہوتا ہے جیسے وہ قرآن ہی سے استدلال کر رہے ہیں۔

علما جانتے ہیں استدلال کی یہ فنکاری کن لوگوں کا شیوہ ہے۔ **وان منهم لفريقا يلوون السنتهم بالكتاب لتحسبوه من الكتاب وماهو من الكتاب ويقولون هو**

من عندالله وماهو من عندالله ويقولون على الله الكذب وهم يعلمون. اوران میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کتاب کو پڑھنے میں زبان کوتوڑتے مروڑتے ہیں، تا کہ تم یہ سمجھو کہ یہ بات بھی کتاب ہی کی ہے، حالانکہ کتاب سے اس کا تعلق نہیں ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے، اور اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔ **وما اوتيتم من العلم الاقليلاً.** علم کا بہت تھوڑا حصہ تمہیں دیا گیا ہے، لیکن موصوف فرماتے ہیں کہ اللہ نے وہ سب کچھ سکھایا جو انسان نہیں جانتا تھا۔ کتنا فرق ہے کلام الٰہی میں اور دعویٰ انسانی میں؟!

حضرت نوح علیہ السلام نے بے شک کشتی بنائی تھی، اور اللہ کے حکم سے بنائی تھی، اس کے بنانے کی ضرورت تھی، عذاب الٰہی آنے والا تھا، اس سے حفاظت کے لئے بنائی تھی، لیکن کیا کسی اشارے سے بھی یہ بات ملتی ہے کہ کشتی بنانے کا فن کوئی دینی اور انبیائی علم ہے؟ کیا حضرت نوح علیہ السلام نے یا ان کے بعد کسی بھی نبی نے اپنی امت میں بطور علم دین کے اس کو رواج دیا؟ یا اس کی ترغیب دی؟ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال تک اپنی قوم کو دین کی دعوت دی تھی، کیا اس دعوت کا کوئی جزیہ بھی تھا کہ فن کشتی سازی سیکھو؟۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے اللہ نے لوہا نرم کر دیا تھا، یہ ان کا معجزہ تھا، شعبداتی اور کراماتی ذہن والوں سے نہیں، متعدد تابعین جن میں حضرت حسن بصری، قتادہ اور اعمش شامل ہیں، مروی ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں آ کر نرم ہو جاتا تھا۔ (دیکھئے تفسیر ابن کثیر) اور اگر لوہا ان کے ہاتھ میں نرم ہونے سے یہی مراد ہے کہ وہ لوہے کو بھٹیوں میں پگھلاتے تھے، اس مقصد کے لئے انہوں نے بھٹیاں بنوا رکھی تھیں، تو یہ ان کی کون سی خاص بات ہے؟ جس کو اللہ تعالی نے اتنے اہتمام سے بطور احسان کے بیان کیا ہے، اس طرح کی چھوٹی بڑی بھٹی تو ہر لوہار کے پاس ہوتی ہے۔ داؤد علیہ السلام کے زمانے سے پہلے بھی ہوا کرتی تھی، کیونکہ لوہے کے ہتھیاروں کا استعمال بہت پہلے سے عام ہے۔ قرآن کی شہادت ہے کہ داؤد علیہ السلام سے صدیوں پہلے یوسف علیہ السلام کے دور میں زنان مصر کے پاس چھریاں تھیں جن سے انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، ظاہر ہے کہ بغیر ان بھٹیوں کے جن میں لوہا تپایا اور گلایا جائے، چھری بنانے کی کوئی اور صورت

نہیں ہے، یہ ساری افسانہ طرازی انہوں نے اسلحہ سازی کے فن کو دینی علوم میں شامل کرنے کی غرض سے کی ہے، مگر دونوں باتیں غلط ہیں، اس فن کو علوم دین میں شامل کرنا بھی، اور یہ افسانہ طرازی بھی!

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلاشبہہ جنات سے کام لیا، ان سے بلڈنگیں تعمیر کرائیں مجسمے بنوائے، لگن اور دیگیں ڈھلوائیں، لیکن کیا اس سے اشارۃً بھی کوئی ثبوت ملتا ہے کہ یہ فن علوم دین میں شامل ہیں، اور اس کا براہ راست دین سے کوئی تعلق ہے؟ ہاں ان کے اس استدلالی منطق سے اگر کوئی چاہے تو یہ ثابت کرسکتا ہے کہ جنات کو مسخر کرنے اور ان کو اپنے کاموں میں استعمال کرنے کا فن البتہ دینی اور انبیائی علم ہے، کیوں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات مسخر تھے، اور وہ ان سے کام لیا کرتے تھے، مگر وہ شاید اس کو پسند نہ کریں۔

اور تخت سلیمانی کے بارے میں مولانا موصوف نے مولانا مودودی صاحب اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تقلید میں ایک نیا انکشاف کیا ہے، جس کا شاید اب تک کسی کو علم نہ رہا ہو کہ وہ ایک زبردست بحری بیڑہ تھا جو سمندروں میں گشت کرتا پھرتا تھا۔ کاش اس کے لئے موصوف کوئی دلیل پیش کئے ہوتے!۔

رسول اللہ ﷺ نے یقیناً غزوۂ طائف میں منجنیق کا استعمال فرمایا تھا مگر ہمارے ناقص علم میں اب تک یہ بات نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اسلحہ سازی کو علم دین قرار دیا ہو، یا بطور علم دین کے اس کی ترغیب دی ہو، یا کم از کم اس کے لئے کوئی کارخانہ بنایا ہو، ضرورت کے بقدر ہتھیار مہیا کرنا، دشمنوں سے مقابلہ کی تیاری کرنا، اس کے ذرائع ووسائل فراہم کرنا لاریب کہ مطلوب ہے مگر اسلحہ سازی کو دینی علوم کی حیثیت دیدی جائے، اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

ضرورت کی چیزیں ضرورت کے لئے ہوتی ہیں، وہ مقاصد نہیں ہوتیں، کھانے پکانے کا فن، کپڑا سینے کا فن ایک انسانی ضرورت ہے، مگر ان فنون کو دینی علوم قرار دینا ستم ظریفی ہے!!

ان کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت سے بڑی مصیبت آئی جب سے علم کو تقسیم کردیا گیا، یہ ایک مجمل بات ہے، اللہ جانے اس کا مطلب کیا ہے؟ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ علم کی جتنی شاخیں ہیں، سب دین کے دائرے میں آتی ہیں، اور سب کو حاصل کرنے اور ان کے لئے جد جہد

کرنے کی فضیلت یکساں ہے۔ اگر یہی مطلب ہے تو بالکل غلط، قرآن وسنت کے خلاف اور اجماع امت سے بغاوت ہے، اور اگر اس کا کوئی اور مطلب ہے تو اسے واضح کرنا چاہئے، مولانا کی تقریر دل پذیر سے وہی مطلب واضح ہوتا ہے جو ہم نے سمجھا ہے اور جسے اوپر لکھا ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر غلط بات ایک ہوش مند عالم کی زبان سے کیوں کر نکلی؟ اسی لئے رہ رہ کر شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی اور مطلب تو نہیں ہے؟ لیکن اگر کوئی اور مطلب ہے تو اس کے لئے جوانہوں نے تعبیر اختیار کی ہے، نہایت گمراہ کن ہے۔

اس مسئلہ پر میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے دو بزرگ علما کی تحریر سے استفادہ کروں گا، ایک بزرگ مشہور صاحب تصانیف محدث اور امام ابوعمر یوسف بن عبدالبر اندلسی متوفی ۴۶۳ھ ہیں، ان کی مشہور ومعتبر تصنیف ''جامع بیان العلم وفضلہ'' ہے، اس میں انہوں نے علوم کی قسموں سے تفصیلی بحث کی ہے، ہم اس کی تلخیص اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں، اصحاب علم و تحقیق اصل کی طرف مراجعت کرلیں، فرماتے ہیں:

''تمام اصحاب دین کے نزدیک علوم کی تین قسمیں ہیں (۱) علم اعلی (۲) علم اوسط (۳) علم اسفل۔ علم اعلی ان کے نزدیک دین کا علم ہے، جس میں اپنی مرضی اور اپنی رائے سے کسی کو کلام کرنا درست نہیں ہے، اس میں وہی کلام درست ہے جو وحی الہی سے استناد رکھتا ہو، خواہ وہ وحی الہی کتاب اللہ کی صورت میں ہو یا اسے انبیاء کی زبان پر ظاہر کیا گیا ہو۔ علم اوسط دنیاوی علوم ہیں، جن کی معرفت ان کی نظیروں سے ہوتی ہے، اور جن پر نوع اور جنس وغیرہ سے استدلال کیا جاتا ہے، جیسے علم طب، ہندسہ، ریاضی وغیرہ۔ علم اسفل صنعتوں کے علوم ہیں، جیسے حدادی، خیاطی وغیرہ، ان علوم کا تعلق زیادہ تر جسمانی اعمال سے ہے۔ پھر انہوں نے علم اوسط تحت نجوم کو ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے فلک کی گردش، طلوع وغروب کے اوقات، دن رات کے اوقات کی کمی وزیادتی کا پتہ چلتا ہے، نماز اور عبادات کے اوقات کا تعین ہوتا ہے، اس لحاظ سے ایک مفید اور دین کے لئے مددگار علم ہے، لیکن اس کا ایک پہلو اور ہے، اور وہ یہ کہ اس علم سے بعض لوگ غیب کی باتوں کے جاننے اور بتانے کا دعوی کرنے لگتے ہیں تو یہ بالکل غلط ہے، غیب کا علم اللہ کے علاوہ کوئی نہیں رکھتا، علم نجوم کا یہ شعبہ حرام وناجائز بلکہ شرک ہے، مصنف

نے اپنی سند سے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ ''علم نجوم اتنا حاصل کرو جس سے صحرائی اور دریائی راستوں میں اندھیرے میں صحیح راہ پا سکو، اس سے آگے نہ بڑھو''۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ **من اقتبس علماً من النجوم اقتبس شعبةً من السحر زادمازاد.** جس نے علم نجوم کا کوئی حصہ حاصل کیا اس نے سحر کا ایک حصہ حاصل کیا، اور جو کچھ زیادہ حاصل کیا اس نے زیادہ سحر حاصل کیا۔

خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے نجومیوں کے بارے میں فرمایا ہے:
اولٰئک لا خلاق لھم. ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

حافظ ابن عبدالبر علیہ الرحمہ نے ابواسحاق الکوفی کا ایک قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: علوم تین ہیں، وہ علم جو دنیا کے لئے ہوں، وہ علم جو دنیا وآخرت دونوں کے لئے ہے، اور ایک وہ علم جو دین کے لئے ہے نہ دنیا کے لئے۔

وہ علم جو دنیا کے لئے ہے، وہ علم طب اور علم نجوم ہے، اور وہ علم جو دنیا وآخرت دونوں کے لئے ہے، وہ قرآن وسنت اور فقہ کا علم ہے، جو دنیا وآخرت دونوں جگہ کام دیتا ہے، اور وہ علم جو نہ دنیا کے لئے ہے نہ آخرت کے لئے، وہ علم شعر ہے، اس کی مشغولیت نہ دنیا کے لئے ہے نہ آخرت کے لئے۔

اسی بحث میں علامہ ابن عبدالبر نے مزید لکھا ہے کہ تمام اصحاب ادیان اس بات پر متفق ہیں کہ علم اعلی وہ علم دین ہی ہے، اور اہل اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ دین کی معرفت تین قسموں پر ہے، یعنی علوم دین کی تین قسمیں ہیں، اول خاص ایمان واسلام کی معرفت، اس کا تعلق توحید و اخلاص کی معرفت سے ہے، یہ علم نبی ﷺ سے ہی حاصل ہوسکتا ہے، کیوں کہ وہی اللہ تعالی کی طرف سے اس علم کو پہونچانے والے ہیں، اور قرآن کی آیات میں غور وتدبر سے اس علم تک رسائی ہوسکتی ہے، چنانچہ حق تعالی نے اس کا حکم دیا ہے۔

دوسری قسم دین اور احکام شرع کی خبریں کن واسطوں سے ہم تک پہونچی ہیں، ان کی

معرفت، اس علم کا تعلق نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کی معرفت سے ہے، جن پر اللہ تعالی نے اپنا دین نازل فرمایا، اور پھر ان لوگوں کی معرفت سے جن کے واسطے سے ہم تک دین پہونچا ہے۔

تیسری قسم سنن وواجبات اور مستحبات وغیرہ احکام کا علم ہے، یہ علم فقہ ہے۔

علوم دین انہیں تینوں کے مجموعے کا نام ہے۔ (ج ۲ ص ۳۷ تا ۴۰)

علامہ ابن عبدالبر علیہ الرحمہ کی اس گفتگو سے چند باتیں وضاحت کے ساتھ معلوم ہوئیں۔

(۱) اول یہ کہ تمام علوم یکساں نہیں ہیں، بلکہ بنیادی طور پر ان کی تین قسمیں ہیں، ایک وہ علم جو مرتبہ میں سب سے بلند ہے، اور وہ علم دین ہے۔ دوسرے وہ جو بلند اور پست کے درمیان میں ہے، وہ دنیاوی علوم ہیں جن کا تعلق انسانی ذہانت وذکاوت اور تجربوں سے ہے، جیسے علم ریاضی، علم طب، علم ہندسہ اور علم نجوم کے زیادہ تر شعبے۔ تیسرے وہ علم جو مرتبہ میں سب سے کمتر ہے، یہ وہ علوم ہیں جن کا تعلق صنعت وحرفت سے ہے، جس میں جسم انسانی کی محنت ومشقت صرف ہوتی ہے، یہ علوم بھی ذہانت وذکاوت سے بے نیاز نہیں ہیں، لیکن ان میں دخل زیادہ تر جسم انسانی کی کارفرمائی کا ہے۔

(۲) یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض علوم سرے سے درست ہی نہیں ہیں جیسے علم نجوم کا وہ شعبہ جس کا تعلق غیب کی خبریں بتانے سے ہے۔

(۳) یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کا انحصار تین علوم میں ہے۔ اول توحید واخلاص اور عقائد کی معرفت، یہ علم صرف وحی الٰہی سے حاصل ہوتا ہے، خواہ قرآن سے ہو یا سنت سے۔ دوسرے قرآن وسنت کو جن واسطوں سے ہم نے حاصل کیا ہے ان واسطوں کی معرفت، اس کے تحت اصولِ حدیث، علم اسماء الرجال وغیرہ آتے ہیں۔ تیسرے احکامِ شرعیہ، فرائض وواجبات سنن و آداب کی معرفت، اس کا تعلق علم فقہ سے ہے۔

انہیں تین طرح کے علوم کو علم دین کہتے ہیں، اور یہ جو کچھ کہا گیا ہے یہ کسی ایک عالم کی انفرادی رائے نہیں ہے بلکہ اس پر اجماع ہے، کیا اس کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ علم ایک اکائی ہے اور یہ کہ صنعت وحرفت وغیرہ بھی انبیائی علوم ہیں، خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ شکل اختیار کر گئے

ہوں۔

اب آیئے امام غزالی علیہ الرحمہ کی خدمت میں چلیں کہ وہ کیا فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ علوم کی دو قسمیں ہیں۔ علوم شرعیہ اور علوم غیر شرعیہ۔

علوم شرعیہ وہ ہیں جنہیں انبیاء کرام صلوٰۃ اللہ علیہم وسلامہ ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے، انہیں نہ علم حساب کی طرح محض عقل سے حاصل کیا جا سکتا ہے، نہ علم طب کی طرح تجربے سے، اور نہ علم لغت کی طرح محض سماع سے۔

پھر علوم غیر شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ محمود اور مذموم۔

محمود وہ علوم ہیں جن کا دنیا کی مصلحتوں سے تعلق ہوتا ہے، مثلاً علم طب، حساب اور اصول صناعات مثلاً کاشتکاری، کپڑوں کی بنائی وغیرہ۔

اور مذموم جیسے سحر، طلسمات اور شعبدوں کا علم۔

علوم شرعیہ سب محمود ہیں۔ علوم شرعیہ کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) اصول: یہ چار ہیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، اجماع امت، آثار صحابہ۔

(۲) فروع: یہ وہ علوم ہیں جو اصول سے مفہوم اور مستنبط ہوتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق دنیا کے مصالح سے ہے، انہیں اصطلاح میں علم فقہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ جن کا تعلق آخرت کے مصالح سے ہے، وہ احوال قلب، اخلاق محمودہ، اخلاق مذمومہ اور اللہ کی مرضی ونامرضی کا علم ہے۔

(۳) مقدمات: یہ وہ علوم ہیں جو بمنزلہ آلات ووسائل کے ہیں، جیسے علم نحو وصرف، علم لغت، یہ علوم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ تک رسائی کے لئے اسباب ووسائل ہیں، بذات خود علوم دین میں شامل نہیں ہیں لیکن انہیں بھی حاصل کرنا ضروری ہے کیوں کہ ہماری شریعت عربی میں نازل ہوئی ہے۔

(۴) متممات (تکمیلات): یہ وہ علوم ہیں جو قرآن وسنت کے علوم میں حسن اور کمال پیدا کرتے ہیں، چنانچہ علم قرآن میں الفاظ سے متعلق علم، علم قرأت وتجوید ہے، معنی سے متعلق علم تفسیر ہے، احکام سے متعلق ناسخ ومنسوخ، عام وخاص اور نص اور ظاہر کی معرفت ہے، جس کا بیان علم

اصول فقہ میں ہوتا ہے۔

اور علوم سنت کی تکمیلات اسماء الرجال کی معرفت ہے، یہ علوم شرعیہ ہیں۔(احیاء العلوم ۱۶/۱ ملخصاً) پوری تفصیل دیکھنی ہو تو امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء العلوم کی پہلی جلد میں ”**بیان العلم الذی ھو فرض کفایة**“ کا مطالعہ کریں۔

امام غزالی کے کلام سے بھی ظاہر ہے کہ علوم بنیادی طور پر دو ہیں، علوم شرعیہ وغیر شرعیہ۔ علم کی تقسیم ہر مسلمان کے لئے بدیہی ہے، جس کو ذرا بھی علم اور شعور ہے وہ خوب جانتا ہے کہ دنیا میں علم کے نام سے بے شمار چیزیں جو بکھری ہوئی ہیں، وہ کوئی بھی علم دین نہیں ہے، علم دین وہی ہے جس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے، جس کے ادراک میں عقل انسانی ناکافی ہے، باقی دوسرے علوم اگر علم دین کے لئے معین ومددگار یا ضروری ہیں تو وہ علم دین سے تعلق رکھنے کی وجہ سے کسی درجے میں علوم دین میں شمار ہو سکتے ہیں، اور ان کے علاوہ کوئی بھی علم، علم دین نہیں ہے، اس بات کے لئے کسی دلیل اور حوالے کی ضرورت نہ تھی لیکن کیا کیجئے کہ یہ چھوٹی بات ایک بڑے منھ سے نکلی ہے، اس لئے اس تفصیل کی ضرورت پڑی۔

☆☆☆☆☆☆

تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار کی شرعی حیثیت

سوال: موجودہ دور میں ایک تبلیغی تحریک ‘‘تبلیغی جماعت’’ کے نام سے تبلیغی سرگرمیوں میں منہمک ہے، اس کے کثرت شیوع اور ہمہ گیری کے باعث جب مطلق تبلیغ کا نام بولا جاتا ہے تو اس کا اطلاق بے تکلف اسی تحریک پر ہوتا ہے، یہ تحریک چند اعمال واشغال سے مرکب ہے، جنہیں اس کی مجموعی حیثیت میں اجزا ولوازم کی حیثیت حاصل ہے، اور ان پر بے حد التزام و اصرار کیا جاتا ہے، نیز تمام مسلمانوں کو خواہ عالم ہوں یا جاہل، دیندار ہوں یا دین سے دور، سب کو اس میں شرکت اور ان اعمال واشغال پر کاربند ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، اور بشدت اصرار کیا جاتا ہے، اس دعوت واصرار کا اثر یہ ہے کہ عامۃ الناس جو اس میں شریک یا اس کے مؤید ہیں، اس کو اس درجہ ضروری دینی عمل سمجھنے لگے ہیں کہ جو اس میں شریک نہ ہو یا اس سے اختلاف رکھتا ہو وہ نہ صرف یہ ہے کہ مستحق ملامت ہے بلکہ گمراہ اور راہ سے بھٹکا ہوا ہے، حتی کہ جو عالم اپنے اور دینی مشاغل کے باعث اس میں شریک نہیں ہوتے وہ بھی اس حلقہ میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ بہت سے مدارس میں مدرسی کے لئے شرط ہے کہ وہ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو، یہ ذہن صرف عوام ہی کا نہیں ہے خواص بھی اپنی تقریروں میں کہیں صراحۃً اور کہیں عالمانہ تعبیرات میں اشارۃً یہ کہتے ہیں کہ ہدایت کا راستہ اگر کوئی ہے تو یہی ہے، جو کچھ اس کے علاوہ ہے خالی از خطر نہیں۔ یہ تبلیغی حضرات کے ذہن وفکر کا اجمالی خاکہ ہے، ذیل میں ان اعمال واشغال کو لکھا جاتا ہے جن سے اس کی مجموعی صورت مرتب ہوتی ہے۔

(۱) خروج:

یعنی اس تحریک میں شرکت کے لئے گھر چھوڑ کر ایک مدت متعینہ کے لئے باہر نکلنا، سفر

کے اخراجات خود نکلنے والے کے ذمے ہوتے ہیں، اس کو کبھی ہجرت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ ''تفریغِ وقت'' بھی یہی ہے۔

(۲) چلہ:

چالیس روز کے واسطے گھر چھوڑ کر نکلنا، لیکن یہ لفظ بطور عموم کے بھی استعمال ہوتا ہے جس میں چالیس روز سے کم وبیش مقدار بھی شامل ہے، عامۃ الناس کو ابتداء سال کی دعوت دی جاتی ہے، اس کے بعد ایک چلہ کی، پھر دس دن کی، یہ نہ ہو تو تین روز کی، ورنہ چوبیس گھنٹہ کی، پھر جتنے وقت کے لئے چاہیں۔ اور علما سے ابتداء سات چلہ کا مطالبہ ہوتا ہے۔

(۳) جماعت:

چند افراد پر مشتمل ایک جماعت بنائی جاتی ہے، جس میں ایک امیر ہوتا ہے، باقی مامور، یہ جماعت مخصوص آداب واعمال کے ساتھ قریہ قریہ سفر کرتی رہتی ہے، اس کا قیام ہمیشہ مسجد میں ہوتا ہے۔

(۴) گشت:

یہ تین طرح کا ہوتا ہے۔ (۱) خصوصی (۲) عمومی (۳) تعلیمی

خصوصی کا مطلب یہ ہے کہ جماعت کے دو یا تین افراد مل کر بااثر اور ذمہ دار قسم کے افراد سے ملاقات کرتے ہیں، اور انہیں تعاون اور شرکت کی دعوت دیتے ہیں، اس تعاون کو اپنی اصطلاح میں ''نصرت'' کہتے ہیں۔

عمومی کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ دن بھر ایک بار پوری جماعت مل کر بستی کے عام افراد سے ملاقات کر کے نماز کی اور اس کے بعد بیانِ تبلیغ میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے، اس گشت میں نکلتے وقت جماعت کے ایک فرد کو مسجد میں دعا کرنے کے لئے متعین کر دیا جاتا ہے، جماعت ہی کا ایک فرد گشت کا امیر اور ایک شخص متکلم مقرر ہو جاتا ہے، اور ایک رہبر بستی کا لے لیا جاتا ہے۔

اور تعلیمی یہ ہے کہ ایک مخصوص وقت میں کتب فضائل جنہیں تبلیغی نصاب کہتے ہیں، پڑھی جاتی ہیں، اس وقت ایک یا دو آدمی بستی کی گلیوں میں اور چوراہوں پر جاتے ہیں، اور جس آدمی کو فارغ دیکھتے ہیں اسے دعوت دے کر مسجد میں لاتے ہیں، تاکہ وہ اس میں شریک ہو۔

(۵) بیان:

عمومی گشت کے بعد جو عموماً کسی نماز سے پہلے ہوتا ہے، نماز سے فارغ ہوکر جماعت ہی کا کوئی فرد علی العموم امیر جماعت اپنی دعوت لوگوں کے سامنے رکھتا ہے، اور چھ باتوں پر تقریر کرتا ہے۔

(۶) تعلیم:

کتب فضائل کسی ایک وقت یا دو وقت پڑھی جاتی ہے، اسی کو تعلیم کہتے ہیں۔

(۷) مشورہ:

جماعت جب کسی آبادی میں پہونچتی ہے تو فوراً افراد جماعت بیٹھ کر مشورہ کرتے ہیں، جس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ کھانے کے نظم پر کون کون ہوگا؟ اعلان کون کرے گا؟ بیان کس کا ہوگا؟ گشت خصوصی میں کون جائے گا؟ مشورہ کا بھی امیر متعین ہوتا ہے۔

(۸) تشکیل:

بیان کے خاتمے پر لوگوں کو چلہ میں نکلنے کی ترغیب دی جاتی ہے، بیان کرنے والے کے علاوہ خود جماعت کے تمام افراد بھی فرداً فرداً بات کرتے ہیں، اور انہیں اصرار سے چلہ میں نکلنے کی دعوت دیتے ہیں، ان کے اعذار و موانع کا حل پیش کیا جاتا ہے، یا رد کیا جاتا ہے۔

(۹) دعا:

ہر بیان کے بعد اجتماعاً اور جہراً طویل دعا ہوتی ہے، اس کے علاوہ بھی گشت شروع کرنے سے پہلے مسجد سے باہر نکل کر کسی بستی میں داخلہ سے پہلے، کھانے سے پہلے اور بعد، سونے پہلے اجتماعاً اور جہراً اور کبھی صرف جہراً دعا ہوتی ہے۔

(۱۰) تفقد:

جو لوگ چلہ میں نکلنے کے لئے نام لکھواتے ہیں انہیں دوبارہ اہتمام کے ساتھ اکٹھا کرنا ان کا حوصلہ بندھانا، ان کی دیکھ بھال کرنا ‘‘تفقد’’ کہلاتا ہے۔

(۱۱) اجتماع:

مختلف جماعتیں اور افراد ایک جگہ تاریخ مقررہ پر اکٹھا ہوتے ہیں، جماعت کے اکابر بھی تشریف لاتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، اجتماع کے خاتمہ پر تشکیل کے بعد بہت لمبی دعا ہوتی

ہے۔ یہ اجتماعات دوطرح کے ہوتے ہیں، سہ روزہ۔ یہ بڑا اجتماع ہوتا ہے، کبھی اس کو عالمی اجتماع کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جبکہ غیر ملکی جماعتیں شریک ہوتی ہیں۔ دوسرے چوبیس گھنٹہ کا اجتماع، یہ بالعموم ہر ماہ کسی کسی جگہ ہوتا، اس کے علاوہ مقامی طور پر بھی ہفتہ وار اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔

(۱۲) شب گزاری:

مقامی احباب عموماً جمعہ کی شب کسی مسجد میں اکٹھے ہوکر وہیں آداب کے مطابق کھانا کھاتے اور رات گزارتے ہیں۔

(۱۳) چھ باتیں:

جماعت میں نکلنے کے بعد آدمی چھ باتوں کے دائروں میں منحصر ہوکر اپنے اوقات گزارتا ہے، انہیں چھ باتوں پر بیانات ہوتے ہیں، ان کے علاوہ کسی اور بات کی اجازت نہیں ہوتی، وہ چھ باتیں یہ ہیں۔ (۱) کلمہ طیبہ (۲) نماز (۳) علم وذکر (۴) اکرام مسلم (۵) اخلاص نیت (۶) تفریغِ وقت یعنی خروج۔ ان چھ کے علاوہ ایک اور چیز ہے جس کو پرہیز کا لقب دیتے ہیں، وہ ہے ''ترکِ لایعنی'' ان چھ باتوں کے علاوہ کسی اور میں مشغول نہ ہوں۔

(۱۴) اجتماعی تلاوت سورہ یٰس:

یہ امر مرکز یعنی بستی نظام الدین میں بعد مغرب التزاماً رائج ہے۔

(۱۵) مصافحہ:

جماعتیں جب اجتماعات سے روانہ ہوتی ہیں یا مرکز سے کوچ کرتی ہیں تو وہاں موجود حضرت جی یا کسی بڑے سے مصافحہ کرتی ہیں، اس کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔

یہ ہیں اجزا اس تبلیغی جماعت کے، ان سب امور کو التزاماً پورا کیا جاتا ہے، ان میں سے اکثر کے مستقل فضائل بیان کئے جاتے ہیں، گشت سے پہلے تو بالالتزام ''فضائلِ گشت'' کے عنوان سے ایک مختصر بیان ہوتا ہے، ان امور کو دینی اور عبادتی حیثیت سے ضروری سمجھا جاتا ہے، ان میں سے کسی کی عدم بجا آوری کو اصول کے خلاف اور بے برکتی اور خرابی کا باعث خیال کرتے ہیں، وعیدیں سنائی جاتی ہیں۔ جہاد کے فضائل اس جماعت پر چسپاں کئے جاتے ہیں، اور ہر ہر فرد کے

لئے شمولیتِ جماعت کو لازم قرار دیا جاتا ہے، عدمِ شمولیت پر بعض اوقات عذاب تک کی وعیدیں سنا دیتے ہیں۔

ترتیب شمولیت کی علی الانفراد یہ بیان ہوتی ہے کہ عمر بھر میں بیک دفعہ تین چلہ، اور علما کے لئے سات چلہ، پھر سال بسال ایک ایک چلہ، مہینہ میں تین دن، ہفتہ میں دو گشت، ایک اپنے محلے میں اور ایک دوسرے محلے میں، روزانہ کی تعلیم۔ جو اس طریقہ پر پوری طرح عامل ہے، وہ کامل ہے، ورنہ بقدر کمی اس میں کوتاہی۔ تبلیغی حضرات اس تحریک سے کسی کو مستثنی نہیں کرتے، چنانچہ مدرسین اور طلبہ سے بھی جمعرات جمعہ اور رمضان کی تعطیلات میں چلہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔

نتائج:

اس تحریک کے کچھ مفید اور کچھ مضر اثرات شاہد ہیں، اچھے تو یہ کہ ہر ہر جگہ دین کی بیداری پیدا ہوگئی، مسجدوں میں نمازی بڑھ گئے، بعض بعض علاقہ جو بالکل فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے تھے ان کی اصلاح ہوگئی، عام دینی زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی، جہاں لوگ نماز روزے سے ناواقف تھے وہاں مسجدیں آباد ہوگئیں، بہت سے اہل بدعت کی اصلاح ہوگئی، یورپین ممالک میں اس تحریک کے ذریعے بکثرت مسلمان ہونے کی اطلاعات ہیں۔

نقصانات یہ ہیں کہ دینی اعمال واشغال کو مذکورہ چھ باتوں میں منحصر سمجھنے کا رجحان پیدا ہوگیا ہے، تبلیغ صرف اسی ایک طریقہ میں منحصر سمجھی جانے لگی دوسری دینی خدمات کے متعلق دینی خدمات نہ سمجھنے کے رجحانات پیدا ہوگئے ہیں، اس میں شرکت نہ کرنے مورد ملامت بن گئے، وہ علما جو اپنے مشاغل تدریس وتالیف، وعظ وتقریر، افتاء وارشاد میں مصروف ہونے کے باعث اس میں عملاً شریک نہیں ہوتے ان کی وقعت عامۃ الناس کے قلوب سے نکل گئی، ان پر کاہلی اور ناکارگی کے اتہامات عائد ہوتے ہیں، مدارس وخوانق کے متعلق بھی اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔

ان سب حالات کو دیکھ کر دریافت طلب یہ بات ہے کہ اس تحریک کا شرعی حکم کیا ہے؟ مفصل بیان کیا جائے۔

حامداً و مصلیاً

پہلے چند قواعد سمجھ لینے ضروری ہیں، ان کے ذہن نشیں ہونے کے بعد مسئلہ کا حکم دریافت کرنے میں سہولت ہوگی۔

(۱) امور شرع کے معتبر دلائل چار ہیں، قرآن، سنت رسول، اجماع، قیاس۔ کسی عمل کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ ان چاروں دلائل میں کسی ایک سے ثابت ہو، اور جو حکم ان سے ثابت نہ ہو، خواہ وہ کتنا ہی ضروری اور مفید معلوم ہوتا ہو، جائز نہیں۔

(۲) احکام شرع دو طرح کے ہیں۔ بعض احکام ایسے ہیں جنہیں محض بجالانے کا امر ہے، شریعت نے ادائیگی کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی ہے، انہیں ادا کرنے کے لئے کوئی بھی طریقہ جو شرعاً جائز ہو اختیار کیا جاسکتا ہے، اس سے وہ فرض ادا ہو جائے گا، مثلاً جہاد کہ اس کے لئے کوئی خاص ہیئت، فوج کی کوئی خاص ترتیب، کچھ مخصوص اسلحے متعین نہیں ہیں، جب جیسی ضرورت ہو ویسی ہیئت بنائی جاسکتی ہے، ہر زمانہ کے مطابق اسلحے اختیار کئے جاسکتے ہیں، کسی ایک محدود و مخصوص صورت میں جہاد منحصر نہیں ہے، ایسے احکام اصطلاحِ شرع میں 'مطلق' کہے جاتے ہیں۔

بعض احکام ایسے ہیں جن کی ادائیگی کے لئے کوئی خاص شکل یا وقت وغیرہ متعین ہیں، مثلاً نماز کہ یہ عبادت رکوع، سجود، قیام وقعود اور قرأت وغیرہ پر مشتمل ہے، ایسے احکام 'مقید' کہلاتے ہیں، اور مقیدہ کو ان کی قیودات کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے ورنہ اس کا وجود ہی نہ ہوگا، فرض کرو کوئی نماز تو پورے طور پر ادا کرے مگر سجدہ نہ کرے تو اس کو نماز ہی نہ کہیں گے، سجدہ شرعاً مطلوب ہے، امور مقیدہ میں جتنی تقییدات ہیں سب مطلوبِ شرعی ہیں، اس کے خلاف امور مطلقہ کو کسی بھی ہیئت میں بشرطیکہ وہ ہیئت جائز ہو، ادا کرنا درست ہے۔

(۳) لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کسی امر مطلق کی بجا آوری ہوگی تو وہ کسی فرد کے ضمن میں ہوگی، اس کی کوئی خاص صورت و ہیئت ضرور بنے گی، تاہم یہ خیال رہے کہ اس کے اجزاء مطلق کے لئے قیود نہ ہوں گے کہ ان کے بغیر اس کی ادائیگی ہی نہ ہو سکے، بلکہ انہیں عوارض اور منضمات کہیں گے، مثلاً جہاد کے لئے کسی نے ایک لشکر ترتیب دیا، اس کے مختلف دستے متعین کئے، انہیں مختلف مقامات پر مامور کیا، سب کی خدمات بتائیں، ہتھیار دیئے، ان تمام امور سے جہاد کی ایک

ہیئت بنی، ان امور کو جہاد کی قید نہیں سمجھا جائے گا، اگر کوئی شخص اس طریقہ سے مختلف کوئی اور ڈھنگ اختیار کرے تو وہ بھی بے تکلف جہاد ہی ہوگا۔ غرض مطلق کی کوئی شکل اس طور پر متعین نہیں ہوگی کہ اس کے اجزا کو قیود کا درجہ دیا جائے، اگر کوئی شخص اپنی رائے سے مطلق میں کوئی قید لگا دے تو یہ امر نامشروع اور بدعت ہوگا، فقہا کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ:

المطلق يجرى على اطلاقه ۔ مطلق اپنے اطلاق ہی پر رہے گا۔

علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

التقييد فى المطلقات اللتى لم يثبت بدليل الشرع تقييدها رأى فى التشريع. (الاعتصام ج ۱ ص ۳۴۵)

مطلق کی ایسی تقیید جو دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو، شریعت میں رائے کی دخل اندازی ہے۔

مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں:

> ’’اصل یہ ہے کہ بحکم آیات واحادیث مجمع علیہ تمام امت کا ہے کہ کسی حد کو حدود شرعیہ میں سے تغیر نہیں کرنا چاہئے، اور کسی حکم کو تبدل، تبدل کمی زیادتی وغیرہ نہیں دینا چاہئے، مطلق کو مطلق، مقید کو مقید، ضروری کو ضروری، مباح کو مباح، اپنے مشروعہ پر رکھنا واجب ہے ورنہ تعدی حدود اللہ اور احداث وبدعت میں گرفتار ہو جاوے گا‘‘۔ (براہین قاطعہ ص ۱۱۲)

(۴) امر مشروع میں کسی مباح یا مندوب کا انضمام اسی حد تک جائز ہے جب تک وہ اپنی حد پر رہے، اگر اسے لازم اور ضروری قرار دیا جائے یا اس پر ایسا دوام واستمرار ہو جائے کہ لوگوں میں لزوم کے اعتقاد کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو وہ امرِ منضم اپنی حدِ انضمام سے بڑھ کر قید بن جائے گا، اس لئے اس کا ترک لازم ہوگا، اسی کا نام اصطلاح فقہ میں ’’التزام مالا یلزم‘‘ ہے، یعنی جس امر کو شریعت نے عبادۃً یا عادۃً لازم اور ضروری نہ بنایا ہو، اس کو اپنی طرف سے لازم قرار دینا، یہ درست نہیں ہے، اس کو اگر دین یا ثواب کی چیز سمجھ کر لازم کیا گیا تو بدعت ہے، مثلاً نماز میں کسی خاص سورت کا پڑھنا متعین نہیں ہے، کوئی بھی سورت پڑھی جاسکتی ہے، اگر کوئی شخص کسی خاص

نماز میں کسی ایک ہی سورت کا ایسا التزام کرے جس سے اس کے لزوم کا ایہام ہو تو فقہا نے اسے ممنوع قرار دیا ہے، اسی بنا پر سورِ مستحبہ مثلاً جمعہ کے دن نماز فجر میں 'الم سجدہ' اور سورہ 'دہر' کا التزام مکروہ ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں:

> ''التزام مالا یلزم بدونِ اعتقادِ وجوب بھی ممنوع ہے، اگر باصرار ہو، اگر مندوب پر دوام ہو بلا اصرار، وہ جائز ہے، اور مستحب ہے، بشرطیکہ عوام کو ضرر نہ کرے، اور اگر عوام کے اعتقاد میں نقصان ڈالے تو وہ بھی مکروہ ہے، چنانچہ کتب فقہ میں سورِ مستحبہ کے التزام کو مکروہ لکھا ہے''۔ (تذکرۃ الرشید ج ا ص ۱۳۴)

مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی فرماتے ہیں:

قدتقرر فی مقرہ ان کل مباح ادی الی التزام غیر مشروع والی فساد عقائدالجھلة وجب ترکه علی الکملة ان لا یلتزموا لکونه مؤدیاً الی اعتقاد السنیة. (روع الاخوان عن محدثات آخر جمعة فی رمضان)

اپنی جگہ ثابت ہو چکا ہے جو مباح ضروری سمجھ لیا جائے اور اس سے عوام کا اعتقاد فاسد ہونے لگے تو اس کا ترک کرنا علما پر ضروری ہے، اور یہ کہ اس کا التزام نہ کریں، کیوں کہ لوگ اسے سنت سمجھنے لگیں گے۔

امام شاطبی اور وضاحت فرماتے ہیں:

کل ماواظب رسول اللہ ﷺ من النوافل فی الجماعات فھو سنة فالعمل بالنافلة اللتی لیست بسنة علی طریقة العمل بالسنة اخراج النافلة عن مکانھا المخصوص بھا شرعاً ثم یلزم من ذالک اعتقاد العوام فیھا من لا علم عندہ انھا سنة وھذا فساد عظیم ،لان اعتقاد مالیس بسنةوالعمل علی حد العمل بالسنة نحو من تبدل الشریعة کما لو اعتقد فی الفرض انه لیس بفرض اوفیما لیس بفرض انه فرض ثم عمل وفق اعتقادہ فانه فاسد فھو العمل فی الاصل صحیحاً فاخراجه عن بابه اعتقاداً وعملاً من باب افساد الاحکام

الشرعية ومن هٰهنا ظهر عن السلف الصالح تركهم سنةً لئلا يعتقد الجاهل انها من الفرائض. (الاعتصام ص ۳۴۶)

ہر وہ عبادت نافلہ جس پر رسول اللہ ﷺ نے مواظبت فرمائی ہو، اور اس کو جماعتوں میں ظاہر فرمایا ہو، وہ سنت ہے، پس وہ نفلی عمل جو سنت نہ ہو، اس کو عمل بالسنۃ کے طریقے پر کرنا در حقیقت اس نفلی عمل کو اس کے مخصوص شرعی مرتبے سے خارج کرنا ہے، پھر اس سے لازم آتا ہے کہ عوام اور جہلا اس کو سنت اعتقاد کرنے لگیں، اور یہ فساد عظیم ہے۔ اس لئے کہ جو سنت نہ ہو اس کو سنت اعتقاد کرنا شریعت کو تبدیل کر دینا ہے، جیسا کہ فرض کو غیر فرض اور غیر فرض کو فرض اعتقاد کر لیا، پھر اپنے اعتقاد کے موافق عمل کر لیا تو یہ فاسد ہے، پس مانا کہ عمل فی نفسہ درست ہے لیکن اس کو اپنے باب سے اعتقاداً یا عملاً نکال دینا احکام شرعیہ کو فاسد کر دینے کے قبیل سے ہے، یہیں سے سلف صالحین کے قصداً سنتوں کے ترک کر دینے کا عذر ظاہر ہو گیا کہ جاہل یہ اعتقاد نہ کرنے لگیں کہ یہ عمل فرائض و واجبات میں سے ہے۔

(۵) مذکورہ بالا قاعدہ کی تتمیم کے لئے یہ اصول بھی پیش نظر رہے کہ فرض کیجئے کہ کسی امر مشروع میں کچھ چیزیں لازم کی گئیں، یا مستقل کوئی امر جدید ایجاد کیا گیا تو اس سلسلے میں اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ قرونِ مشہود لہا بالخیر یعنی دورِ نبوت، دورِ صحابہ، دورِ تابعین میں اس کا مقتضا اور موجب تھا یا نہیں؟ اگر اس کا مقتضا اس دور میں بھی موجود تھا مگر اسے اختیار نہیں کیا گیا تو اس صاف مطلب ہے کہ اس امر جدید کو بالقصد ترک کیا گیا ہے، مثلاً عید کی نماز کے لئے اجتماع مطلوب ہے، اور اجتماع کا تقاضہ ہے کہ اذان ہو، تاکہ وقت پر لوگ سہولت سے جمع ہو جائیں، لیکن اسے اختیار نہیں کیا گیا، اب اگر کوئی شخص اپنی رائے سے عیدین میں اذان کا اضافہ کر دے تو صریح بدعت ہے۔ اور اگر ان قیودات اور امر جدید کا مقتضا اس دور میں نہ تھا، اب پایا گیا تو یہ دیکھنا چاہئے کہ مامور بہ ان لوازم پر موقوف ہے یا نہیں؟ اگر انہیں پر موقوف ہے تو بدعت تو کیا ہوتیں وہ بھی مامور بہ ہوں گی، مثلاً تحصیل نسبت مع اللہ مامور بہ ہے، دور اول میں اس کا حصول فقط رسول اللہ ﷺ اور صحابہ و تابعین کی صحبت ہی سے ہو جایا کرتا تھا، اس لئے ریاضات و مجاہدات

اورادواشغال کی ضرورت نہ تھی، لیکن زمانۂ نبوت سے بعد اور نفوس بہیمی کے غلبہ کی وجہ سے اب ضرورت ریاضات ومجاہدات کی پڑی کہ اس کے بغیر تحصیلِ نسبت عادۃً بہت مشکل ہے، اس لئے انہیں بدعت نہ کہا جائے گا۔

دوسری مثال۔ علم دین کی تحصیل مامور بہ ہے، اس کا حصول عادۃً مدارس کے وجود پر موقوف ہے، اس لئے مدارس کا وجود بھی اس کے لوازم کے ساتھ ضروری ہے، اگر ان چیزوں میں کچھ شرعی خرابیاں پیدا ہوجائیں تو ان کی اصلاح کردی جائے گی، انہیں ترک نہ کیا جائے گا۔ علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

فامثلة(القيد)الواجب منها من قبيل مالا يتم الواجب الابه فلا يشترط ان يكون معمولاً به في السلف ولا ان يكون له اصل في الشريعة على الخصوص لانه من باب المصالح المرسلة لاالبدع. (الاعتصام ج۱ص۱۹۷)

قیود واجبہ میں سے وہ قیود بھی ہیں جو ’’مالایتم الواجب الا بہ‘‘ کے قبیل سے ہے، یعنی ایسی قید جس پر واجب کا حصول موقوف ہو، اس قید کا سلف میں مامور بہ ہونا شرط نہیں ہے، اور نہ یہ شرط ہے کہ خاص طور پر شریعت میں اس کی کوئی اصل ہو، اس لئے کہ یہ مصالح مرسلہ کی بات سے ہے، بدعت نہیں ہے۔

اور اگر مامور بہ کا حصول اس پر موقوف نہیں ہے، تو ان کا اختیار کرنا بس اسی حد تک درست ہے جب تک وہ اپنی حد پر رہے، اور اگر انہیں لازم سمجھ لیا جائے تو بدعت اور قابل ترک ہے جیسا کہ اس کی تفصیل قاعدہ نمبر چار میں گزری۔

(۶) کسی مرکب عمل کے اجزا اگر علیحدہ علیحدہ مباح، مستحب، یا مسنون ہوں تو یہی امر اس مجموعہ کے لئے جواز کی دلیل نہ بنے گا، نماز نفل امر مندوب، جماعت بھی مشروع، جماعت کے لئے تداعی واہتمام بھی مامور بہ لیکن ان سب کی الگ الگ مشروعیت کے باوصف ان کا مجموعہ [۱] ناجائز اور بدعت ہے۔

علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

فذالک ابتداع والدليل عليه انه لم يات عن رسول الله ﷺ ولا عن

اصحابه ولا عن التابعين لهم باحسان فعل هذا المجموع هٰكذا مجموعاً وان اتى مطلقاً من غير تلک التقييدات فالتقييد فى المطلقات اللتى لم يثبت بدليل الشرع تقييدها رأى فى التشريع. (الاعتصام۳۴۶)

پس یہ بدعت ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب اور تابعین سے یہ مجموعہ ثابت نہیں ہے، اگرچہ مطلقا بغیر قید کے ثابت ہو، پس مطلق میں ایسی قید لگانا جو شریعت سے ثابت نہ ہو، شریعت میں رائے کو دخل دینا ہے۔

(۷) جو امر بذریعۂ غیر مشروعہ حاصل ہو، وہ خود ناجائز ہے۔

’’یہ امر یقینی ہے کہ جو امرِ خیر بذریعۂ غیر مشروع حاصل ہو، وہ امر خیر نہیں، اور جب قیود کا غیر مشروع ہونا ثابت ہوجائے تو اس کا ثمرہ کچھ بھی ہو، جائز الحصول نہ ہوگا‘‘۔ (تذکرۃ الرشید ج۱ص۱۳۰)

(۸) التزام مالا یلزم اور دوام عمل میں فرق ہے، التزام میں لزوم کا اعتقاد ہوتا ہے، یا عوام میں اعتقادِ لزوم کا ایہام ہوتا ہے، ہر صورت میں کراہت سے خالی نہیں، بخلاف اس کے مندوب پر دوام میں، نہ اس کے لزوم کا اعتقاد ہوتا ہے اور نہ عوام کو اس سے کوئی ضرر ہوتا، اور اگر ضرر ہونے لگے تو وہ بھی التزام میں داخل ہو کر ممنوع ومکروہ ہوگا۔

ان اصول وقواعد کو بغور ملاحظہ کیجئے، یہ تمام کلیات علمائے احناف کے درمیان مسلم ہیں تفصیل کے لئے ’’براہین قاطعہ‘‘ اور ’’مکاتیب حضرت گنگوہی وحضرت تھانوی قدس سرہما، مندرجہ تذکرۃ الرشید‘‘ کا مطالعہ کیجئے، اس کے بعد موجودہ تبلیغی تحریک پر غور کیجئے۔

اولاً اس پر غور کیجئے کہ تبلیغ احکامِ مطلقہ میں سے ہے یا مقیدہ میں سے؟ تو اس کے متعلق علامہ شاطبی کا قول نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

الامر بتبليغ الشريعة بدون الاختلاف فيه لقوله تعالى ’’يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليک من ربک‘‘ وامته مثله، وفى الحديث ’’ليبلغ الشاهد منكم الغائب والتبليغ كما لا يتقيد بكيفية معلومة لانه من قبيل المعقول المعنى فيصح باى شئى من الحفظ والتلقين والكتابة وغيرها ذالک لا يتقيد حفظه

عن التحریف والزیغ بکیفیة دون اخری. (الاعتصام ج ا ص ۱۸۷)

تبلیغ شریعت کا حکم بغیر کسی اختلاف کے ثابت ہے، اللہ تعالی کے ارشاد سے کہ: ’’اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اس کی تبلیغ کیجئے‘‘، اور آپ کی امت بھی آپ کے مثل مامور ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ ’’چاہئے کہ تم میں سے جو حاضر ہیں وہ غائب کو تبلیغ کر دیں‘‘، اور تبلیغ جس طرح کیفیتِ متعینہ کے ساتھ مقید نہیں ہے، اس لئے کہ معقول المعنی کی قبیل سے ہے، لہٰذا حفظ، تلقین، تحریر جس صورت میں ممکن ہو، صحیح ہے، اسی طرح شریعت کی تحریف وزیغ وغیرہ سے حفاظت کے لئے بھی کوئی کیفیت اور صورت متعین نہیں۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تبلیغ امور مطلقہ میں سے ہے، اور قاعدہ نمبر تین سے معلوم ہو چکا ہے کہ مطلق کو اپنی رائے سے مقید کرنا درست نہیں ہے، اب قابل نظر یہ امر ہے کہ تبلیغِ موجودہ کے جو اعمال واشغال ہیں وہ قیود ہیں یا انضمامات؟ ظاہر ہے کہ اصلاً تو وہ امور منضمہ ہی ہیں، لیکن التزام واصرار کے باعث قیود بن گئے ہیں، کیوں کہ ان کے بغیر تبلیغ کا وجود ہی نہیں سمجھا جاتا، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ایک مطلق کی تقیید لازم آتی ہے۔

خود ان اجزا پر فرداً فرداً غور کیجئے تو فی نفسہ وہ سب جائز اور مشروع ہیں، لیکن التزام و اصرار کے باعث کوئی بھی اپنی حد پر نہیں رہ گیا، بلکہ انہیں واجب کا درجہ دیدیا گیا، اس سلسلے میں عامۃ الناس کا فسادِ عقیدہ بالکل ظاہر ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ترک پر ملامت کی جاتی ہے، اسی کا تو نام ’’التزام مالا یلزم‘‘ ہے، جو باتفاقِ فقہا مکروہ وممنوع ہے۔

مجموعی حیثیت سے غور کیجئے! کیا اس مرکب شکل کے ساتھ جس کی طرف آج دعوتِ عام دی جا رہی ہے، تبلیغ کا وجود قرون ثلاثہ میں تھا، ظاہر ہے کہ نہیں تھا، ہمارے اس زمانہ میں ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان ادوار میں اس کا داعی اور مقتضا موجود تھا یا نہیں؟ تبلیغ کا مقصد اشاعتِ دین ہے اور یہی مقتضا ہے مروجہ تبلیغ کا بھی، کون کہہ سکتا ہے کہ اشاعتِ دین کی ضرورت اسی دور میں ہوئی ہے، پہلے بھی تھی اور یقیناً تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں میں فسق وفجور اور دین سے غفلت نہ تھی، لیکن دوسری اقوام میں شرک وکفر موجود تھا، قرون ثلاثہ کے بعد عملی واعتقادی گمراہیاں بھی بہت پھیلیں، تو مسلمانوں کو احکامِ اسلام سکھانے کی ضرورت بھی بکثرت پیش آئی، مگر اس کے لئے

خاص یہ شکل تو کیا کبھی کوئی متعین اور محدود صورت نہیں اختیار کی گئی، جہاں جیسا مصلحت کا تقاضا ہو، اطریقِ کار اختیار کیا گیا، کہیں مقامی طور پر علما ومشائخ نے تبلیغ وتلقین کا فرض انجام دیا، کہیں مشائخ نے اپنے خلفا اور علما نے اپنے تلامذہ کے وفود بھیجے، کہیں کوئی ایک شخص گیا، کوئی مسجد میں وعظ کہتا، کوئی عام مجامع میں تلقین کرتا، کوئی تصنیف وتحریر کے ذریعے تبلیغ کرتا، کہیں مناظرہ ومجادلہ کی نوبت آتی، کہیں حرب وضرب تک بھی معاملہ پہونچتا، اور یہ سب اسی ایک امر مطلق کی تعمیل تھی، کسی نے کوئی خاص طریقہ عمومی طور پر لازم نہیں کیا، اس کے برحلاف موجودہ تحریک میں دنیا کے ہر خطے اور ہر ماحول میں وہی ایک طریق متعین ہے، اور سب پر لازم ہے، ظاہر ہے کہ یہ بالکل نیا امر ہے، اس صورت حال پر غور کیجئے کہ مقتضا ابتدا ہی سے موجود مگر اس کا حدوث اب ہوا، اس لحاظ سے قواعد کی روشنی میں تو یہ امر صریح بدعت معلوم ہوتا ہے۔ فتأمل

اگر کوئی کہے کہ موجودہ شکل کا مقتضا ان ادوار میں نہ تھا، اس وقت حالات ایسے نہ تھے، بے دینی اتنی عام نہ تھی کہ اس اجتماعی شکل میں تبلیغ کی ضرورت ہوتی، اس کی ضرورت ہمارے اس دور میں ہوئی ہے، تو اول اسی میں کلام ہے، جیسا کہ اس کی طرف اشارہ سطور بالا میں گزر چکا ہے، لیکن چلئے فرض کیجئے کہ اس کا تقاضا اس وقت نہ تھا، آج ہی ہوا ہے، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ تبلیغ وتعلیم کا حصول خاص اسی طریقہ پر موقوف ہے، اور عادۃً اس کے بغیر تبلیغ کا فریضہ ادا نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اب بھی تبلیغ کے مختلف شعبے ضعف کے ساتھ ساتھ سہی جاری ہیں، وعظ وتقریر، تصنیف وتالیف، مدارس وخوانق یہ تمام شعبے تو چل ہی رہے ہیں، پھر تبلیغ کو اسی طریقہ خاص میں منحصر کیسے کیا جاسکتا ہے؟۔

بہرکیف یہ بدیہی امر ہے کہ تبلیغ کا حصول اس پر موقوف نہیں ہے، لہٰذا اس مجموعہ کے التزام واصرار کے لئے مستقل دلیل کی ضرورت ہے جیسا کہ قاعدہ نمبر چھ سے معلوم ہو چکا ہے، اور وہ ہے نہیں۔ مزید اگر غور سے دیکھا جائے تو بہت سے مفاسد اس میں شامل ہیں، التزام مالا یلزم تو ہر ہر جز میں ہے، مثال کے طور پر دعا بالجہر للاجتماع، بے شک مطلق دعا مامور بہ ہے، لیکن متعین مواضع پر التزاماً دعا جہراً واجتماعاً کرنا بلاشبہہ ایک نئی بات ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے ہرگز ثابت نہیں، اسی طرح اس تحریک میں جہلا کو علما کے منصب پر فائز کرنے کا بالعموم رواج ہے، وعظ

اور خطاب عام کرنا.... کتب فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ.... کہ علما کے لئے مخصوص ہے، کسی جاہل، ناواقف کو وعظ کہنے کا حق نہیں ہے، خطاب خاص کے ساتھ انفراداً کسی کو نصیحت کرنے کی اجازت تو ہے مگر محافل ومجامع میں نہ وعظ کہنا درست ہے نہ اس کا سننا، جب کہ یہ عام مشاہدہ ہے کہ بالکل ناواقف شخص جو شریعت کے اصول وقواعد سے بالکل نابلد ہوتا ہے، اسے امیر بنادیا جاتا ہے، اور وہ بے ڈھڑک وعظ کہتا پھرتا ہے، اور اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جاہل وناواقف سے ہر وہ شخص مراد ہے جس نے علما کی صحبت میں رہ کر معتد بہ علم جس سے عرف میں عالم کہلاتا ہو، نہ حاصل کیا ہو، اور نہ اسے کسی معتمد عالم سے وعظ کہنے کی اجازت ہو۔

اسی طرح نہی عن المنکر جو شریعت کا ایک مستقل فریضہ ہے، وہ بھی جماعت میں التزاماً متروک ہے، بلکہ اس کے ترک کا حکم ہے، یہ بھی علما کی تصریحات کے مطابق نادرست ہے۔

علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

ان البدعة من حيث قيل فيها انها طريقة مخترعة الخ. يدخل فى عموم لفظها البدعة الترکيه فقد يقع الابتداع بنفس الترک تحريماً للمتروک اوغير تحريم فان الفعل مثلاً قد يكون حلالا بالشرع فيحرمه الانسان على نفسه اويقصد ترکه قصداً.

بدعت کے بارے میں جب کہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ دین میں گھڑے ہوئے طریقہ کا نام ہے، الخ۔ تو اس کے عموم لفظ میں بدعت ترکیہ بھی داخل ہے، جیسا کہ بدعت غیر ترکیہ داخل ہے، پس بدعت صرف ترک کردینے کا نام ہے، خواہ متروک کو حرام سمجھ کر ترک کیا ہو، خواہ حرام نہ سمجھا ہو، اس لئے کہ مثلاً فعل کبھی شرعاً حلال ہوتا ہے، مگر انسان اس کو اپنے اوپر حرام کرلیتا ہے، یا قصداً اسے ترک کردیتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

وان كان الترک تديناً فهو الابتداع اذ قد فرضنا الفعل جائزاً شرعاً فصار الترک المقصود معارضة فى شرع التحليل. (الاعتصام ج۱ص۴۲)

اور اگر ترک تدیناً ہے تو یہ ابتداع فی الدین ہے، اس لئے کہ فعل کو ہم نے جائز فرض کیا

ہے، لہٰذا بالقصد ترک کر دینا شارع کا معارض ہوگا کہ یہ تحلیل شارع کے مقابلے میں تحریم ہے۔

علاوہ ازیں اور بھی مفاسد ہیں جن کا ذکر سوال میں موجود ہے، اس لئے حسبِ قاعدۂ مذکورہ اس کا تدارک ضروری معلوم ہوتا ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ یہ اس تحریک سے دینی فوائد بہت ہیں، تو بلاشبہ یہ صحیح ہے، اس کا انکار کون کرسکتا ہے؟ لیکن مخصوص فوائد کا ہونا کسی چیز کی صحت کی دلیل نہیں، فائدہ وہی معتبر ہے، جو بذریعۂ مشروع ہوا ہو، اگر موجودہ تبلیغ دلائل وقواعد کی رو سے درست ہو تب تو کلام کی گنجائش ہی نہیں، ورنہ ان منافع کا شرعاً کچھ وزن ہی نہیں ہے جنہیں حاصل کرنے کے لئے مکروہات و ممنوعات کا ارتکاب کیا گیا ہو۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی حیثیت فتوی کی نہیں ہے بلکہ سوال وجواب دونوں مل کر ایک استفتا ہے، جو حضرات اہم علم کی خدمت میں پیش ہے، اب تک اس حیثیت سے جماعت کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے، چونکہ اپنی جماعت کے اکابر نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے، اور اپنے ہی اکابر کی سرپرستی میں چل رہی ہے، اس لئے کبھی غور کی ضرورت ہی شاید محسوس نہ ہوئی، اگر چہ بعض اوقات ناخوشگواریاں پیش آتی ہیں، لیکن عوام کا غلو کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے، لیکن سوچنے کا ایک طرز یہ بھی ہے۔ حضرات اہل علم غور کریں، اور دیکھیں کہ اس میں کیا خامی ہے؟ اگر واقعۃً کوئی کمی اور کجی ہے تو اس کو ظاہر کریں ورنہ جو کچھ صحیح ہوا سے ظاہر کردیں۔

والله الموفق والمعين

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) یعنی اگر کوئی نفل نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کرے اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دے، تو یہ ناجائز ہے۔

جماعت تبلیغ۔ مشورے اور گزارشیں

یہ خاکسار راقم جماعت تبلیغ کے اندر کچھ ایسی چیزیں دیکھ رہا ہے جسے اکابر کے سامنے پیش کر دینا امانت و دیانت کا تقاضا سمجھتا ہے، اس دیکھنے والے کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے تاہم چونکہ ان تمام اکابر سے تعلق رکھتا ہے جو تبلیغی جماعت اور اس کے اجتماعات کی سرپرستی فرماتے ہیں، اور ان احباب سے محبت رکھتا ہے جو اس میں شرکت کو دین و ایمان سمجھتے ہیں، اور دین نام ہی خیر خواہی کا ہے، اس لئے کچھ باتیں ان کی خدمت میں پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہے، اگر مجھ سے غلطی ہو رہی ہے تو اصلاح کا امیدوار ہوں، اور اگر یہ گزارش کسی درجہ میں لائق اعتنا ہے تو حضرات اکابر توجہ فرمائیں۔

مفید تحریکات کا مزاج عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ابتدا میں وہ ایک فطری سادگی کے ساتھ چلتی ہیں، ان میں مقصدیت کا عنصر غالب ہوتا ہے، ذرائع و وسائل کو ان کے درجے پر ہی رکھا جاتا ہے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے اور اس تحریک کا پھیلاؤ بڑھتا ہے اس میں دوسرے عناصر بھی شامل ہوتے چلے جاتے ہیں، وسائل کبھی مقاصد کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں، اور بعض اوقات تو تحریک کسی اور ہی رخ پر چل پڑتی ہے، ایسے وقت میں بہت چوکنا ہو کر ان فاضل عناصر کو دیکھتے رہنا بہت ضروری ہوتا ہے، جو تحریک کے لئے مضر یا اجنبی ہوں، اور ضرورت ہوتی ہے کہ وقتاً فوقتاً تطہیر کا عمل جاری رہے، ورنہ ابتدا کا رنگ انتہا میں باقی نہیں رہتا ہے، یہ مزاج تحریکات ہی تک محدود نہیں ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود دین اسلام میں نئی نئی چیزیں کرنے والے شامل کر دیتے ہیں، تو اللہ تعالی دین کی تطہیر و تجدید کے لئے مجددین کو مقرر فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”**ان الله يبعث لهذه الامة على راس كل مأة سنة من يجددلها**

دینھا"۔ (ابوداؤد شریف۔ کتاب الملاحم) ہر سو سال پر اللہ تعالی اس امت کے واسطے ایسے شخص کو کھڑا کرتے ہیں جو دین کی تجدید کرے یعنی زائد آمیزشوں سے اسے پاک کرے۔

تبلیغی جماعت جو اشاعتِ دین کی تحریک کے طور پر شروع ہوئی تھی، اور اب اس پر نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، اور ماشاء اللہ اس کے اثرات وفوائد عالمی پیمانے پر ظاہر ہوئے ہیں، اللہ تعالی نے اس سے بڑا کام لیا لیکن جیسے اور تحریکات میں نامناسب عناصر کے داخل ہونے کا امکان ہوتا ہے، اس تحریک کا بھی اصولِ دین کی روشنی میں احتساب کرنا چاہئے، اگر کوئی چیز نامناسب اس میں داخل ہوگئی ہو تو اسے چھانٹ دیں، حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ہر شخص، ہر جماعت، ہر تحریک جو دینی خدمت کرتی ہے، وہ مکلّف ہے کہ اپنے طریقۂ کار کو قرآن وسنت پر پیش کرے، حضرات صحابہ کے تعامل پر پیش کرے، معیار یہی ہے، تمام ائمہ کرام، مشائخ عظام نے یہی کوشش کی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے نقش قدم پر رہیں، ہر ایک نے برملا اعلان کیا ہے کہ ان کا کوئی قول وعمل یا کشف والہام دلیل سے ثابت ہوجائے کہ خلافِ سنت رسول ہے تو اسے بے تکلف رد کردیں۔

تبلیغی جماعت بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے، تحزب وعصبیت سے برکنار ہوکر یہ ضرور دیکھنا چاہئے کہ اس میں کوئی ایسی بات تو نہیں آچلی ہے جسے نہیں ہونا چاہئے، تبلیغی جماعت کا مسئلہ اس حیثیت سے بہت اہم ہے اور نازک ہے (کہ اس میں جو بھی غلطی ہوگی) تو وہ انفرادی نہ ہوگی، ایک بڑی اجتماعیت اس میں سرایت کرجائے گی، اور وہ دین کا تقدس بھی اختیار کرے گی، کیوں کہ ماشاء اللہ اس جماعت کا حلقہ دنیا کی تمام دینی جماعتوں سے بڑا ہے، بلکہ یہ عالمی حلقہ ہے، اس لئے کوئی بھی صدا جو اس حلقہ میں ایک جگہ بلند ہوتی ہے اس کی گونج سارے اسلامی جہاں میں سنائی دیتی ہے۔

(۱) بنگلہ دیش کے اجتماع میں شریک ہونے اور وہاں کے مقررین وواعظین کی تقریروں کو سننے کے بعد یہ احساس بہت ہوا کہ ان میں غلو کا خاصا دخل ہوچکا ہے، اللہ تعالی نے قرآن پاک میں دین کے اندر غلو کرنے سے منع فرمایا ہے: **"قل یا اھل الکتاب لاتغلوا فی دینکم غیر الحق"** غلو کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز یا حکم کا جو درجہ ہے اس سے اس کو بڑھا دیا جائے، تبلیغی

جماعت اور اس کا موجودہ طریقۂ کار خود دین و مذہب نہیں ہے، بلکہ دین سے غافل اور ناآشنا لوگوں کو دین کی طرف متوجہ اور آشنا کرنے کا ایک ذریعہ اور طریقہ ہے، یہ طریقہ بذات خود مقصود نہیں ہے، حصول مقصود کا واسطہ ہے، یہ طریق بہیئتِ مجموعی منصوص نہیں ہے بلکہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نوراللہ مرقدہ نے اپنے الہام وتجربات کی روشنی میں اسے ترتیب دیا ہے، لیکن حضرات واعظین کی تقریروں سے بھی اور اس میں شریک ہونے والوں کے عمومی رجحان سے بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ بذات خود یہی طریقہ مقصود ہو گیا ہے، چنانچہ اجتماع کی تمام تقریروں میں عموماً یہی بات بتکرار کہی جاتی رہی کہ ’’دعوت سے اونچا کوئی عمل نہیں، یہ پوری امت کی ذمہ داری ہے، اس کے واسطے ملکوں ملکوں پھرنا چاہئے‘‘۔ بعض حضرات نے تو یہ تک فرمادیا کہ ’’دعوت کا یہ عمل مثل کشتیٔ نوح کے ہے، نجات وہی پائے گا جو اس میں آجائے گا‘‘۔ ان بزرگوں کی گفتگو میں جب دعوت کے عمل کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس سے یہی مخصوص طریقۂ کار مراد ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ باتیں غلو اور افراط پر مبنی ہیں، پھر ہر ایک کو اس میں شریک ہونے کی دعوت پوری قوت سے دی جاتی ہے۔

ان تقریروں سے عوام تو عوام ہیں خواص کا بھی یہی ذہن بنتا ہے کہ جو لوگ جماعت کے اس طریقہ کار میں شریک نہیں ہوتے، خواہ وہ دین کی خدمت کسی اور راہ سے کتنی ہی کرتے ہوں، وہ ایک بڑی ذمہ داری سے پہلوتہی کرتے ہیں، اور نجات سے گویا محروم رہتے ہیں، حالانکہ ایک طریقۂ دعوت وتبلیغ جو منصوص نہیں ہے یا کوئی اور طریقہ جو دینی خدمت کے لئے کسی تجربہ اور مصلحت کے تحت اختیار کیا جائے، اس میں شرکت نہ واجب ہے اور نہ اس میں شریک نہ ہونے سے کوئی فرد یا جماعت مستحقِ ملامت ہے، بلکہ اس میں شرکت کی شدومد سے دعوت دینا اور اصرار کرنا خود محلِ نظر ہے، جب ائمہ فقہ [۱] کو اپنے مسلک میں شمولیت کی دعوت عام دینے کا اختیار نہیں ہے، تو دوسروں کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ لیکن تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار میں شرکت کی نہ صرف دعوت عام دی جاتی ہے بلکہ تشکیل کے نام پر اس پر ایسا اصرار ہوتا ہے کہ شرکت نہ کرنے والوں کے مجرم ہونے کا شبہہ ہونے لگتا ہے، گویا ان کی ذمہ داری ہے کہ اس میں ضرور شریک ہوں، حالانکہ علما کی یہ ہرگز ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ خاص اس طریقہ سے تبلیغ وتعلیم کا

فریضہ انجام دیں۔ خود حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو علما دینی خدمت کی مشغولیت رکھتے ہوں انہیں اس میں نکلنے کی دعوت نہ دی جائے، بس ان سے دعا کرائی جائے۔

(۲) (دعوت وتبلیغ کے فضائل) بہت زیادہ اور نہایت شد ومد سے بیان کئے جاتے ہیں، اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور سے قابل توجہ ہیں، اور افسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں عوام نہیں ذمہ داروں کی طرف سے بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ فضائل کے سلسلے میں ہر قسم کی رطب ویابس روایات، بے سروپا حکایات، اور خواب وخیال اور کشف وکرامات سے کام لیا جاتا ہے، بلکہ موضوع روایات کو بھی بے تکلف بیان کر دیا جاتا ہے، موضوع روایات کا امت میں رواج پانا خود ایک مصیبت ہے، پھر اس سے جو ذہن بنتا ہے وہ مزید مصیبت کا باعث بنتا ہے۔ ایک صاحب کے سامنے گناہوں کی قباحت اور ان پر اللہ تعالی کی ناراضگی کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ حدیثوں میں ایک ایک دعا پر بیس بیس لاکھ نیکیوں کا وعدہ ہے، اتنے گناہ تو ہم کرتے بھی نہیں، یہ ذہن جب بنتا ہے تو گناہ کا ڈر ختم ہو جاتا ہے کہ جماعت میں جائیں گے اور سب گناہ معاف ہو جائیں گے، یہ رجحان کتنا خطرناک ہے؟ محتاجِ بیان نہیں!

دوسرے یہ کہ مقرر حضرات رسول اللہ ﷺ کے واقعات وحالات کو آج کی جدید تبلیغی اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں، اصطلاحات کی تبدیلی کی وجہ سے واقعہ کی صورت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، مثلاً حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جہاد کے لئے سفر ہوتے تھے، قدیم اصطلاح میں اسے ’غزوہ‘ یا ’سریہ‘ یا ’فی سبیل اللہ‘ کہا جاتا تھا، چنانچہ قرآن میں مصارف زکوۃ میں ’فی سبیل اللہ‘ کا جو ذکر آیا ہے فقہا نے اس کا مصداق غزوہ کے مسافر کو قرار دیا ہے، جو فوج سے پیچھے رہ گیا ہو، ان الفاظ سے واقعہ کی صحیح صورت ذہن میں آتی ہے، لیکن یہ حضرات اسے ’’جماعت‘‘ کے نکلنے سے تعبیر کرتے ہیں، اس سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جیسے آج کل جماعتیں نکلتی ہیں، اسی طرح صحابہ کرام کی بھی جماعتیں نکلتی تھیں، حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہے، کہاں حضرات صحابہ کا جہاد وقتال کے لئے اسلحہ بند ہو کر نکلنا؟ جہاں ہر وقت جان کا خطرہ رہتا تھا، اور کہاں موجودہ جماعتوں کا

نکلنا؟ بنگلہ دیش کے اجتماع میں ایک صاحب نے تو اور کمال کر دیا، کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب حکم ملا کہ مصر میں فرعون کے (پاس جایئے اور ان دعوت دیجئے) تو اسے مقرر صاحب نے یوں تعبیر کیا کہ ’’کوہِ طور سے جماعت چلی‘‘۔

(یہ ایسی سنگین باتیں ہیں جن) پر حضرات اکابر کو بہت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

(۳) جماعت میں جو امیر مقرر کئے جاتے ہیں ان کا مسئلہ بھی خاصا اہم ہے، جماعت کے امراء اکثر صاحب علم نہیں ہوتے، لیکن امارت کے منصب کی وجہ سے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں، وہ بہت سی ناہموار باتیں عوام کے درمیان کر جاتے ہیں جس کی وجہ سے غلط علم عوام میں پھیلتا ہے، اس سلسلے میں عموماً یہ عذر بیان کیا جاتا ہے کہ کیا کریں صاحب علم امیر نہیں ملتے تو جو بھی مل جاتا ہے اسی کو امیر مقرر کر دیا جاتا ہے، لیکن یہ عذر قابل قبول نہیں ہے۔ اصول یہ ہونا چاہئے کہ جب لائق امیر ملے جبھی جماعت تشکیل دی جائے، اور اگر کسی ایسے شخص کو امیر بنانا ناگزیر ہو جس میں علمی لیاقت نہ ہو تو اسے پابند کر دیا جائے کہ وہ عوام کے درمیان خطاب عام نہ کرے، بلکہ صرف کتاب پڑھ دیا کرے، اور اس میں بطور تشریح کچھ بھی نہ کہے۔

(۴) جماعت اور اجتماعات دیکھنے اور ان میں شرکت کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیان وتقریر اور تشکیل ہی اصل مقصود ہے، تقریروں کی اتنی کثرت ہوتی ہے، اور اتنا طولانی بیان ہوتا ہے کہ آدمی اکتا جائے، اور جماعتیں جو مسجدوں میں قیام کرتی ہیں، وہ ہر نماز کے بعد بیان کو ضروری سمجھتی ہیں، اور تشکیل کا حاصل عنصر اصرار ہوتا ہے، یہ باتیں افراط پر مبنی معلوم ہوتی ہیں، بیان دن بھر میں صرف ایک ہونا چاہئے، باقی اوقات جماعت کے افراد باہم مذاکرہ کریں، تلاوت میں مشغول رہیں، دعائیں یاد کریں، مسائل سیکھنے کا اہتمام کریں، مقامی لوگوں کو بھی اس میں شریک ہونے کی دعوت دیں، دن بھر کی پانچ تقریریں سب پر بھاری پڑتی ہیں، لوگ تقریروں کا اعلان سنتے ہیں اور مسجد سے باہر نکلنے لگتے ہیں۔ تذکیر میں لوگوں کے مزاج کی رعایت تو خود رسول اللہ ﷺ نے کی ہے کہ لوگ اکتا نہ جائیں۔ لوگوں کے بھاگنے کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ تقریر کرنے کے لئے ہر کس وناکس کھڑا ہو جاتا ہے، حالانکہ ہر شخص کو نہ تقریر کرنی جائز ہے اور نہ ہر شخص کی تقریر سننی درست ہے۔

تشکیل میں اصرار کا حاصل یہ ہے کہ خواہی نخواہی جماعت میں نکلو، حالانکہ تبلیغ کا جو طریقۂ کار منصوص نہیں ہے اس میں شرکت پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہے، ترغیب دینے کا مضائقہ نہیں ہے، بذات خود تبلیغ کی ہیئتِ موجودہ کو مقصود بنالینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک وسیلہ و ذریعہ کو اصل مقصد بنالیا جائے، یہ بات شرعی اصول کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔

(۵) تبلیغ کے نام پر اتنے بڑے بڑے اجتماعات کا اہتمام بھی کھٹکتا ہے، ۱۳۹۰ھ میں دہلی مرکز میں مجھے دو ہفتہ رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اس وقت وہاں بڑے حضرات سے سنتا تھا کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نوراللہ مرقدہ بڑے اجتماعات کی اجازت بہت مشکل سے دیتے تھے، وہ بڑے اجتماعات کو پسند نہیں کرتے تھے، پھر حضرت مولانا کے مکاتیب میں بھی یہ مضمون دیکھا کہ وہ ہفتہ واری اجتماع کو اہم قرار دیتے تھے، مگر اب بڑے اجتماعات کی بڑی کثرت ہوگئی ہے، اور انہیں عوام کی نظروں میں ایسا تقدس حاصل ہوتا جارہا ہے جیسے آگے چل کر یہ حج کے اجتماع کے مشابہ قرار پاجائیں گے، چنانچہ زبانوں پر مجمع کی تعداد کے لحاظ سے سہی، حج کے اجتماع سے اس کا موازنہ آنے لگا ہے۔ کیا بعید ہے کہ کچھ دنوں کے بعد تقدس کے اعتبار بھی موازنہ ہونے لگے۔

پھر ایک ایک اجتماع میں کڑوڑوں روپئے صرف ہوجاتے ہیں، کشن گنج بہار میں ابھی ۲۸ رفروری کو اجتماع ہوا تھا، اس سے کچھ دنوں پہلے اس کے قریبی ضلع ارریہ میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا، معلوم ہوا کہ ارریہ کوٹ کے ایک شخص نے اس کے ایک حصے کے شامیانے کے لئے چار لاکھ روپئے دیئے ہیں، صرف تین چار روز کے لئے اتنے پیسے صرف کردیئے جاتے ہیں، ایک ظاہری شان وشوکت معلوم ہونے لگتی ہے، فخر سے لوگوں کی زبانوں پر یہ آنے لگتا ہے کہ اتنے اتنے لاکھ آدمی جمع ہوئے تھے، لیکن کیا اتنے صرفہ کے بقدر اس کے نتائج نکلتے ہیں؟ یہ بہت قابل توجہ ہے۔

ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں دینی مکاتب اور مدارس کی سخت ضرورت ہے لیکن گاؤں میں یہ مکاتب و مدارس نہیں چل پاتے، کیوں کہ عمارت نہیں ہے، اساتذہ کی معقول کفالت نہیں ہے، بچے دین سے جاہل رہتے ہیں، ان مدارس و مکاتب کے لئے پکارا جاتا ہے تو وہی لوگ غریب ہوجاتے ہیں، جو اجتماعات کے سلسلے میں خاصے دولت مند نظر آتے ہیں، انہیں اس ٹھوس

اور بنیادی خدمت دین کے لئے خرچ کی توفیق نہیں ہوتی، اور وقتی اجتماع کے لئے لاکھوں لاکھ روپئے مسلمانوں کی جیب سے بے تکلف نکل آتے ہیں، ان بڑے اجتماعات کے بجائے چھوٹے چھوٹے اجتماعوں کو کارآمد بنانے کی سعی کرنی چاہئے، تاکہ بے تحاشا اخراجات بھی نہ ہوں، اور دینداری لوگوں میں آہستہ آہستہ راسخ ہوتی رہے، اور اس کے ساتھ ہر جگہ مدارس ومکاتب کا نظم کیا جائے کہ بچے ابتدا ہی سے دین سیکھ جائیں۔

یہ چند باتیں جماعت اور اجتماعات کو دیکھنے کے بعد عموماً محسوس ہوتی ہیں، برائے اعتراض نہیں، از راہ خیر خواہئ دین ومذہب بزرگان تبلیغ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں، اس پر توجہ فرمائیں، ورنہ یہ جماعت بھی مختلف فرقوں کی طرح ایک فرقہ بن کر رہ جائے گی، بلکہ اسی رخ پر چلنے لگی ہے، حضرات اکابر اگر توجہ دیں تو اس کا تدارک ہوسکتا ہے۔

ان ارید الا الاصلاح مااستطعت. وما توفیقی الاباللہ علیہ توکلت والیہ انیب

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) مشہور واقعہ ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کی فقہ کا لوگوں کو سرکاری طور پر پابند کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن امام مالک علیہ الرحمہ نے اس کو منع کردیا تھا۔

تبلیغی جماعت اور اس کے اجتماعات

تحریکات کا مزاج عموماً یہ ہے کہ کوئی صاحبِ عزیمت شخص اسے برپا کرتا ہے، اور اس کے مقاصد متعین کرتا ہے، ابتدا میں وہ انہیں خطوط پر کام کرتی ہیں، اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے مناسب طریقے اختیار کرتی ہیں، اور ڈرتی بھی رہتی ہیں کہ اصحابِ نظر کہیں اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں، احتیاط کو بھی کام میں لاتی رہتی ہیں، لیکن جب یہ تحریکیں پھیل جاتی ہیں اور کسی درجہ میں مقبول اور مؤثر ہو جاتی ہیں تو ہر قسم کے رطب ویابس لوگ اس میں گھس آتے ہیں، اور جو آتا ہے اپنے نظریات وخواہشات سمیت آتا ہے، پھر یہ تحریکات احتیاط ترک کر کے بہت سے نامناسب امور میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ ذمہ داروں کی طرف سے ایسے عناصر سے اس کی تطہیر کا عمل ہوتا رہے تو ان کی افادیت کچھ عرصے تک برقرار رہتی ہے، لیکن اگر انہیں عناصر کا غلبہ ہو جائے اور اس کی تطہیر نہ ہو سکے تو نفع سے زیادہ نقصان ہونے لگتا ہے۔

ادھر پچھلی صدیوں میں ہندوستان میں بھی اور ہندوستان کے باہر بھی مختلف مقاصد کے لئے مختلف نام سے بہت سی تحریکیں اٹھیں، جنہوں نے کچھ مدت تک مناسب کام کئے، مگر بعد میں ''**واثمهما اكبر من نفعهما**'' کی مصداق بن کر رہ گئیں۔

پچھلی صدی میں دین کی خدمت، اس کی تبلیغ واشاعت اور مسلمانوں کے درمیان دینی علم وعمل کی ترسیخ واستحکام کے لئے مشہور داعی بزرگ حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ نے ایک عظیم تحریک کی بنیاد ڈالی، یہ تحریک بہت مخلصانہ تھی، اس کے پیچھے زبردست اخلاص اور دینی جذبہ کام کر رہا تھا، حضرت مولانا ہمہ اخلاص ہمہ سوز اور ہمہ عزیمت تھے، ان کے جوشِ اندروں نے تھوڑے عرصے میں دینی علم وعمل کا ایک ایسا صور پھونکا کہ مشرق سے مغرب تک

مسلمان چونک پڑے، اوراس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ لوگ جو دین سے بے گانہ تھے، ایمان و اسلام کے داعی بن گئے، امیر المومنین حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کی اصلاحی وایمانی اور جہادی تحریک کے بعد اس کا قدرے پرتو حضرت مولانا الیاس صاحب کی تحریک میں نظر آیا، ابتدا میں یہ تحریک احتیاط سے چلی، حضرت مولانا علیہ الرحمہ علما کو متوجہ کرتے رہتے کہ اس کے طریق کار کو دیکھتے رہیں، کہیں کوئی غلطی تو دراندازنہیں ہورہی ہے؟ پھر یہ تحریک بڑھی اور پھیلی اوراس میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوگئے، چونکہ اس کا مزاج دعوت ہے اس لئے ہر ایک کو اس میں آنے کی دعوت دی گئی، دعوت ہی نہیں اس میں شامل ہونے پر غیر معمولی اصرار کیا گیا، پھر ظاہر ہے کہ ہر طرح کے عناصر داخل ہونے ناگزیر تھے، تحریک کی ہمہ گیری نے اور عوامی رویے کی سطحیت نے جہاں اس میں شرعاً نامناسب چیزیں داخل کردیں، وہیں اس کا مزاج بھی تبدیل ہوگیا، پہلے علما کا علم وتقوی معیار تھا کہ اس جماعت میں کوئی غلطی نہ آجائے، مزاج بدلا تو یہی تحریک حق بن گئی، صرف حق نہیں معیارِ حق بن گئی، اب اس تحریک میں شامل افراد کا عام خیال یہ ہے کہ جو عالم خواہ کتنا ہی صاحب علم ہو، اگر اس تحریک سے وابستہ ہے تو معتبر ہے، ورنہ خارج از اعتبار ہے، ایک چلتی ہوئی مثال بکثرت سننے میں آتی ہے کہ ”یہ تحریک سفینۂ نوح کے مثل ہے، جو اس میں آگیا وہی ہدایت پر ہے، نجات یافتہ ہے، ورنہ غرق طوفان ہے“!

یہ مثال اور بحالات موجودہ اس مثال کو اس تحریک پر منطبق کرنا غلو کا ایک نمونہ ہے، عوام الناس کا خیال کچھ اور رنگ پر آگیا ہے کہ یہ تحریک اور اس تحریک کا ہر طریق کار معصوم ہے، اس پر نہ ٹوکا جاسکتا اور نہ اس میں غلطی کا تصور کیا جاسکتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی عالم نے کسی بدعنوانی پر تنبیہ کی تو اس تحریک کے افراد اسے مخالفت قرار دے کر حیزِ اعتنا والتفات سے اسے خارج کردیتے ہیں، اس مزاج میں یہ جماعت اتنی پختہ ہوگئی ہے کہ اس کے اپنے افراد بھی اگر کسی بات پر نکیر کرتے ہیں تو وہ بات نہیں خود نکیر کرنے والا نظر سے گرجاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نوراللہ مرقدہ نے جن خطوط پر جماعت کی تحریک چلائی تھی اوران کے جو خیالات تھے، ان سے اب یہ جماعت بہت ہٹ چکی ہے۔ حضرت مولانا کے ملفوظات کا مجموعہ مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ نے مرتب فرمایا، اوران کی سوانح حیات نیز

ان کی اس تحریک کا تعارف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ نے تفصیل سے لکھا ہے، انہیں ملاحظہ فرمائیے، اور جس رخ پر جماعت چل رہی ہے دونوں کا موازنہ کیجئے تو بہت فرق ملے گا، غالبًا اسی وجہ سے یہ دونوں کتابیں تبلیغی تحریک میں بار نہیں پا سکی ہیں۔

اس تبلیغی تحریک میں ایک بڑا اہم مقام ''اجتماعات'' کا ہے، اس تحریک میں چھوٹے بڑے اجتماعات کا ایک دستور سا ہو گیا ہے، ایک روز کے مختصر اجتماعات تو خیر کسی قدر مفید کہے جا سکتے ہیں، مگر بہت بڑے بڑے اجتماعات کی افادیت مشکوک ہے، بڑے اجتماعات کا اہتمام بہت ہوتا ہے، تین روز کے اجتماع کے لئے اللہ ہی جانتا ہے کتنا مال خرچ ہوتا ہے؟ اور اس مال کا حصول شرعی اعتبار سے قباحت سے خالی نہیں ہوتا۔

اس تحریک سے وابستہ حضرات دینی مدارس کے چندوں کی بہت تحقیر کرتے ہیں، مدرسہ کی خدمت کو دینی خدمت ماننے سے ان کے دلوں میں گرانی ہوتی ہے، کیوں کہ یہ چندے کرتے ہیں، اور ان میں خدمت کرنے والے انہیں چندوں سے تنخواہ پاتے ہیں، لیکن جب ان اجتماعات پر خرچ ہونے والے سرمایے پر نظر ڈالی جاتی تو یہ چندہ نہیں ٹیکس معلوم ہوتا ہے، اجتماعات کے منتظمین مسلمانوں کی آبادیوں پر اخراج کی مدات تقسیم کر دیتے، بانس بلی کی ذمہ داری، کھانے پینے کی ذمہ داری، پانی کی ذمہ داری، ٹینٹ کی ذمہ داری، قضائے حاجت کے مواقع کی ذمہ داری اور اللہ جانے کیا کیا ذمہ داریاں مختلف آبادیوں کے ذمے کر دی جاتی ہیں، اب اسے خواہی نخواہی یہ کام کرنا ہے، ورنہ لازم آئے گا کہ وہ لوگ دین سے گریز کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف طرح کی وعیدیں لوگوں نے گھڑ رکھی ہیں، جنہیں سنا سنا کر لوگوں کو ہلکان کیا جاتا ہے، پھر یہ بڑے اجتماعات عوام الناس کے لئے میلے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اور اس کام سے وابستہ لوگوں کے لئے فخر وریا اور شہرت ونمو کا ذریعہ بن جاتے ہیں، عرصہ تک یہ چرچا کیا جاتا ہے کہ اتنے اتنے لاکھ لوگ اجتماع میں آئے، اور اجتماع سے پہلے بھی خوب پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اتنے اتنے لاکھ افراد آئیں گے، یہ پروپیگنڈہ اتنے منظّم پیمانے پر ہوتا ہے کہ شبہہ ہونے لگتا ہے کہ یہ ریا ونمود ہی مقصود ہے، بلکہ اس کی ہر ہر چیز کی الگ الگ تشہیر کی جاتی ہے، مجمع کی زیادتی کی الگ، تشکیل کی الگ، اتنی اتنی جماعتیں بن کر نکلیں، اس کی الگ، خصوصاً دعاؤں کی بہت تشہیر

کی جاتی ہے، اجتماع کی کامیابی کے لئے دعا کی تشہیر، اس کے لئے اعتکاف کی تشہیر، اس کے لئے روزہ رکھنے کی تشہیر، پھر اجتماع کے خاتمے کے دعا کی تشہیر! اس کے علاوہ اجتماع میں اجتماعی نکاح کا اہتمام! خدا جانے اس کے کیا لوازمات والتزامات ہیں؟ پھر اس اجتماع کے سلسلے میں تقدس کا ایسا اعتقاد دیا جانے لگا ہے کہ نہ مدارس کی تعلیم، نہ خانقاہوں کے اشغال واوراد، نہ کسی اور دینی جماعت کی سرگرمی، کسی کی کوئی اہمیت نہیں رہتی، بلکہ اب تو زبانوں پر حج کے اجتماع سے موازنہ بھی دبے دبے لہجے میں آنے لگا ہے، اندیشہ ہے کہ یہ لہجہ آئندہ بلند ہو جائے گا۔

اس تحریک اور اس کے اجتماعات کے یہ رویے، بہت زیادہ اندیشہ ناک ہیں کہ کہیں یہ تحریک جو دین کی خدمت کے لئے اٹھائی گئی تھی خود مستقل دین نہ بن جائے۔ عملاً رویہ کچھ ایسا ہی ہے کہ یہ خود ایک مستقل دین بن گئی ہے، ایسی صورت میں اصحاب علم کو مجبوراً کہنا پڑے گا کہ یہ تحریک اور یہ طریقۂ کار سنت سے دور جا پڑا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اب بجائے خادمیت کے اس میں مخدومیت کی شان آ گئی ہے۔ اللہ تعالی حفاظت فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆

بے احتیاطیوں کا طوفان

دور حاضر میں گھٹیا صحافت بھی ایک فن ہے، اور اس کی فن کاری یہ ہے کہ بے بنیاد کوئی بات اڑادی جائے، اور اس طرح اڑادی جائے کہ وہی حق وصداقت کی سند بن جائے، کتنی ہی بے سند باتیں ہیں جو اس صحافت کے کرشمہ سے معیار صدق بن گئی ہیں، حالانکہ اگر واقعی انہیں تلاش کیا جائے تو ان کی حقیقت ایک افواہ سے زیادہ نہ ہوگی، بڑی بڑی شخصیتوں کو اس صحافت کی کرشمہ سازیوں نے معمولی درجہ کے انسان سے بھی گیا گزرا بنادیا ہے، اور بعض نامعقول اور ناہموار اشخاص کو ’’ہیرو‘‘ بنا کر پیش کر دیا ہے۔

اس فن کا ایک نمونہ دیوبند سے شائع ہونے والے ایک نومولود رسالہ جس کو برائے نام نسبت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے ساتھ ہے، یعنی ’’عزم حسین احمد‘‘ اس کے ٹائٹل کے آخری صفحے پر دیکھنے میں آیا، اس کے آخری صفحے کی فوٹو کاپی دیوبند ہی سے ایک بزرگ نے دفتر المآثر کو ارسال فرمائی، اس پر عنوان ہے ’’حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مشاہیر کی نظر میں‘‘۔

اس عنوان کے تحت مشاہیر کے اقوال درج کئے گئے ہیں، ان میں نمایاں نام حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب، محدث کبیر مولانا حبیب الرحمان الاعظمی صاحب، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کے ہیں۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اقوال مرتب نے کہاں سے نقل کئے ہیں، کوئی حوالہ تو دیا نہیں کہ تحقیق کی جاسکتی، لیکن یہ اکابر ہمارے ہی دور کے ہیں، اور ہماری قریبی شخصیات ہیں، جن کے مزاج ومذاق سے واقفیت رکھنے والے بہت سے لوگ ہیں۔ مذکورہ بالا تینوں بزرگوں کے ذوق و

مزاج کو اگر سامنے رکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض اسی گھٹیا صحافت کی چابکدستی ہے، جس کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے، مثلاً مولانا منت اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔

’’عام انسانوں کے دماغ کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے، مگر مولانا مجاہدالاسلام کے دماغ کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں‘‘۔

اللہ جانے ایک کھڑکی اور ساری کھڑکیاں کھلی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ ایک بے معنی اور مہمل جملہ ہے، جس کا مطلب کوئی چاہے تو مدح کی صورت میں لے لے، اور اگر چاہے تو اسے مذمت اور تنقیص بنادے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب علیہ الرحمہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ:

’’اگر کوئی شخص اپنے وقت کا امام اعظم ابوحنیفہ دیکھنا چاہتا ہے تو وہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی کو دیکھ لے‘‘۔

مبالغہ خود مبالغہ کی حد سے تجاوز کئے ہوئے ہے، اللہ ہی بہتر ہے کہ یہ قول کس کا ہے؟ لیکن اس پر نام چسپاں مولانا علی میاں صاحب کا ہے۔ حضرت مولانا مرحوم ہی کا اگر یہ قول ہے تو خود ان کی شخصیت مشکوک قرار پائے گی، اتنا بڑا صاحب نظر کیسی کم نظری کی بات کرتا ہے کہ اسے نہ امام ابوحنیفہ کے مقام کی خبر ہے اور نہ قاضی صاحب سے واقف ہے۔

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی قدس سرہ کی طرف جو قول منسوب ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے:

’’اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آتا تو قضا کے سب سے بڑے عہدے پر مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی فائز ہوتے‘‘۔

اس قول کو وضع کرنے والا گویا یہ سمجھتا ہے کہ جو چاہو لکھ کر جس کی طرف جی چاہے منسوب کردو، جھوٹ اور افترا کی صحافت میں کون ہے جو سچ کو کرید ے، اور اگر کوئی سچ کو کرید کر نکالے بھی تو جہاں جہاں جھوٹ پہونچ چکا ہے کیا ضروری ہے کہ وہاں وہاں سچ بھی پہونچ جائے، اور اگر پہونچ بھی گیا تو جھوٹ کے دھوئیں سے جن کے دماغ ماؤف ہوچکے ہیں کیا وہ سچ

کو جھوٹ نہ سمجھ لیں گے؟ صحافت کی کرشمہ سازی سے جھوٹ چل گیا، سچ کہاں تک تعاقب کرے گا، اور کیا ضروری ہے کہ تعاقب میں کامیاب ہی ہو جائے، کہیں اسی پر جھوٹ اور غلط بیانی کا لیبل نہ لگ جائے۔

جو لوگ حضرت محدث کبیر علیہ الرحمہ کی محتاط اور سنجیدہ طبیعت سے واقف ہیں اور جن کو پتہ ہے کہ حضرت کی تقریر وتحریر میں مبالغہ آرائی کی کہیں گنجائش نہیں ہوتی، بڑی بڑی شخصیتوں حتی کہ اپنے اساتذہ کے اظہارِ کمال میں بھی وہ مبالغہ سے کام نہیں لیتے، وہ اس قول پر دروغ کی نشانیاں صاف دیکھ رہے ہیں۔

قاضی صاحب شہرت کی بلندی پر فقہ اکیڈمی، فقہی سیمیناروں اور ملی کونسل کی تاسیس کے بعد نمایاں ہوئے ہیں، اس سے پہلے وہ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی علیہ الرحمہ کے تحت امارت شرعیہ میں کام کرتے تھے، اور بلاشبہہ امارت کے بڑے قاضی تھے، لیکن ان کی فقہی اور علمی تحریریں یا کمالات منظر عام پر نہیں آئے تھے، محدث کبیر جیسا محتاط عالم اتنی غیر محتاط اور مبالغہ آمیز بات کیسے کہہ سکتا ہے؟ ہاں اگر حضرت مولانا کی بات سنی ہو تو سننے والے آپ کو سنائیں گے کہ حضرت مولانا ہر نئی تحریک اور علم دین کے نام پر ہر نئی سرگرمی سے بہت چوکنا رہتے تھے، حضرت کی حیات میں چند ایک فقہی سیمینار ہوئے، حضرت نے اس کا رخ بھانپ لیا تھا، اس وقت فرمایا تھا کہ:

”اس قسم کے سیمینار فقہ حنفی کو مسخ کردیں گے“۔

بعد کے تجربات نے اس کو سچ ثابت کر دیا۔ اس ارشاد کو سننے والے حضرت کے تلامذہ مدرسہ مرقاۃ العلوم میں موجود ہیں، ان سے اس کی تصدیق حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس سطور کا مقصد قاضی صاحب کی شخصیت پر حرف رکھنا نہیں ہے، ادارۂ المآثر کو تو ان سے مسلسل اختلاف رہا ہے، ان کی سیمیناری سرگرمیوں پر المآثر نے برابر ان کو ٹوکا ہے، مقصد یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی عظمت کے لئے ان وضعی اقوال سے ان محترم اور بزرگ ہستیوں کو داغدار نہ کریں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ رسالہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

قدس سرہ کے نام سے شرفِ انتساب رکھتا ہے، اور حضرت شیخ کے نامور صاحبزادگان جو بذات خود ملک وملت کی اہم اور گرانمایہ شخصیتیں ہیں، ان سے اس رسالہ کا دامن کسی نہ کسی عنوان سے وابستہ ہے، ان اہم اور مقدس انتسابات کی وجہ سے رسالہ کا بڑا وقار اور وزن خواص وعوام کے حلقے میں ہونا چاہیئے، لیکن اس طرح کی بے سروپا باتیں اس وقار اور وزن کے منافی اور اسے مجروح کرنے والی ہیں۔

فدائے ملت امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی اس طرف توجہ فرمائیں تاکہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ سے شرف نسبت رکھنے والا رسالہ بے احتیاطیوں کے طوفان کی زد میں نہ آئے۔

☆☆☆☆☆☆

صبر

عربی زبان میں صبر کے معنی روکنے کے ہیں، یعنی اپنی طبیعت کو گھبراہٹ اور بے قراری سے روکنا، اسے شریعت اور عقل کے تقاضوں پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کرنا، زبان کو شکایت اور اظہار نا گواری سے روکنا، اور ہاتھوں کو گریبان پھاڑنے اور چہرہ نوچنے سے بچانا۔

صبر کی قسمیں:

صبر کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) اللہ کے احکام پر اپنے کو جمانا (۲) جن چیزوں سے اللہ نے منع کیا ہے ان سے اپنے آپ کو روکنا (۳) اللہ کی طرف سے جو مصائب آئیں ان پر صبر کرنا۔

صبر کے متعلق اللہ کے ارشادات:

(۱) **واستعينوا بالصبر والصلوٰة وانها لكبيرة الا على الخاشعين** (سورہ بقرہ ۴۵)

اور صبر اور نماز کے واسطے سے مدد چاہو، اور بیشک نماز بھاری ہے مگر وہ لوگ جو خدا کے سامنے جھکنے والے ہیں۔ (ان پر بھاری نہیں)

(۲) **يا ايها الذين آمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا وتقوا الله لعلكم تفلحون.** (سورہ آل عمران ۲۰۰)

اے ایمان والو! صبر کرو اور ایک دوسرے کے مقابلے میں جم کر رہو اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو، اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم کامیاب ہو۔

(۳) **ماعندكم ينفد وما عندالله باق ولنجزين الذين صبروا اجرهم باحسن ماكانوا يعملون.** (سورہ النحل: ۹۶)

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہوجائے گا، اور جو کچھ اللہ کے پاس وہ ہمیشہ رہے گا، اور جن لوگوں نے صبر سے کام لیا ہم ضرور ان کے بہترین کاموں کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

(۴) **اولٰئک یجزون الغرفة بما صبروا ویلقون فیها تحیة وسلاماً** (سورہ الفرقان:۷۵)

یہی لوگ ہیں کہ ان کے صبر سے کام لینے کی وجہ سے اونچے بالا خانے جزا میں ملیں گے، اور ان میں انہیں مبارکبادیاں اور سلامتی کی بشارتیں حاصل ہوں گی۔

(۵) **قل یٰعبادِ الذین آمنوا اتقوا ربکم للذین احسنوا فی ھذة الدنیا حسنة وارض الله واسعة ،انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب.** (سورہ زمر:۱۰)

تم کہہ دو! اے میرے وہ بندو! جو ایمان لائے، اپنے رب سے ڈرو، جن لوگوں نے نیکی کا عمل کیا، ان کے لئے اس دنیا میں بھلائی ہے، اور اللہ کی زمین وسیع ہے، جو لوگ صبر کرنے والے ہیں ان کو ان کا اجر وثواب بے حساب عطا ہوگا۔

احادیثِ رسول:

(۱) حضرت ابو سعید خذری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چند انصاری حضرات نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا، آپ نے عطا فرمادیا، پھر انہوں نے مانگا، آپ نے پھر دیا، اس کے بعد وہ مال ختم ہوگیا، ختم ہونے کے بعد آپ نے فرمایا، میرے پاس جو بھی مال ہوگا میں اسے تم سے بچا اور چھپا کو رکھنے والا نہیں ہوں، اور جو کوئی اللہ تعالی سے پاکیزگی مانگتا ہے، اللہ اسے پاکیزگی عطا فرماتے ہیں، اور جو کوئی غنا مانگتا ہے اللہ تعالی اسے غنا عطا فرماتے ہیں اور سب بڑا عطیہ جو خدا کی طرف سے ملتا ہے، جس سے بڑا کوئی عطیہ نہیں وہ صبر ہے۔ (بخاری ومسلم)

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ اللہ تعالی نے فرمایا کہ جب میں کسی بندہ کو اس کی آنکھوں کی آزمائش میں ڈالتا ہوں (یعنی بینائی ختم ہوجاتی ہے) اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو ان دونوں کے بدلے میں اسے جنت عطا کرتا ہوں۔ (بخاری)

(۳) حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ گزر رہے تھے، ایک عورت ایک قبر کے

پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو اور صبر کرو، بولی ہٹئے آپ! آپ کو میری مصیبت کا کیا پتہ؟ اس نے آپ کو پہچانا نہیں، بعد میں اسے بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ تھے، تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس نے عرض کیا کہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا، فرمایا صبر تو ابتداءِ صدمہ ہی کے وقت ہے۔ (بعد میں تو از خود صبر آجاتا ہے) (بخاری ومسلم)

(۴) حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مومن کا معاملہ بھی کیسا عجیب ہے، اس کا سارا معاملہ اس کے لئے خیر ہے، یہ بات مومن کے علاوہ اور کسی کو میسر نہیں، اگر اسے خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو اس پر شکر ادا کرتا ہے، یہ اس کے حق میں خیر ہے، اور کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو صبر کرتا ہے، اور یہ اس کے حق میں خیر ہوتا ہے۔ (مسلم)

(۵) حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کسی مرد مومن کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے، خواہ درد ہو، مرض ہو، فکر اور غم ہو، اور کوئی زحمت ہو، یہاں تک کہ کوئی کانٹا چبھتا ہے تو اس سے اللہ تعالی اس کی خطاؤں کو مٹا دیتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

اقوالِ سلف:

(۱) امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمام کاموں میں صبر کا وہی درجہ ہے جو بدن میں سر کا درجہ ہے، جب جسم سے سر جدا ہو جاتا ہے تو جسم خراب ہو جاتا ہے، اسی طرح جب معاملات میں سے صبر ہٹ جاتا ہے تو سب معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایمان کے دو حصے ہیں، آدھا صبر ہے اور آدھا شکر ہے۔

(۳) ابوحاتم فرماتے ہیں کہ صبر تمام کاموں کا خلاصہ ہے، پختگی کا نظام ہے، عقل کا مدار ہے، بھلائی کا تخم ہے اور جس کے پاس کوئی تدبیر نہ ہو، صبر اس کی تدبیر ہے۔

(۴) ایک حکیم نے کہا کہ صبر کامیابی کی کنجی ہے، اور اللہ پر بھروسہ کرنا کامرانی کا قاصد ہے۔

(۵) بعض سلف نے فرمایا: اس ذات کے فیصلے پر صبر کرو، جس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں، اور

اس کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں۔

(۶) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: صبر کی دو قسمیں ہیں، ایک ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کرنا، دوسرے اپنی محبوب شے سے صبر کرنا، یعنی ناجائز چیزیں جو عموماً مرغوب نفس ہوتی ہیں، ان سے صبر کئے رہنا۔

(۷) نیز فرمایا: زمانے کے دو دن ہیں، ایک دن وہ جو تمہارے موافق ہے اور ایک دن وہ جو تمہارے مخالف ہے۔ جب موافق دن ہو تو اتراؤ مت، اور جب مخالف دن ہو تو گھبراؤ مت، صبر کرو۔

(۸) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے چار چیزوں میں بھلائی کو جمع پایا۔ (۱) نوافل کے ذریعے اللہ کی محبوبیت حاصل کرنا (۲) اللہ کے فیصلوں پر صبر کرنا (۳) اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا (۴) اللہ کی نظر سے حیا کرنا۔

صبر کا نمونہ:

حضرت سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عروہ زبردست تابعی وفقیہ ہیں، اور مومن صابر کے لئے جو اللہ تعالی کی تقدیر پر راضی رہنا چاہتا ہے، بہترین نمونہ ہیں، ان کے پاؤں میں کینسر جیسا مرض ہو گیا، اطبا نے تجویز کیا کہ ان کا پاؤں کاٹ دیا جائے، ورنہ پنڈلی اور ران تک پہونچ جائے گا، اور ہو سکتا ہے کہ پورے بدن میں سرایت کر جائے، آپ نے کاٹنے کی بخوشی اجازت دیدی، لوگوں نے ان کے سامنے کوئی نشیلی چیز پیش کی کہ اس کو پی لیجئے، اس سے عقل مستور ہو جائے گی، تکلیف کا احساس نہ ہوگا، اور آسانی سے کاٹا جا سکے گا، فرمایا کہ میرا خیال ایسا نہیں ہے جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہوگا وہ ایسی چیز نہیں پیئے گا جس سے اس کی عقل غائب ہو جائے، اور وہ خدا کو بھی نہ پہچان سکے، مجھے ایسے ہی رہنے دو، میں دو رکعت نماز پڑھتا ہوں، نماز کے آخر میں پاؤں کاٹ دینا، لوگوں نے ایسا ہی کیا، حضرت عروہ ساکت وخاموش رہے، نہ انہیں احساس ہوا اور نہ تکلیف ہوئی نہ کچھ بولے۔

پھر اللہ کی مشیت یہ ہوئی کہ ان کی آزمائش ان کے ایمان کے بقدر ہو، جس دن ان کا پاؤں کاٹا گیا اسی دن ان کا ایک بیٹا جوان کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب تھا، چھت سے گر کر

مر گیا، لوگ تعزیت کے لئے ان کے پاس گئے، انہوں فرمایا: اے اللہ! سب تعریف آپ کے لئے ہے، سات تھے، آپ نے ایک ہی کو لیا، اور چھ کو باقی رکھا، اور میرے ہاتھ پاؤں چار تھے، آپ نے ایک ہی کو لیا، اور تین کو باقی رکھا، اگر آپ نے لیا ہے تو بے شک دیا بھی ہے، اور اگر آپ نے مبتلائے آفات کیا تو اس سے بدر جہا زائد عافیت بھی بخشی۔

☆☆☆☆☆☆

اخلاص

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم   بسم الله الرحمان الرحيم

ومـاامـروا الا لیعبـدوا اللـه مخلصين له الدين حنفاء يقيموا الصلوة ويوتوا الزكوٰة وذالک دين القيمة. (سورہ البینہ)

اوران کوحکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی، خالص کر کے اس کے واسطے بندگی، ابراہیم کی راہ پر، اور قائم رکھیں نماز، اور دیں زکوٰۃ، اور یہ ہے راہ مضبوط لوگوں کی۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان بدنصیبوں کا ذکر کیا ہے جنہیں آسمانی کتاب سے نوازا گیا تھا، لیکن انہوں نے اس کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر اپنی خواہشات کی پیروی کی، اور اس کے نتیجے میں ان کی الگ الگ پارٹیاں اور ٹکڑیاں بن گئیں، وہ لوگ بجائے خدا پرستی کے خواہش کی پوجا کرنے میں لگ گئے، اور چونکہ ہر آدمی کی خواہش الگ ہوتی ہے، اس کا مفاد الگ ہوتا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ ان میں بہت سی ٹولیاں بن جاتیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو تو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ سب کی طرف سے یکسو ہو کر صرف اللہ کی بندگی کریں، اور اس بندگی میں کسی اور کو بالکل شریک نہ کریں، جیسا ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا، ان کی قوم ستاروں کو پوجتی تھی، چاند کو خدا سمجھتی تھی، سورج کو دیوتا بنائے ہوئے تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سب معبودوں کی نفی کر کے ارشاد فرمایا: **یٰقـوم انی بـریٔ مـمـا تشرکون انی وجهت وجهی للذی فطر السموٰت والارض حنیفاوما انا من المشرکین.** (سورہ انعام ۷۸،۷۹)

اے میری قوم! جن چیزوں کو تم لوگ خدائی میں شریک کرتے ہو، میں ان سب سے الگ ہوں، میں نے اپنا قبلۂ توجہ سب سے یکسو ہو کر صرف اس ذات کو بنایا ہے جس نے آسمان وزمین کو پیدا

کیا، اور میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں۔

یہی راہ ابراہیم علیہ السلام کی ہے کہ جب اللہ کو اپنا خالق و مالک اور رب مان لیا اور بندگی کا سر ان کے سامنے جھکا لیا تو اب کوئی مخلوق خواہ کتنی ہی شان وشوکت رکھتی ہو، اور خواہ وہ کتنی ہی محبوب ہو حتی کہ اپنی خواہش اور دل کی چاہت ہی کیوں نہ ہو، اس کی بندگی اور غلامی ہرگز نہیں ہوگی، اور اگر اللہ کے ساتھ ساتھ بندگی کا تعلق کسی اور سے کسی درجہ میں جوڑ دیا تو یہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔

مصلح الامت حضرت اقدس مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی موجود تھے، حضرت نے ایک اور صاحب کے واسطے سے حضرت محدث جلیل سے دریافت کرایا کہ اخلاص کسے کہتے ہیں؟ ان صاحب نے جس وقت یہ بات پوچھی، حضرت محدث الہند لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے، اور دیر تک سر جھکائے رہے اور پھر فرمایا کہ حضرت سے عرض کر دیجئے کہ اخلاص یہ ہے آدمی جس کا ہو بس اسی کا ہو رہے، حضرت کے اس جملے سے اخلاص اور حنیف ہونے کی حقیقت کھل جاتی ہے، آدمی اللہ کا بندہ ہے تو بس اللہ ہی کا ہو رہے، کوئی اور دروازہ اس کا مرکزِ نگاہ نہ ہو۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا ایک دوہا مشہور ہے، اس میں بھی اسی اخلاص اور حنیف کی ترجمانی اور اس کے بہترین ثمرہ کا بیان ہے، سننے اور لوحِ دل میں نقش کر لینے کے لائق ہے۔

جہہ کتا دَر دَر پھرے   دَر دَر دُر دُر ہوئے
ایک دَر کو تھام لے   کہے نہ دُر دُر کوئے

آوارہ کتا ہر دروازہ پر جاتا ہے اور ہر جگہ سے دُر دُرایا جاتا ہے، اور ایک مالک کے دروازے سے چمٹا ہوا کتا روزی پاتا رہتا ہے، اور کسی کی دُر دُراہٹ سننے کی نوبت نہیں آتی، اخلاص وبندگی کی یہی شان ہے کہ جب اللہ کو رب مان لیا، تو ہر طرف سے کٹ کر ساری نیاز و بندگی سب حاجت روائی، مشکل کشائی اس کے متعلق کر دی۔ **ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا** (بے شک جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے، پھر اسی پر جم گئے) **واذکر اسم**

ربک وتبتل الیہ تبتیلاً (سورہ مزمل) اور پڑھے جا نام اپنے رب کا، اور چھوٹ کر چلا آ، اس کی طرف سب سے الگ ہوکر۔ پھر ارشاد ہوا کہ ”اور انہیں اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ نماز قائم رکھیں، اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں، یہی پختہ کار لوگ یعنی انبیاء وصالحین کا دین ہے“۔

اللہ کا یہ حکم جیسے پہلے لوگوں کو تھا آج بھی یہی حکم ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، زمانے کے حالات بدلتے رہیں مگر اس حکم میں تبدیلی نہیں ہے، اللہ کے تمام بندوں سے اللہ کا یہی مطالبہ ہے، بندوں کی سرخروئی اسی میں ہے کہ حق تعالی کے اس پاک حکم کی تعمیل جان ودل سے اور ذوق وشوق سے کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆☆

اہل بیت کون ہیں؟

سوال: گزارش ہے کہ رسالہ فروری مارچ کا موصول ہوا، اپنی معلومات کے لئے عرض ہے کہ صفحہ ۵۹ پر تین بنات طاہرات کا آپ نے ذکر کیا ہے، حضرت ام کلثوم، حضرت رقیہ، حضرت زینب کا۔ بعدہٗ اہل بیت کا تذکرہ ہے، کیا صرف حضرت فاطمہ ہی اہل بیت میں داخل ہیں، یہ چاروں بیٹیاں حضرت خدیجہ ہی کے بطن سے ہیں، یا میری معلومات میں کمی ہے، آخر سب کو اہل بیت میں شمار کیوں نہیں کیا گیا، میری معلومات کے مطابق رافضی ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں، صرف انھیں کو اہل بیت میں شمار کرتے ہیں جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، امید کہ تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں گے۔

(ضیاء الدین کانپور)

جواب:

میرے جس مضمون کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس میں خاکسار نے مقبرۂ مبارکہ جنت البقیع کے اندر چند اصحاب کرام کی قبروں کی نشان دہی کی ہے، اور اس کا ماخذ ایک عربی کتاب ہے، جس کا نام ''**بقیع الغرقد**'' ہے، اس میں جس طرح قبروں اور ان میں مدفون بزرگوں کا تذکرہ ہے، میں نے اسی طرح نقل کردیا ہے، اس وقت میرے ذہن میں یہ نکتہ نہ تھا جو آپ نے تحریر فرمایا ہے، آپ کے سوال سے ذہن اس کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ تو واقعہ ہے کہ بعض چیزیں شیعوں کی سنیوں کے درمیان رائج ہیں، لیکن ہمارے علماء بالخصوص امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نور اللہ مرقدہٗ کی کوششوں سے اس غلطی کا بہت کچھ ازالہ ہوگیا ہے۔

اہل بیت کون ہیں؟ اس مسئلے میں شیعوں کی ایک منفرد رائے ہے، جو خلاف نقل بھی ہے اور خلاف عقل بھی، خلاف نقل اس لئے کہ قرآن پاک میں اهــل البیــت کا لفظ امہات المومنین ازواج النبی ﷺ کے تذکرے کے سیاق میں آیا ہے، یہ لفظ سورۂ احزاب کے چوتھے رکوع میں آیا ہے، اس رکوع کی ابتداء یَـاأَیُّهَـاالـنَّبِیُّ قُلْ لِأَزْوَاجِکَ سے ہے، یعنی اے نبی! آپ اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے، یہاں سے ازواج مطہرات کیلئے خصوصی ہدایات کا آغاز ہے، اسی رکوع میں آیت ذیل ہے:

وَقَـرْنَ فِـیْ بُیُـوْتِـکُـنَّ وَلَاتَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْأُوْلٰی وَأَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَآتِیْـنَ الـزَّکـوٰـةَ وَأَطِـعْـنَ اللهَ وَرَسُـــوْلَهٗ إِنَّمَا یُـــرِیْدُ اللهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ أَهْــلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرُکُمْ تَطْهِیْراً (آیت:۳۶)

اور اپنے گھروں میں جم کر رہو، اور اگلی جاہلیت کے طریقے پر اپنے آپ کو دکھلاتی نہ پھرو، اور نماز قائم رکھو، اور زکوٰۃ دیتی رہو، اور اللہ ورسول کی اطاعت کرتی رہو، اور اللہ یہی چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو! کہ تم سے گندی باتیں دور کر دے، اور تمہیں خوب پاک صاف کر دے۔

اس آیت کریمہ کا خطاب ازواج مطہرات کو ہے، اسی خطاب کے ذیل میں حق تعالیٰ نے یہ بات بھی فرمائی ہے کہ اے اہل بیت! اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ تم سے گندی باتیں دور رکھیں اور تمہیں خوب صاف ستھرا کر دیں، ظاہر ہے کہ یہ خطاب ازواج مطہرات ہی کو ہے، اس لئے اہل بیت اصلاً وہی ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ...... جو شئون الٰہیہ کی زبردست معرفت رکھتے تھے...... نے جب دیکھا کہ اہل بیت کا خطاب ظاہر کے اعتبار سے عام ہے، اور ہر وہ شخص اس کے عموم میں داخل ہوسکتا ہے جو آپ کے گھر کا فرد کہا جاسکتا ہے، تو آپ نے چاہا کہ اس فضیلت خاص میں اپنی اولاد کو بھی شامل فرمالیں، تو آپ نے حضرت فاطمہ، حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو بلا کر ان کے حق میں بھی بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ یہ بھی میرے اہل بیت ہیں۔

”اس کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ کریم اپنے کسی مقرب اور مصاحب سے یہ کہے کہ میرے پاس اپنے اہل خانہ اور گھر والوں کو حاضر کرو، میں انھیں خلعت خاص دینا چاہتا ہوں، اس مقرب اور مصاحب نے عالی ہمت بادشاہ کے لطف وکرم پر نظر کر کے اپنے اہل خانہ کے علاوہ کچھ

دوسرے قریبی اعزہ واقارب کو بھی بارگاہِ شاہی میں پیش کردیا، اور کہنے لگا کہ حضور یہ سب میرے اہل خانہ ہیں، جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ اعزہ واقارب بھی شاہی خلعت ونوازش سے بہرہ مند ہوں۔‘‘ (معارف القرآن ادریسی، ج:٦، ص:٢٦٧)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر واولاد کو کیوں اکٹھا کیا، آخر ان کے علاوہ بھی تو تین صاحبزادیاں تھیں، ان کا ذکر کیوں نہیں ہے؟۔

اس کا جواب حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی علیہ الرحمہ نے تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ’’حضرت خدیجہ کی چار صاحبزادیاں تھیں، رقیہ، ام کلثوم، زینب اور فاطمۃ الزہراء، اول الذکر تین صاحبزادیاں اس آیت کے نزول سے پہلے وفات پاچکی تھیں، صرف حضرت فاطمہ باقی تھیں، اس لئے فاطمہ کو اس دعا کے ساتھ مخصوص فرمایا‘‘۔ (دیکھو تفسیر ابن کثیر، ج:۲، ص: ۴۹۳ معارف القرآن ادریسی، ج:٦، ص:٢٦٧)

یہاں ایک سوال اور ذہن میں کھٹکتا ہے کہ لفظ اہل بیت کا اطلاق عموماً انھیں بزرگوں پر کیوں ہوتا ہے، جن کو بعد میں رسول اللہ ﷺ نے اہل بیت میں شامل فرمایا ہے، ازواج مطہرات پر عموماً اہل بیت کا لفظ نہیں بولا جاتا۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ازواج مطہرات کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور لقب سے اسی سورۂ احزاب میں نوازا ہے، وہ ہے ’’امہات المومنین‘‘۔ فرمایا: وأزواجه أمهاتهم، اس لقب میں مزید ایک شرف کا بیان ہے، وہ یہ کہ یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں ہونے کی وجہ سے تمام اہل ایمان کی مائیں ہیں، یہی لقب مذکورہ حضرات اہل بیت پر عمومی طور پر غالب آگیا ہے، اور وہ حضرات جن کو ایک چادر میں سمیٹ کر آپ نے خصوصی دعا فرمائی اور انھیں اہل بیت میں شامل فرمایا، ان پر ’’اہل بیت‘‘ کا لقب عموماً بولا گیا، اور یہ اب سے نہیں، اور کسی اور نے نہیں، خود رسول اکرم ﷺ نے ان حضرات پر بطور لقب کے اطلاق فرمایا ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں حضرت انس بن مالک ؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا چھ ماہ تک یہ معمول رہا

کہ جب آپ فجر کی نماز کے لئے نکلتے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر گزرتے تو فرماتے: **یااھل البیت! إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرُكُمْ تَطْهِيراً**، یہ حدیث امام ترمذیؒ نے بھی روایت کی ہے۔

ظاہر ہے کہ چھ ماہ تک جب آپ کا روزانہ کا یہ معمول رہا ہے کہ حضرت فاطمہ اور ان کے گھر والوں کو **یا اھل البیت** کہہ کر پکارتے رہے تو یقیناً یہ لقب ان لوگوں کے لئے مستند اور معروف ہو جائے گا، اسی بنا پر جب مطلق اہل بیت بولا جاتا ہے تو یہی حضرات مراد ہوتے ہیں، اور اس میں کوئی رافضیت نہیں ہے۔

رہی رافضیوں کی ہرزہ سرائی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ کی اور کوئی صاحبزادی نہ تھی، تو کہنے والے کیلئے یہ بات انتہائی شرمناک ہے، اللہ بچائے۔

☆☆☆☆☆☆

قوم انصار کی حقیقت
اور
قطب، ابدال اور مجذوب کی شرعی حیثیت

حضرت اقدس مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی دامت برکاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دو تین سوال کرنے کی جرأت کررہا ہوں، امید ہے کہ ناگوار خاطر نہ ہوگا۔

(۱) مسلم انصاری، جولہا مومن یہ ایک فرقہ یا قوم کے نام ہیں، کیا ان کا تعلق حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ہے؟ کیا امام غزالی اسی قوم کے تھے؟۔

(۲) قطب، ابدال، مجذوب کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ کیا ان کا دنیاوی نظام میں کچھ دخل ہے؟۔

(۳) خاتمہ بالخیر اور جنت فردوس میں داخلہ کا یقین کس طرح ہوگا؟

ناچیز محمد شبیر حسن منظرؔ

نیالہیر یاسرائے دربھنگہ، بہار

☆☆☆☆☆

محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہندوستان کے عرف میں وہ لوگ جو کپڑا بننے کا پیشہ کرتے ہیں، انھیں ’’جولاہا‘‘ کہا جاتا ہے، دستکاری کوئی بھی ہو بشرطیکہ جائز ہو، اس میں شرعاً اور عرفاً کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن اللہ

جانے، دستکاری کرنے والوں کے سروں پر ذلت وخواری کیونکر چسپاں ہوگئی ہے، ہندوستان جو مذہبی طور پر نسل وبرادری کی تفریقات میں ہمیشہ سے مبتلا رہا ہے، اور اس کو یہاں کے مذہبی رہنماؤں نے خدائی ہدایات کا رنگ دے دیا تھا۔ ذات پات کی اس تقسیم کی بنیاد کئی چیزوں پر تھی، ان میں نسل، علاقائیت، مذہبی تقدس اور پیشوں کا خاص لحاظ تھا، دستکاری کرنے والی اقوام خدام اور غلاموں کی فہرست میں تھیں، اسلام کا نور جب اس کفرستان میں چمکا، تو ہر طبقہ کے لوگ اسلام کی آغوش میں آئے، لیکن طبقہ واریت اور ذات پات کی جو پختہ بندشیں تھیں، ان سے یہ ملک آزاد نہ ہوسکا۔

پھر کپڑا بننے والی قوموں میں جو لوگ مسلمان ہیں، اور عموماً وہ مسلمان ہی ہیں، انھوں نے بعض عوامل وموثرات کے نتیجے میں اپنے لئے انصاری اور مومن کا لقب اختیار کیا، ان کے لئے جولاہا کا لفظ باعث ننگ وعار بن گیا تھا۔ اسلامی تاریخ میں ''انصاری'' ایک بڑے شرف والا لقب ہے، یہ ان حضرات کا لقب ہے جنھوں نے مدینہ طیبہ میں حضور اکرم ﷺ کو تشریف آوری کی دعوت دی تھی، اور ان کی دعوت بارگاہِ الٰہی میں منظور ہوئی، آپ کو ہجرت میں وہیں جانے کا حکم ہوا، اور جب آپ کے اصحاب ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے گئے، تو ان حضرات نے ایسی عدیم المثال خدمت آپ کی اور آپ کے اصحاب کی کہ رہتی دنیا تک نصرت اور وفاداری کی ایک دل آویز مثال قائم ہوگئی۔ یہ نسبت کپڑا بننے والی قوم نے اپنے لئے جو اختیار کی، تو میں عرصے تک خلجان میں مبتلا رہا کہ یہ نسبت کس مناسبت سے ہے، ظاہر ہے کہ یہ برادری مدینہ کے انصار سے کوئی نسلی تعلق نہیں رکھتی، ہندوستان کے یہ انصاری حضرات اپنا نسب نامہ چند پشتوں سے اوپر لے جانے سے عموماً قاصر ہیں، کیونکہ آج کے دور سے پہلے ناخواندگی کی شرح اس برادری میں بہت زیادہ تھی پھر کون اپنا نسب محفوظ رکھتا۔ پھر محدث الہند ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہٗ کی بعض کتابیں مطالعہ میں آئیں، تو معلوم ہوا کہ مدینہ کے انصار حضرات میں پارچہ بافی و دستکاری وغیرہ کا عمل رائج تھا، اور اس دستکاری کا رواج خاندانی اعتبار سے اور اوپر سے ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

عرب ممالک میں خصوصیت سے ملک یمن عرصۂ قدیم سے کپڑے کی بُنائی کا مرکز رہا

ہے، وہاں کے اکثر قبائل پارچہ بافی کی صنعت اختیار کئے ہوئے تھے، اور انصار مدینہ یمن ہی سے آ کر یثرب (مدینہ کا قدیم نام) میں آباد ہوئے تھے، اس لئے قدرۃً پارچہ بافی کی صنعت یہاں رائج ہوگئی تھی، غالبًا اسی نسبت سے ہندوستان کے اہل حرفت نے اپنے لئے ’’انصاری‘‘ کا لقب اختیار کیا۔

محدث الہند ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمہ کی کتاب ’’تذکرۃ النساجین‘‘ کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، وہ یمن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’کندہ اور اشعر دو یمنی خاندان اور قبیلے تھے، اور یمن میں عمومًا بُنائی کا کام ہوتا تھا، اس میں اکثر قبائل کا پیشہ یہی تھا، اس کا سب سے بڑا ثبوت عربی لٹریچر ہے۔ (ص:۶)

اس کے بعد انھوں نے متعدد اشعار کی روشنی میں ثابت کیا کہ یمن میں پارچہ بافی کی صنعت کافی مشہور تھی، پھر تاریخ کی کتابوں کے متعدد حوالے انھوں نے دئے، تفصیل کے لئے اصل کتاب ملاحظہ ہو، پھر لکھتے ہیں:

> ’’اس سلسلہ میں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ مدینہ منورہ کے انصار بھی یمنی الاصل ہیں، ان کے اجداد یمن سے آ کر مدینہ میں آباد ہوئے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ انصاریوں کے متعدد گھرانوں میں بُنائی کا کام ہوتا تھا، جیسا کہ متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ (ص:۸)

مدینہ شریف میں جو لوگ بُنائی کا کام کرتے تھے، ان میں ایک روشن نام میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ کا ہے، حضرت محدث الہند لکھتے ہیں کہ:

> ’’معارج النبوۃ میں ہے کہ آپ بھی حیاکت کیا کرتے تھے، چنانچہ رسول اکرم ﷺ جب مدینہ پہونچے ہیں تو صرف یہ خیال کر کے میں غریب بننے والا ہوں، اپنے یہاں آپ کے ٹھہرنے کی کیا خواہش کروں، آپ نے حضور سے اپنے یہاں نزول اجلال فرمانے کی درخواست نہ کی، مگر مشیت ایزدی یہی تھی کہ یہ دولت لازوال ابوایوب ہی کے حصے میں آئے، حضرت ابوایوب کا مقولہ معارج النبوۃ میں یوں منقول ہے:
>
> ’’من مرد ضعیف وفقیر بافندہ ام، ورسول ازمن عار دارد و در خانۂ من نزول نفرماید‘‘
>
> مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد
> ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

میں ایک کمزور وغریب بنکر آدمی ہوں، رسول اللہ ﷺ کو مجھ سے عار ہوگا، اس لئے میرے گھر میں نزول نہ فرمائیں گے۔ (ص: ۴)

اس تفصیل سے انصاری کے لقب کا سراغ ملتا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انصار مدینہ کے ساتھ انصار ہند کا کوئی نسلی تعلق نہیں ہے۔

امام غزالی علیہ الرحمہ کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے کہ ان کا تعلق کپڑا بننے والی قوم سے ہے۔

قطب:

قطب، ابدال اور مجذوب، یہ اصطلاحات ہیں، جو حضرات صوفیہ رحمہم اللہ کے علوم میں استعمال کی جاتی ہیں، اس قسم کی اصطلاحات کی حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات عالم میں تمام تصرفات کے مالک تو اللہ تعالیٰ ہیں، وہ خواہ کلی تصرفات ہوں، یا ان کی جزئیات، سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت کے ماتحت ہیں، وہ جیسے چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں، لیکن حق تعالیٰ ان تصرفات کے لئے اپنی حکمت بالغہ کے تقاضے سے اپنے خاص خاص بندوں سے انتظام عالم کے بہت سے کام لیتے ہیں، مثلاً دلائل شرعیہ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ تکوینیات میں بھی اور تشریعیات میں بھی حق تعالیٰ فرشتوں سے کام لیتے ہیں، چنانچہ قرآن وحدیث سے صراحۃً ثابت ہے کہ دنیا ودین کے الگ الگ کاموں پر فرشتے مامور ہیں، کتب ہدایت کا نزول حضرت جبرئیل علیہ السلام سے متعلق رہا ہے، قرآن کریم کی شہادت ہے کہ فرشتوں کو جہاں بشارت کے ساتھ بھیجا گیا، وہیں وہ ایک قوم پر عذاب بھی لے کر آئے، پھر قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے علاوہ بعض خاص خاص انسانوں سے بھی انتظامِ عالم متعلق ہوتا ہے، چنانچہ تشریعیات میں ہدایت وارشاد کا کام انبیاء سے متعلق ہے، پھر ان کے نائبین سے اس خدمت کا تعلق ہوتا ہے، اسی طرح تکوینیات میں بھی ان سے کام لیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے، اس واقعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک صاحب تشریع پر مامور تھے، اور ایک صاحب تکوین پر متعین تھے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ان کے نائبین میں بعض حضرات ارشاد وہدایت کی

مرکزی شان رکھتے ہیں، ان کی برکت سے ہدایت کا خوب رواج ہوتا ہے، یہ لوگ قطب الارشاد کہلاتے ہیں، بعض کے سپرد کچھ تکوینی امور ہوتے ہیں، یہ لوگ باطنی طور پر حضرت خضر علیہ السلام کے نائب ہوتے ہیں، انھیں ''قطب التکوین'' کہا جاتا ہے۔

ابدال:

رسول اکرم ﷺ کی بعض احادیث میں ''اَبدال'' کا ذکر آیا ہے، مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالے سے ایک روایت منقول ہے، شریح بن عبید کہتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے عرض کیا گیا جب وہ عراق میں تھے، کہ اہل شام پر لعنت بھیجئے، فرمایا نہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ فرما رہے تھے کہ ابدال شام میں ہوں گے، وہ چالیس ہوں گے، ایک کا انتقال ہوگا، تو اس کی جگہ پر اللہ تعالیٰ دوسرے کو متعین فرمادیں گے، ان کی برکت سے بارش ہوگی، دشمنوں پر غلبہ ہوگا، اور اہل شام سے بلائیں ٹلیں گی۔ (ج:۱، ص:۱۱۲)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اس امت میں تیس ابدال ہوں گے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر قدم ہوں گے، جب کسی ایک کا انتقال ہوگا، تو اس کے بدلے میں دوسرا مقرر ہوگا۔ (مسند احمد، ج:۵، ص:۵۲۳)

ان دونوں روایتوں میں محدثین کے اصول وقواعد کے اعتبار سے قدرے ضعف ہے، اجمالاً سنن ابی داؤد میں بھی ابدال کا تذکرہ ہے (دیکھئے: کتاب المهدی) حضرات ابدال کا ذکر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں بھی ہے، جو مختلف الفاظ میں منقول ہے، اور امام سخاوی نے لکھا ہے کہ وہ سب روایتیں ضعیف ہیں، خلال نے کرامات الاولیاء، طبرانی نے المعجم الاوسط میں، ابن عدی نے الکامل میں یہ روایتیں قدرے الفاظ کے فرق سے نقل کی ہیں، طبرانی نے معجم کبیر میں بھی حدیث ذکر کی ہے۔

امام ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر دور میں میری امت میں پانچ سو بہترین لوگ ہوں گے، اور ابدال چالیس ہوں گے، نہ یہ پانچ سو سے کم ہوں گے اور نہ وہ چالیس سے کم ہوں گے، جب کسی کا

انتقال ہوگا، تو دوسرا آدمی اس کی جگہ آجائے گا، لوگوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! ان کے اعمال کیا ہوں گے؟ فرمایا کہ جو کوئی ان پر ظلم کرے گا اسے معاف کردیں گے، جو ان کے ساتھ بُرا برتاؤ کرے، یہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے، اور جو کچھ اللہ نے انھیں دیا ہے، اس میں مسلسل بخشش کرتے رہیں گے۔

حلیۃ الاولیاء ہی میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے بھی مرفوعاً منقول ہے کہ چالیس آدمی میری امت میں حضرت ابراہیم ؑ کے قلب کے مطابق رہا کریں گے، ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ اہل زمین سے بلائیں دفع فرمائیں گے، انھیں ابدال کہا جاتا ہے، انھوں نے یہ مرتبہ نماز، روزے اور صدقہ کی وجہ سے نہ پایا ہوگا، لوگوں نے سوال کیا، پھر کیونکر ملے گا؟ فرمایا سخاوت سے اور مسلمانوں کی قلبی خیرخواہی سے۔

اور بھی کئی ایک روایتیں ہیں جنھیں امام سخاوی نے **المقاصد الحسنة** میں نقل کیا ہے، اور ان سب پر ضعیف کا حکم لگایا ہے، ضعف کی شدت میں کمی بیشی ہے، ان سب میں بہتر امام سخاوی نے اس روایت کو قرار دیا ہے جس کو ہم نے ابتداء میں حضرت علی ؓ کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

روایات کے اس مجموعے سے یہ بات بالکل بے غبار ہوجاتی ہے کہ ابدال کا تصور بے بنیاد نہیں ہے، بلکہ رسول اکرم ﷺ کے ارشادات میں اس کی اصل موجود ہے، امام سخاوی فرماتے ہیں کہ:

> ''ان قرائن میں سے جن سے اس حدیث کی قوت ثابت ہوتی ہے، اور جن سے ائمہ کے درمیان اس حدیث کی شہرت معلوم ہوتی ہے، ایک قرینہ یہ ہے کہ ہمارے امام شافعی علیہ الرحمہ نے بعض حضرات کے بارے میں فرمایا کہ ہم انھیں ابدال میں شمار کرتے تھے، نیز امام بخاری بھی بعض اکابر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ لوگوں کو فلاں کے ابدال میں سے ہونے میں شک وشبہ نہیں ہے، ایسے ہی متعدد ائمہ، حفاظِ حدیث اور اصحابِ نقد ونظر نے متعدد لوگوں کے ابدال میں ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ (**المقاصد الحسنة**، ص:۲۲/۲۳)

یہ اللہ کے مخصوص بندے ہیں، جن کے ذریعے حق تعالیٰ زمین پر برکتیں نازل فرماتے

ہیں، ان کا قلب بہت صاف ستھرا ہوتا ہے، یہ ساری امت بلکہ ساری انسانیت کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ كثر الله أمثالهم

مجذوب کی حقیقت:

تیسرا لفظ آپ نے ’مجذوب‘ لکھا ہے، اس کے متعلق بقدر ضرورت تشریح کرتا ہوں۔

مجذوب کا لفظ جذب سے مشتق ہے، جذب کے معنی کھینچنے کے ہیں۔ مجذوب حضرات صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے، جو لوگ حق تعالیٰ کے خاص بندے ہیں، وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، بعض حضرات کا اپنی بارگاہ کے لئے اللہ تعالیٰ انتخاب فرماتے ہیں، ان کی خصوصی تربیت فرماتے ہیں، انھیں غلطیوں اور معصیتوں سے بچاتے ہیں، جیسے انبیاء کرام علیہم السلام۔ یہ حضرات اپنی خلقت کے روز اول سے حق تعالیٰ کی نگاہ انتخاب میں ہوتے ہیں، بہت سے اولیاء اللہ کا بھی یہی حال ہوتا ہے، انھیں اللہ تعالیٰ اپنی عبادت وطاعت یا اپنی طرف مخلوق کو دعوت دینے کے لئے منتخب فرما لیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حق تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، ان کا قصد وارادہ بارگاہِ الٰہی تک پہونچنے کا ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ انھیں اپنی بارگاہ تک رسائی عطا فرماتے ہیں، حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دونوں طرح کے لوگوں کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں: اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَہۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یُّنِیۡبُ (سورۂ شوریٰ: ۱۳) اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، اور جو شخص رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی عطا فرماتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے مسائل السلوک میں لکھا ہے کہ:

> ’’روح (المعانی) میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے جذب وسلوک کی طرف، وجہ یہ ہے کہ ’’جبی‘‘ کے معنی جذب کے ہیں، اور ہدایت کے معنی سالک کو اراءۃ طریق ہے۔‘‘

لفظ یجتبی اور اس کا مصدر اجتباء، جبی سے بنا ہے، اس کے معنی وہی ہیں، جو جذب کے ہیں، اسی جذب سے مجذوب بنا ہے، حضرات صوفیہ رحمہم اللہ کی اصطلاح میں مجذوب وہی ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ کے پیرائے میں بیان کیا ہے، اور جن لوگوں کو وَیَہۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یُّنِیۡبُ (اور کوئی رجوع کرے تو اس کو اپنے تک رسائی عطا فرماتے

ہیں) کے پیرائے میں ذکر کیا ہے، صوفیہ کی اصطلاح میں اس قسم کے لوگ سالک کہلاتے ہیں، صاحب روح المعانی مذکورہ بالا آیت کے تحت (ومما قاله أرباب الاشارات) میں لکھا ہے کہ:

> ”اس آیت میں مجذوب اور سالک کے مقامات کی جانب اشارہ ہے، مجذوب وہ خاص حضرات ہیں جن کو حق تعالیٰ سبحانہ نے ازل میں چن لیا ہے، اور ان لوگوں کے زمرے میں انھیں داخل کیا ہے، جن سے اللہ سبحانہ محبت فرماتے ہیں، اور جن کو خاص اپنے واسطے منتخب فرمایا ہے اور انھیں ہر دو عالم سے ہٹا کر اپنی جانب اس طور سے کھینچ لیا ہے کہ یہ ”جذب“ جن وانس کے تمام عمل کے ہم پایہ ہے، یہ لوگ صاحب اقتدار بادشاہ کے دربار میں ایک سچے مقام پر فائز ہیں۔
>
> اور سالک وہ عام لوگ ہیں، جن کو حق تعالیٰ نے ان لوگوں کے زمرے میں رکھا ہے، جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں، انھیں ہدایت، جہد وانابت اور صراط مستقیم کی توفیق منجانب اللہ عطا ہوتی ہے۔“ (ص:۶۱، ج:۲۵)

اس تشریح کے لحاظ سے مجذوب وہ خاص حضرات ہیں، جن کا انتخاب حق تعالیٰ نے اپنی ذات، اپنی اطاعت اور اپنی مرضیات کے لئے کر لیا ہے، یہی لوگ ”مجذوب“ ہیں، انھیں کو ”مراد“ بھی کہا جاتا ہے۔

اور وہ لوگ جن پر یہ خاص نظر عنایت نہیں، مگر انھیں حق تعالیٰ کی جانب سے توفیق ہدایت ملتی ہے، یہ اللہ کی طرف اپنی رغبت سے چلتے ہیں، نفس وشیطان کی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن ان کے ارادہ کے خلوص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انھیں اپنی راہ پر چلنے کی ہمت اور توفیق دیتے ہیں، یہ لوگ صوفیہ کی اصطلاح میں ”سالک“ اور ”مرید“ کہے جاتے ہیں۔

لیکن ”مجذوب“ عوام الناس کی بھی ایک اصطلاح ہے، اس اصطلاح میں مجذوب ان پاگلوں کو کہتے ہیں، جن کے بارے میں لوگوں کا کسی وجہ سے یہ حسن ظن ہوتا ہے کہ شاید یہ اللہ والے بزرگ ہوں، یہ اصطلاح معتبر نہیں ہے، اور نہ شریعت میں اس کا کوئی وزن ہے۔

حسن خاتمہ کا یقین:

آپ کا تیسرا سوال یہ ہے کہ خاتمہ بالخیر اور جنت الفردوس میں داخلہ کا یقین کس طرح

ہوگا؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات نہایت رحیم وکریم ہے، ان کے رحم وکرم پر نگاہ جاتی ہے، اور اس پر کہ اس رحیم وکریم ذات نے محض اپنے فضل وکرم سے ایمان بخشا ہے، اور اس کے تقاضوں کے مطابق کچھ کچھ اعمال کی توفیق دی ہے، اس سے امید ہوتی ہے کہ آخری وقت میں بھی فضل فرمائیں گے، لیکن وہ پروردگار بے نیاز بھی ہیں، بندوں سے بھی، بندوں کی طاعات سے بھی، پھر کیا معلوم آخر میں کون سی شان جلوہ گر ہو، اس بے نیازی پر نظر جاتی ہے، تو دل پر ہیبت چھا جاتی ہے، مومن انھیں دونوں حالتوں کے درمیان رہتا ہے، اور ان دونوں شانوں کا استحضار رہنا بھی اللہ کی عظیم رحمت ہے، **الایمان بین الخوف والرجاء**، ایمان خوف اور امید کے درمیان میں ہے۔ اس زندگی میں کامل اطمینان کا ہونا مناسب نہیں ہے۔

اطمینان تو اسی کو ہوگا، جس کا دل خوف اور امید دونوں حالتوں سے خالی ہو، اور ظاہر ہے کہ جس کا قلب ان دونوں حالتوں سے خالی ہوگا، وہ ایمان ہی سے خالی ہوگا، اس لئے اس فکر میں نہ پڑا جائے کہ خاتمہ بالخیر اور داخلۂ جنت کا یقین حاصل ہو جاء، دنیا میں امید وخوف کی حالت ہی بہتر ہے، اسی بنیاد پر طاعتوں کا شوق، گناہوں پر ندامت، حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وانابت کی توفیق ہوتی ہے، ہاں اتنا ہے کہ عام حالات میں خوف کا غلبہ ہو، اور دم واپسیں میں امید کا غلبہ ہو، تو بہتر ہے، امید کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن سے ہے، یہ حسن ظن بھی بڑی عبادت ہے، مرنے کے قریب اسی کا غلبہ ہونا چاہئے۔

امام نووی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ:

> ’’جو شخص ایمان رکھتا ہے، اور اس نے خالص اللہ کی رضا کے لئے عمل کئے، تو اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا، سوء خاتمہ اس شخص کے حق میں ہے، جس نے خلاف شریعت برے اعمال کئے، یا عمل صالح میں ریاکاری اور جذبۂ شہرت طلبی کو شامل کرلیا۔‘‘ (شرح اربعین)

ایمان کے ساتھ عمل میں خلوص ہو، یعنی جو عمل کرے، وہ محض اللہ کی رضا کے لئے کرے، اور ظاہر ہے کہ محض اللہ کی رضا کے لئے وہی عمل ہوگا، جو شریعت وسنت کے مطابق ہو، اگر شریعت کے مطابق نہ ہو، تو اس میں رضائے الٰہی کی نیت ہی باطل ہوگی، اور اگر شریعت کے

مطابق ہے، لیکن رضائے الٰہی کی نیت نہیں ہے تو دکھلاوا ہے، کسی کو خوش کرنا ہے، یا کسی اور کے دباؤ میں کرتا ہے، کسی آدمی کے ڈر سے کرتا ہے، تو وہ ہے تو شریعت کے مطابق، مگر اس میں نیت فاسد ہے، تو اس پر خاتمہ بالخیر کی امید کیونکر کی جائے۔

ایمان اور مخلصانہ عمل کے ساتھ کثرت سے دعا بھی کرنی چاہئے، حق تعالیٰ دعاؤں کی برکت سے بگڑے ہوئے کاموں کو بنا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ہم سب کو ایمان پر استقامت عطا فرمائیں، اعمال صالحہ اور ان میں اخلاص وللہیت کی توفیق بخشیں اور زندگی کی آخری ساعت میں کلمۂ ایمان نصیب فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆

اداریئے

(۱) رسالۃ الاوائل اور ناشر دیوبند

(۲) کتب خانہ محدث کبیر

(۳) محدث کبیر کی سوانح حیات کی ضرورت

(۴) دارالعلوم دیوبند کا نمائندہ اجلاس بسلسلۂ نصاب تعلیم

(۵) حکومت کی پالیسیاں اور مسلمانوں کے لائحہ عمل

(٦) سیمناروں کے سوال نامے؟

(۷) بیمہ اور فقہ اکیڈمی کا فیصلہ؟

(۸) تمہیں بتاؤ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

(۹) ایک مجلس کی تین طلاق اور غیر مقلدین کا رویہ

(۱۰) مملکت سعودیہ عربیہ میں غیر مقلدین کی بدعنوانیاں

(۱۱) منافق علیم اللسان

(۱۲) تحریف وتبدل کی ابتدا اور قرآن وحدیث کی وضاحت

رسالۃ الاوائل اور ناشر دیو بند

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی علیہ الرحمۃ کی حدیثی خدمات اور محدثانہ تحقیقات تمام اہل علم پر عیاں ہیں، بہت سی نادر ونایاب کتابوں کو ڈھونڈ نکالنا، پھران کی تصحیح وتحقیق کر کے شائع کرانا، حضرت کا ایک عظیم کارنامہ ہے، اس طرح کی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں ہیں، جن کا تعارف سلسلہ وار آپ ’’المآثر‘‘ میں پڑھ رہے ہیں، اسی سلسلہ کا ایک مختصر سا رسالہ مشہور محدث وفقیہ شیخ محمد سعید بن سنبل مکی کا مرتب کیا ہوا ہے، اس کا نام ’’رسالۃ الاوائل‘‘ ہے، اس میں شیخ موصوف نے حدیث کے مشہور مجموعوں میں سے ۴۳ کتابوں کی پہلی اور چند ایک کی آخری حدیث صاحب کتاب تک اپنی سند سے نقل کی ہے۔ محدثین کا دستور ہے کہ کسی کتاب کی پہلی حدیث سن کر یا سنا کر پوری کتاب کی روایت کی اجازت طالب علم کو دے دیتے ہیں، اس مجموعہ کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی طالب علم کسی محدث سے ان سب کتابوں کی اجازت حاصل کرنا چاہے تو سب کو جمع کرنے اور ان کی ورق گردانی کے مشکل عمل سے بچ جائے گا، اس رسالہ سے ہر کتاب کی ایک ایک حدیث پڑھ کر اسے سب کی اجازت حاصل ہو جائے گی، اجازت کا یہ طریقہ اساتذۂ حدیث کے درمیان معروف ہے۔

یہ رسالہ سب سے پہلے مولانا نور محمد صاحب نے ’’اکلیل المطابع‘‘.....جو ابتداءً رسڑا ضلع بلیا میں تھا، اور بعد میں بہرائچ منتقل ہو گیا تھا.....سے شائع کیا تھا، اس کے بعد دوبارہ مصر سے شائع ہوا، پھر نایاب ہو گیا، ۱۳۸۲ھ میں محدث کبیر نے ’’اکلیل المطابع‘‘ والے نسخے کی تصحیح کر کے اور بعض جگہ مختصر حواشی تحریر فرما کر ’’مکتبہ اعظمی مئو‘‘ سے تیسرا ایڈیشن عمدگی کے ساتھ چھپوایا، اس نسخے میں شیخ الدلائل حضرت مولانا عبدالحق صاحب الہ آبادی مہاجر مکی کے قلم سے کچھ تعلیقات

تھیں، حضرت نے انہیں مولانا موصوف کے حوالہ سے حاشیہ میں درج کر دیا، اور اس پر ابتداء میں ایک مختصر سی تمہید بھی لکھی، جس میں مذکورہ بالا باتیں درج کیں۔

یہ تیسرا ایڈیشن نایاب نہیں ہے، حضرت محدث اعظمی کے گرامی قدر صاحبزادگان سے اب بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر دیو بند سے اسی نسخے کا فوٹو ایڈیشن اور اس پر ناشر کی تمہید دیکھ کر حیرت بھی ہوئی، اور حق امانت کا پاس ولحاظ نہ کرنے پر افسوس بھی ہوا، اس کے ناشر نے نادانستہ یا دانستہ کئی غلطیاں کیں، جن سے ناظرین دھوکہ میں پڑ سکتے ہیں، اس لئے اس کا مختصر سا احتساب ضروری ہوا۔

(۱) شروع میں ناشر نے ایک تمہید لکھی ہے، اس میں ذکر کیا ہے کہ اس رسالہ کے سابقہ ایڈیشن نایاب ہو چکے تھے، اس لئے اس کے ایک قدیم نسخے کو جو مجھے حاصل ہوا، بنیاد بنا کر یہ نیا ایڈیشن شائع کر رہا ہوں، لیکن نہ اس نے اس قدیم نسخے کا تعارف کرایا، اور نہ یہ بتایا کہ اس کو کس نے شائع کیا تھا، حالانکہ ایسا کرنا ضروری تھا، علاوہ ازیں جو کچھ ناشر نے لکھا ہے، وہ غلط بھی ہے، ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ ۱۳۸۲ھ میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا، اور اس کے نسخے اب تک موجود ہیں، اس لئے یہ نسخہ نہ تو نایاب ہے، اور نہ قدیم!

(۲) یہ جدید ایڈیشن ۱۴۰۷ھ میں شائع کیا گیا ہے، اس وقت حضرت محدث کبیر باحیات تھے، ان سے اس بارے میں کوئی استصواب نہیں کیا گیا۔

(۳) حضرت نے تیسرے ایڈیشن کے شروع میں جو مختصر تمہید تحریر کی تھی، ناشر نے اسے حذف کر دیا، اور اپنی تمہید میں اس کا کوئی ذکر بھی نہیں کیا، اور یہی بڑی غلطی کی ہے، اس تمہید میں حضرت نے صراحت فرمائی ہے کہ اس کتاب پر جگہ جگہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب الہ آبادی مہاجر مکی شیخ الدلائل کے قلم سے تعلیقات ہیں، اس تمہید کے حذف ہونے سے یہ ضروری وضاحت بھی حذف ہوگئی، جو لوگ زیر نظر ایڈیشن پڑھیں گے، اور اس میں جابجا تعلیقات کے خاتمہ پر ''محمد عبدالحق عفی عنہ'' یا ''مولانا عبدالحق عم فیضھم'' یا ''الشیخ عبدالحق'' پڑھیں گے، یا ''الاعظمی'' لکھا ہوا دیکھیں گے، تو ان کا ذہن مذکور الصدر مولانا عبدالحق الہ آبادی یا حضرت محدث اعظمی کی جانب نہ جائے گا، بلکہ عجب نہیں کہ وہ اس سے حضرت مولانا عبدالحق صاحب الاعظمی

مدظلہ استاذ حدیث دار العلوم دیو بند کو سمجھ لیں، کیونکہ ناشر نے مشیر کی حیثیت سے ان کا نام تمہید میں ذکر کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا موصوف ایک سال سے اس رسالہ کو پڑھا رہے ہیں، پھر اگر قارئین یہ خیال کریں کہ یہ حواشی مولانا موصوف ہی کے قلم سے ہیں، تو یقیناً اس اشتباہ کا اندیشہ ہے، اس لئے ناشر کا فرض تھا کہ جب وہ پورے نسخے کا... بلا اجازت ہی سہی... فوٹو لے کر اسے شائع کر رہا ہے، تو حضرت کے تمہیدی کلمات بھی شائع کر دیتا، تاکہ علم کی امانت کا حق ادا ہو جاتا۔

(۴) مئو کے مطبوعہ نسخے میں طباعت کی کچھ غلطیاں تھیں، جن کی تصحیح آخر میں صحت نامہ لگا کر کی گئی ہے، دیو بند کے ناشر نے ان اغلاط کی تصحیح اصل کتاب میں کر دی ہے، مگر ایک جگہ تساہل کے نتیجہ میں ایسی فاش غلطی ہوگئی ہے، جو اہل علم کی شان سے بہت بعید ہے۔

صحت نامہ میں دو تصحیحات اس طرح ہیں:

الصفحہ	السطر	الخطا	الصواب
٦	**٧**	**ابی عیسیٰ بن سورة**	**ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ**
//	//	**وحدثناھناد**	**بن سورہ ح وحدثنا ھناد**

یہ دوسری عبارت سطر/۱۱ کی ہے، مگر کمپوزنگ (حرف جوڑنے) کی غلطی سے اس پر بھی ایضاً کا نشان لگ گیا ہے، لیکن یہ غلطی کچھ ایسی اہم نہیں ہے، نیز اس میں پہلی سطر کی تصحیح کا ایک لفظ ”**بن سورہ**“ دوسری سطر میں آ گیا ہے، تصحیح کرنے والا ذرا غور سے کام لیتا تو بالکل واضح ہو جاتا کہ اس کا ربط سطر اول سے ہے، بعد والی سطر میں تصحیح صرف ”**ح وحدثنا**“ ہے مگر اس نے غفلت سے کام لیا، سطر/۷ میں صرف اتنی تصحیح کی، ”**ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ**“ حالانکہ اس کے بعد ”**بن سورہ**“، ضروری تھا، اور سطر/۱۱ میں ”**بن سورہ**“ کو ملا کر عبارت کو خبط کر دیا، تصحیح شدہ عبارت ملاحظہ ہو:

”**حدثنا قتیبہ بن سعید قال حدثنا ابوعوانہ عن سماک بن حرب وبن سورہ ح وحدثنا ھناد**“ اس میں ”**بن سورہ**“ بالکل بے تکی بات ہے، اگر ترمذی شریف کھول کر اس کی پہلی حدیث دیکھ لی گئی ہوتی، تو یہ غلطی نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ توفیق نیک عطا فرمائیں۔

ماخذ: المآثر۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر (۱۹۹۲ء)

کتب خانہ محدث کبیر

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمۃ نے اپنے بعد جہاں اپنی بیش قیمت تصنیفات وتالیفات کا وافر ذخیرہ چھوڑا ہے، وہیں ایک عظیم الشان علمی کتب خانہ بھی حضرت کی یادگار ہے، جاننے والوں کو معلوم ہے کہ حضرت والا بچپن ہی سے مخصوص علمی ذوق رکھتے تھے، حافظہ بھی اللہ تعالیٰ نے محدثین جیسا عطا فرمایا تھا، ذہانت وذکاوت بھی بھرپور تھی، حضرت اقدس نادر ونایاب علمی کتابوں کی تلاش وجستجو میں لگے رہتے تھے، اس وقت جن کتابوں کے صرف نام ہی اہل علم نے سن رکھے تھے، محدث کبیر انہیں حاصل کرنے کیلئے بے تاب رہا کرتے تھے، یہ بے تابی انہیں باوجود غربت وافلاس اور استغناء وبے نیازی کے جگہ جگہ لئے پھرا کرتی تھی، کبھی حیدرآباد، کبھی رامپور، کبھی مچھلی شہر، کبھی دیوبند، کبھی لکھنؤ، کبھی مکہ مکرمہ، کبھی مدینہ منورہ، غرض جہاں کہیں نادر کتابوں کا پتہ ملتا، کوئی نہ کوئی جتن کر کے حضرت تشریف لے جاتے، اگر وہ حاصل ہو سکتیں انہیں حاصل کرتے، ان کی فوٹو کاپی مل سکتی تو وہ لیتے، ورنہ کم از کم ان کا وہیں مطالعہ کر کے اپنے حافظہ میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت نے ۲۹/سال کی عمر میں رجال طحاوی پر ایک مفصل اور مکمل کتاب ”الحاوی“ کے نام سے تصنیف فرمائی، اور اس کا مسودہ اس وقت کے امام حدیث اپنے استاذ علامہ انور شاہ کشمیری کی خدمت میں بھیجا، کچھ دنوں کے بعد خود دیوبند ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ صاحب اس وقت علیل تھے، پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ عرض کیا اعظم گڈھ سے، فرمایا اعظم گڈھ میں مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی کون ہیں، جنہوں نے رجال طحاوی پر کتاب لکھی ہے، عرض کیا بندہ حاضر ہے، شاہ صاحب نے بہت اکرام فرمایا، اور پوچھتے رہے کہ فلاں فلاں کے حالات کہاں ملے، اور وہ کتابیں آپ کو کہاں سے ملیں، شاہ صاحب کا یہ ارشاد

دلیل ہے کہ حضرت اقدس نے کس قدر کدوکاوش سے کتابوں کی جستجو کی تھی۔

حضرت کی جوانی کے دور میں اسلامی ذخائر حیدرآباد سے اور مصر سے چھپ چھپ کر شائع ہورہے تھے، ان ذخائر کو حضرت مولانا قیمتاً حاصل کرتے، ان کا بغور مطالعہ کرتے، اس طرح ایک بیش قیمت کتب خانہ علمی کتابوں سے معمور ہوگیا، بعد میں حضرت کی شہرت جب عالم عرب میں ہوئی، تو مصنفین اور ناشرین اپنی کتابیں ہدیہ بھیجنے لگے، اس کے ساتھ کتابوں کی خریداری کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، چنانچہ حضرت کی وفات سے پہلے موسم حج میں جب صاحبزادۂ گرامی مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ حج کے لئے تشریف لے گئے تو ان کے ہاتھوں کئی کتابیں منگوائیں۔

آج وہ ایک بھرپور کتب خانہ ہے، جس میں نادر ونایاب قلمی کتابیں بھی ہیں، پرانی مطبوعات بھی ہیں، تازہ اور جدید کتابیں بھی ہیں، حضرت نے اپنی حیات میں کتابوں کو ایک خاص ترتیب سے رکھا تھا، اور وہ صرف ان کے تصرف میں رہتی تھیں، ضعف وعلالت کے زمانہ میں جب کہ خود سے اٹھ کر وہ کتابیں نہیں نکال سکتے، اپنے خدام کو کتاب کی جگہ کا پورا پتہ بتا کر نکلواتے، پھر وہیں رکھوا دیتے، حضرت کا حافظہ بے نظیر تھا، کتاب کی جگہ انہیں بخوبی یاد رہتی تھی، لیکن حضرت کے گزرنے کے بعد اس کتب خانہ سے استفادہ کی بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں ہے کہ ان کتابوں کو جدید ترتیب کے مطابق از سرنو مرتب کیا جائے، ان کی مکمل فہرست بنائی جائے ان کے لئے مستقل کشادہ عمارت بنائی جائے، حضرت نے تو ایک مختصر سے کمرے میں تمام کتابیں رکھ چھوڑی تھیں، مگر ان کی حفاظت کے پیش نظر اور ان سے استفادے کی سہولت کے لئے ضروری ہے کہ کتب خانہ کی ایک وسیع عمارت تعمیر کی جائے، اور اس میں تمام کتابیں منتقل کردی جائیں، اہل علم حضرات حضرت کی وفات کے بعد ہی سے مشورہ دے رہے ہیں کہ حضرت کے نام پر ایک اکیڈمی قائم کرکے حضرت کی باقیات کی نشر واشاعت کا اہتمام کیا جائے، اور حضرت کے کتب خانہ کو از سرنو مرتب کیا جائے۔

چنانچہ حضرت کے صاحبزادگان اور اہل تعلق نے کتب خانہ کی عمارت کا منصوبہ بنالیا تھا اس کا نقشہ بھی انجینئر سے بنوالیا تھا، اس کے لئے سامان بھی ایک حد تک فراہم کرلئے تھے، اب

صرف اس کا انتظار رہ گیا تھا، کہ کسی بزرگ اور صاحب علم صاحب نسبت شخصیت سے اس کی پہلی اینٹ رکھوائی جائے، اس کے لئے سب کی نگاہ انتخاب عصر حاضر کے معروف صاحب علم، اور صاحب نسبت بزرگ اور شیخ حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہ العالی پر پڑ رہی تھی، حضرت اقدس باندوی مدظلہ محدث کبیر سے بہت گہرا عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے، اور حضرت محدث کبیر بھی ان کی بڑی قدر ومنزلت کرتے تھے، حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی نے ان سے تشریف آوری کی درخواست کی، جس کو انہوں نے از راہ کرم منظور فرمایا، اور ۲۴/ جمادی الاخری ۱۴۱۴ھ مطابق ۹/ دسمبر ۱۹۹۳ء بروز جمعرات تشریف لائے۔

حضرت باندوی مدظلہ دور حاضر میں اخلاص وللہیت اور مجاہدہ وجانفشانی کی ایک علامت ہیں، حق تعالیٰ نے انہیں ایسی محبوبیت ومقبولیت عطا فرمائی ہے، کہ فقر میں شاہی کا منظر نظر آتا ہے، بغیر کسی سابقہ اطلاع کے خلقت کا ایک انبوہ عظیم اکٹھا ہو گیا، ظہر کی نماز سے چند منٹ قبل اپنے دست مبارک سے کتب خانہ کی پہلی اینٹ رکھی، ان کے بعد اور بھی اکابر علماء کرام نے انٹیں رکھیں، پھر حضرت نے نہایت خشوع اور الحاح وزاری کے ساتھ جناب باری میں دعائیں فرمائیں حق تعالیٰ قبول فرمائے۔

بعد نماز ظہر حضرت محدث کبیر کے مدرسہ مرقاۃ العلوم کے درجۂ حفظ کے بچوں نے حضرت کے سامنے قرآن کریم کی آخری سورتیں پڑھ کر حفظ کی تکمیل کی، اس کے بعد حضرت کا نہایت مؤثر اور اصلاحی وعظ ہوا، یہ سلسلہ عصر کی نماز تک چلتا رہا، عصر کی اذان کے وقت حضرت نے وعظ ختم فرمایا، کافی لوگ جمع ہو گئے تھے، سارا مجمع ایمانی اور روحانی کیفیات سے سرشار تھا۔

الحمد للہ بنیاد رکھے جانے کے بعد سے مسلسل کام ہو رہا ہے، دیواریں مکمل ہو گئی ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ بقیہ کام بھی بسہولت اور بعجلت ہو جائے، تاکہ یہ کتب خانہ حضرات اہل علم کے لئے ایک مرکز تحقیق بن سکے۔

ماخذ: الماثر (جنوری، فروری، مارچ) ۱۹۹۴ء

☆☆☆☆☆☆

محدث کبیر کی سوانح حیات کی ضرورت

محدث کبیر حضرت مولانا اعظمی قدس سرہ کی وفات حسرت آیات کے بعد ہی سے اہل علم کے حلقوں سے حضرت کے سوانح حیات کے جمع کئے جانے اور انہیں شائع کئے جانے کا تقاضا شروع ہوگیا تھا، اور یہ فطری بات ہے، حضرت کے علمی ودینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے، اور حضرت کی زندگی اتنی سبق آموز ہے کہ اس کی روشنی میں آنے والی نسلیں نہ صرف یہ کہ راہ عمل اور منزل کا پتہ ڈھونڈھ لیں گی، بلکہ انہیں جدوجہد کے لئے حوصلہ مندی اور آرزو وجستجو کا ایک نہ تھمنے والا جوش وولولہ بھی ملے گا، استقامت وثبات قدمی کا سلیقہ حاصل ہوگا، لیلائے علم کی تلاش وجستجو میں کس طرح راتیں آنکھوں میں کاٹ لی جاتی ہیں، اور حوادث زمانہ سے بے نیاز کس طرح دن بسر کرلئے جاتے ہیں، اس کا شعور ملے گا، جو لوگ حضرت سے واقف نہ تھے، انہیں تو ان کے احوال وسوانح جاننے کا شوق تھا ہی، جو لوگ واقف ہیں وہ بھی بے تاب تھے، کیونکہ کسی عالم اور بزرگ کی زندگی کے تمام پہلو ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتے، سوانح مرتب کرنے والا زندگی کی تمام کیفیات وشئون کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے لئے وہ مختلف لوگوں کی معلومات سے مدد لیتا ہے، اور ایک ایسا مرقع تیار کردیتا ہے، جس میں زندگی کے بیش تر پہلوؤں کا دل آویز جلوہ نظر آنے لگتا ہے، یہ تقاضا روز بروز بڑھتا رہا، انتظار ہوتا رہا، پھر مولانا اسیر ادروی نے اس تقاضے کو محسوس کرکے جتنی جلد ممکن ہوسکتا تھا، اور کم وقت میں جس قدر بہتر ہوسکتا تھا، حضرت کی علمی خدمات اور حضرت کی زندگی کا ایک خوبصورت مرقع ترجمان الاسلام کے ایک خاص نمبر کی صورت میں پیش کردیا، انہوں نے وقت کی بڑی ضرورت کو محسوس کیا، دلوں کے تقاضوں کو بھانپا، اہل علم سے رابطہ قائم کیا، ان سے فرمائش کرکے، تقاضے کرکے مضمون لکھوائے،

پھر ذوق سلیم کے ہاتھوں انہیں ترتیب دیا، اور ایک سجا سجایا گلدستہ پیش کر دیا۔

اس خاص نمبر نے حضرت کی حیات طیبہ کے سلسلہ میں معلومات کا ایک بیش قیمت خزانہ مہیا کر دیا، علم وفضل میں حضرت کے مقام بلند کو نمایاں کیا، اور جن چیزوں سے لوگ واقف نہ تھے، ان کے سلسلہ میں معلوماتی دستاویز پیش کی، یہ پہلی کوشش اس قدر برمحل اور کامیاب ہوئی کہ باوجود کاغذ اور طباعت کے معیاری نہ ہونے کے اس نے ارباب ذوق کی بارگاہ میں حسن قبول پایا، جیسے انہیں اس کا شدید انتظار رہا ہو، اور بلاشبہ انتظار تھا۔

اس کے بعد حضرت کے صاحبزادگان اور متعلقین ومنتسبین نے حضرت کی یادگار میں ''مجلّہ المآثر'' کا اجراء کیا، اس میں حضرت کی علمی تحقیقات کا تعارف حضرت کی نایاب تحریروں، قیمتی مقالات، اور حضرت کے بلند پایہ فتاویٰ کی اشاعت ہونے لگی، اس نے بھی ایک حد تک ضرورت کی تکمیل کی، اور جاننے والے بھی چونک چونک پڑے کہ حضرت کے مقام بلند سے اجمالاً تو واقفیت ضرور تھی، مگر اب جو تفصیلی معلومات حاصل ہو رہی ہے، تو ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے اس سے پہلے اس عظیم محدث ومحقق کو جانا ہی نہ تھا۔

تاہم یہ جو کچھ ہوا سہ ماہی مجلّات کے واسطے سے ہوا، جن میں متفرق معلومات، مختلف حضرات کے قلم سے شائع ہوئی ہے، ان سے چاہے جس قدر احوال وسوانح کا علم ہو، لیکن ایک مرتب ومفصل سوانح عمری کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے، جس میں پیدائش، بچپن، جوانی سے لے کر واقعۂ وصال تک ہر موضوع پر ممکن معلومات مہیا کر دی جائیں، پھر صاحب سوانح کا ذوق، ان کی خصوصیات، ان کے علمی وعملی کمالات، ان کے کارناموں اور ان کی کوششوں اور کاوشوں کا کسی قدر تفصیلی تعارف کرا دیا جائے، اور جن گوشوں تک مجلّات کے مضمون نگاروں کا قلم نہیں پہونچ سکا ہے، انہیں بھی سامنے لایا جائے۔

اس ضرورت کا احساس بار بار ہوتا رہا، مگر کسی بلند وبالا شخصیت جس کے علم وفضل کا سکہ تقریباً تین چوتھائی صدی تک رواں رہا ہو، لیکن اس کے باوصف اس نے اپنے آپ کو کہیں نمایاں کرنا پسند نہ کیا ہو، اس کے عرصۂ حیات کے بہت سے گوشے مخفی ہو گئے ہوں، اور آج انہیں کوئی بتانے والا نہ ہو، ایسی شخصیت کے حالات لکھنے کے لئے جس قدر علم وتحقیق، کدوکاوش،

مبصرانہ صلاحیت، اخذ وترک کی لیاقت کی ضرورت ہے، وہ بالکل ظاہر ہے، اور یہاں جس دیوانے کے نام یہ قرعۂ فال نکل رہا ہے، وہ ان سب چیزوں سے نہ صرف عاری ہے، بلکہ اس کی مخصوص مصروفیات کی وجہ سے آئندہ بھی اس میں اس طرح کی استعداد پیدا ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، مگر بزرگوں کے حکم کی تعمیل بجائے خود سعادت ہے، اسی سعادت کے حصول کے پیش نظر اس نے ہمت کر لی ہے کہ جیسا کچھ بن پڑے گا، لکھ کر پیش کرنے کی سعی کرے گا۔ چنانچہ کسی قدر اس کا سلسلہ شروع کیا جا چکا ہے، قارئین سے درخواست ہے کہ اس کے اتمام کے لئے بارگاہ حق میں دعا کریں، اور جن حضرات کے پاس حضرت سے متعلق کچھ معلومات ہوں، حضرت کے علمی مکاتیب ہوں، یا انہوں نے حضرت کے ساتھ کہیں کا سفر کیا ہو، وہ اپنی معلومات قلم بند کر کے ''مجلّہ المآثر'' کے پتے پر ارسال کریں، استفادہ کے بعد بحفاظت انہیں واپس کر دیا جائے گا۔

ماخذ: المآثر۔ مارچ، اپریل، مئی (۱۹۹۵ء)

☆☆☆☆☆☆

دارالعلوم دیوبند کا نمائندہ اجلاس بسلسلۂ نصاب تعلیم

محرم کے اوائل میں دارالعلوم دیوبند سے مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کو ایک دعوت نامہ موصول ہوا، اس میں اطلاع دی گئی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام ۲۱/۲۲/محرم ۱۴۱۵ھ مطابق یکم و۲/جولائی ۱۹۹۴ء کو ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہو رہا ہے، جس میں نصاب تعلیم، طرز تعلیم وتدریس، طریقۂ تربیت اور مدارس عربیہ کے مشکلات پر غور کیا جائے گا، دعوت نامہ کچھ مبہم سا تھا، یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ نصاب تعلیم کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے گا، اس میں کوئی بڑی تبدیلی لانے کا ارادہ ہے؟ یا جزوی طور پر کچھ ترمیم کرنی منظور ہے؟ اور اس کے لئے ذہن سازی کرنی ہے، یا صرف لوگوں کی رائے معلوم کرنی ہے۔

نصاب تعلیم میں بالخصوص درس نظامی کے سلسلہ میں جب کسی حلقے سے ’’غور وفکر‘‘ کی آواز آتی ہے، تو خوامخواہ وہم ہوتا ہے کہ یہ غریب نسخ وترمیم کے لئے تختۂ مشق بنایا جائے گا، واقعہ یہ ہے کہ اصلاح نصاب کا یہ آوازہ بہت عرصہ سے رہ رہ کر گونجتا رہتا ہے، اور دارالعلوم اور اس کے ہم مشرب مدارس، تجویزوں، تقریروں، اور تحریر وانشاء کی چاندماری کا نشانہ بنتے رہتے ہیں، مگر یہ مدارس اتنے سخت جان واقع ہوئے ہیں کہ ان تمام یلغاروں کے باوجود اب تک اپنی قدیم بنیادوں پر کھڑے ہیں، جزوی ترمیم واصلاح تو بعض اوقات ہوتی رہی ہے، مگر نصاب کا مجموعی ڈھانچہ وہی ہے، جو ابتداء میں بنا دیا گیا تھا، مدعیان اصلاح کو ان جزوی اصلاحات سے تسکین نہیں ہے، اس لئے وہ بار بار ہانک لگاتے رہتے ہیں کہ نصاب تعلیم عقیم ہے، از کار رفتہ ہے، آثار قدیمہ میں داخل ہے وغیرہ۔

دعوت نامہ سے معلوم ہوا کہ ابھی تو نمائندہ اجتماع کیا جا رہا ہے، جو محدود پیمانہ پر ہے،

اس میں ملک کے صرف کلیدی مدارس شرکت کریں گے، اس کے بعد اکتوبر میں ایک بڑی کانفرنس اس موضوع پر ہوگی، خیال ہوا کہ شاید ارباب دارالعلوم بھی عرصہ سے اٹھنے والے شور وغوغا سے متأثر ہوگئے ہیں، اور اب وہ بھی اسی منزل کی طرف چلنے کی تیاریاں کررہے ہیں، جدھر مدعیان اصلاح لے جانا چاہتے ہیں۔

دارالعلوم کا چراغ جن مقاصد کے لئے روشن کیا گیا تھا، اور پھر اس سے روشنی حاصل کرکے ملک کے طول وعرض میں مدارس ومکاتب کی جو بہت سی چھوٹی بڑی شمعیں جلی تھیں، اور اب تک ان کا سلسلہ قائم ہے، جن لوگوں کی نظر ان کے اساسی مقصد پر ہے، اور وہ زمانہ کے شور وغل کی حقیقت سے بھی واقف ہیں، اور تاریخی تجربات سے فائدہ اٹھانے کا ملکہ بھی رکھتے ہیں، ان کے سامنے دو اور دو چار کی طرح یہ بات یقینی ہے کہ جس دن دارالعلوم دیوبند کا مجموعی نصاب بدلا گیا، اسی دن وہ مقاصد فنا ہوجائیں گے، جن کو دارالعلوم دیوبند کی بنیادوں کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے، وہ موضوع جس پر ان مدارس عربیہ کا مدار ہے، اپنی موت آپ مرجائے گا، وہ دل، وہ دماغ، وہ شخصیتیں بدل جائیں گی، جن کی تربیت دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم مسلک مدارس کی آغوش میں ہوا کرتی تھی، نصاب بدلا گیا تو گویا دارالعلوم کا خاتمہ ہوا، یقین تو نہ تھا کہ ایسا ہوگا، مگر احتمال اور اندیشہ تو تھا ہی!

حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی نے راقم الحروف اور مولانا عبدالرب اعظمی ناظم جامعہ عربیہ انوارالعلوم جہانا گنج اعظم گڈھ کو حکم دیا کہ ان کی رفاقت میں دیوبند چلیں، دیوبند پہونچ کر بعض ذمہ داروں سے گفتگو کی گئی، تو بحمد للہ یہ اندیشہ غلط نکلا، نمائندہ اجتماع میں پچاس سے زائد مدارس کے نمائندے تشریف لائے، چار نشستیں ہوئیں، پہلی نشست میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے خطبۂ صدارت پڑھا، خطبۂ صدارت جامع اور متوازن تھا، اس سے وہ تمام اندیشے باطل ہوگئے، جو مبہم دعوت نامے سے پیدا ہوئے تھے، خطبۂ صدارت کے بعد حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور مولانا سعید احمد پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی تقریریں ہوئیں، مولانا پالنپوری نے اس اجتماع کی ضرورت اور اس کے پس منظر پر مفصل روشنی ڈالی، انہوں نے اپنی تقریر میں ان کانفرنسوں اور سیمیناروں کا

تذکرہ کیا، جومختلف حلقوں سے اصلاح نصاب کے سلسلہ میں ہوتے رہتے ہیں، مولانا پالن پوری خود براہ راست دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایسے اجتماعات میں شریک ہوتے رہتے ہیں، انہیں اصحاب فکر ونظر سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کے مواقع بھی ملتے رہتے ہیں، اور ماشاءاللہ بہت گہرائی اور توازن کے ساتھ اشخاص وافراد اور نظریات کا جائزہ لیتے ہیں، اس لئے ان کی تقریر بہت بصیرت افروز ہوئی۔ اصلاح نصاب کے متعلق مختلف امور کا تذکرہ کرتے ہوئے، مدارس عربیہ کے تعلیمی انحطاط کا بھی بہت عمدگی سے جائزہ لیا، جس سے شرکاء اجتماع بہت محظوظ ہوئے، وہ تقریر اس قابل ہے کہ اسے شائع کردیا جائے، ان شاءاللہ اہل مدارس کے لئے بھی اور مدعیان اصلاح کے لئے بھی رہنما ثابت ہوگی۔

دوسرے اجلاس میں نصاب تعلیم کے متعلق بحث ہوئی، تمام شرکاء اجلاس اس بات پر متفق تھے کہ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی جائے گی، بعض جزوی اصلاحات کا ذکر آیا، جن کو اکتوبر میں ہونے والی کانفرنس پر موقوف رکھا گیا۔

تیسرے اجلاس میں طریقۂ تدریس اور طریقۂ تربیت پر شرکاء اجلاس نے اظہار خیال کیا، اس میں مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند اور مولانا عبدالحق اعظمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے خطاب کیا، مولانا مدنی نے مدارس پر مسلط ہونے والے بیرونی خطرات اور اسلام دشمن عناصر کی دسیسہ کاریوں کی نشاندہی کی۔

چوتھے اجلاس میں تجویزیں پڑھی گئیں، اور حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی مدظلہ کی دعا پر اس اجتماع کا خاتمہ ہوا۔

ماخذ: الماثر۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر (۱۹۹۴ء)

☆☆☆☆☆☆

حکومت کی پالیسیاں اور مسلمانوں کا لائحہ عمل

دسہرہ کے موقع پر شہر مئو میں فساد پھوٹ پڑا، پھر کرفیو لگ گیا، لوگ اپنے اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ کرفیو بے ضرورت تھا، ظلماً پر امن شہریوں پر مسلط کیا گیا، پھر پولیس اور پی، اے، سی کو زیادتیاں کرنے کا موقع ملا، یہ بھی لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ حکومت کی پالیسی یہی ہے کہ لوگ مطمئن ہو کر زندگی بسر نہ کریں، ہر وقت ایک نہ ایک اضطراب کا شوشہ نکلتا رہے، اور عام لوگ اسی میں الجھے رہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اس وقت ہمارے صوبہ میں اور مرکز میں برسر اقتدار ہیں، ان کی نیتیں بخیر نہیں ہیں، یہ بات آج سے نہیں، حکمراں پارٹی کی بنیاد کے دن سے سب کو معلوم ہے، یہ تنگ نظر لوگوں کی ایک جماعت ہے، جو اپنے علاوہ کسی مذہب وملت کو اس ملک میں برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے، جب سے یہ پارٹی حکمرانی کے محل میں داخل ہوئی ہے، اس کی بدنیتی کا اثر یہ ہے کہ اس وقت سے یہ ملک مسلسل زمینی اور آسمانی آفات ومصائب سے لگا تار دوچار ہوتا رہا ہے، کبھی زلزلہ، کبھی قحط سالی، کبھی تباہ کن سیلاب، اقتصادی کساد بازاری، کون سی بلا ایسی ہے، جو اس ملک پر اور ملک کے مختلف خطوں پر مسلط نہیں ہوئی ہے، قتل وخون، عصمت دری و آبروریزی، چوری ڈکیتی، اور خانہ جنگی کا تو کوئی شمار نہیں ہے، پورا ملک ایک غیر یقینی اور بے اطمینانی کی حالت میں مبتلاء ہے، اس حکومت میں سب سے زیادہ جو لوگ مصائب کا شکار ہیں، وہ مسلمان ہیں، اور لاریب کہ یہ پارٹی مسلمانوں کی دشمنی ہی کے بل بوتے پر پروان چڑھی ہے، یہ خم ٹھونک کر مسلمانوں کے مقابلہ میں کھڑی ہے، اس کا عزم یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہاں سے فنا کر دیا جائے، اس کا ہر منصوبہ مسلمانوں کے مفاد کو ضرب لگاتا ہے، اور اس کا ہر قدم مسلمانوں کی

خوش حالی کو روندتا ہے۔

یہ تو وہ صورت حال ہے، جو اس ملک کا ہر سمجھ رکھنے والا آدمی جانتا ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم! لیکن مسلمانوں کے لئے دیکھنے کی اتنی ہی بات نہیں ہے کہ فلاں پارٹی کی پالیسی ایسی ہے، حکمراں طبقہ بدنیت ہے، واقعہ یہ ہے کہ کفر نے، خواہ کوئی کفر ہو، اسلام کو برداشت نہیں کیا ہے، کفر اسلام کے ساتھ براہ راست ٹکراتا ہے، کسی بھی کافر حکمراں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اہل اسلام کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، ایک خواب پریشاں ہے۔

مسلمانوں کو جو کہ زمین کے صحیح طور پر وارث ہیں، جب ایسی صورت حال کا سامنا ہو، جیسی آج کل مسلط ہے، تو انہیں باہر سے زیادہ اپنے اندر غور کرنا چاہئے، باہر جو کچھ ہوتا ہے، وہ عموماً اندر کے احوال کا ظہور ہوتا ہے، ایک آدمی راہ چلتے ہوئے، کسی معمولی سی ٹکر سے بے تحاشا گر جاتا ہے، تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جسمانی اعتبار سے بہت کمزور ہوں، ورنہ اتنی معمولی ٹھوکر آدمی کو گرانے کے لئے کافی نہیں ہے۔

موجودہ صورت حال میں حکومت کو کوسنا، اس کے ظلم و ناانصافی کی فریاد کرنا، اس کے خلاف بولتے اور لکھتے رہنا، کافی نہیں، کافی تو کیا ہو، ایسا خیال میں آتا ہے کہ مضر ہے، کیونکہ ایسا کر کے مسلمان مطمئن ہو کر بیٹھ رہتا ہے کہ ہم نے حکومت کو برا بھلا کہہ کر دل کو ٹھنڈا کر لیا ہے، آگے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے اندرون کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے، اور پھر دل میں اتنا حوصلہ اور اتنی ہمت بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنے نفس پر دباؤ ڈال کر اپنی خواہشوں کو قربان کر کے، وہ کام اختیار کریں، جس کا حکم ہمارا مالک حقیقی دیتا ہے، اگر ہم نے اپنے نفس کا بگاڑ نہیں تلاش کیا، اور اس سے بے خبر رہے تو بھی ہلاکت ہے، اور اگر تلاش کرنے کے بعد اس کی اصلاح کی ہمت نہیں کی تو بھی بربادی ہے۔

اس جذبہ سے جب ہم خود کو کریدتے ہیں تو الامان والحفیظ! کیا عوام کیا خواص؟ ایک عجیب بدحالی دکھائی دیتی ہے، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، جہاں خواہش نفس کی حکمرانی نہیں ہے، ہماری خواہشیں، ہمارے اغراض، ہمارا مفاد ہر جگہ آگے رہتا ہے، حکم شریعت پامال ہو جائے

ہم نے اسلام کا کلمہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا عہد باندھا ہے، اور جب زندگی کے مسائل و معاملات میں قدم رکھتے ہیں، تو ہر ہر قدم پر یہ دعویٰ ٹوٹتا دکھائی دیتا ہے، پھر ظاہر ہے کہ عہد شکنی نہ اللہ کو پسند ہے، نہ بندوں کو! اگر اس کی سزا اسی دنیا میں ملے تو کیا عجب ہے، کفار کا معاملہ الگ ہے وہ تو ابتدا سے باغی ہیں، ان کی گرفت کے لئے آخرت متعین ہے، جہنم انہیں کے لئے بنائی گئی ہے مسلمانوں کے لئے جہنم نہیں ہے، اسی لئے انہیں تابڑ توڑ تازیانے یہیں لگتے ہیں، تاکہ آنکھیں کھلیں، اور صحیح راہ اختیار کریں۔

لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ حکومت کے مظالم کی شکایت بہت کرتے ہیں، لیکن ہم میں سے جب کسی کو ذرا بھی طاقت حاصل ہوتی ہے، تو ظلم کرنے میں ذرا بھی کسر نہیں چھوڑتا، ابھی پچھلے دنوں اعظم گڈھ کے ایک گاؤں میں ایک معمولی بات پر کچھ لوگوں نے ایسا بھیانک ظلم ڈھایا کہ سن کر روح ایمان کانپ کانپ جائے۔ جمعہ کا دن تھا، لوگ جمعہ پڑھ کر مسجد سے باہر نکل رہے تھے، گاؤں کے کچھ افراد مسلح ہوکر دروازے پر کھڑے ہوگئے، اور چار آدمیوں کو رائفل کی گولیوں سے چھلنی کر دیا، دو آدمی مسجد کے اندر گرے، اور دو آدمی مسجد کے باہر، مارنے والا بھی مسلمان، اور مرنے والے بھی کلمہ گو، بس ایک آن اور شان کا مسئلہ تھا، اور کچھ نہیں، ہمارا پورا ماحول اور پورا معاشرہ اس بات کی کھلی گواہی دیتا ہے کہ جس کو کچھ زور حاصل ہوا، وہ کمزوروں کو گرانے اور دبانے کی کوشش کرتا ہے، آج ہم اپنے معاملات کو شریعت کی روشنی میں دیکھتے ہیں، تو ایسا لگتا ہے کہ جاہلیت زندہ ہوکر اسلام کا گلا گھونٹ رہی ہے، شریعت کے احکام کو توڑ کر اللہ کو راضی کرنا ممکن نہیں، اور اللہ ناراض ہوں تو احوال کا درست ہونا خواب وخیال ہے۔

ہمارا دین اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس نعمت کی قدردانی یہ ہے کہ اس پر کما حقہ عمل ہو دل میں اس کی محبت وعظمت ہو، نعمت اسلام کے آثار وثمرات ساری دنیا جانتی ہے کہ اس سے کتنے بہتر احوال پیدا ہوتے ہیں، یہ بہتر احوال ہم سے چھن گئے، کیوں چھن گئے؟ اس لئے کہ ہم نے اپنے آپ کو بدل لیا، دین اسلام کی روشن شاہراہ سے ہٹ کر جاہلیت اور معصیت کی ٹیڑھی ٹیڑھی راہوں پر بھٹکنے لگے، پھر اسلام کے آثار وثمرات ہم سے چھن گئے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **اِنَّ اللّٰہَ لَایُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ**، اللہ تعالیٰ کسی قوم کے اچھے حالات

کواس وقت تک نہیں بدلتے، جب تک وہ اپنے احوال واعمال کونہیں بدل لیتے، ہم نے جب اپنی دینی حالت بدلی تو ہمارے دنیاوی حالات من جانب اللہ بدل دیئے گئے۔

پھرایک مصیبت اور بھی ہے، وہ یہ کہ ہم میں بہتوں کو یہ احساس ہے کہ ہمارے اندر دین کے راستے سے انحراف ہے، لیکن یہ انحراف خود ہم کو اپنی ذات اور نجی زندگی کے اندر نظر نہیں آتا ہے، ہم اپنی ذات کے باہر دوسروں کی ذات میں ڈھونڈھتے ہیں، اپنے کو اصلاح سے بے نیاز سمجھ کر دوسروں کی اصلاح کی فکر کرتے ہیں، اور غالباً اپنی اصلاح کا حوصلہ نہیں ہوتا، دوسروں کو نصیحت کرنے والے اپنی رسوائی کا سامان لئے پھرتے ہیں۔

کاش ہم اپنے اندر اتنی ہمت اور اتنا حوصلہ پیدا کرتے کہ مفاد دنیوی اور اغراض نفسانی سے بے نیاز ہوکر اور خواہشات سے بلند ہوکر اپنے آپ کو شریعت کے حوالہ کردیتے، شریعت جیسا تصرف ہم میں کرتی، اسے بخوشی ہم قبول کرتے، اور کاش ہم کو ایسے لوگ ملتے، جو قلوب کے طبیب اور نفوس کے معالج ہوتے، اور ہم اپنے آپ کو ان کے سپرد کردیتے کہ وہ شریعت کی روشنی میں ہمارا علاج اور ہماری اصلاح کریں۔

ہماری خوشحالی کی یہی صورت متعین ہے، اس کے باہر ہم جو کچھ ڈھونڈھتے ہیں، وہ ایک چمکتی ہوئی ریت ہے، جس پر پانی ہونے کا دھوکہ ہورہا ہے، فسادیوں کو پکڑنے سے زیادہ ضروری اپنے دل کے فساد کو پکڑنے کا عمل ہے، اسے پکڑیں، اور دل سے نکال باہر کریں، اللہ تعالیٰ توفیق دیں۔

ماخذ: المآثر۔ نومبر، دسمبر، جنوری (۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆☆

سیمیناروں کے سوال نامے؟

کہا جاتا ہے کہ ہمارے دور میں سائنس کی ترقیات، کاروبار کے پھیلاؤ، صنعت کے عروج، اورذرائع آمدورفت کی سہولیات نے بہت سے پیچیدہ اور سنگین مسائل پیدا کردیئے ہیں، جوعلماءاسلام کے سامنے چیلنج بن کرابھرے ہیں، اس لئے علماءامت کی ذمہ داری ہے کہ سرجوڑکر اجتماعی طور پران مسائل کوحل کرنے کی فکرکریں، ورنہ ترقی کی اس تیز رفتار دوڑ میں مسلمان بہت پیچھے رہ جائیں گے، اوراسلام ایک ناکارہ اوراز کاررفتہ مذہب بن کررہ جائے گا۔

یہ آواز اتنے دنوں سے، اتنے حلقوں سے، اوراتنی شدت سے مسلسل آرہی ہے کہ ساری کائنات اس کی گونج سے بھرگئی ہے، چنانچہ ان پیچیدہ مسائل کوحل کرنے کے لئے تقریباً ان تمام ممالک میں جہاں مسلمان رہتے بستے ہیں، اجتماعی طور پر بیٹھنے اورغوروفکراور بحث وفیصلہ کی کاوش ہورہی ہے۔

ہمارے ملک میں بھی ان جدید پیچیدہ مسائل کا نام لے کرفقہی سیمیناروں کا انعقاد ہورہا ہے، اورمسائل کے تصفیہ کی کوشش ہورہی ہے، طریقۂ کار یہ ہے کہ علماء کے پاس پہلے کسی خاص موضوع سے متعلق سوال نامے بھیجے جاتے ہیں، ان سے جواب حاصل کئے جاتے ہیں، پھران علماءکوایک جگہ جمع کیا جاتا ہے، کچھ بحث وتحقیق ہوتی ہے، کچھ مسائل کا فیصلہ وہیں کردیا جاتا ہے، کچھ مسائل کے لئے کمیٹیاں بنادی جاتی ہیں، وہ غوروتعمق کے بعد ایک تجویز پیش کرتی ہیں، اور اسے فیصلہ کی شکل دیدی جاتی ہے۔

لیکن اب تک جتنے سیمینار ہوچکے ہیں، انہیں سامنے رکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ طریقۂ کار خود اسلام اورمسلمانوں کے لئے دورحاضر کا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، ہوتا یہ ہے کہ دور

حاضر کے خدا بیزار، مذہب سے نفور، دولت دنیا کے حریص، اور خود غرضی اور بے حیائی سے معمور ذہنیت نے دنیاوی ترقی کی جو بے شمار راہیں کھولی ہیں، ان میں بہت سی راہیں کہیں براہ راست، اور کہیں بالواسطہ شریعت محمدیہ (جو سراسر آخرت کو مقصود بنانے پر مبنی ہے) سے ٹکراتی ہیں، تو ان سیمیناروں کو یہ ہمت تو ہوتی نہیں کہ ان باطل اور غلط طریقوں کو مٹانے کی جدوجہد کریں، اور انہیں اپنا موضوع بنائیں، یہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت، مجبوری، صنعتی ترقیات اور حاجات کی دہائی دے کر مسائل شرعیہ میں کتر بیونت کردیں۔

خودتو بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

ان سیمیناروں کے لئے جو سوال نامے مرتب کئے جاتے ہیں، انہیں دیکھنے سے ایسا تأثر ہوتا ہے کہ آج کی دنیا میں اسلامی فقہ اور اسلامی تعلیمات ناقابل عمل ہیں، زمانہ کی ترقیات نے حالات ومعاملات میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں، اور زندگی میں ایسی الجھنیں ڈال دی ہیں، کہ ان پیچیدگیوں کو دور کرنا اور ان الجھنوں کو سلجھانا، اس وقت تک ممکن ہی نہیں، جب تک اسلامی فقہ کے مسائل میں حالات حاضرہ کے مطابق ترمیم وتنسیخ نہ کرلی جائے، وہ تو اللہ بھلا کرے، پرانے طرز کے مدارس میں پڑھے ہوئے، پرانے خیال کے علماء کا، کہ وہ اس جذبہ اور اس تحریک پر ناتمام سی سہی، مگر روک لگانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اس جذبۂ ترمیم کو پوری طرح نمایاں ہونے کا موقع نہیں مل پاتا، ورنہ نوخیز علماء جو اپنے ناتمام مطالعہ کے نتیجہ میں اپنی ’’ناقص رائے‘‘ کے اظہار میں اچھی خاصی جرأت دکھا لیتے ہیں، وہ اب تک اپنی ’’ناقص رائے‘‘ کی بدولت مسائل شرعیہ کی تمام چولیں ڈھیلی کر چکے ہوتے، لیکن یہ روک کب تک؟ جب سیمینار کے یہ سوالات مسلسل ’’راہ اجتہاد‘‘ ہموار کرتے چلے جارہے ہیں، تو کیا عجب پرانے خیال کے علماء یا تو خود کو اس سے الگ کرلیں، یا وہ بھی اسی رنگ میں رنگ جائیں، اس کے بعد احداث اور نوخیز علماء کے لئے ہر ’ناقص رائے‘ کو درجۂ کمال تک پہونچانے کا موقع بآسانی ہاتھ آجائے۔

اعظم گڈھ کے سیمینار میں اس کا ایک منظر دیکھنے میں آیا تھا، زکوٰۃ کے مصارف میں ’’فی سبیل اللہ‘‘ کا موضوع زیر بحث تھا، پرانے خیال کے علماء اسی رائے پر متفق تھے، جس کا فیصلہ فقہاءِ متقدمین نے کیا ہے، یعنی ’’غازی فی سبیل اللہ‘‘ لیکن ایک صاحب بغداد سے تشریف لائے

تھے، انہوں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک زبان کی پوری طاقت اس کو لغو اور مہمل قرار دینے میں صرف کر دی، غیر مقلدین اور جماعت اسلامی کے مولویوں کے چہروں پر خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں، لیکن دوسرے علماء بڑی گرانی سے اس سمع خراشی کو برداشت کر رہے تھے، اسی طرح ہر سیمینار میں ایک دو صاحب تشریف لاتے ہیں، اور اپنی آزادانہ رائے سے فقہ اسلامی کی پابندرایوں کو ڈھیلا کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

سیمینار کے سوال ناموں سے دوسرا تأثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذاہب فقہ میں حنفی مسلک ایک مشکل ترین فقہ ہے، جس کا نفاذ آج کے پیچیدہ دور کے بہت سے سنگین مسائل میں مشکل ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس کے بہت سے مسائل سے دستبردار ہو جایا جائے، اس عمل کے واسطے 'تلفیق' اور 'مذہب غیر' پر عمل کرنے کے مباحث اٹھائے گئے، اور راستہ ہموار کیا گیا کہ جو مسائل مشکل نظر آئیں، انہیں تلفیق کے ذریعہ یا مذہب غیر کے مطابق فتویٰ دے کر آسان کر لیا جائے۔

غالباً اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ سوال نامے اتنے جذباتی اور ڈراؤنے انداز میں مرتب کئے جاتے ہیں کہ ان کو پڑھتے ہی مفتی کی ذہنیت، فرار کے لئے اغلب یہ ہے کہ آمادہ ہو جاتی ہے، پھر وہ دلائل کی قوت اور ان کے ضعف سے قطع نظر سوال نامہ میں بیان کردہ مجبوری کا حوالہ دے کر فقہ حنفی سے گریز کی راہ سوچنے لگتا ہے، حالانکہ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اتنی مجبوری نہیں ہوتی، کہ اس کی وجہ سے فقہ حنفی کو چھوڑنے کی ضرورت پیش آ جائے، ان سیمیناروں کی برکت سے اندیشہ ہے کہ مفتیان کرام کا ذہن خصوصیت سے فقہ حنفی کے خلاف نہ بنتا چلا جائے، اور اس کے نتیجے میں فقہاء متقدمین پر اعتماد کم ہو جائے۔ نہ غیر مقلدیت! بلکہ ایک طرح کی ذہنی اباحیت ہے، جو بالآخر شریعت ہی کو مشکوک بنا کر رکھ دے گی۔

اس سلسلہ میں بطور مثال کے حج سے متعلق بعض مسائل قابل توجہ ہیں، جو سیمینار کے سوال نامے میں شدومد کے ساتھ اٹھایا گیا ہے، اور مفتیان کرام نے بے تکلف فقہ حنفی سے فرار کا مشورہ دیا ہے، سوال نامہ میں کہا گیا ہے کہ:

''حج واحرام کے بعض مسائل ایسے ہیں، جن میں فقہ حنفی کے مطابق عمل کرنا موجودہ

زمانہ میں بعض اعذار اور ضرورتوں کی وجہ سے دشوار ہوگیا ہے، ان مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک میقات سے باہر رہنے والوں کے لئے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے لئے حج یا عمرہ کا احرام باندھنا ضروری ہے، خواہ وہ کسی نیت سے داخل ہو رہا ہو، آج کل اس مسئلہ پر عمل کرنا نہایت دشوار ہے، کیونکہ بکثرت تجارتی تعلقات، آمدورفت کی سہولیات کی وجہ سے بار بار مکہ مکرمہ میں باہر والوں کو بھی اور خود مکہ والوں کو بھی میقات کے اندر باہر آنا جانا پڑتا ہے، بالخصوص تجارتی سامان لے جانے والے ملازمین اور ٹیکسی ڈرائیوروں کو اس صورت میں ہر مرتبہ میقات سے احرام باندھ کر آنا اور ارکان عمرہ کی ادائیگی بہت مشکل ہے، تو کیا ایسی صورت میں مسلک حنفی سے عدول کر کے مسلک شافعی پر عمل کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ یہ سوال کا خلاصہ ہے

اب ناظرین غور فرمائیں، ایسے مشکل مسئلہ کا جواب بجز اس کے اور کیا ذہن میں آسکتا ہے کہ جی ہاں حنفیہ کے ایسے سخت مسئلہ کو دور رکھئے، اور بجان ودل شافعیہ کے مسلک پر عمل کیجئے، اور ایسا فیصلہ صادر بھی فرما دیا گیا ہے، اور اسے عوام میں مشتہر کر دیا گیا، اب فقہ حنفی کے بارے میں عوام وخواص کا ذہن یہی تو بنے گا کہ فقہ حنفی جب یہاں قابل عمل نہیں ہے تو اور بھی مسائل میں قابل عمل نہ ہوگا۔

اس میں نہ مفتی کو دلائل پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ فرصت ہے، اس کے لئے یہ آسان ہے کہ "**الدین یسر**" کہہ کر حنفیت کی جڑ کاٹ دے، حالانکہ غور کرنے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔

حرم محترم دنیا کی عام جگہوں کی طرح کوئی جگہ نہیں ہے، وہاں ایک خاص تقدس اور احترام ہے، وہاں شکار نہیں کر سکتے، خودرو پودوں اور گھاسوں کو نہیں کاٹ سکتے، اسی طرح اس کے تقدس اور احترام کا تقاضا ہے کہ جب کوئی شخص اس میں داخل ہونے کا ارادہ کرے تو ادب و احترام اور وہاں کے مقصد خاص کی رعایت کر کے داخل ہو، احادیث کی روشنی میں فقہ حنفی نے یہ بات واجب قرار دی ہے کہ جانے والا احرام باندھ کر جائے، اور وہاں کی اصل عبادت حج یا عمرہ کر کے پھر کسی اور کام میں لگے، وہ کوئی تجارت گاہ یا صنعت گاہ نہیں ہے، کہ آدمی جیسے چاہے چلا جائے۔

اب سنئے کہ سعودی حکومت حج کے لئے محیر العقول انتظامات کرتی ہے، اگر وہ چاہے تو احناف کے لئے نہایت آسانی سے حرم میں داخل ہونے کے اس پیچیدہ اور ہولناک عذر کو حل کرسکتی ہے، اور دوسرے لوگ بھی اس کار خیر سے مستفید ہوسکتے ہیں، آخر وہاں غیر مسلموں کے داخل ہونے پر پابندی ہے، تو ان کے لئے عجیب وغریب انتظامات کئے گئے ہیں، یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ حرم کی توسیع وتعمیر اور وہاں کے بڑے بڑے تعمیری وصنعتی منصوبوں کے چیف انجینئر بلکہ بہت سے ذیلی انجینئر غیر مسلم ہیں، انہیں حرم سے باہر رکھا جاتا ہے، اور جدید آلات کے ذریعہ جن کے بڑے بڑے مراکز نصب ہیں، ان سے مشورے اور رہنمائیاں حاصل کی جاتی ہیں، اسی طرح کیا یہ انتظام نہیں ہوسکتا کہ حدود حرم کے باہر ایسے تجارتی چک پوسٹ اور ناکے بنادیئے جائیں، جہاں وہ اہل تجارت ڈرائیور اور ملازمین وغیرہ جو احرام اور حج وعمرہ کی پابندی نہیں برداشت کرنا چاہتے، رک جایا کریں، اور حرم کے اندر رہنے والے ڈرائیور، ملازمین اور تجار یہاں سے اپنی ذمہ داری سنبھال لیں، حکومت کے لئے یہ انتظام کچھ مشکل نہیں، بجائے مسئلہ میں تبدیلی کرنے کے یہ صورت سعودی حکومت کے سامنے اجتماعی طور پر ان سیمیناروں کے فیصلہ کی صورت میں رکھیں، یہ حکومت تو مشوروں کی طالب رہتی ہیں۔

اسی طرح یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ مکی شخص حج کے مہینوں میں میقات سے باہر جائے، اور اس سال حج کا ارادہ رکھتا ہو، تو وہ کیا کرے؟ اگر میقات سے بلا احرام کے واپس چلا آتا ہے تو یہ جرم۔ عمرہ کا احرام باندھ کر آتا ہے تو یہ غلط، کیونکہ وہ حج کا ارادہ رکھتا ہے، اب عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کرے گا، پھر حج کا احرام باندھ کر حج کرے گا، تو تمتع لازم آئے گا، وہ مکی کے لئے جائز نہیں ہے، اور اگر صرف حج کا احرام باندھ کر آئے، تو حج کے وقت تک اسے احرام میں مقید رہنا پڑے گا، یہ بہت دشوار! اور اگر وہ یہ طے کرلے کہ حج کے مہینوں میں وہ میقات کے باہر نہ جائے گا تو اس کی تجارت کے لئے سخت نقصان دہ! اب وہ کرے تو کیا کرے؟ مفتیان کرام بتائیں کہ اگر فقہ حنفی میں اس کا حل نہیں ہے، تو مسلک شافعی پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی کہ بلا احرام میقات سے واپس آجائے، اور حج وعمرہ کا ارادہ نہ کرے۔

اب کون ایسا سرپھرا مفتی ہوگا، جو اتنی ہولناک مجبوریوں کے بعد بھی فقہ شافعی پر عمل کا

مشورہ نہ دے گا، اور فقہ حنفی کو کالائے بد بریش خاوند کا مقولہ نہ سنائے گا۔

حالانکہ مسئلہ کچھ مشکل نہیں ہے، اگر اس کا حج، حج فرض ہے، تو یہ زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہوتا ہے، اس سال میقات سے باہر نہ نکلے، تجارت کا قدرے نقصان برداشت کرلے، یا کسی اور آدمی سے کام کرالے، خود باہر نہ جائے، اور اگر حج نفل ہے، تو اس کے لئے زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے، عمرہ کا احرام باندھ کر آئے، اور عمرہ کرکے فارغ ہوجائے، حج نہ کرے بلکہ تجارت کرتا رہے، نفلی حج کے لئے حنفی مسلک کو چھوڑ دینے کی کیا ضرورت ہے، اور اگر اسے نفلی حج کا ایسا ہی شوق ہے، تو دنیا کی قربانی دینا اس کے لئے کیا مشکل ہے؟۔

ایک سوال اور ملاحظہ ہو، یہ سوال حج تمتع اور حج قران والوں کے لئے رمی، ذبح، اور حلق کے درمیان ترتیب کے وجوب سے متعلق ہے، سوال میں کہا گیا ہے کہ:

’’احناف کے مفتیٰ بہ قول میں ترتیب کو واجب کہا گیا ہے، دور حاضر میں اس ترتیب کی رعایت میں دشواری یہ ہے کہ حجاج کے بے پناہ ازدحام، موسم کی شدت، قیام گاہ اور مذبح میں کافی دوری ہونے، اور سواری نہیں ملنے کی وجہ سے حجاج خصوصاً ضعیف ومعذور حجاج کے لئے خود مذبح جاکر قربانی کرنا، انتہائی مشکل ہوگیا ہے، اس لئے حجاج عام طور پر قربانی کی رقم ان اداروں کے حوالہ کرکے فارغ ہوجاتے ہیں جو حجاج کی طرف سے نیابۃً قربانی کا نظم کرتے ہیں، قربانی کا نظم کرنے والے ان اداروں کے ذمہ داروں کے مسلک میں ترتیب واجب نہیں ہے، اس لئے یہ لوگ بسا اوقات ترتیب کا خیال نہیں کرتے، ان حالات میں اگر رمی، ذبح، حلق کے درمیان ترتیب قائم نہ رہ سکے تو...... مذکورہ حالات کے پیش نظر کیا اس مسئلہ میں فقہ حنفی کے قولِ مرجوح اور دوسرے ائمہ کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے؟‘‘۔

ظاہر ہے کہ اس انتہائی مشکل حال میں بھی کہا جائے گا، ہاں فقہ حنفی کے قول مرجوح کو اختیار کرلیا جائے، اور وہ کرلیا گیا، لیکن غور کرنے کا یہ پہلو چھوٹ گیا کہ:

(۱) ان غیر ذمہ دار اداروں کے علاوہ دوسرے ایسے ذمہ دار ادارے بھی ہیں، جن کے مسلک میں ترتیب واجب ہے، اور وہ ترتیب کی رعایت کرتے بھی ہیں، ان سے مدد لی جاسکتی ہے۔

(۲) ذبح کے لئے ایک ہی دن نہیں ہے، اللہ نے خود آسانی پیدا فرمادی ہے کہ اس کے لئے تین دن متعین کردیئے ہیں، ۱۰؍ذی الحجہ کو ضرور ازدحام ہوتا ہے، تو کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ضعفاء ۱۰؍ کو رمی کرلیں، اور قربانی نہ کریں، وہ ۱۱؍یا ۱۲؍کو قربانی کرلیں، ان دنوں میں ازدحام نہیں ہوتا، اگر قربان گاہ دور ہے، تو عموماً حجاج تنہا نہیں ہوتے، کئی لوگ ساتھ ہوتے ہیں، اپنے ساتھی سے مدد لے لیں۔

البتہ اس صورت میں احرام نہیں اتر سکے گا، جب تک قربانی سے فارغ نہ ہوجائیں، اور یہی چیز لوگوں پر بھاری پڑتی ہے، وہ جلد سے جلد احرام سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، کیونکہ بہت سے لوگوں کو نعوذ باللہ داڑھی منڈانے کی جلدی رہتی ہے، حالانکہ ایک دو روز احرام کی پابندی کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس سہل صورت کے ہوتے ہوئے، مشکلات اور دشواریوں کی دہائی دے کر حنفی مسلک کو ترک کرنے یا قول مرجوح کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ وجیہ نہیں ہے۔

اسی طرح ایک سوال میں یہ بھی مسئلہ نازک بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ طواف زیارت جو حج کا ایک فریضہ ہے، جب اس کے کرنے کا وقت آیا تو عورت کو حیض آگیا، اور پاک ہونے سے پہلے اس کی روانگی کی تاریخ آگئی، اور وہ قلت نفقہ یا ویزا نہ بڑھ سکنے کی مجبوری، جہاز کی تاریخ میں عدم تبدیلی کے سبب مکہ مکرمہ میں نہیں ٹھہر سکتی، تو کیا کرے؟ پھر کچھ اور دشواریوں کو ذکر کرکے طواف زیارت کے لئے طہارت کے وجوب کے متعلق پوچھا گیا ہے کہ کیا وہ ساقط ہوجائے گا؟ اور اگر اس وجوب کو نہ ساقط کیا گیا، تو واپسی کے بعد اپنے شوہر کے لئے کبھی حلال نہ ہوگی، جب تک دوبارہ وہ مکہ مکرمہ آکر طواف زیارت نہ کرلے، مکہ واپس آنا دور دراز ملک سے انتہائی مشکل ہے، پھر مزید یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ مسئلہ آج کل حجاج کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کے بعد کثیر الوقوع ہے، اس لئے اس کا شرعی حل واضح کرنا ضروری ہے۔

ناظرین عالی مقام غور کریں کہ اس نازک اور دشوار ترین اور قانونی مجبوری کی فضا میں مفتی اس کے علاوہ اور کیا سوچے کہ لاؤ حالت حیض میں طواف کی اجازت دے دو، اس کے نتیجہ میں ایک بڑا دم دینا ہوگا، وہ آسان ہے۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک تو حالت حیض میں طواف کرنا خود حرام، دوسرے اس حالت میں مسجد میں داخل ہونا حرام، ان دو حراموں کی اجازت صرف اس بنا پر کہ قانونی مجبوری ہے، یا قلت نفقہ کی مجبوری ہے، جب کہ فی الحقیقت یہ مجبوریاں زیادہ تر فرضی ہیں، کیسے درست ہوسکتی ہے؟۔

اول تو اس سلسلہ میں حکومت کو متوجہ کرنا چاہئے، جو فریضۂ حج کے سلسلہ میں ہر سہولت دینے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتی ہے، حکومت کی اس خصوصی توجہ کے بعد کسی مجبوری کا نام لینا بے کار ہے۔

دوسری مجبوری جہاز کی تاریخ نہ بڑھ سکنے کی ہے، تو یہ بھی کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے، عملاً ایسا بہت ہوتا رہتا ہے کہ لوگ جہاز کی تاریخوں میں تبدیلی کرواتے رہتے ہیں، یہ حیض کی مجبوری کا مسئلہ سیکڑوں میں کسی ایک کو پیش آتا ہے، اس کا حل کرلینا کچھ مشکل نہیں ہے، لیکن بات یہ ہے کہ لوگ کسی طرح کی مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، دنیاوی سامان کی خرید وفروخت ہو تو سب کچھ کرلیتے ہیں، اور دینی فرائض کے لئے سخت کاہل ہوجاتے ہیں، چاہتے ہیں کہ کچھ کرنا نہ پڑے، بلکہ ناجائز ہی جائز ہوجائے۔[۱]

قلت نفقہ کی بات بھی فرضی ہے، آج کل حج کے قوانین کے رو سے آدمی کبھی قلت نفقہ کا شکار نہیں ہوسکتا، الاّ یہ کہ کوئی آسمانی آفت آجائے، لیکن اول تو یہ صورت اقل قلیل ہے، دوسرے اس حالت میں مدد کرنے والے بہت اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر یہ مسئلہ باوجود حجاج کرام کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کے ایسا کثیر الوقوع نہیں ہے، کہ اس کے لئے اجتماعی طور سے ناجائز کو جائز کرنے کی ضرورت پیش آئے، ماشاء اللہ مکہ مکرمہ میں علماء کی کمی نہیں ہے، کسی کو ایسی ضرورت پیش آئے گی، تو اس کے وقتی حالات وضروریات اور سہولیات ومشکلات کو سامنے رکھ کر حضرات علماء کرام حل کردیں گے، یہ اجتماعی فیصلۂ جواز شریعت ہی کو مشتبہ بنادے گا۔

یہ چند مسائل بطور نمونہ کے پیش کئے گئے ہیں، ایسے مسائل ہر سوال نامے میں بہتات کے ساتھ ہوتے ہیں، ان مسائل کا حل آسانی سے نکالا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ ہم سے یہ نہیں

ہوسکتا، اس لئے لاؤ مسائل ہی کو حالات کے رنگ میں لے آؤ، یہ رجحان سیمیناروں کے، سامنے آرہاہے، یہ اباحیت کا راستہ ہے، اس پر چل کر آدمی کہاں پہونچے گا؟ شریعت کا کیا حلیہ بنے گا؟ اوراسلاف پر اعتماد کا کیا حال ہوگا؟ آج کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

سوال نامہ مرتب کرنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ سوال نامہ مرتب کرتے وقت ادنیٰ ادنیٰ حاجات کو ضرورت ومجبوری کی ہولناک صورت نہ بنادیا کریں، ورنہ اسلام سے جہاد وغیرہ کے مسائل کو نکالنا پڑے گا، کیونکہ ان میں اورزیادہ مجبوریاں اور مشقتیں ہیں، اورنوادر کو عام مسائل کے درجہ میں نہ رکھیں، بلکہ نادر مسائل کو سیمینار کا موضوع بحث ہی نہ بنائیں، جس کسی کو اس طرح کے نادر مسائل اتفاقاً پیش آجائیں، مثلاً حالت حیض میں کسی مجبوری سے طواف زیارت کا مسئلہ وغیرہ تو وہ کسی متدین عالم سے مسئلہ پوچھ کر عمل کرلے گا، عام ناجائز صورتوں کو کسی خاص مجبوری سے جائز قرار دے کر اسے عام نہ کریں، ورنہ خاص مجبوری تو پس پشت چلی جائے گی، اورناجائز چیز جائز بن جائے گی، جیسا کہ بیمہ کی تحلیل کے مسئلہ میں بکثرت مشاہدہ ہوا ہے۔ **وباللہ التوفیق**

ماخذ: المآثر۔ستمبر، اکتوبر، نومبر (۱۹۹۷ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) دینی مسائل میں لاپرواہی اورکاہلی کا یہ عالم ہے کہ اس سال حج سے ایک روز پہلے منیٰ میں زبردست آگ لگی، جس میں بڑی افراتفری ہوئی، یہ خاکسار بھی وہاں حاضر تھا، منیٰ میں جس خیمہ میں ہمارے قافلہ کا قیام تھا، اس میں کچھ گجراتی نوجوان مرد وعورت بھی تھے، آخری دن مجھ سے ایک گجراتی نے پوچھا کہ کیا ہم اپنی عورتوں کی طرف سے نیابۃً رمی کرسکتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کیا یہ وہاں نہیں پہونچ سکتیں، اس نے کہا پہونچ سکتی ہیں، میں نے کہا انہیں اپنی کنکری خود مارنی ہوگی، وہ یہ سن کر خیمہ کے باہر عورتوں سمیت نکل گیا، وہاں کچھ اورلوگ اس قافلہ میں شامل ہوگئے، تو وہی شخص پکار کر کہہ رہا تھا کہ جمرات پر بہت بھیڑ ہوتی ہے، عورتوں کو ایک طرف ٹھہرادیں گے، اوران کی طرف سے کنکری ماردیں گے، اس کو سن کر ایک دوسرا شخص اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے میرے پاس لایا، اوردوبارہ مسئلہ پوچھا، میں نے پھر وہی بتایا، جو بتاچکا تھا، تو پہلے شخص نے کہا کہ بہت مشکل ہے، دوسرے نے جواباً کہا کہ حج کرنا بھی تو بہت مشکل ہے، آخر کیوں عورتوں کو لائے ہو، ان کی طرف سے تم پورا حج کردیئے ہوتے، یہ ایک مثال نہیں ہے، اس طرح کے متعدد واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

بیمہ اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے؟

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ میں ۳/تا ۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ کو ’’مجمع الفقہ الاسلامی‘‘ کا پانچواں سیمنار منعقد ہوا، اور اس کے معاً بعد اخبارات میں ’’انقلابی فیصلہ‘‘ کے عنوان سے ممتاز سرخی کے ساتھ جان ومال کے بیمہ کے جواز کا قطعی فیصلہ شائع ہوا، بعد میں مجمع الفقہ الاسلامی کی طرف سے بھی کتابچہ وغیرہ کی صورت میں اس فیصلہ کی اشاعت کی گئی، اس فیصلہ کی اشاعت کے بعد جہاں بیمہ کمپنیوں کو اپنے کاروبار میں وسعت وہمہ گیری پیدا کرنے میں مدد ملی وہیں عام مسلمانوں بالخصوص دیندار طبقہ میں ایک بے چینی بھی پیدا ہوئی، اس فیصلہ سے پہلے عام طور سے مسلمانوں کا رجحان اس کے خلاف تھا، کیونکہ اس میں سود اور جوا دونوں موجود ہیں، جن سے مسلمانوں کو ایسی ہی گھن ہے، اور ہونی چاہئے، جیسی لحم خنزیر سے ہے، یا پاخانہ پیشاب سے، اس لئے بیمہ کمپنیاں اپنے کاروبار کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کے درمیان کامیاب نہیں ہو پاتی تھیں عموماً بیمہ ایجنٹوں کے پاس بریلی علماء کے کچھ فتوے ہوا کرتے تھے، جن سے عموماً مسلمان متاثر نہیں ہوتے تھے، لیکن اس فیصلہ کی اشاعت سے بیمہ ایجنٹوں کو اپنے کاروبار کے فروغ کے لئے ایک مؤثر سبب ہاتھ آ گیا ہے، لیکن بہرحال اندازہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس سے مطمئن نہیں ہے، اس سلسلہ میں انفرادی طور پر مسلسل استفسارات ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اس باب میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ اس فیصلہ کو چوتھے اور پانچویں دونوں فقہی سیمینار کے حوالہ سے شائع کیا گیا ہے، یہ خاکسار چوتھے سیمینار میں شریک نہ تھا، لیکن پانچویں سیمینار میں اول سے آخر تک شریک رہا، سیمینار کے جو جلسے دونوں وقت ہوتے رہے، ان میں یہ مسئلہ کسی وقت زیر بحث

نہیں آیا[۱] البتہ جب سیمینار کے تمام اجلاس ختم ہوگئے، اور صرف آخری اجلاس باقی رہ گیا تھا، اور اس وقت مختلف مسائل کے سلسلہ میں ذیلی کمیٹیاں اپنی تجاویز تیار کرنے میں مصروف تھیں، تا کہ انہیں آخری اجلاس میں سنا دیا جائے، اسی دوران ایک صاحب بیمہ کے جواز کی اس تجویز پر فرداً فرداً علماء کرام سے دستخط لے رہے تھے، بعض حضرات دستخط کررہے تھے، بعض انکار کررہے تھے، چنانچہ خاکسار نے بھی اس سے اختلاف کیا، اور دستخط کرنے سے معذرت کردی، جو صاحب دستخط کرارہے تھے، وہ بار بار لے کر آئے، اور بہت زور دیا کہ اس پر دستخط کرہی دیجئے، مگر میں نے اور میرے کچھ رفقاء نے اس کی تائید سے انکار کردیا، پھر جب آخری اجلاس ہوا، تو جہاں تک مجھے یاد ہے، اس میں پانچویں سیمینار کی تمام تجاویز تو پڑھ کر سنائی گئیں، اور بعض بعض پر بحثیں بھی ہوئیں، ترمیمیں بھی کی گئیں، مگر یہ تجویز اس میں بھی نہ آئی، گویا اس کا تعلق پانچویں فقہی سیمینار اور اس میں شریک ہونے والے تمام علماء سے نہیں ہے، لیکن جب اس کی اشاعت ہوئی تو اس سے ایسا محسوس ہوا کہ یہ مسئلہ چوتھے سیمینار میں زیر غور تھا، اور پانچویں سیمینار میں اس کا فیصلہ ہوا، گویا اس میں شریک ہونے والے تمام علماء کی رائیں اس سے متفق ہیں، لیکن یہ بات خلاف واقعہ ہے، کہ تمام شرکاء اس سے اتفاق رکھتے ہیں۔

(۲) مزید برآں یہ کہ چوتھے فقہی سیمینار میں اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے کسی قطعی فیصلہ تک پہونچنے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی، اور اس کمیٹی کے ممبران کے اسماء گرامی شائع کئے گئے ہیں، اور یہ ذکر کیا گیا ہے کہ پانچویں فقہی سیمینار میں ’’کمیٹی کے موجود ارکان اور مزید دیگر علماء پر مشتمل ایک کمیٹی نے صورت حال پر غور کیا‘‘ اس میں ’’موجود ارکان‘‘ ایک مبہم لفظ ہے، جس سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ کمیٹی کے کون کون سے ارکان شریک تھے، اور کون نہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات کے ناموں کی اشاعت کی گئی ہے، وہ سب شریک رہے ہوں گے، لیکن ایسا نہیں ہے، ان میں کئی ایسے افراد شریک نہیں تھے، جن کا ہونا اس فیصلہ کے سلسلہ میں ضروری تھا، اور ان کی موجودگی اس میں بڑی حد تک مؤثر ہوسکتی تھی۔

ایک سنجیدہ مجلس علم وتحقیق، جس میں ملک کے مؤقر علماء شریک ہوتے ہوں، اس کی طرف سے ایسے اہم مسئلہ میں اس طرح کی مبہم تحریر اس کی ثقاہت واعتماد کو مجروح کرتی ہے۔

(۳) حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جان ومال کا تحفظ بیمہ کے جواز پر موقوف نہیں، بیمہ جس کے عدم جواز کے معترف ذمہ داران فیصلہ بھی ہیں، کیا یہ بات وہ حضرات سوچ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے تحفظ کی اب کوئی شکل بجز بیمہ کے باقی نہیں رہ گئی ہے؟ اگر ایسی بات ہوتی تو اس کے جواز کی گنجائش نکل سکتی تھی، وہ بھی انفرادی اور شخصی طور پر نہ کہ اجتماعی اور علی الاطلاق طریقہ پر، لیکن یہاں تو اور بھی ذرائع اور اسباب ہیں، جن سے تحفظ کا کام لیا جاسکتا ہے، اس وقت سب کی تفصیل مقصود نہیں ہے، دو اہم باتوں کی جانب ہم حضرات علماء کرام کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں، (۱) اول یہ کہ حرص مال کی بہتات نے ہمارے دور میں حلال وحرام کی تمیز اٹھادی ہے، خالص حرام اموال جن کے حاصل کرنے کے لئے کسی کو کسی طرح کی مجبوری نہیں ہے، آدمی انہیں لے لینے اور کھا لینے میں کوئی خوف اور جھجک نہیں محسوس کرتا، جو سرکاری ملازم ہیں، ان کے لئے رشوت مال غنیمت ہے، تجارت جیسا شریف پیشہ، کس قدر دغا وفریب پر مبنی ہو گیا ہے، اجیر اور مزدور اپنی ذمہ داری ادا کئے بغیر پوری اجرت کے لئے بے قرار رہتے ہیں، مرنے والے کا ترکہ جبراً غصب کرنے کا عام دستور ہے، چند لوگ کسی کاروبار میں شریک ہیں، تو عموماً دیکھا جاتا ہے، کہ اس کا کوئی ایک رکن اس میں خیانت اور بددیانتی کا شکار ہوتا ہے، غرض ناجائز اور حرام اموال کی کھیپ کی کھیپ مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہوتی ہے، کافر کے گھر میں داخل ہو تو وہاں اوپر سے نیچے تک سب حرام ہی حرام ہے، عقائد، اعمال، دل، دماغ سب نجس ہیں، وہاں تو ایک ہی جواب ہے، **فحسبہ جھنم** (اس کے لئے جہنم کافی ہے) لیکن مسلمانوں کے گھروں میں اس طرح سے حرام مال داخل ہوگا، تو ظاہر ہے کہ سب کو تہ وبالا کرکے رہے گا، ایک ناجائز چیز کو جائز قرار دینے کے بجائے مسلمانوں کو اہتمام کے ساتھ حلال خالص کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے، حلال خالص مقدار میں خواہ زائد نہ ہو مگر اس میں برکت ہوتی ہے، اور اس کے بے جا ہلاک ہونے کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ہم میں سے جو لوگ صاحب حیثیت ہیں، وہ باقاعدہ طور پر زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتے، یونہی جیسے تیسے کرکے کچھ مانگنے والوں اور کچھ مدرسہ کے محصلین کو زکوٰۃ ادا کردیتے ہیں، لیکن اپنی ملکیت کے تمام اموال کا حساب لگا کر سال بسال پوری پوری

زکوٰۃ ادا کرنے کا دستور کم ہے، اور یہ بات مسلم ومعروف ہے، اور حدیث سے ثابت ہے کہ جس مال میں زکوٰۃ کی رقم شامل رہ جائے، وہ ہلاکت کے نشانے پر ہے، زکوٰۃ کا نکال دینا مال کی طہارت ہے، باوجود فرض ہونے کے جب زکوٰۃ نہیں نکالی گئی تو سارا مال نجس ہوگیا، اب وہ جلا دینے کے ہی قابل رہتا ہے۔

میں یہ وعظ نہیں کہہ رہا ہوں جس اضطرار کی بنیاد پر فقہی قاعدہ کا سہارا لے کر ایک ناجائز معاملہ کو عموماً جائز قرار دے دیا گیا ہے، اور اس میں جان ومال کے تحفظ کی ضمانت سمجھی گئی ہے، عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ جان ومال کے تحفظ کا یہ کوئی یقینی سبب نہیں، ہاں اللہ کا جو فریضہ ہے، اس کے نافذ کرنے کا انفرادی اور اجتماعی طریقہ پر اہتمام کیا جائے تو تحفظ کو زیادہ یقینی کہا جا سکتا ہے۔

بہرحال یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے قابل عمل نہیں ہے، اس سے اجتناب کرنا ہی متعین ہے۔ **والله الموفق**

ماخذ: المآثر۔ جنوری، فروری، مارچ (۱۹۹۳ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

ہم نے مجلّہ المآثر کے صفحات پر انشورنس کے سلسلے میں مجمع الفقہ الاسلامی کے فیصلہ کا سنجیدہ احتساب کیا تھا، اور اس سلسلہ میں چند باتیں حرف آغاز کے تحت تحریر کی گئی تھیں، اس میں یہ بات بھی عرض کی گئی تھی، کہ انشورنس کے سلسلہ میں پانچویں فقہی سیمینار منعقدہ اعظم گڈھ کے جلسوں میں بحث نہیں ہوئی تھی، اور جہاں تک مجھے یاد ہے، آخری اجلاس میں پانچویں سیمینار کی تمام تجویزیں پڑھ کر سنائی گئی تھیں، مگر انشورنس والی تجویز اس میں نہیں آئی۔

اس پر ہمارے ایک محترم دوست نے ہمیں ٹوکا ہے کہ یہ تجویز آخری اجلاس میں پڑھ کر سنائی

گئی تھی، بلکہ خود انہیں محترم نے سنائی تھی، بحث اس لئے نہیں ہوئی کہ زیادہ تر شرکاء گذشتہ سیمینار کے تھے، شرکاء کی ایک بڑی تعداد نے مشروط یا غیر مشروط دستخط کئے تھے۔

بلا شبہ انسان خطا وسہو کا پتلہ ہے، اس کا حافظہ عین ممکن ہے کہ دغا کر جائے، ہم نے اس تحریر کے لکھنے سے پہلے اپنے حافظہ کو ٹٹولا تھا، فقہ اکیڈمی کی طرف سے شائع شدہ کتابچہ پڑھا، کئی احباب کے سامنے جو سیمینار کے اجلاسوں میں شریک تھے، اس کا تذکرہ کیا، مگر کہیں سے اس خبر کا سراغ نہ لگا کہ یہ فیصلہ آخری اجلاس میں سنایا گیا تھا، لیکن ہمارے دوست نے لکھا ہے کہ انہیں بخوبی یاد ہے کہ یہ تجویز سنائی گئی تھی، اگرچہ اس کے بعد بھی یہ بات ہماری لوح حافظہ پر ابھر نہ سکی، تاہم یادداشت کی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے، موصوف کی اس بات کو تسلیم کر لینا ہم انصاف ودیانت کا تقاضا سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس کی اطلاع بخشی۔

لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اسے اجلاس میں سنایا گیا یا نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ انشورنس کے جواز کا جو فیصلہ صادر کیا گیا ہے، دلائل واصول کی روشنی میں اس کا وزن کتنا ہے؟۔

☆☆☆☆☆☆

تمہیں بتاؤ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

حضرات قارئین کو یاد ہوگا کہ فقہ اکیڈمی دہلی کی طرف سے جب بیمہ کے جواز کا فتویٰ شائع ہوا، اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اسے شائع کر کے پورے ہندوستان میں تقسیم کیا گیا، اور لوگ بڑی تیزی سے ہلاکت کی اس دلدل میں گرنے لگے، تو سب سے پہلے ’’المآثر‘‘ نے اس کے خلاف آواز بلند کی، پھر مشہور صاحب نظر عالم و مفتی حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری، جو عرصۂ دراز سے جوار رسول میں اقامت کا شرف رکھتے ہیں، انہوں نے اس کی طرف توجہ فرمائی، اور اس مسئلہ پر مسلسل مضامین اور خطوط لکھے، جن میں سے زیادہ تر ’مجلّہ المآثر‘ میں چھپے، اور بعض خطوط و مضامین دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اس صدائے حق کو تاثیر بخشی اور جس تیزی سے انشورنس کا سیلاب چلا تھا، اس پر ایک مضبوط بند لگ گیا، یہ سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا، مولانا موصوف نے حق کا اظہار بلا خوف لومۃ لائم کر دیا۔

اس سلسلہ کا ایک بڑا افسوس ناک پہلو یہ سامنے آیا کہ انشورنس کے جواز کے خلاف المآثر میں حضرت مفتی صاحب مدظلہ اور دوسرے معتبر اور قابل احترام علماء کے مضامین شائع ہوتے رہے، حضرت مفتی صاحب نے فقہ اکیڈمی کے سربراہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب مدظلہ کو براہ راست مخاطب کر کے انہیں خط بھی لکھا، مسئلہ اہم ہے، مسئلہ ایک ایسے معاملے کے جواز کا ہے، جس کے بنیادی ارکان میں سود اور قمار دونوں شامل ہیں، اور یہ دونوں قرآن کی نص قطعی سے حرام ہیں، جواز کا مطلب یہ ہے کہ عارضی طور پر سہی ان دونوں محرمات قطعیہ کو جواز کی مطلق سند دے دی گئی، حق یہ تھا کہ جب اس پر ٹوکا گیا، تو فقہ اکیڈمی کی طرف سے اس سلسلہ میں وضاحت کی جاتی، ٹوکنے والوں کو غلط فہمی ہوئی تھی، تو اسے دور کرنے کی کوشش کی جاتی، اگر

اپنی غلطی محسوس ہوتی تو اس کا اعتراف کر کے رجوع کیا جاتا، اور یہ سب برملا ہوتا، اور اسی پیمانے پر ہوتا، جس پیمانے پر اس کی حلت وجواز کا فتویٰ شائع کیا گیا، ورنہ کم از کم یہ ہوتا کہ جن بزرگ نے براہ راست قاضی صاحب کو خط لکھ کر اس کی طرف متوجہ کیا تھا، انہیں کو خط کے جواب میں کچھ تحریر کیا جاتا، مصلحت نہ تھی تو شائع نہ کرتے، مگر ایک شخص خط لکھتا ہے، اور وہ بھی ایسا شخص جو علم و تفقہ کے بلند مقام پر فائز ہے، تو کیا اس کا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ چند صفحات اس کے جواب میں لکھ کر مجلّہ میں نہ سہی، نجی طور پر انہیں بھیج دیا جائے۔

لیکن افسوس یہ سب کچھ نہیں ہوا، فقہ اکیڈمی اور اس کے ارکان نے اس سلسلہ میں بالکل خاموشی اختیار کی، ایک آدھ مضمون آیا بھی تو محض ضمناً اور گویا تجاہل کے انداز میں! یا انہوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ جو کچھ ہم نے فیصلہ کر دیا ہے، کوئی کچھ کہتا رہے، اس سے متاثر ہونا ہی نہیں ہے، یہ ٹھیک وہی انداز ہے جو جماعت اسلامی کے بانی علامہ مودودی نے علماء حق کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا، کہ ان بزرگوں کی طرف سے خواہ کوئی بھی بات آئے، سرے سے دھیان ہی نہیں دیتے تھے، بس اپنے خرام ناز میں محو رہتے تھے، ہاں اگر ان کی جماعت کے کچھ افراد اس کی طرف انہیں متوجہ کرتے، تو بے تحاشا کبر وغرور کی پھلجھڑیاں ان کے قلم سے چھوٹنے لگتی، پھر تجہیل وتحمیق کے تمام اوصاف والقاب سے علماء کو وہ نوازتے چلے جاتے، اس طرح کے نمونے دیکھنے ہوں تو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری علیہ الرحمۃ کی عربی تالیف ''الاستاذ المودودی'' کے ترجمہ کے مقدمہ میں ملاحظہ فرمائیں، جنہیں خاکسار نے بطور عبرت کے جمع کر دیا ہے، ان کی جماعت کے افراد نے متوجہ کیا، تب تو وہ کچھ بولے، ورنہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کہتے رہے، مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے رہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے ٹوکا، مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند نے مواخذہ کیا، مگر ان کے کبر وغرور نے سرے سے التفات کرنے کی اجازت نہیں دی، بس کہا تو یہی کہا کہ ہمارے مخالفین ہم پر بہتان لگاتے ہیں، تہمت تراشی کرتے ہیں، خوف خدا سے دور ہیں، آخرت کی جواب دہی کا انہیں احساس نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ بات! جی نہیں چاہتا کہ قاضی صاحب مدظلہ کے متعلق لکھی جائے، لیکن واقعہ یہی ہوا

کہ انہوں نے تمام ایرادات ومواخذات، تمام اشکالات ودلائل اور تمام خطوط ومضامین کو یکسر نظر انداز کر دیا، جیسے انہیں کچھ خبر ہی نہیں۔

پھر اخیر میں ایک خط حضرت مفتی صاحب نے قاضی صاحب کے نام نہایت مفصل لکھا اور امید رکھی کہ اس کے جواب سے خواہ نجی طور پر ہو، یا مجلّہ میں ضرور نوازیں گے، مگر قاضی صاحب نے اسے بھی لائق اعتناء نہیں سمجھا، تو حضرت مفتی صاحب نے انتظار کے بعد اسے بعض رسالوں میں اشاعت کے لئے دے دیا، چنانچہ وہ شائع ہوا، اس کے بعد بھی صدائے برنخواست!

جب بات حد سے آگے بڑھ گی، تو ہندوستان کے نامور صاحب افتاء، جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری مدظلہ صاحب فتاویٰ رحیمیہ نے قاضی صاحب سے اس کے جواب کا مطالبہ کیا، تب قاضی صاحب نے جواب کا ارادہ فرمایا، لیکن اب بھی انہوں نے مفتی عاشق الٰہی صاحب کو لائق خطاب نہیں سمجھا، یہ جواب انہوں نے حضرت لاجپوری کے نام لکھا، اور انہیں کے پاس بھیجا، اس کے بعد بحث ونظر میں شائع کیا، نیز ریاض الجنہ گورینی میں چھپا، اس طرز عمل کو کیا کہا جائے؟۔

تمہیں بتاؤ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

یہ راقم الحروف سن وسال کے اعتبار سے بہت چھوٹا ہے، اور علم وتفقہ میں درجۂ صفر سے بھی گرا ہوا ہے، لیکن یہ وسوسہ دل میں آتا ہے کہ کہیں یہ وہی طرز عمل تو نہیں ہے، جو مودودی صاحب نے علماء حق کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔

بہر کیف! مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری مدظلہ نے قاضی صاحب کا خط اور اس کے ساتھ اپنا بھی ایک مکتوب مفتی عاشق الٰہی صاحب کے پاس ارسال فرمادیا، حضرت لاجپوری نے اپنے خط میں حضرت مفتی صاحب کے لب ولہجہ کی شکایت بھی کی ہے، حضرت مفتی صاحب نے ان کے خط کا جواب فوراً تحریر فرمایا، اور اس میں قاضی صاحب کے خط سے بھی تعرض فرمایا، حضرت مفتی صاحب نے حکمت وموعظۂ حسنہ اور مداہنت کا فرق واضح فرمایا ہے، نیز عوام الناس کی نفسیات اور ان کے لحاظ ورعایت سے گفتگو کرنے کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے، اور ایک بڑی بات اس خط میں حضرات ناظرین یہ دیکھیں گے کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے سابقہ خط میں لکھا تھا

> ”آپ نے تلفیق پر بھی بہت زور دے رکھا ہے، متقدمین میں سے جس کسی نے جواز تلفیق کے بارے میں جو کوئی بات کہہ دی، آپ کو وہی ملتی ہے، اور جن حضرات نے اس میں سختی کی ہے، ان کا قول لینا گوارہ کیوں نہیں؟ کیا اس میں یہ جذبہ مضمر نہیں ہے کہ پہلے سے جو بات طے کر رکھی ہے، اسی کے دلائل پیش کرنے ہیں، آپ مجھے معاف کریں یا نہ کریں یہ اتباع ہویٰ ہے“۔ (ریاض الجنۃ بابت مئی ۱۹۹۷ء)

اس پر قاضی صاحب نے سخت مواخذہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ”حضرت والا (حضرت لاجپوری) سے بڑھ کر اس کو کون سمجھ سکتا ہے کہ اتباع ہویٰ کا یہ فتویٰ جو مولانا نے صادر فرمایا ہے، وہ بدترین گالی سے بھی بڑھ کر ہے، اور پھر جس کی بنیاد بھی سو فیصد غلط ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا موصوف نے تلفیق کے موضوع پر میرے مقالہ کو پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی“۔ (حوالۂ سابق)

پھر انہوں نے بتایا کہ تلفیق کے موضوع پر انہوں نے تمام اقوال کو جمع کیا ہے، اب یہاں یہ الگ بات ہے کہ تلفیق کے موضوع پر تمام اقوال کو جمع کرنے کا حاصل کیا ہے، بجز اس کے کہ عوام اور دنیا داروں کے نفس کے لئے کام جوئیوں کا ایک حیلہ دستیاب ہو جائے، کہ چلو اگر بعض لوگ اسے منع کرتے ہیں تو بہت سے لوگوں کے نزدیک جائز بھی تو ہے، سہل انگار علماء بھی سہولت کے ان اقوال سے فائدہ اٹھا کر اباحیت کا دروازہ کھولنے میں تکلف نہیں کرتے، خیر یہ تو ایک الگ موضوع ہے، دیکھنا یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے اس مواخذہ سے کیا اثر قبول کیا، میں کوئی تبصرہ نہیں کرتا، آپ خود اندازہ کرلیں گے کہ جذبۂ حق آدمی کو کس بلندی پر پہونچا دیتا ہے؟ لکھتے ہیں کہ:

> ”قاضی صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے تلفیق کے بارے میں مجوزین اور مانعین دونوں کے قول لکھے ہیں، اور عاشق نے میری طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ تمہیں صرف مجوزین ہی کے قول ملتے ہیں، واقعی یہ احقر کی غلطی ہے، میں قاضی صاحب سے معافی چاہتا ہوں، ہوسکتا ہے کہ میں نے بحث ونظر کا وہ پرچہ نہ دیکھا ہو، جس میں تمام اقوال نقل کئے گئے ہیں، بہرحال غلطی غلطی ہی ہے“۔

کاش قاضی صاحب بھی اسی طرح کا کوئی نمونہ پیش کئے ہوتے۔

ماخذ: (جون، جولائی، اگست) ۱۹۹۷ء

☆☆☆ ☆☆☆☆☆

ایک مجلس کی تین طلاق اور غیر مقلدین کا رویہ

تقریباً تین ماہ کے عرصہ سے اخبارات ورسائل میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مسئلہ پر ایک ناگوار شور وغوغا برپا ہے، یہ مسئلہ ایک خالص علمی اور قانونی مسئلہ ہے، جو علمی حیثیت سے اہل علم کے حلقوں میں موضوع بحث کبھی کبھی بنتا رہا ہے، لیکن آج وہ عامیانہ اخبارات ورسائل کے صفحات پر آکر غیر سنجیدگی کا شکار اور افتراق وانتشار پھیلانے کے لئے تختۂ مشق بن گیا ہے۔

ایک مجلس کی تین طلاق کے سلسلہ میں اسلام کے مشہور ائمہ وفقہاء کے درمیان اختلاف کبھی نہیں پایا گیا، قرآن وسنت کی روشنی میں سب نے یہی سمجھا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں، تین ہی ہوتی ہیں، لیکن بعد کی صدیوں میں چند ایک علماء کی منفرد رائے سامنے آئی کہ ایک مجلس کی تین طلاق، تین نہیں ایک ہی تسلیم کی جائیں، جنھوں نے یہ رائے دی ان کے سامنے خواہ کوئی بنیاد رہی ہو، لیکن یہ ایک شاذ اور منفرد رائے تھی، گو انہوں نے بہت شد ومد سے اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی مگر امت نے اسے قبول نہیں کیا، سعودیہ عربیہ کی ہیئت کبار علماء نے بھی ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہونے کا فیصلہ دیا ہے، چنانچہ وہاں یہی فیصلہ نافذ ہے۔

ہمارے ملک کی یہ بدنصیبی ہے کہ یہاں اس شاذ رائے پر اصرار کرنے والی ایک جماعت وجود میں آ گئی، اس نے اس مسئلہ کے حق ہونے پر جارحانہ قسم کا اصرار شروع کردیا، اور ائمہ وفقہاء کی فہم اور ان کے اجتہاد کو قطعی غلط کہنے کی جرأت کر بیٹھی، اور ایک نزاع کی فضا پیدا ہوگئی، مگر اختلاف ونزاع کا جو بھی دائرہ تھا وہ علمی حلقوں ہی میں تھا، دلائل دیئے جاتے، ان کے جوابات تحریر کئے جاتے، تاہم ان کا ان عوامی اخبارات اور ریڈیو وغیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

لیکن شاہ بانو کیس میں شکست کھا جانے کے بعد ملک کا وہ عنصر جو ہمیشہ مسلمانوں اور

اسلام کی دشمنی پر آمادہ رہتا ہے، اسے بے قراری تھی کہ اس کا بدلہ کسی عنوان سے چکایا جائے، نہ جانے اسے تین طلاق والا یہ مسئلہ کن ذرائع سے حاصل ہوگیا کہ اسے بنیاد بنا کر اس عنصر نے مسلمانوں میں افتراق وانتشار کی چنگاری پھیلانی شروع کردی۔

اس سلسلہ میں ذرائع ابلاغ، اخبارات اور ریڈیو وغیرہ کی ہرزہ سرائیوں پر سنجیدہ اور متوازن رائے رکھنے والے علماء بہت کچھ لکھ چکے ہیں، اور بہت کچھ اس کی تفصیل اخبارات میں بھی اور دینی وعلمی رسائل میں بھی آچکی ہے، اسے دہرانے کا اس وقت کوئی حاصل نہیں ہے۔

البتہ ہم ان حضرات سے ایک گزارش ضرور کرنا چاہتے ہیں، جو خود کو اہل حدیث کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں، کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت اس مسئلہ میں اور دوسرے فروعی اختلافی مسائل میں آپ کی ہمنوا نہیں ہے، یہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد، بہت بڑی تعداد امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ پر اعتماد کرتی ہے، اور اختلافی مسائل میں ان کی تقلید کرتی ہے، اور اس مسئلہ میں تو ائمہ اربعہ ایک زبان ہیں، آپ کے اس فتویٰ کو جب مسلم دشمن عناصر نے ایک انقلابی اجتہاد کی شکل میں اچھالنا شروع کیا، اور یہ غل مچایا کہ مفروضہ ستم رسیدہ مسلم خواتین کے درد کا یہ مداوا ہے، اس لئے تین طلاق کے اس مسئلہ میں جو ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہے، ترمیم کرکے یہ نیا فتویٰ علی العموم نافذ کردینا چاہئے، اور پھر اس ایک مسئلہ کو نظیر بنا کر دوسرے مسائل پر بھی انقلابی اجتہاد کی قینچی چلانی چاہئے، جب یہ غوغا مچایا گیا تو فطرۃً مسلمانوں کے سواد اعظم کے ترجمان علماء نے اس کا نوٹس لیا، اور یہ حقیقت واضح کی کہ ایک مجلس میں تین طلاق کے ایک ہونے کا مسئلہ ائمہ اربعہ کے یہاں سرے سے ہے ہی نہیں، اور اس کے برخلاف جن لوگوں کی رائے ہے، وہ ایک شاذ رائے ہے، یہ اس لئے ہوا تاکہ مسلم دشمنوں کی طرف سے اٹھایا گیا فتنہ فرو ہوجائے، ایسے وقت میں اہل حدیث کہلانے والے حضرات کا بھی فریضہ تھا کہ مسئلہ کی صحیح صورت حال واضح کردیتے، اور جرأت مندی اور حق پسندی کا ساتھ دیتے ہوئے، برملا یہ کہہ دیتے کہ یہ مسئلہ امت کے سواد اعظم کے نزدیک یوں ہے، اور ہمارے نزدیک یوں ہے، ایک کا مسئلہ دوسرے کے سر نہیں تھوپا جاسکتا، اختلافی مسائل میں ابتداء اسلام سے طریقۂ کار یہی رہا ہے کہ جس کو جس پر اعتماد ہوا اس پر اس نے عمل کیا، علمی طور پر دلائل کو پیش کرنے کی بات اور ہے،

لیکن کسی نے دوسرے کے سر اپنا اجتہاد تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔

مشہور عباسی خلیفہ منصور نے امام مالک علیہ الرحمۃ سے درخواست کی کہ آپ اجازت دیں تو میں آپ کی مرتب کی ہوئی کتاب مؤطا کو اسلامی حکومت کے تمام شہروں میں بھیج کر یہ حکم دے دوں کہ اب سب لوگ اسی کتاب پر اور اس کے فتووں پر عمل کریں، یعنی اسے سرکاری قانون کی حیثیت دے دی جائے، تو امام مالک نے فرمایا کہ ہرگز نہیں، اس کتاب سے پہلے ہر طرف صحابہ کرام اور ان کے جلیل القدر تلامذہ پھیل چکے ہیں، اور لوگ ان سے سیکھ سیکھ کر دین پر عمل کررہے ہیں، اب یہ کتاب بطور قانون کے پہونچے گی، تو جو باتیں ان کے علم اور عمل سے مختلف ہوں گی، ان کو لے کر انتشار پھیلے گا، چنانچہ منصور اپنے خیال سے باز رہا۔

امام مالک کا یہ فیصلہ نہایت حکیمانہ فیصلہ تھا، ورنہ ان کے لئے خوشی کی بات تھی، کہ ان کی کتاب قانونی دستاویز بن رہی ہے، مگر انہیں جو بصیرت حاصل تھی، اور اخلاص کی جس دولت سے وہ سرفراز تھے، اس نے ان کے سامنے صحیح راستہ کھول دیا۔

غرض ان حضرات کے کرنے کا کام یہ تھا، کہ اپنے اور دوسرے فقہی مکاتب فکر کی پوزیشن واضح کردیتے، لیکن دیکھا یہ گیا کہ یہ لوگ اپنی شاذ رائے کے حق بجانب ہونے کی دلیلیں پیش کرنے لگ گئے، اور اس کا کل فائدہ انہیں مسلم دشمن طاقتوں کو پہونچا، جنہوں نے ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔

بلکہ ایسا محسوس ہوا کہ اندرونی طور پر ان حضرات کو کچھ مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ شاید اس طرح ہمارا مسئلہ اور ہمارا مسلک عام ہو جائے گا، چنانچہ بعض مقامات پر وہ لوگ باقاعدہ تحریکی شکل میں اپنے مسلک کی تبلیغ واشاعت میں لگ گئے، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں مزید انتشار بڑھ رہا ہے۔

کاش یہ حضرات امام مالک علیہ الرحمۃ کے نکتے کو سمجھ لیتے، اور اس کو اپنے لئے مشعل راہ بنالیتے، تو کتنے فتنے اپنی موت مرجاتے! **الیس منکم رجل رشید**

ماخذ: المآثر۔ جولائی، اگست، ستمبر (۱۹۹۳ء)

☆☆☆☆☆☆

مملکت سعودیہ عربیہ میں غیر مقلدین کی بدعنوانیاں

دنیا میں علم اور جہل کی کش مکش ہر دور میں رہی ہے، مختلف مفادات کے زیر اثر قوموں نے بھی اور افراد نے بھی علم کے ساتھ عداوت کی ہے، یہ عداوت کبھی جوش انتقام میں، کبھی غیض و غضب میں، کبھی کسی کی ضد اور عناد میں ظاہر ہوتی رہی ہے، اور اس کے ظہور کے پیرائے بھی الگ الگ ہوئے ہیں، علم کا دشمن کبھی علم صحیح کو چھپا کر اپنی عداوت ظاہر کرتا ہے، کبھی کتابوں کو جلا کر، کبھی علماء سے نفرت کر کے! غرض اس کے ظہور کے طریقے بھی متعدد رہے ہیں، دوسری قومیں اور ملتیں چاہے اسے اپنے لئے مایۂ ناز اور باعث افتخار قرار دیں، مگر اسلام نے علم کی اشاعت کی ترغیب دی ہے، اس سے عداوت کو کبھی پسند نہیں کیا ہے، بشرطیکہ وہ علم ایمان و اسلام کے مخالف نہ ہو، اور جو علم دین و ایمان کا مخالف ہوگا، وہ علم نہیں ہے، جہل ہے، خواہ اس کے حق میں کتنے ہی دلائل مہیا کئے جائیں، ایسے علم نما جہل سے دشمنی رکھنا ہی علم دوستی ہے۔

لیکن افسوس ہمارے زمانہ میں کچھ لوگ دین و ایمان اور علم وعقیدہ کا نام لے کر اس کے پردہ میں علم کی عداوت میں پیش پیش نظر آ رہے ہیں، اور اسے شاید وہ اپنا قابل فخر کارنامہ سمجھتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے پیچھے پیٹ کی غرض پوشیدہ ہوتی ہے، بریلوی مسلک کے عالم ہر سال ۱۰ ارمحرم کو تعزیہ داروں کی دعوت پر ان کے مجمع میں تقریر کیا کرتے تھے، شہداء کربلا کے فضائل ومناقب پر تفصیلی کلام کرتے، مگر یہ کبھی نہیں کہا کہ تعزیہ داری شرک ہے، حرام ہے، کسی نے ان سے دریافت کیا کہ تعزیہ داری کا کیا حکم ہے؟ تنہا تھے، مجمع نہیں تھا، فرمایا کہ حرام ہے، اعلیٰ حضرت کا فتویٰ یہی ہے، پوچھنے والے نے کہا کہ آپ ہر سال تعزیہ داروں کے مجمع میں تقریر کرتے ہیں، مگر اس کو کبھی نہیں بیان کرتے، کہا کہ اگر اسے بیان کر دیں گے، تو پھر کون بلائے گا؟ نہ بلائیں،

صحیح مسئلہ کا اعلان تو ہو جائے گا، کہنے لگے کہ مسئلہ روزی کا ہے۔

ایک علم صحیح کو اس لئے چھپالیا کہ روزی کا مسئلہ اندیشناک ہو جائے گا، یہ ایک مثال ہے اس مفاد کی جس کی بنیاد پر علم سے عداوت اختیار کی جاتی ہے۔

اب تازہ واقعہ سنئے، مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً وکرامۃً میں ایک نہایت عابد وزاہد، کریم الطبع مہمان نواز اور سخی بزرگ رہتے ہیں، حضرت مولانا عبداللہ صاحب مدظلہ [۱]، رہنے والے تو یہ ضلع بستی کے ہیں، لیکن اب مستقلاً جوار نبوی میں رہتے ہیں، مجلّہ المآثر کے بڑے قدرداں ہیں، اور حضرت محدث الاعظمی قدس سرہ سے والہانہ تعلق رکھنے والے ہیں، انہوں نے حکم دیا کہ اب تک المآثر کی جتنی جلدیں شائع ہو چکی ہیں، سب کو الگ مجلد کروا کے دو سیٹ ان کے پاس بھیج دیئے جائیں، دفتر المآثر نے اس حکم کی تعمیل کی، کئی شمارے ختم ہو چکے تھے، ان کی فوٹو کاپی تیار کرائی، اور سات سات جلدوں کے دو سیٹ تیار کرائے گئے، مدرسہ شیخ الاسلام کے ایک استاذ پانچ چھ حجاج کے قافلہ کے ساتھ حج کو جا رہے تھے، یہ جلدیں ان کے حوالہ کی گئیں، کہ وہ رفقاء میں تقسیم کر دیں، تاکہ سب کے سامانوں کے ساتھ یہ علمی تحفہ وہاں پہونچ جائے، ہم لوگ مطمئن تھے، کہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب انہیں پا کر بہت خوش ہوں گے، دعاؤں سے نوازیں گے۔

مگر ہوا کیا؟ عبرت کی داستان ہے، عقیدہ کے دعویٰ فروشوں پر عقل وایمان کا ماتم ہے، حجاج کا قافلہ اپنے سامانوں کے ساتھ ان تحائف علمیہ کو بھی لے گیا، احتیاطی تدابیر کے طور پر جدہ ایر پورٹ میں حجاج کے ساتھ جانے والے سامانوں کی تفتیش ہوتی ہے، ان حجاج کا قافلہ اترا تو بدقسمتی سے تفتیش کرنے والی ٹیم میں ہندوستان اور پاکستان کے غیر مقلدین بھی تعینات تھے، عموماً دیکھا گیا ہے کہ تفتیش کرنے والے عرب ہوتے ہیں، تو دینی رسائل وکتابوں سے تعرض نہیں کرتے، تین سال قبل یہ خاکسار المآثر کی متعدد جلدیں لے کر گیا تھا، اور تفتیش کرنے والے نے انہیں ایک نظر دیکھا، اور پاس کر دیا، مگر اس جگہ اردو زبان والا غیر مقلد ہوتا ہے، تو وہ کسی طرح برداشت نہیں کرتا کہ کسی حنفی کی کوئی کتاب مملکت سعودیہ میں پہونچے، یا کوئی ایسی کتاب وہاں داخل ہو جس کا تعلق تصوف سے ہو، اس کا قدرے تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

ان غیر مقلدین نے دیکھا کہ ایک ایسا مجلّہ جو ہندوستان کے محدث کبیر کی طرف

منسوب ہے، وہ محدث کبیر جس کی جلالت قدر تمام علماء عرب وعجم کے نزدیک مسلم ہے، لیکن وہ غیر مقلدین کے فرقہ شاذہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ مسلمانوں کے سواد اعظم احناف کا پیشوا تھا ان غیر مقلدین کو کیوں کر گوارہ ہوتا کہ اس مجلّہ کی جلدیں مملکت سعودیہ میں داخل ہوں، انہوں نے ان تمام مجلّات کو ضبط کر لیا، ان سے ان حجاج نے دریافت بھی کیا، کہ آخر ان رسائل میں کیا قصور ہے؟ جس کی وجہ سے ان پر پابندی لگ رہی ہے، مگر ایک رٹ تھی کہ نہیں! کسی عرب تفتیش کرنے والے نے بھی پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ حق کے ان دعویداروں نے جنہیں جھوٹ کا ٹھیکیدار کہنا بجا ہے، کہہ دیا کہ ان میں ''عقائد مخلفہ'' ہیں، ایسی کتابوں کے بارے میں سعودی گورنمنٹ کا قانون ہے کہ انہیں روک کر ان کی رسید دیدی جاتی ہے، اور تفتیش کے بعد ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہوتی تو انہیں اصل مالک کو واپس کر دیا جاتا ہے، یا رسید دکھا کر ان سے واپسی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، ان ظالموں سے رسید مانگی گئی، تو انہوں نے رسید دینے سے بھی انکار کر دیا، مجبوراً یہ حضرات خالی ہاتھ وہاں سے آگے بڑھے، اناللہ وانا الیہ راجعون

یہ وہ گروہ ہے جو اپنے کو حقانیت کا علمبردار قرار دیتا ہے، جو اپنے ٹولے کے علاوہ کسی فرد یا جماعت میں حقانیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، اس نے اہل عرب کو باور کرا رکھا ہے کہ عقائد صحیحہ اسی گروہ میں منحصر ہیں، بے جا ضد اور ہٹ دھرمی اس کا شعار ہے، ایسی جامد ذہنیت اس گروہ کی ہے کہ اسے ہر شخص اہل باطل ہی نظر آتا ہے، یہ گروہ نہیں چاہتا کہ اس کے علاوہ دوسرے اہل اسلام کی کتابیں وہاں پھیلیں، انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ان کا پول نہ کھل جائے، اور ان کی روزی کا مسئلہ نہیں، بلکہ ان کی تکمیل حرص وہوس کا مسئلہ کھٹائی میں نہ پڑ جائے، یہ جھوٹ بول کر، تعصب وتنگ نظری کا خول بنا کر عربوں کی دولت اینٹھتے رہتے ہیں، انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں یہ دولت ان کے ہاتھ سے نکلنے نہ لگ جائے، اس کے لئے وہ عجب عجب کھیل کھیلتے ہیں۔

اس طرح یہ اپنے تعصب، ضد وعناد اور بے عنوانیوں کی بدولت مملکت سعودی کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں، سعودی مملکت جہاں تمام دنیا سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، ان میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی سب ہوتے ہیں، بلکہ اہل سنت کے ساتھ شیعہ بھی ہوتے ہیں، ان سب کو سعودی مملکت میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی

ہے، لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے، باہر سے ایک فسادی ٹولہ وہاں پہونچ کر اپنی چاپلوسیوں اور تقیہ بازیوں کی بدولت حکومت کے اداروں میں کس قدر گھس جاتا ہے، اور علم ونظر کے ان تمام دروازوں کی ناکہ بندی کرنے کی کوشش کرتا ہے، جن کا تعلق اس ٹولہ سے نہیں ہوتا ہے، یہ علم سے دشمنی نہیں تو اور کیا ہے؟۔

غور کرنے کی بات ہے کہ معاملہ اتنے پر ہی بس نہیں ہوا، کہ مجلّہ المآثر کی جلدوں کو روک دیا گیا ہے، جہالت وعناد کے شرارے جب اڑتے ہیں تو علم وعقل کا تمام خرمن جل جاتا ہے، ان حجاج کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے منقول دعاؤں کا مجموعہ ''الحزب الاعظم'' بھی جاتا ہے، جسے مرتب کرنے والے مشہور عالم، مشکوٰۃ شریف کے شارح حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمۃ المتوفی ۱۰۱۴ھ ہیں، اسے بھی ان ستم ظریفوں نے ضبط کرلیا، حالانکہ اس کتاب میں وہی دعائیں ہیں، جو قرآن کریم میں ذکر کی گئیں ہیں، یا جو رسول اللہ ﷺ کی زبان غیب ترجمان سے ادا ہوئی ہیں، یا حضرات صحابہ کرام وتابعین عظام سے منقول ہیں، اور سہولت کے لئے انہیں سات منزلوں پر تقسیم کردیا گیا ہے، کہ ہر روز ایک منزل کو پڑھ لیا جائے، بھلا اس میں کیا قابل اعتراض بات تھی؟ مگر اسے بھی ظالموں نے روک دیا، حجاج کہتے ہی رہ گئے، کہ ہم ان مسنون دعاؤں کو کیسے پڑھ سکیں گے، مگر:

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت نہیں کام آتی دلیل اور حجت

ان اللہ کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ اس طرح دوسروں کی ملکیت کو بزور حکومت غصب کرلینا، صرف تمہارے اس مفروضہ کی بنیاد پر کہ اس میں اس راہ سے علم نہیں آیا ہے، جو راہ تم نے اپنے لئے متعین کررکھی ہے، تنگ نظری کی راہ، تعصب کی راہ، ایک جامد ذہنیت کی راہ، چونکہ اس راہ سے اس میں علم نہیں آیا ہے، اس لئے وہ غلط ہے، محض اس غلط مفروصہ کی بنیاد پر کسی مسلمان کا مال تمہارے لئے حلال ہوجاتا ہے، اس کی ملکیت پر دست اندازی کا تمہیں جواز مل جاتا ہے، کیا کوئی حدیث تمہیں اس کی سند دیتی ہے؟ اللہ سے ڈرو، یوم حساب دم بدم قریب آتا جارہا ہے، یہ سب غصب کی ہوئی ملکیتیں اس دن برآمد کرلی جائیں گی، اپنے کو اتنا معصوم اور پاک باز قرار نہ دو کہ دوسرے سب گنہ گار اور خطا کار نظر آئیں۔

اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت   دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

کسی حکومت کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اسے ایسے مخلص اور صحیح الفکر علماء میسر آ جائیں، جو حکومت کو مخلصانہ اور صحیح مشورہ دیں، اس سے مملکت روز بروز ترقی کی جانب قدم بڑھاتی چلی جاتی ہے، رعایا خوش حال اور مطمئن ہوتی ہے، باہر سے جانے والے زائرین اور سیاح بھی بے خوف ہوتے ہیں، اور مملکت کی ہر طرف نیک نامی ہوتی ہے، اچھے اچھے لوگ کھنچ کھنچ کر پہونچتے ہیں علم کی قدر دانی ہوتی ہے تو علوم کے قافلے وہاں اترتے ہیں اور ملک میں علم کی بہار آ جاتی ہے۔

ٹھیک اسی کے مقابلہ میں کسی حکومت کی بڑی بدنصیبی ہے کہ اس کے گرد ’’علماء سوء‘‘ کا حصار قائم ہوجائے، جو اپنے علاوہ کسی کو حکومت کے پاس پھٹکنے نہ دیں، علم وکمال کے تمام راستوں کو مسدود کر دیں، اور اپنی من مانی چیزوں کو حکومت پر مسلط کریں، جب یہ صورت حال ہوتی ہے تو ظلم عام ہوجاتا ہے، انصاف مٹتے مٹتے ختم ہوجاتا ہے، پھر یہی چیز حکومت کے زوال کا سبب بن جاتی ہے۔

ہر زمانے میں حکومتوں کو غلط کارمشیروں نے اور برے علماء نے بگاڑا ہے، بدقسمتی سے سعودی حکومت پر بھی علماء سوء کا تسلط ہوتا جاتا ہے، بذات خود مملکت کے حکمراں بالخصوص خادم الحرمین الشریفین ملک فہد حفظہ اللہ بہت نیک نیت ہیں، ان کے قانون میں ہر مسلک والوں کے لئے رواداری موجود ہے، وہ حق کو اپنی اجارہ داری نہیں سمجھتے، مگر ہندوپاک کے غیر مقلدین اور نجد کے بعض متشدد علماء نے حکومت کی غلط اور ڈراونی تصویر بنا رکھی ہے، جس سے دوسرے ملک و مشرب کے علماء خوفزدہ رہتے ہیں۔

ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمۃ کی تائید و تصویب سے ملک فہد کے پریس سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کا ترجمۂ قرآن پاک اور مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ کے تفسیری فوائد کی اشاعت ہوئی تھی، اس ترجمہ و تفسیر کی صحت وجلالت قدر پر برصغیر ہندوپاک میں بغیر استثناء کے اتفاق تھا، غیر مقلدوں نے بھی کبھی اعتراض کا کوئی شوشہ نہیں چھوڑا تھا، لیکن جونہی مدینہ منورہ کے شاہی پریس سے چھپ کر اس کی اشاعت ہوئی، تمام غیر مقلدین کے پیٹوں میں مروڑ ہونے لگی، وہی ترجمہ وتفسیر جس پر اب

تک کوئی اعتراض نہ تھا، اب اس میں انہیں گمراہی کے کیڑے نظر آنے لگے، پھر اتنا طوفان اٹھایا گیا کہ اس کی اشاعت بند کردی گئی، اوراس کے بجائے محمد جونا گڑھی کا ترجمہ اور صلاح الدین یوسف کے تفسیری حواشی شائع کئے گئے، جن کا علمی دنیا میں نہ کوئی وزن ہے، اور نہ معتبر علماء ان سے واقف تھے۔

ان شرانگیزوں کی وجہ سے مملکت کی بدنامی ہورہی ہے، لیکن جیفۂ دنیا کے کرگسوں کو اس سے کیا مطلب؟ انہیں تو اپنا پیٹ بھرنے سے مطلب ہے، کوئی بدنام ہو یا نیک نام! انہیں اگر خوف ہے تو بس اس کا کہ کوئی شخص ان کی اس لوٹ گھسوٹ میں حصہ دار نہ بن جائے، تو وہ مطمئن رہیں، علماء احناف بالخصوص علماء دیوبند کو ان کے مرغوبات سے دلچسپی نہیں ہے، لیکن یہ ضرور چاہتے ہیں کہ مملکت پر علم کے دروازوں کو کوئی بند نہ کرے۔

سعودی حکومت کو ایسے شر پسند افراد کا احتساب کرنا چاہئے، ورنہ یہ خود تو ڈوبے ہیں، حکومت کو بھی لے ڈوبیں گے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔

ماخذ: المآثر۔مئی، جون، جولائی (۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) حضرت مولانا عبداللہ صاحب مہاجر مدنی (المتوفی ۳۰/رجب ۱۴۲۵ھ) کے بارے میں جاننے کے لئے دیکھیں ''کھوئے ہوؤں کی جستجو''، صفحہ ۵۴۲۔

فرق ضالہ اور علمائے حق

۲؍اور ۳؍مئی کو ہندوستان کے مرکزی شہر دہلی میں جمعیۃ العلما ہند کی طرف سے ’’تحفظ سنت کانفرنس‘‘ کا انعقاد ہوا۔ ہمارے ملک میں مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہے جو سنت اور حدیث کے اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا دعوی بڑی بلند آہنگی کے ساتھ کرتا ہے، اس نے توحید و سنت کا نعرہ اختیار کر رکھا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے دعوئ عمل بالحدیث کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ حنفیت پر چوٹ کی جائے، ائمہ کرام بالخصوص امام ابوحنیفہ کو برا بھلا کہا جائے، ہندوستانی مسلمانوں کے سواد اعظم احناف کو گمراہ، مشرک، خرافی اور ان کی نماز کو خلاف سنت ثابت کیا جائے اس فرقہ میں کیا عالم کہلانے والے کیا جاہل، کیا کتابیں اور کیا جرائد ومجلّات، سب کا ایک موضوع ہے کہ حنفیت کو خلاف سنت وشریعت ثابت کر کے اپنے ٹولے میں اضافہ کیا جائے، اس کے لئے یہ لوگ وہ تمام حربے اور وسائل اختیار کرتے ہیں جن کے زیر اثر آدمی حنفیت سے بدگمان ہو جائے اس مقصد کے لئے مال اور پروپیگنڈہ کے تمام ذرائع بے دریغ استعمال کئے جاتے ہیں۔ آج کی دنیا تو جھوٹی تشہیر اور پروپیگنڈے کو کمال اشاعت سمجھتی ہے، چنانچہ بہت سے لوگ ان کے پھندے میں گرفتار ہو جاتے ہیں، اور جب سے سعودی اور خلیجی ممالک کی دولت کا رخ اس فرقہ کی طرف ہوا ہے، اس وقت سے اس کی جارحیت میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ حدیث پر عمل کرنا سر آنکھوں پر، سنت کی ترویج عین مقصد ہے، توحید کی دعوت اور شرک سے بیزاری دین و ایمان ہے، لیکن ان چیزوں کا نام لے کر مسلمانوں کے نہیں! بلکہ علما وفقہا، مشائخ وصوفیہ اور بزرگان دین کے سواد اعظم کو گمراہ اور بدعتی ومشرک قرار دینا یہ کس عمل بالحدیث کا کرشمہ ہے؟ ایک زمانہ میں خوارج نے قرآن کو فیصل ماننے کا نعرہ لگایا، اور صحابہ کی ایک بڑی تعداد کو کافر قرار دیا،

روافض نے محبت اہل بیت کا دعوی کیا اور بیشتر صحابہ کو مرتد قرار دیا، معتزلہ نے توحید اور عدل کا آوازہ بلند کیا اور فقہا ومحدثین کو گمراہ بنایا، ہمارے دور میں بریلیوں نے محبت رسول کا غل مچایا اور دین کے سچے خادموں کے بے دین ہونے کا فتوی شائع کیا، اور اب پانچوں سواروں میں یہ آخری ٹولہ اٹھا ہے اس نے حدیث پر عمل کرنے کا نام لے کر ہندوستان میں جب سے اسلام داخل ہوا، اس وقت سے لے کر اب تک کے تمام مسلمانوں اور تمام دین کے خادموں پر بیک جنبشِ قلم گمراہ اور خلاف سنت ہونے فتوی صادر فرمادیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ نہ یہ توحید کی دعوت ہے اور نہ حدیث وسنت پر عمل ہے، یہ ایک فتنہ ہے جو مسلسل مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالے ہوئے ہے، کسی بھی آبادی میں، کسی بھی ملک میں مسلمان اپنا دین اور اپنی نماز سنبھالے ہوئے سکون کی فضا میں مسجدیں آباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اچانک کوئی غیر مقلد اپنے کو اہل حدیث کہتا ہوا وہاں پہونچ جاتا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا کے تیور بدل جاتے ہیں، لڑائی جھگڑے کی بنیاد پڑجاتی ہے، نمازیں علیحدہ ہونے لگتی ہیں، گمراہی کے فتوے لگتے ہیں، اکابر واسلاف جن کی عظمت کے سامنے ہمیشہ جبین عقیدت جھکی رہتی ہے، ان کو گالیاں دی جانے لگتی ہے۔ اس ٹولے نے سنت کا نام لیا مگر اس کو مسخ کردیا، بدشکل بنادیا، سنت میں احترام تھا، اتحاد تھا، خیر وبرکت تھی، لیکن سنت کے ان متوالوں نے احترام والوں کو بے احترام کیا، اتحاد میں رخنہ ڈال کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کیا، خیر اٹھ گیا، برکت جاتی رہی، سنت اور حدیث کو بگاڑنے والی اور اس کو بے محل استعمال کرنے والی اس قوم کی دست اندازیاں بلکہ چیرہ دستیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ جب تحفظ سنت کے نام پر ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے اصحاب علم اور ارباب فتوی کو دعوت دی گئی تو ہر طرف سے لوگ بے اختیار امڈ پڑے، معلوم ہوا کہ ہر چہار جانب اس جارحیت پسند جماعت کا تشدد پھیلا ہوا ہے، ہر طرف لوگ زخموں سے کراہ رہے ہیں، پریشان ہیں، سب نے فریاد کی کہ اچھی خاصی پرسکون فضا میں ایک غیر مقلد کودتا ہے اور تمام سکون کو تہ وبالا کر کے رکھ دیتا ہے۔

اس فرقہ کا بنیادی مقصد کوئی مثبت مقصد نہیں ہے، نفی اور انکار پر اس فرقہ کی اساس ہے اور ہر گمراہ فرقہ کا خاصہ یہی ہے کہ اس کی بنیاد نفی اور انکار پر ہوتی ہے، اگر اس کا انکار ختم ہو جائے تو اس کا وجود ہی فنا ہوجائے۔ بریلویت کی اساس علماءِ دیوبند کا انکار ہے، صحیح عقائد اور صحیح اعمال کا

انکار ہے، اگر کوئی بریلوی علماءِ دیوبند کو کافر نہ کہے تو بریلی نہیں رہے گا، اگر اجتماعی طور سے ان کے علما، اہل حق کو کافر کہنا ترک کر دیں تو بریلویت فنا ہو جائے گی، اسی طرح غیر مقلدوں کی اساس انکارِ حنفیت پر ہے، اسی کے ضمن میں شافعیت، مالکیت اور حنبلیت کا انکار بھی ہے، مگر وہ محض ضمناً ہے، اصل مخاصمت احناف سے ہے، اگر احناف کی مخاصمت یہ چھوڑ دیں تو غیر مقلدیت بنام اہل حدیثیت فنا ہو جائے گی، اس لئے ہمیشہ ان کی طرف سے ردِ حنفیت کا کام جاری رہتا ہے۔ ابتدا سے جب سے اس فرقہ کا وجود ہوا ہے، یہی وطیرہ قائم ہے۔ حدیث وسنت کے نام پر ان کے پاس گنتی کے چند مسائل ہیں، جن میں یہ غوغا مچاتے ہیں، البتہ جارحیت کا انداز گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اب سے پچاس سال پہلے ان کی جارحیت میں بہت شدت آ گئی تھی، مسجدوں میں لڑائی، بازاروں میں بحث ومجادلہ، اشتہار اور پمفلٹ میں زوردار دعوے اور چیلنج کی وہ بہتات ہو گئی تھی کہ الامان والحفیظ! علمائے اہل حق بنام علمائے دیوبند کو عام طور سے ان چیلنجوں کے جواب دینے کی فرصت نہ ہوتی تھی، ان حضرات کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہی کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت جا چکی ہے، مسلمانوں کا شیرازہ بکھر رہا ہے، اس شیرازہ کو سمیٹا جائے، کس طرح دین سے دور ہوتے ہوئے معاشرہ کو دین سے قریب کیا جائے؟ ان کے بکھرے ہوئے اتحاد کو کس طرح بچایا جائے؟ دشمنانِ اسلام کی طاقتیں اسلام کو مٹانے پر تلی ہوئی ہیں، ان کا دفاع کس طور پر کیا جائے؟ کسی طرف سے عیسائیوں کا حملہ ہے، کسی محاذ پر آریہ سماجیوں کی جنگ تھی، کہیں قادیانی نقب لگا رہے تھے، ہر محاذ پر علمائے حق ڈٹے ہوئے مقابلہ کر رہے تھے، اب اگر ان داخلی فتنوں کی طرف توجہ کی جائے تو دوسرے محاذ کمزور پڑ جائیں، اس لئے یہ حضرات طرح دے جاتے، غیر مقلدین اور دوسرے مسلمان فرقوں کے فتنوں سے بچ کر نکلنے کی کوشش کرتے، مگر یہ سورما للکارتے ہی رہتے، اور اس سے آگے بڑھ کر اسلاف وائمہ حتی کہ صحابہ کرام کے مقدس دامنوں پر دست درازی کرنے لگتے تو ان کی غیرت کو جوش آتا، اور کوئی صاحب ضرورت کے بقدر ان کے فتنے کی سرکوبی کر کے پھر اپنے تعمیری اور مثبت کاموں میں مشغول ہو جاتے، شیعیت کے مقابلے میں اللہ تعالی نے امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی نور اللہ مرقدہ اور ان کے خاندان ذی شان کو توفیق بخشی، انہوں نے نہایت اعتدال اور توازن کے ساتھ شیعیت کا فتنہ کچلا، بریلویوں کے

مقابلے میں حضرت مولانا مرتضی حسن صاحب چاند پوری، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب شاہجہاں پوری اور حضرت مولانا نور محمد صاحب ٹانڈوی علیہم الرحمہ کو سعادت بخشی گئی، ان حضرات نے بریلویت کا سارا طلسم کھول کر رکھ دیا، اور امت اس فتنے سے خبردار ہوئی۔ غیر مقلدیت کے فتنے کی حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ سے لے کر آج تک حسب ضرورت متعدد علماء کبار نے خبر لی، مگر عموماً کسی نے اس کو اپنا موضوع نہیں بنایا، جب جیسی ضرورت پڑی علما نے اس کا تعاقب کیا، اور بعض خوش نصیب علما ایسے بھی تھے جو ہر محاذ پر نظر آتے ہیں، نیز وہ اپنے مثبت اور تعمیری کام میں بھی اسی انہماک سے لگے ہوئے ہیں، مدرسوں میں قرآن وحدیث کی اعلی تعلیم بھی دے رہے ہیں، عام مسلمانوں کی دینی زندگی میں راہنمائی بھی کر رہے ہیں، تصنیف وتالیف میں بھی لگے ہوئے ہیں، شیعوں کے مقابلے میں ضرورت پڑتی ہے تو وہاں بھی اپنی وسعت معلومات کا لوہا منوا رہے ہیں، بریلویت بھی ان سے گھبراتی ہے، غیر مقلدیت بھی ان سے خائف ہے، ایسے بزرگوں میں نمایاں تر نام اس شخصیت کا ہے جس کی یادگار میں یہ مجلّہ (المآثر) شائع کیا جاتا ہے، یعنی محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نور اللہ مرقدہ، اللہ تعالی نے ان سے ہر محاذ پر کام لیا، بالخصوص غیر مقلدیت تو ان سے اتنی خائف رہی کہ ان کے نام سے اس کی روح کانپتی تھی، حالانکہ انہوں نے اس کام کو اپنی زندگی کا موضوع نہیں بنایا تھا، ان کی زندگی کا موضوع تو خدمت حدیث تھا، اور اس کے روشن نمونے آج بھی دنیا کے سامنے جگمگا رہے ہیں، تاہم جب ضرورت ہوئی ہے، غیر مقلدیت کا جائزہ نہایت تحقیقی اور علمی انداز میں لیا ہے۔ ’’رکعات تراویح‘‘ ’’اعلام مرفوعہ‘‘ ’’تحقیق اہل حدیث‘‘ اور ’’ازہار مربوعہ‘‘ وغیرہ میں علم کا ایک دریا امڈ رہا ہے۔

حضرت مولانا کی خدمت کا اعتراف اقبال سہیلؔ نے بڑے بلیغ انداز میں کیا ہے، سدھاری اعظم گڑھ کے جلسے کے لئے انہوں نے فارسی قصیدہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ اور دوسرے بزرگ علما کی شان میں تصنیف کیا تھا، اس کا ایک شعر ہے:

ازاں پس آں حبیب ما ادیب مام خطیب ما کہ ذاتش در مئو احناف را حصن حصین آمد

اس کے بعد ہمارے وہ حبیب، ہمارے وہ ادیب، ہمارے وہ خطیب ہیں، جن کی

ذات گرامی مئو کے اندر احناف کے لئے ایک مضبوط قلعہ ہے۔

حضرت کے گزر جانے کے بعد غیر مقلدوں نے بہت زور دکھایا، تو اللہ تعالی نے نئی نسل میں مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری مدظلہ کو اس فتنہ کی سرکوبی کی توفیق بخشی، وہ اس سلسلے میں بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن یہ فتنہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی دامت برکاتہم صدر جمعیۃ علمائے ہند کو اس فتنہ کی ہمہ گیری اور پھیلاؤ نے بے چین کیا تو ضرورت محسوس کی کہ ملک کے تمام حساس اور ذمہ دار علما کو اکٹھا کر کے اجتماعی طور پر اس فتنے کو کچلنے کی تدبیر کی جائے، اور مسلمانوں کو اس سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ ۲؍۳؍مئی کو تحفظِ سنت کے عنوان سے یہ اجلاس کیا گیا، جس میں ملک کے تمام علاقوں کی نمائندگی بہت اچھی رہی، ملک بھر کے ستائے ہوئے علما وفضلا اس میں شریک ہوئے، اجلاس ماشاء اللہ بہت کامیاب ہوا، امید ہے کہ اس اثرات اچھے مرتب ہوں گے۔

ماخذ: المآثر (مئی، جون، جولائی) ۲۰۰۱

☆☆☆☆☆☆

منافق علیم اللسان

امیر المومنین سیّدنا عمر بن الخطاب ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن أخوف ماأخاف علىٰ كل منافق عليم اللسان (مسند احمد)

مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ جس سے خوف ہے، وہ ہر وہ منافق ہے جو زبان کا ماہر ہو۔

یعنی وہ شخص ہو جو زبان کا تو ماہر ہو، لیکن دل ودماغ اور عمل کے لحاظ سے جاہل ہو، علم دین کو حصول معاش کے ذریعے کے طور پر استعمال کرتا ہو، زبان وبیان کی مہارت کی وجہ سے لوگوں میں اپنا وزن بنا رکھا ہو، بظاہر لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہو، لیکن خود خدا کی راہ سے بھاگتا ہو، دوسروں کے عیب کو تو برا سمجھتا ہو اور خود اس سے زیادہ برائیوں میں مبتلا ہوتا ہو۔ لوگوں کے سامنے تو تقویٰ وطہارت اور عبادت وخلوص کا اظہار کرتا ہو، مگر خدا کے حضور بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہو، ایسا شخص تنہائی میں بھیڑیا ہوتا ہے، لیکن لوگوں کے سامنے انسانی لباس میں ہوتا ہے، اس سے اس حدیث میں ڈرنے اور بچنے کی تاکید کی گئی ہے، کہ کہیں وہ اپنی زبان کی حلاوت سے تمہیں زہر نہ دے دے، اور اس کے گناہوں کی آگ تمہیں جلا نہ دے۔

اس حدیث کی شرح مشہور تابعی حضرت احنف بن قیس علیہ الرحمہ کے ایک واقعے سے بخوبی ہوتی ہے، اس کو علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ذکر کیا ہے، ان کا تعارف کراتے ہوئے علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے:

الامير الكبير، العالم النبيل، أحد من يضرب بحلمه وسودده المثل ،

کان سید تمیم اسلم فی حیاۃ النبی ﷺ ووفد علی عمر۔

امیر کبیر، صاحب عقل وفہم عالم، ان کی عقل وحلم اور سیادت وقیادت ضرب المثل ہے، قبیلہ تمیم کے سردار تھے، نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مدینہ شریف میں ان کی حاضری ہوئی تھی۔

حضرت احنف جب مدینہ شریف حاضر ہوئے تو کسی موقع پر انھوں نے خطبہ دیا۔ یہ بڑے فصیح وبلیغ اور بہترین خطیب تھے، حضرت عمر نے ان کا خطبہ سنا تو بہت پسند کیا۔ ان کی عام گفتگو بھی بڑی دلآویز ہوتی تھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ امیر المومنین نے مجھے حکم دیا کہ میں سال بھر مدینہ شریف میں ان کی خدمت میں حاضر رہوں، روزانہ میری حاضری ان کی خدمت میں لازم تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ انھوں نے میرے اندر کوئی ناپسندیدہ بات نہیں دیکھی۔ ایک سال کے بعد انھوں نے ایک بار مجھے طلب کیا، اور فرمایا: احنف! تمہیں کچھ پتہ ہے کہ میں نے تمہیں کیوں اپنے پاس روک رکھا ہے؟ میں نے عرض کیا، حضرت! مجھے معلوم نہیں، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو صاحب علم منافق سے ڈرایا تھا، تمہارا خطبہ اور تمہاری گفتگو سن کر مجھے اندیشہ ہوا تھا کہ شاید تم اس کے مصداق ہو، لیکن احنف! الحمد اللہ! مجھے اطمینان ہے، میں نے تمہارا امتحان کرلیا ہے، تمہارا ظاہر تو اچھا ہے ہی، مجھے امید ہے کہ تمہارا باطن بھی تمہارے ظاہر ہی کی طرح بہتر ہے۔ ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ اس امت کی بربادی صاحب علم منافق سے ہوگی۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۵، ص ۳۹)

یہ اس وقت کی بات ہے، جبکہ زمانۂ نبوت ابھی دور نہیں ہوا تھا، اللہ کے رسول نے جن تین دوروں کے خیر ہونے کی گواہی دی تھی ان میں دوسرے دور کا آغاز تھا۔ پہلا دور تو خود حضور اکرم ﷺ کا دور تھا، اس میں عرش اعظم سے براہ راست ربط قائم تھا، اللہ کی مرضیات کی اطلاع یقینی طور پر ہوا کرتی تھی، وہ دور گزر چکا تھا۔ دوسرا دور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور تھا، نبوت کی تمام برکتیں عروج پر تھیں، فتوحات اسلامی کا سلسلہ چل رہا تھا، اسی دور میں ایک ایسے بزرگ جو خود زمانۂ نبوت میں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے، مگر آپ کی خدمت میں کسی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مدینہ حاضر ہوتے ہیں، اور یہاں کسی موقع پر ایک خطبہ دیتے ہیں، بہت فصیح وبلیغ اور بہت پُر زور اور بلند آہنگ! حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اہل

زبان تھے، زبردست عالم تھے، ان کے دل کو یہ خطبہ بہت بھایا، وہ ان سے واقف نہ تھے، وہ چونکے، انھیں رسول اللہ ﷺ کا فرمان یاد آیا کہ اس امت پر سب سے زیادہ اندیشہ ایسے صاحب زبان سے ہے، جو دل کا منافق ہو، انھیں خطرہ ہوا کہ یہ عظیم ادیب وخطیب کہیں منافق علیم اللسان نہ ہو، اس کو دیکھنے کے لئے اور اس کا امتحان لینے اور اطمینان کرنے کے لئے حضرت احنف کو اپنے پاس ایک سال کے لئے روک لیا۔ اس پوری مدت میں ان کا جائزہ لیتے رہے، سال بھر کے بعد اطمینان ہوا اور انھیں وطن واپس ہونے کی اجازت دی۔

خیر القرون میں امیر المومنین حضرت عمر ؓ جس خطرے سے چونک رہے تھے، صدیاں گزر جانے کے بعد اس خطرے کا صرف امکان نہیں بلکہ اس کا بکثرت وقوع کیا اہل اسلام کو چونکانے کے لئے کافی نہیں؟ ہمارے دور میں تو علیم اللسان افراد کی بہتات ہے جو زبان وقلم کی فصاحت وبلاغت اور تحریر وخطابت کے امتیازات میں مشہور ومعروف ہیں، کیا ان کے بارے میں اگر کوئی چونکتا ہے اور دین وشریعت کی میزان پر انھیں تولتا ہے تو کیا یہ ایک ضروری عمل نہیں ہے۔

ہم تو اپنے دور میں بکثرت دیکھتے ہیں کہ ایک ذہین وذکی آدمی اٹھتا ہے، اس کا ذہن زرخیز ہوتا ہے، زبان وبیان کا ماہر ہوتا ہے، لوگوں پر چھا جانے کا ذوق ہوتا ہے، اپنے گرد وپیش اپنے نام لیواؤں کا ہجوم دیکھنا چاہتا ہے، مال حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے، لوگوں کے رنگ ڈھنگ دیکھتا ہے، کس چیز سے لوگ متاثر ہوں گے؟ اس پر غور کرتا ہے، پھر اپنے ذہن ودماغ اور زبان وقلم کو اس طرح کام میں لاتا ہے کہ لوگ ابتداءً متحیر ہو جائیں، پھر اس پر فریفتہ ہو جائیں، وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کو اللہ سے، رسول سے، قرآن سے، حدیث سے محبت ہے، تو وہ انھیں چیزوں کو نئے نئے انداز سے پیش کرتا ہے، تاکہ لوگ اس کے آس پاس بھیڑ لگائیں، اور وہ ان سے اپنا مقصد حاصل کر لے۔

کم از کم ہندوستان کی حد تک ماضی قریب میں غلام احمد قادیانی سے لے کر ڈاکٹر ذاکر نائیک تک ذہین وذکی افراد کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے، جنھوں نے جمہور امت کا راستہ چھوڑ کر حدیث کی زبان میں ''سواد اعظم'' کی راہ ترک کرکے، اتباع کو اپنے لئے باعث عار خیال کیا، اور

ابتداع کی نئی نئی راہیں نکالیں، اور دونوں ہاتھوں سے دنیا خوب کمائی، امت کے سادہ لوح اور ناواقف افراد کو معروف راستوں سے ہٹایا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **اتبعوا السواد الاعظم فانه من شذ شذ فی النار۔ (رواه ابن ماجه من حديث انس ؓ)**

سواد اعظم کی پیروی کرو، جو کوئی اس سے انحراف کرکے الگ ہوا، وہ جہنم میں جا پڑا۔

سواد اعظم کا مصداق جمہور علمائے اسلام ہیں، ہر دور میں خود پسند ذہین وذکی افراد نے جمہور اہل اسلام کی راہ سے الگ اپنی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے، انھیں محسوس ہوا ہے کہ عام لوگوں کے ساتھ چلنے میں ان کی انفرادیت باقی نہ رہے گی، اور ایسے لوگوں کو اپنی انفرادی شان بنانے کا خاص ذوق ہوتا ہے، بعض افراد کا یہ ذوق انفرادیت انھیں اتنی دور لے جاتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ بزرگوں کی راہ سے کٹ جاتے ہیں، بلکہ وہ اپنی تیزیٔ طبع کی وجہ سے اسلام کی راہ کو ہی خیر باد کہہ دیتے ہیں، اس کی مثال میں قادیانی فرقہ اور منکرین حدیث کا فرقہ پیش کیا جاسکتا ہے، بعض وہ ہوتے ہیں کہ حلقۂ اسلام سے تو خارج نہیں ہوتے ہیں، مگر اہل سنت کے زمرے سے باہر آجاتے ہیں، ان میں بھی تیزیٔ طبع کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے، مختلف فرقے، بریلوی، غیر مقلدین، جماعت اسلامی، جماعت مسلمین، مختلف افراد مثلاً وحید الدین خاں، ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر ذاکر نائیک وغیرہ اس کے مصداق ہیں۔

یہ نام میں نے بطور مثال کے لکھے، اس فہرست میں اور بھی افراد ہیں، سب میں انفرادیت کا ذوق کام کرتا ہے۔ آج کل ٹی۔ وی چینل دیکھنے والے مسلمانوں کی طرف سے بکثرت سوال کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک کی حیثیت کیا ہے؟ بعض ان کے غالی معتقد ہیں، ایک بڑی تعداد ان کے پروپیگنڈے سے بہت متاثر ہے۔ ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ یہ صاحب سواد اعظم سے ہٹے ہوئے ہیں۔

أللهم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه

☆☆☆☆☆☆

تحریف وتبدل کی ابتداء
اورقرآن وحدیث کی وضاحت

قرآن پاک میں سورۂ مریم میں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کے تذکروں کے بعد حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ **فخلف من بعد هم خلف أضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشهوات فسوف يلقون غيا** (۵۹:) پھر ان کے بعد ایسے ناخلف افراد آئے جنھوں نے نماز ضائع کی اور اپنی چاہتوں کے پیچھے چلے، تو یہ عنقریب خرابی و بربادی میں پڑیں گے۔ سورہ اعراف میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فخلف من بعد هم خلف ورثوا الكتاب ياخذون عرض هذا الادنىٰ ويقولون سيغفرلنا وإن ياتهم عرض مثله ياخذوه ألم يوخذ عليهم ميثاق الكتاب أن لايقولوا على الله إلا الحق ودرسوا مافيه والدرار الآخرة خير للذين يتقون أفلاتعقلون** (۱۶۹:) پھر ان کے بعد جانشین ایسے نالائق لوگ ہوئے، جنھوں نے وراثت میں کتاب کو تو پایا لیکن وہ اس سے دنیا کا مال حاصل کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری مغفرت ہو ہی جائے گی، اور اگر ویسا ہی مال پھر مل جائے تو اسے بھی لے لیتے، کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ پر کوئی بات نہ گڑھیں، بجز حق بات کے اور کچھ نہ کہیں، حالانکہ جو کچھ اس میں ہے اسے انھوں نے پڑھا ہے، اور دار آخرت ہی ان کے لئے بہتر ہے جو ڈرتے ہیں، تو کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

یہ دونوں آیتیں انبیاء کی اور ان کے بعد آنے والی امتوں کی تاریخ کا آئینہ پیش کرتی ہیں، نبی کے واسطے سے ہدایت کی صاف ستھری راہ کھلتی ہے، عقائد وافکار کی صحت کی ضمانت ہوتی ہے، عمل وکردار کا رخ متعین ہوتا ہے، پھر انبیاء کے دنیا سے چلے جانے کے بعد جو ان کے صحیح

جانشین ہوتے ہیں وہ دین کی تعلیمات کو باقی رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، اور ہدایت کا راستہ اپنی اصل شکل میں محفوظ رہتا ہے، مگر جوں جوں وقت گزرتا ہے، انبیاء کے وارثین دنیا سے اٹھتے جاتے ہیں، ان کے چلے جانے سے علم کا نور مضمحل ہوتا رہتا ہے، پھر ان کے جانشینوں کو علم وعمل کا وہ مقام نہیں حاصل ہوتا جس سے وہ ہدایت کی راہ کو باقی رکھ سکیں، وہ عمل میں بھی کمزور ہوتے ہیں اور علم میں بھی درماندہ ہوتے ہیں، نمازیں ضائع کرتے ہیں، ہدایت کی راہ چھوڑ کر خواہشات اور اپنے ذاتی نظریات وجذبات کے پیچھے چل پڑتے ہیں، اور اس طرح ہدایت کا راستہ گم ہوکر رہ جاتا ہے، پھر اصل تعلیمات کی جگہ تحریفات کی بھرمار ہوجاتی ہے، دینی اعمال میں سستی پیدا ہوجاتی ہے، نبی کے طور طریقے کی جگہ نئے نئے رسوم ایجاد ہوجاتے ہیں، پھر آخری حد یہ ہوتی ہے کہ جن لوگوں کے پاس کتاب الٰہی کا علم ہوتا ہے، جو اسے پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہیں وہ دنیوی مال ومتاع، عارضی چمک دمک اور دنیوی معیار زندگی کی ترقی ونمائش پر فریفتہ ہوجاتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کا ذریعہ اسی کتاب الٰہی اور علوم آسمانی کو بنا لیتے ہیں، جہاں سے مال ملتا انھیں نظر آتا ہے، کتاب اللہ کے فتووں کے رخ کو توڑ مروڑ کر کے ادھر ہی کر دیتے ہیں اور جھوٹی تسلی سے اپنے ضمیر کو مطمئن کرتے ہیں کہ ہماری بخشش تو ہو ہی جائے گی۔

اس طرح ہادیان راہ شریعت کے بعد آہستہ آہستہ گمراہی عام ہوتی چلی جاتی ہے، یہ گمراہی کفر وشرک اور گناہ وبدعملی کی راہ سے تو آتی ہی ہے، اس کے علاوہ خود دین ومذہب کا لبادہ اوڑھ کر، شریعت الٰہی کے رنگ میں رنگین ہوکر بھی بکثرت آتی ہے، ناواقف آدمی اسے حکم الٰہی سمجھ کر مانتا اور بجالاتا ہے، مگر حقیقت میں اسے دین الٰہی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، وہ سراسر گمراہی ہوتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے امتیں جب اس طرح کے احوال سے دوچار ہوتی تھیں، تو حق تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے تازہ نبی بھیج دیتے تھے، جو حق کے روئے زیبا سے باطل کے گرد وغبار کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیتے تھے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ؑ تک انبیاء کرام کا سلسلہ لگاتار قائم رہا، آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر جب نبوت کا دروازہ بند ہوگیا، اور آپ کی نبوت قیامت تک کے لئے استوار اور محکم ہوگئی، ایسی استوار اور ایسی

محکم کہ اب کسی نبی کی بعثت کی حاجت باقی نہ رہی، آپ کی رسالت عام بھی ہے اور اتنی مضبوط اور پختہ بھی ہے کہ اس میں دراندازی کرنے والوں کو تحریف وترمیم کرنے کے امکانات کم سے کم ہیں، آپ کے اوپر اللہ نے جو آخری کتاب نازل فرمائی اس کی حفاظت کا ایسا انتظام بھی فرمایا کہ اس میں تحریف کی کوئی گنجائش نہ رہی، نہ صرف وہ کتاب الٰہی بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے ہر علم وفن کو اس قدر مستحکم کر دیا گیا کہ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، گویا دین کی حفاظت کا انتظام مکمل کر دیا گیا۔ نبی آخرالزماں کی نبوت خود اس درجہ مستحکم ہے کہ اس میں کسی کے لئے دخل اندازی کا امکان کم سے کم ہے، تاہم طبائع انسانی کا جو قدیم انداز ازل سے ہے وہ اب بھی ہے، انسانی ذہن ودماغ، خواہشات وشہوات کے جال میں جیسے پہلے گرفتار رہا ہے اب بھی رہتا ہے، اس لئے ہر مضبوطی اور پختگی کے باوجود انسانی ذہانت اغواء شیطانی سے متاثر ہو کر تحریف وتبدیل اور ترمیم واضافے کے چور دروازے تلاش کر ہی لیتی ہے، شیطان گمراہیوں کو مزین کرتا ہے، طبیعت لذتوں کی جانب ٹوٹ کر آگے بڑھتی ہے، نفس امارہ مختلف حیلوں بہانوں سے ان لذتوں میں آدمی کو مبتلا کرتا ہے اس طرح وہ دین حق سے منحرف ہو کر گمراہی کے گڈھوں میں جا گرتا ہے۔

نبی سے بڑھ کر طبیعتوں کا دانائے راز کون ہوسکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے شیطان کی تمام گمراہیوں اور نفس امارہ کی تمام رخنہ اندازیوں کی نشاندہی فرمادی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح ودرستگی کا مکمل انتظام بھی فرمادیا ہے۔

چنانچہ صاحب مشکوٰۃ شریف نے کتاب العلم میں حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن عذری کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے: **یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین**، یعنی اس علم کو یعنی کتاب وسنت کے علم کو ہر پچھلے طبقے میں سے نیک سیرت، معتبر اور معتمد افراد حاصل کریں گے، وہ اس علم سے غلو کرنے والوں کی دست درازیوں اور تحریفات کو، باطل مدعیوں کے غلط انتسابات کو، نیز جاہلوں کی ناروا تاویلات کو محو کرتے رہیں گے، اور اس کی اصل صورت میں پیش کریں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امت میں تین طرح کے افراد سے دین میں تحریف

وتبدیل کے چوردروازے کھلیں گے۔

(۱) غلو کرنے والوں کی تحریف ۔(۲) باطل مدعیوں کے غلط انتسابات۔ (۳) جاہلوں کی ناروا تاویل۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت نے تمام احکام واعمال اور عقائد ونظریات کی حدیں متعین کررکھی ہیں، اعمال کے بھی حدود ہیں اور عقائد کے بھی، جب تک وہ حدیں قائم رہتی ہیں دین وشریعت کا اعتدال وتوازن برقرار رہتا ہے، اور جب وہ حدیں توڑ دی جاتی ہیں تو دینی تعلیمات میں تحریف کا دروازہ کھل جاتا ہے، اسی لئے ان حدوں کی پاسداری ضروری ہے، بدعت کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے، کہ اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے آدمی آگے بڑھنے لگتا ہے، تو بظاہر وہ اچھا کام کرتا ہے مگر وہ غلط ہوتا ہے، مثلاً عقائد میں ملاحظہ ہو کہ نبی کا مرتبہ عام انسانوں سے بدرجہا بلند ہوتا ہے، وہ معصوم ہوتے ہیں، علم وعمل کے معیار ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ان کی عظمت وجلالت کا اعتقاد فرض ہے، مگر جب اس عظمت کو اس کی حد سے آگے بڑھاتے ہیں تو نبی کو خدا کے درجے میں پہونچادیتے ہیں، بظاہر ایسا وہ عظمت ومحبت سے تقاضے سے کرتے ہیں مگر درحقیقت اس طرح وہ شرک کے قریب جاپڑتے ہیں۔

اس طرح مشہور حدیث میں ہے کہ تین حضرات ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی عبادت کی کیفیت دریافت کی، جب انھیں صورت حال بتائی گئی تو انھوں نے خیال کیا کہ یہ تو کم ہے، پھر کہنے لگے کہ کہاں ہم اور کہاں نبی ﷺ، آپ تو بخشے بخشائے ہیں، ایک صاحب نے کہا میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے صاحب بولے میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے صاحب نے کہا میں عورتوں سے کامل اجتناب کروں گا، نکاح سرے سے نہ کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ نے دریافت کیا، کیا تم نے ایسا ایسا کہا ہے، سنو! مجھے اللہ کی خشیت اور تقویٰ سب سے زیادہ ہے، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات کو نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو کوئی میرے طریقے سے انحراف کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ (بخاری ومسلم)

حدود سے تجاوز کرنے کا نام غلو ہے، غلو کرنے والا دین میں، علم میں تحریف کا مرتکب ہوتا

ہے۔

دوسری چیز غلط مدعیوں کے غلط انتسابات ہیں۔ انتحال کا مطلب یہ ہے کہ بات ہو کسی کی اور منسوب کسی کی طرف کر دی جائے، چنانچہ مدعیان باطل بات تو اپنی جانب سے کرتے ہیں مگر اسے مضبوط بنانے اور رواج دینے کے لئے اللہ و رسول یا کسی بڑے بزرگ عالم کی جانب اس کی نسبت کر دیتے ہیں، نہ جانے کتنی حدیثیں وضع کی گئیں، اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی گئیں، نظریہ بذات خود ایجاد کیا گیا مگر اس کی سند اللہ و رسول کے ساتھ جوڑ دی گئی، اس طرح بہت سی بے بنیاد باتیں اللہ و رسول کی طرف منسوب کر کے انھیں دین کا رنگ دیدیا گیا، حالانکہ ان سے دین کا تعلق کچھ بھی نہیں۔

تیسری چیز جاہلوں کی تاویل باطل ہے، جاہل کا مطلب بے پڑھا لکھا نہیں ہے بلکہ ایسا شخص جس کی طبیعت میں کجی ہے، وہ اپنی طبیعت کی کجی کی وجہ سے آیات واحادیث کا صحیح مطلب نہیں اخذ کرتا بلکہ اپنے غلط نظریات پر کھینچ تان کر انھیں منطبق کرتا ہے، صاف ستھرا مطلب چھوڑ کر اینچ پیچ کی راہ نکالتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں وہ ہیں جن سے دینی تعلیمات اور دینی اعمال میں تحریف وترمیم راہ پاتی ہے، اللہ کا انتظام ہے کہ اس کی تدبیر نے ہر زمانے میں ایسے مخلص اور علم میں رسوخ رکھنے والے علماء پیدا فرمائے ہیں جو صحیح علم اور سچے دین کے اوپر غلو، تحریف، غلط انتسابات اور بے جا تاویلات کے پڑے ہوئے غبار کو ہٹا کر اسے صاف ستھرا واضح کر دیتے ہیں، اللہ کی حکمت نے ہر زمانے میں ایسے اصحاب علم حضرات کو برپا کیا ہے جو دین کو اس کی اصلی صورت میں باقی رکھنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اسی کا ثمرہ ہے کہ ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی دین اسلام اپنے اصل رنگ و روغن کے ساتھ واضح اور نمایاں ہے، جس طرح آنکھ میں اگر ایک تنکا پڑ جائے تو آنکھ بلکہ پورے جسم کو احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی اجنبی چیز آنکھ میں آ گئی ہے، اسی طرح کوئی خوشنما سے خوشنما اور ہلکے سے ہلکا نظریہ بھی دین کا لبادہ پہن کر چاہے جتنے خفیہ راستے سے مذہب میں داخل ہو، اسلام کا اجتماعی معاشرہ اسے محسوس کر لیتا ہے، اور آنکھ کے تنکے کی طرح اسے نکال پھینکتا ہے۔ یہ برکت ہوتی ہے ان اصحاب علم وفضل کی جن سے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت لیتے ہیں، ایسے

حضرات کی تعداد کم وبیش ہوتی ہے، پہلے بہت ہوتے تھے، اب کم ہوتے ہیں، لیکن اسلام پر ایسا دور کبھی نہیں آیا کہ ایسے علماء ناپید ہوگئے ہوں۔

ایک حدیث میں ہے: **لایزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لایضرهم من خالفهم حتیٰ یاتیهم أمر الله وهم ظاهرون** (بخاری ومسلم) میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم اور نمایاں رہے گی، کوئی بھی ان کی مخالفت کرکے انھیں ضرر نہیں پہونچا سکے گا، یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے، اور وہ اس طرح اس پر قائم ہوں گے۔

یہ امت قیامت تک کیلئے زندۂ جاوید ہے، اس لئے ایسے علماء وصلحاء کا وجود بغیر کسی انقطاع کے مسلسل قائم رہا ہے اور قائم رہے گا۔ ان حضرات کے درجات اللہ کے نزدیک بہت بلند ہیں۔

چنانچہ حدیث میں ہے: **من جاءه الموت وهو یطلب العلم لیحیی به الاسلام فبینه وبین النبیین درجة واحدة فی الجنة** (رواہ الدارمی) جس شخص کی موت اس حال میں آئے کہ وہ علم کی طلب میں لگا ہو، تاکہ اس کے ذریعے اسلام کا احیاء کرے، اس کے اور انبیاء کے درمیان جنت میں صرف ایک درجہ کا فاصلہ ہوگا۔

ایسے علماء ومشائخ کا وجود امت کی خوش نصیبی کی علامت ہے۔ **کثر الله امثالهم**

☆☆☆☆☆☆

سفر نامے

(۱) سفر کاندھلہ اور ایک شاہکار علمی تحفہ
(۲) تحفۂ مدینہ
(۳) تحفۂ بہار
(۴) سفر بنگلہ دیش
(۵) سفر بنگلہ دیش

سفر کاندھلہ اور ایک شاہکار علمی تحفہ

۱۵/ربیع الآخر ۱۴۲۲ھ مطابق ۶/جولائی ۲۰۰۱ء ہفتہ کا دن تھا، یہ خاکسار راقم الحروف اپنے چند رفقا کے ساتھ تھانہ بھون میں خانقاہ امدادیہ اشرفیہ حاضر ہوا، ناظم خانقاہ حضرت مولانا نجم الحسن صاحب تھانوی مدظلہ سے گفتگو ہورہی تھی، میں نے ان سے عرض کیا کہ کاندھلہ جانے کا ارادہ ہے، کیا مولانا نورالحسن راشد صاحب سے ملاقات ہوسکے گی؟ انہوں نے ازراہ عنایت فوراً کاندھلہ فون کیا، معلوم ہوا کہ مولانا موصوف کیرانہ گئے ہوئے ہیں، مولانا نجم الحسن صاحب نے فون پر ہی انہیں تلاش کرنے کی مہم چھیڑ دی، تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوا کہ مولانا موصوف سے بات ہورہی ہے، یہاں سے مولانا کہہ رہے تھے کہ آپ فوراً کاندھلہ پہونچئے، فلاں صاحب ابھی کچھ دیر کے بعد ایک مختصر سے قافلہ کے ساتھ کاندھلہ پہونچ رہے ہیں۔ ہم لوگ بارہ بجے کے قریب کاندھلہ پہونچے، مولانا نورالحسن راشد انتظار میں تھے، ان سے ملاقات ہوئی، بہت سادہ مزاج، بہت بے تکلف، اپنی تحقیقات وتحریرات میں جس مقام ومرتبہ کے عالم اور محقق نظر آتے ہیں، ملاقات میں اس بلندی کا شائبہ بھی نہیں جھلکا، اس طرح ملے جیسے ان کا کوئی بڑا انہیں اپنی آمد سے نواز رہا ہو۔ میں عرصہ سے ان کی تحریرات ومقالات پڑھتا ہوں، ان کا ظہور ابتدا ہی سے محققین کی صفِ اول میں ہوا ہے، بلکہ ان میں بھی ممتاز اور نمایاں! ان کی ہر تحریر سند ہوتی ہے، وہ کئی سال سے ''احوال وآثار'' کے نام ایک سہ ماہی مجلّہ نکالتے ہیں، جس میں خصوصیت سے اکابر دیوبند کے بارے میں نادر اور نایاب چیزیں نہایت تحقیق سے پیش کرتے ہیں، ان کا ہر مضمون معلومات میں خوشگوار اضافے کا ضامن ہوتا ہے، بہت دنوں سے ملاقات کی آرزو تھی، مگر اپنے کوتاہ قد اور ان کے بلند قامت کو دیکھتا تھا تو ہمت نہیں ہوتی تھی، وہ ایک بلند پایہ محقق اور میں

نرا واعظ! وہ ایک غیر معمولی مؤرخ اور میں ایک معمولی مدرس! وہ یکسوئی وخلوت کی دولت سے مالا مال اور میں منتشر اور پراگندہ جلوتوں میں گم! میں سوچتا تھا کہ ان سامنے پڑ کر اپنی نارسائی علم کا احساس اور بڑھ جائے گا، مگر ملاقات ہوئی تو سب خیال باطل ہوگئے، علم وتحقیق کی بلندی کے باوجود اتنے تواضع اور انکسار سے ملے کہ اندیشہ ہوا کہ مجھے دھوکہ نہ ہوجائے، خدانخواستہ فریب نفس میں نہ مبتلا ہوجاؤں۔

یہ گھر اکابر بزرگوں کا امین رہا ہے، مشہور متبعِ سنت اور متقی بزرگ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب محدث، حضرت مولانا الیاس صاحب، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہم اللہ، سب کا اسی گھر سے تعلق تھا، یہ گھر اور گھرانہ بچپن سے دل کا مرکز عقیدت تھا، حاضری کی سعادت اب مولانا راشد صاحب کے طفیل ملی، مولانا تو آداب ضیافت میں سرگرم تھے، وہ اس طرح دوڑ دوڑ کر مہمان نوازی میں منہمک تھے جیسے انہیں کوئی بڑی دولت ہاتھ آگئی ہو، اور میں حیرت میں انہیں دیکھ رہا تھا، ان کا قیمتی کتب خانہ دیکھ رہا تھا اور وہاں کا سکون اور وہاں کی یکسوئی دیکھ رہا تھا، جس سے میں مدتوں سے محروم ہوں۔

ابھی حال میں مولانا نے بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کے سلسلے میں ایک ضخیم دستاویزی کتاب ۷۷۵ صفحے پر مشتمل بڑی عرق ریزی سے مرتب کی ہے، اس کا قدرے تعارف مولانا عبدالعلی صاحب کاکوری نے اپنے رسالہ ''البدر'' میں تحریر کیا تھا، اس کتاب کی تقریبِ اجرا کے جلسے میں وہ شریک ہوئے تھے، اسی وقت سے میں اس کتاب کو دیکھنا چاہتا تھا، اتفاق سے جلد ہی ادھر کا سفر ہوا تو ع: تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے۔ کا ایک بہانہ نکل آیا۔ اس کتاب کا نام ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، احوال و آثار وباقیات ومتعلقات'' ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ مصنف سے براہ راست یہ کتاب حاصل کروں، مگر میں اسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ مولانا نے فون پر ہی مولانا نجم الحسن صاحب کو اطلاع دیدی تھی کہ انہوں نے ایک کتاب میرے نام مختص کررکھی ہے، ڈاک سے بھیجنا چاہ رہے تھے کہ میں حاضر ہوگیا، یہ ضخیم کتاب اور اس کے ساتھ اور بھی دو چار کتابیں عنایت فرمائیں، مولانا کا کتب خانہ نہایت بیش

قیمت ہے، اس کا تعارف حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے الفاظ میں پڑھیے، وہ لکھتے ہیں:

> ''کاندھلہ ضلع مفظر نگر یوپی کے ان قصبات میں سے ایک ہے جنہوں نے پچھلی دو صدیوں میں علم وفضل اور ورع وتقوی کے آفتاب وماہتاب پیدا کئے، خاتم المثنوی حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس سرہ کے نام پر یہاں ''حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی'' کے نام جو علمی ادارہ قائم ہے، وہ اس لحاظ سے برصغیر پاک وہند کے علمی وتحقیقی اداروں میں ایک منفرد امتیاز کا حامل ہے کہ اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کے سلسلے کے جبالِ علم وعمل کے مآثر اور ان کے بارے میں معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہے کہ شاید پورے برصغیر (بلکہ شاید پوری دنیا) میں اس کی کوئی نظیر نہ ہو، اس ذخیرے میں خاندانِ ولی اللہی، اکابر دیوبند وسہارن پور، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے معاصرین وخلفا کے قلمی اور نادر ونایاب نسخے، ان حضرات کے مکاتیب اور دوسری مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریریں اس اہتمام سے جمع کی گئی ہیں کہ دوسری جگہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے''۔ (ماخوذ از مقدمہ)

یہ ذخیرہ مولانا راشد صاحب کو اپنے بلند پایہ آباء واجداد سے وراثۃً ملا ہے، مولانا اس سے مسلسل استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں، اور جب موقع مل جاتا ہے اس میں اضافہ بھی کرتے رہتے ہیں، اسلاف کے علمی ورثہ کا ایسا قدردان اہل علم کے گھرانوں میں بہت کم ملے گا۔ مولانا ان نادر ونایاب تحریروں کو ایک ترتیب کے ساتھ سجا سنوار کر اہل علم کے ہاتھوں میں پیش کرتے ہیں، احوال وآثار میں افادات کا سلسلہ جاری ہے، اور اب انہوں نے یہ ضخیم اور بیش قیمت کتاب پیش کی ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے حالات پر یہ کتاب سیرت وسوانح کے انداز پر کوئی مسلسل تحریر نہیں، یہ فرض تو مشہور صاحب قلم، مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے صاحب نظر عالم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہ ''سوانح قاسمی'' کے نام سے ادا کر چکے ہیں، لیکن حیاتِ قاسم کے بہت سے گوشے ابھی مخفی تھے، کئی تحریریں ابھی غیر مطبوعہ تھیں، غیر مطبوعہ مکاتیب کا بھی خاصا ذخیرہ ہے، جو بجائے خود علم وحکمت کے شاہکار ہیں، زیر نظر کتاب میں وہ مخفی گوشے نمایاں کئے گئے ہیں، اور غیر مطبوعہ مضامین ومکاتیب کی تحقیق کی گئی ہے، اس طرح یہ

کتاب حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے علمی و تصنیفی کارناموں کے متعلق متعدد رسائل کا مجموعہ ہے، ان رسائل کے عنوانات ملاحظہ ہو۔

(۱) آئینۂ کمالات (۲) مرقوماتِ قاسمی (۳) متاعِ دلفروز (۴) افاداتِ قاسمی (۵) مآثرِ قاسمی (۶) رہنمائے راہ۔

مولانا نورالحسن راشد نے ''احوال و آثار'' کے علاوہ ایک اور مجلّہ کی بنیاد ڈالی ہے، جس کے صرف خاص نمبر شائع ہوا کریں گے، اس کا نام ''صحیفۂ نور'' رکھا ہے، یہ اس کا پہلا خاص نمبر ہے، اس کا آغاز ''سخن مدیر'' کے عنوان سے ہوا ہے۔

آئینہ کمالات:

(۱) اس عنوان کے تحت حضرت حکیم الامت تھانوی کی مثنوی زیر و بم کے کچھ اشعار نقل کئے گئے ہیں، جو حضرت نانوتوی کی شان میں کہے گئے ہیں۔

(۲) پھر اس کا ذکر ہے کہ حضرت نانوتوی کے دینی مزاج، ان کے زہد و تقوی نیز اتباع سنت کے جذبہ کی تربیت میں کاندھلہ کے مشہور بزرگ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت بابرکت کا دخل ہے، حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کیا تھے؟ اس مضمون میں تعارف کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی جو دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس اور نہایت وسیع العلم بزرگ تھے، ان کی لکھی ہوئی چند سطریں ملاحظہ فرمالیں، لکھتے ہیں:

> ''مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی اس آخری زمانہ میں قدما کے نمونہ تھے، تقوی اللہ اکبر! ایسا تھا اور اس سے وہ نسبت پیدا تھی کہ مشتبہ چیز اگر معدہ میں پہونچ گئی تو اسی وقت قے ہو جاتی تھی، اور اتباع سنت نہ ایسا دیکھا نہ سنا، سبحان اللہ! بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اول ان سے ہوئی''۔ (ص ۵۶)

مرحوم سرسید نے مولانا قاسم صاحب کی وفات پر جو تعزیت مضمون اپنے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا تھا اس کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو:

> ''ان کو جناب مولانا مظفر حسین کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت راغب کر دیا تھا''۔ (ص ۵۷)

حضرت نانوتوی نے پہلا وعظ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے حکم پر کاندھلہ کی خاندانی روایت کے مطابق ان کے مکان پر کیا تھا، وہی مکان جس میں مولانا راشد صاحب ہم لوگوں کی ضیافت کررہے تھے، اس مضمون میں حضرت مولانا کاندھلوی کا بقدر ضرورت اختصار کے ساتھ تذکرہ ہے، کتاب کا یہ حصہ بڑا روح پرور اور ایمان افروز ہے۔

(۳) حضرت نانوتوی قدس سرہ نے ایک عرصہ تک مکتبہ مجتبائی میرٹھ میں قرآن شریف اور علمی کتابوں کی کتابت وطباعت کے سلسلے میں تصحیح کی خدمت انجام دی ہے، حضرت کی تصحیح سے مطبع مجتبائی نے قرآن کریم کی بہت عمدہ طباعت کی تھی، اس کا مفصل تعارف ہے۔

(۴) ہندوستان میں حدیث کی کتابوں کی بڑے پیمانے پر طباعت اور ان پر حواشی لکھنے کا آغاز مشہور محدث حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری علیہ الرحمہ نے کیا، وہ حضرت نانوتوی کے استاذ ہیں، انہوں نے بڑے اہتمام سے بخاری شریف کی حاشیہ نگاری اور اعلی طباعت شروع کی، اس عظیم کام میں انہوں نے حضرت نانوتوی کو باوجود ان کی نوعمری کے شریک کیا، اخیر کے اجزاء پر حضرت نانوتوی کے لکھے ہوئے حواشی ہیں۔

(۵) اس کے مرتب ومحقق نے حیات قاسمی کا اور ہماری دینی وملی تاریخ کا ایک اہم گم شدہ ورق کھولا ہے، ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں روس نے مسلمانوں کی مرکزی حکومت، خلافت اسلامیہ ترکی پر ہلہ بول دیا۔ عیسائی حکومتیں اور روس کی حکومت ہمہ وقت ترکی کو نگلنے کی فکر میں رہا کرتی تھیں، متعدد بار انہوں نے ترکی پر حملے کئے، اب کی بار زبردست حملے ہوا اور اندیشہ تھا کہ حکومت ترکی کو یہ طاقتیں شکست وریخت کردیں گی۔ عام طور سے یہ لڑائی ’’جنگ بلقان‘‘ کے نام سے معروف ہے، اس جنگ میں ہندوستانی علما بالخصوص علماء دیوبند نے حضرت نانوتوی کی سربراہی میں ترکوں کی امداد واعانت بڑے پیمانے پر کی تھی، اس کے سلسلے میں حضرت نانوتوی نے ایک مفصل روداد شائع کی تھی۔ مولانا راشد صاحب نے وہ پوری روداد جزء کتاب بنادی ہے، اس سے حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی دینی حمیت وغیرت اور جوش اسلامی کی ایک تابناک صورت جلوہ گر ہوتی ہے۔

(۶) حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت مولانا

یعقوب صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ نے حضرت کے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر کئے تھے، مولانا گیلانی نے اسے الہامی قرار دیا ہے اور ۲۶ صفحے کے اس رسالہ کو پھیلایا ہے تو تقریباً تیرہ سو صفحات کی کتاب بن گئی ہے۔

اس مختصر رسالے کے کئی ایڈیشن نکلے، محقق موصوف نے ہر ایڈیشن کو پڑھا، ایک دوسرے کا مقابلہ کیا، اور پہلی طباعت کو بنیاد بنا کر متن کو مرتب کیا، حتی الامکان تصحیح کا اہتمام کیا، عنوانات کا اضافہ کیا، بکثرت حواشی لکھے، یہ حاشیے بہت معلومات افزا اور محققانہ ہیں، جن شخصیتوں کے نام کتاب میں آئے ہیں، سب کا تعارف کرایا، مجمل اشارات کی تفصیل کی، اس طرح اس رسالہ کو ایک مکمل صورت میں کتاب کا جز بنا دیا ہے۔

مرقوماتِ قاسمی:

(۱) اس عنوان کے تحت مرتب موصوف نے حضرت نانوتوی کے گیارہ مکاتیب درج کئے ہیں، جو اب تک غیر مطبوعہ تھے، یہ سارے خطوط فارسی زبان میں ہیں، اور سب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کے نام ہیں۔ مولانا راشد صاحب نے اصل خطوط بھی درج کتاب کئے، ان کا ترجمہ کیا، اور بیش قیمت حواشی لکھے۔

(۲) حضرت نانوتوی کی حیاتِ طیبہ کا ایک روشن باب یہ ہے کہ آپ نے غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی حقانیت کو اس طرح مدلل کیا کہ کسی کو مجالِ انکار نہیں ہوسکتی، ہندوؤں میں پنڈت دیانند سرسوتی بڑے مرتبے کے شخص ہیں، انہوں نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی، ان پنڈت جی نے حضرت نانوتوی کی شدید علالت کے دوران یہ سمجھ کر کہ مولانا تشریف لانے سے معذور ہیں، رڑکی ضلع سہارن پور میں بیٹھ کر لاف گزاف شروع کیا، بار بار مسلمانوں کو مناظرہ کا چیلنج دیتے اور یہ بھی کہتے ’’میں کسی اور سے نہیں، مولبی کاسم سے مناظرہ کروں گا‘‘ حضرت کے پاس رڑکی سے پے در پے دعوتیں آنے لگیں، حضرت نے باوجود ضعف وعلالت کے رڑکی جانا منظور فرمایا، تاکہ حق واضح ہوجائے، اور باطل کو منہ زوری کا موقع نہ رہے۔ مولانا اپنے مخصوص تلامذہ کے ساتھ وہاں پہونچ گئے، پنڈت جی نے خلافِ توقع یہ صورت حال دیکھی تو کسی طرح دوبدو مناظرہ کے لئے تیار نہیں ہوئے، اس دوران پنڈت جی سے مسلسل خط وکتابت ہوتی رہی، مگر کسی طرح آمنے

سامنے گفتگو لئے آمادہ نہیں ہوئے، حضرت مولانا سترہ دن رڑکی میں مقیم رہے، حضرت مولانا اور پنڈت جی کے درمیان جو مراسلت ہوئی، حضرت کے سوانح نگاروں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔

یہ مکاتیب پنڈت جی کی سوانح عمری ”جیون چرتر مہارشی دیانند“ میں مصنف نے درج کئے ہیں، مرتب موصوف نے انہیں بغور پڑھا، اور انہیں بھی اور پنڈت جی کے خطوط کو بھی کتاب کے اندر شامل کیا، ان میں جو فروگزاشتیں ہوئیں ہیں ان کی اصلاح کی، یہ پوری داستان اس مراسلت کے ساتھ پہلی مرتبہ سامنے آئی ہے۔

(۳) سوامی جی کے فرار پر اس دور کی ایک بڑی صاحب علم شخصیت، حضرت شیخ الہند کے والد گرامی مولانا ذوالفقار علی صاحب نے ایک نظم عربی میں لکھی ہے، مرتب نے اس نظم کو بھی داخل کتاب کر دیا ہے۔

(۴) محقق مرتب نے حضرت نانوتوی کے مکاتیب کا ایک اور غیر مطبوعہ مجموعہ، حضرت کے ایک تلمیذ رشید مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودوی کے کتب خانہ سے حاصل کر کے اصل نسخے کا فوٹو شائع کیا ہے، بقول مرتب یہ کل تین مکاتیب اور ایک افادہ کا مجموعہ ہے جو اسرار و حکم کے خزینے ہیں۔ پہلے خط میں مطلق لفظ کو مقید کرنے کی کیا صورتیں ہیں؟ اس پر مختصراً بحث ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے ”وانا اول المومنین“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے مومن ہیں، حالانکہ ان سے پہلے بھی اہل ایمان بکثرت گزر چکے ہیں۔ اس سوال کا جواب حضرت نے اختصار کے ساتھ دیا ہے، مگر بہت حکیمانہ اور اصولی جواب ہے۔

اس کے بعد ایک افادہ ہے، درحقیقت یہ بھی مکتوب ہے، کاتب نے مکتوبِ دیگر کے عنوان سے اسے شروع کیا ہے، لیکن چونکہ بظاہر کسی سے خطاب نہیں معلوم ہوتا، اس لئے مرتب و محقق نے اسے ”افادہ“ کا عنوان دیا ہے۔ کسی پادری نے طہارت کے سلسلے میں چار اعتراض کئے، حضرت نانوتوی نے ان چاروں اعتراضوں کے نہایت مفصل جواب دیئے، یہ جواب علم و حکمت سے لبریز ہیں۔

یہاں مرتب موصوف سے سہو ہوا ہے، انہوں نے تین ہی سوال کا ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ

چار سوال تھے۔

(۱) خروجِ ریاح ناقضِ وضو کیوں ہے؟ حالانکہ بظاہر ریاح نجاست نہیں ہے۔

(۲) خروجِ منی ناقضِ طہارت اور موجبِ غسل کیوں ہے؟ حالانکہ منی انسان جیسی اشرف المخلوقات اور اس میں بھی انبیاء کرام علیہم السلام جیسے برگزیدہ طبقہ کا مادۂ خلقت ہے، پاک مخلوق کا مادۂ خلقت بھی پاک ہونا چاہئے۔

(۳) قہقہہ ناقضِ وضو کیوں ہے؟ حالانکہ اس کا نجاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

(۴) نیند ناقضِ وضو کیوں ہے؟ جب کہ اس کا بھی نجاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

حضرت نانوتوی نے اپنے خاص حکیمانہ انداز میں ان چاروں اعتراضوں کے مفصل اور تسلی بخش جواب دیئے۔ ان چار سوالوں کے ساتھ ایک پانچواں سوال بھی تھا، وہ یہ کہ ’’خروجِ نجاست ناقض وضو کیوں ہے‘‘؟ حالانکہ بظاہر نجاست کا بدن سے جدا ہو جانا باعثِ طہارت ہونا چاہئے، نہ کہ باعثِ نجاست؟۔

اس سوال کا جواب اس مکتوب میں نہیں ہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ نے اس کا جواب حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے ایک شاگرد حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب محدث امروہوی علیہ الرحمہ کی زبان مبارک سے اجمالاً سنا، پھر اس کی تفصیل اپنے الفاظ میں کر کے اسے مرتب کیا، اور اس جواب کو اور باقی چاروں مذکورہ بالا سوالوں کے جواب کو ’’اسرار الطہارۃ‘‘ نامی رسالہ میں شائع کیا، محقق موصوف نے پانچویں سوال کے جواب کو اسرار الطہارۃ سے نقل کیا ہے، حضرت قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

> ’’ان پنجگانہ سوالات کا جواب دیتے ہوئے حضرت نے اسلامی وضو وغسل کی حقیقت اور نجاست وطہارت کی حقیقی ماہیت پر بحث فرمائی ہے، جس سے اسلام کا بابِ طہارت ایک نہایت ہی روشن طریقے پر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اور اس کے ذیل میں کتنے ہی اور حقائق ومعارف بھی کھل جاتے ہیں‘‘۔ (زیر نظر کتاب۔ ص ۵۰۴)

متاع دلفروز:

(الف) اس عنوان کے تحت مرتب نے حضرت کی چند تحریریں جو خود حضرت کے قلم سے لکھی

ہوئی ہیں، ان کا فوٹو لے کر شامل کتاب کیا ہے، یہ چار تحریریں ہیں۔

(۱) مباحثۂ شاہ جہاں پور (۲) تنویر النبر اس علی من انکر تحذیر الناس (۳) قصیدہ در مدح خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی (۴) مکتوب (غالباً) بنام مولانا سید احمد حسن امروہوی۔

مباحثۂ شاہ جہاں پور کے متعلق مشہور یہ ہے کہ اسے حضرت نانوتوی کے شاگرد رشید مولانا فخر الحسن صاحب نے مرتب کیا ہے، لیکن محقق کو اس کا جو قلمی نسخہ ملا ہے، وہ خود حضرت نانوتوی کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس رسالہ کا فوٹو کتاب میں شامل ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ نے ایک صاحب علم کے ایک سوال کے جواب میں تحذیر الناس تحریر فرمائی تھی، اس پر مخالفین نے اعتراضات کئے، ان اعتراضات پر مشتمل ایک رسالہ ''قول فصیح'' میرٹھ کے ایک صاحب کے نام سے شائع ہوا تھا، حضرت کو وہ رسالہ لوگوں نے دکھایا تو حضرت نے اس کے حاشیہ پر ان اعتراضوں کے جواب لکھے۔ حاشیہ کی یہ تحریر بعینہ فوٹو لے کر کتاب میں شامل کر دی گئی ہے۔

جنگ بلقان کے موقع پر حضرت نانوتوی نے خلیفہ ترکی عبد الحمید خاں کی شان میں عربی میں ایک قصیدہ کہا تھا، قصیدہ مطبوعہ ہے، مرتب موصوف نے حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا قصیدہ فوٹو لے کر شائع کیا ہے۔

اس کے بعد ایک مکتوب گرامی کا فوٹو ہے، جو غالباً مولانا سید احمد حسن صاحب کے نام لکھا گیا ہے۔

(ب) حضرت نانوتوی قدس سرہ کے علوم بہت غامض اور ادق ہیں، اسی لحاظ سے ان کی عبارتوں کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، سب سے مشکل مضمون ''آب حیات'' کا ہے، مشہور ہے کہ اس میں سے چند اوراق حضرت نانوتوی نے تحریر کے بعد نکال دیئے تھے کہ انہیں سمجھنا بغایت دشوار ہے، لیکن مرتب مدظلہ کی تحقیق یہ ہے کہ وہ اوراق حضرت کی ایک اور تالیف ''قبلہ نما'' کے ہیں۔ یہ اوراق حضرت کے شاگرد رشید مولانا عبد الغنی صاحب پھلاودی علیہ الرحمہ کے کتب خانہ میں تھے، اور اب وہ مرتب موصوف کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہو گئے ہیں، تھوڑا سا ان کا فوٹو بھی شامل کتاب ہے۔

افاداتِ قاسمی:

اس بحث کے بعد افادات قاسمی کے عنوان سے کتب حدیث کے مراتب وطبقات اور تنقید حدیث کے اصول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کے افادات کی روشنی میں ذکر کئے گئے ہیں، یہ اصول حضرت نے اپنی کتاب ''ہدیۃ الشیعہ'' میں تحریر کئے ہیں۔ ہدیۃ الشیعہ کے ان صفحات کا فوٹو شامل کتاب ہے جن میں یہ بحث ہے۔

اس کے ساتھ ہی دینی تعلیم پر اجرت اور دینی مدارس کی تعلیم کے متعلقات پر حضرت کی ایک اہم تحریر بلکہ فتوی شامل کیا گیا ہے، چند اور افادات بھی ہیں۔

مآثر قاسمی:

اس عنوان کے تحت حضرت مولانا کے مکتوبات، تالیفات، افادات، مکتوبات کے مضامین اور حضرات مکتوب الیہم کی مفصل فہرست اور اشاریہ ہے۔

رہنمائے راہ:

آخر میں رہنمائے راہ کے عنوان سے حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ اور ان کے علوم و معارف پر کام کرنے کا طریقہ کیا ہو؟ اسے محقق موصوف نے تفصیل سے لکھا ہے، اور اس کے لئے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا محمد میاں منصور غازی انصاری (نواسۂ حضرت نانوتوی) اور مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی کے کچھ ہدایات بھی نقل کئے ہیں۔

یہ کتاب کیا ہے؟ معلومات کا ایک گراں قدر خزانہ ہے، جس میں ۷۰ سے زیادہ اشخاص وافراد کا اجمالی یا تفصیلی تذکرہ ہے، بعض نزاعی یا مشتبہ امور کا محاکمہ اور فیصلہ ہے، کتاب ہر طرح لائق مطالعہ ہے۔

البتہ مرتب موصوف کی خدمت میں ایک مشورہ ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے حضرت نانوتوی کی تحریر کا عکس پورے پورے رسالہ یا مکتوب کا دیدیا ہے۔ حضرت مولانا کے مضامین تو یونہی ادق ہوتے ہیں، جو عام قاری کی دسترس سے باہر ہیں، پھر اس پر مسودہ کی تحریر جو عموماً بہت صاف اور واضح نہیں ہوتی، اور اس پر قدامت کا اثر پڑ جاتا ہے تب تو اس کا پڑھنا اور مشکل ہو جاتا ہے، مزید یہ کہ جس دور کی وہ تحریریں ہیں، کتابت کا انداز اب اس سے خاصا تبدیل ہو گیا،

سو سال پہلے کی تحریر خواہ کتنی ہی صاف ہو، آج کے اردو خواں کے لئے بہت مشکل ہے، اس دور میں ''ے'' اور ''ی'' میں کوئی امتیاز نہ تھا، ایک کو دوسرے کی جگہ بے تکلف لکھتے تھے، موجودہ دور میں دونوں میں بڑا فرق ہے، آج کا املا ''سمجھا'' ہے، پہلے اس کو ''سمجہا'' لکھتے تھے، اور بھی جہاں جہاں ہائے ہوز اور ہائے دوچشمی آتی ہے، ایک کو دوسرے کی جگہ لکھتے چلے جاتے تھے، اب یہ طریقۂ املا متروک ہو چکا ہے، پھر مستزاد یہ کہ کاغذ کی کہنگی کی وجہ سے فوٹو ناصاف ہو جاتا ہے اور کچھ پریس کی مشین روشنائی کو اڑا دیتی ہے، ایسی عبارتوں سے استفادہ نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

ان مجموعی مشکلات کی وجہ سے عکسِ تحریر سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔ مرتب موصوف ماشاء اللہ دیدہ ور ہیں، قلمی تحریرات پڑھنے کے مشاق ہیں، پرانے اور نئے طرز املا سے واقف ہیں، وہ ناظرین کی خاطر تکلیف اٹھاتے اور حضرت کی تحریرات کی کتابت یا کمپوزنگ کرا کے بطرز موجودہ شائع کرتے اور نمونے کے لئے دو تین صفحات کا عکس کتاب میں شامل کر دیتے تو زیادہ مناسب ہوتا، کتاب کی افادیت بہت بڑھ جاتی، اعتماد بھی برقرار رہتا۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ مآثر ونوادر قاسمی کی گمشدگی اور نایابی کا احساس مرتب مدظلہ کو بہت شدت کے ساتھ ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کا زور وشور سے ماتم کیا ہے کہ یہ ماتمی تحریریں کہیں کہیں جارحانہ ہوگئی ہیں۔ اس سے پڑھنے والے کے ذہن میں یہ تأثر قائم ہوتا ہے کہ ہمارے وہ اکابر جو براہ راست حضرت نانوتوی کے وارث تھے، انہوں نے علوم قاسمی کی ناقدری کی، لاپرواہی برتی، بلکہ بعض ضروری اور بنیادی چیزیں جان بوجھ کر انہوں نے ضائع کر دیں، گم شدہ اوراق کی تلاش بہت عمدے چیز ہے، لیکن اگلوں کی ناقدری کی شکایت ذرا کھٹکتی ہے، حالانکہ ان حضرات کی تلاش وجستجو کا ایک نمونہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کے قلم سے اسی کتاب میں موجود ہے۔

اس مسئلے میں اس ناچیز کا خیال یہ ہے کہ حفاظت واضاعت کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے، جن چیزوں کی حفاظت منظور ہوتی ہے اس کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں، اور جن چیزوں کی اضاعت منظور ہوتی ہے اس کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالی نے قرآن کریم کی حفاظت کا تفصیلاً وعدہ کیا ہے، اسی کے ذیل میں احادیث نبویہ کی حفاظت ہوگئی ہے، اس کے علاوہ

کسی کے علوم ومعارف کی حفاظت کا وعدہ نہیں ہے، جو کچھ محفوظ رہ گیا اللہ کا احسان ہے، اور جو ختم ہوگیا تو دستور یہی ہے کہ علما کے اٹھ جانے سے علم اٹھ جاتا ہے، جتنا کچھ سفینہ یعنی کاغذ میں آجاتا ہے وہ اس سے بہت کم ہوتا ہے جو سینے میں رہتا ہے، اس لئے گم شدہ دولت پر افسوس اور ماتم نہ کرکے موجودہ دولت ہی کو قابل استفادہ بنانا چاہئے، اس کا منصوبہ بنانا چاہئے کہ حضرت نانوتوی کے علوم سے استفادہ کیوں کر عام ہوسکتا ہے؟ حضرت کی کتابوں کا حال یہ ہے کہ اچھے خاصے اذکیاء بھی چند ورق پڑھنے کے بعد تھک جاتے ہیں، ان کو صحیح طور پر سمجھنا اور انہیں سہل انداز میں پیش کرنا ایک کام ہے، پرانے کئی علما کے بارے میں سنا ہے کہ حضرت نانوتوی کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھتے تھے، اب بھی ذہین وذکی اساتذہ جو حضرت کی کتابیں سمجھ سکتے ہیں، ذی استعداد طلبہ کو پڑھائیں تو فائدہ عام ہو، علم وہ نہیں جو کتاب میں ہے بلکہ علم وہ ہے جو دماغ میں ہے، ہم نے دماغوں میں اسے اتارا نہیں، دلوں کو اس سے مناسبت نہیں ہوئی، تو کاغذ کے سفینوں میں اس کی حفاظت کیا کرسکیں گے؟۔

پھر یہ بھی ہے کہ مضامین ومکاتیب اور تصنیف وتالیف پر مصنف کے مزاج کا اثر سایہ فگن رہتا ہے، حضرت نانوتوی کا مزاج فنا وخمول کا تھا، وہ کہیں بھی نمایاں نہیں ہونا چاہتے تھے، کیا عجب اس رنگ طبیعت کا پرتو خود حضرت کے مقالات ومضامین پر بھی پڑ گیا ہو کہ عربی اور انگریزی ترجمہ تو الگ رہا، خود اصل تصنیف کی زبان میں بھی مشہور نہ ہوسکے۔

……………………………

آج کل ہر چیز میں آسانی ڈھونڈھ لی جاتی ہے، کتابت کے لئے کمپیوٹر کی ایجاد نے کاتب کے نازنخروں کی مصیبت سے بڑی حد تک نجات دلادی ہے، مگر ایک دوسرا دردسر پیدا ہوگیا ہے، وہ یہ کہ باوجود کوشش کے کتابت کی اتنی غلطیاں رہ جاتی ہیں کہ ان کی تلافی مشکل نظر آتی ہے، زیر نظر کتاب تو بہت ضخیم ہے، ضخامت کے لحاظ سے کتابت کی غلطیاں کم ہیں، پھر بھی بہت ہیں، تصحیح پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محنت بہت ہوئی ہے، مگر کمپیوٹر تو کمپیوٹر ہے، وہ بناتے بناتے بھی کلمات وحروف کو بگاڑ دیتا ہے۔

صفحہ ۴۹ پر غلطی سے حضرت شاہ یعقوب دہلوی کو حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کا بڑا

بھائی لکھا گیا ہے، حالانکہ وہ چھوٹے بھائی تھے۔

کتابت کی غلطیوں کی نشان دہی کتاب ہی کے صفحات پر کر دی ہے، ارادہ ہے کہ زیر تعارف نسخہ حضرت محقق موصوف کی خدمت میں نذر کروں اور اس کے عوض دوسرا نسخہ حاصل کروں۔[۱]

ماخذ: المآثر۔ نومبر، دسمبر، جنوری (۲۰۰۱۔۲۰۰۲)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) زیر نظر نسخہ کی تصحیح کتابت مکمل کر کے اسے مرتب موصوف کے پاس بھیج دیا، انہوں نے بہت شکر گزاری کے ساتھ دوسرا نسخہ ارسال فرما دیا۔ جزاک اللہ خیر الجزاء

تحفۂ مدینہ طیبہ

۱۴۳۱ھ کے رمضان شریف شروع ہونے سے ایک روز قبل حق تعالیٰ کی توفیق سے قسمت نے یاوری کی، بلدۂ مکرمہ، مرکز ایمان ومحبت، قیامگاہ نبوت اور دیار ہجرت ورسالت مدینہ منورہ زادہا اللہ عزاً وکرامۃً میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، ایک امتی کے لئے اس سے بڑھ کر شرف اور خوش بختی کیا ہوگی کہ اسے دنیا کے سب سے بڑھ کر شفقت ورحمت والے آقا، رحمۃ للعالمین ﷺ کے قرب میں کچھ ٹھہرنے اور رہنے کا نصیبہ حاصل ہوجائے، حاضری کے ان ایام کو حاصل زندگی کہئے تو بجا ہے۔

یہاں میرے بہت قریبی دوست شیخوپور کے رہنے والے افتخار احمد اعظمی انتظار واستقبال میں پہلے سے موجود تھے، ان کے واسطے سے ان کے رشتے کے ایک بھانجے محمد اسعد عرف چنّو سے ملاقات ہوئی، یہ بلریا گنج کے رہنے والے ہیں، ایک عرصہ سے مدینہ طیبہ میں مقیم ہیں، اس سے پہلے بھی ایک حاضریٔ طیبہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، ان کی زبان سے بار بار ایک شخصیت کا تذکرہ پہلے بھی سنا تھا اور اس حاضری میں بھی سن رہا تھا۔

بلریا گنج کے ایک غیر مسلم گھرانے کے ایک ہونہار بچے پر اللہ کا فضل خاص ہوا، وہ اسلام کی نعمت عظمیٰ سے نوازا گیا، صاحبزادے ”بانکے لال“ سے ضیاء الرحمٰن ہوئے، بلریا گنج کے مشہور ومعزز معالج جناب حکیم محمد ایوب صاحب علیہ الرحمہ نے سرپرستی فرمائی۔ جنوبی ہند کے مشہور دینی ادارہ جامعہ دارالسلام عمرآباد سے تعلیم کی تکمیل کی، پھر مزید علمی فیوض وبرکات جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ اور جامع ازہر مصر سے حاصل کرتے رہے، تعلیم کے مرحلوں سے فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کلیۃ الحدیث میں استاذ مقرر ہوئے اور

اس کے منصب صدارت پر فائز ہونے کے بعد جامعات کے دستور کے مطابق سبکدوش ہوئے۔

اب مدینہ منورہ کے گہوارۂ سکون ویکسوئی میں ہمہ تن خدمت حدیث شریف میں منہمک ہیں، کیا خدمت کرر ہے ہیں؟ محمد اسعد صاحب یہ تو نہیں بتا پا رہے ہیں، لیکن کہہ رہے ہیں کہ بہت طویل المیعاد کام ہے، دس سال سے لگے ہوئے ہیں، پانچ سال اور لگیں گے، انھیں فرصت نہیں رہتی شب وروز کا زیادہ حصہ اسی شغل میں بسر ہوتا ہے، پچھلی حاضری میں ان کی مشغولیت کی کثرت کی وجہ سے، اور اس لئے بھی کہ میں بہت معمولی اور چھوٹا ہوں، بڑے علماء سے ملنے کی ہمت نہیں کر پاتا کیونکہ جو خود بونا ہو کسی طویل القامت کے پاس کھڑا ہو تو اسے بونا ہونے کا احساس بڑھ جاتا ہے، یہی حال میرا ہے، بہت چھوٹا ہوں، بڑے لوگوں کی خدمت میں حاضری ہوتی ہے تو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس **المضاعف** ہو جاتا ہے۔

لیکن اب کی بار ایک نئی بات یہ ہوئی کہ محمد اسعد صاحب نے ان کے سامنے میرے ایک مضمون کا تذکرہ کیا، جو میں نے حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم کی وفات پر لکھا تھا، انھیں حکیم صاحب سے قلبی تعلق ہے، انھوں نے اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میری کتاب ’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘ میں وہ مضمون شامل ہے، وہ کتاب میرے خاص کرم فرما اور محسن مولانا حافظ محمد مسعود صاحب مدظلہ..... جو عرصۂ دراز سے مدینہ شریف میں مقیم ہیں..... کے پاس ہے، ان سے حاصل کر کے وہ کتاب ان کے پاس بھجوادی، مضمون پڑھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور ملاقات کے لئے ۸؍رمضان المبارک بعد نماز ظہر کا وقت متعین فرمایا، حضرت حافظ صاحب اپنی گاڑی سے محمد اسعد صاحب کی رہنمائی میں ہمارے قافلہ کو مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب کے دولت کدے پر جو حقیقت میں ’’علم کدہ‘‘ ہے، لے گئے، اس قافلہ میں ان دونوں حضرات کے علاوہ خاکسار اور اس کے بیٹے مولانا حافظ محمد راشد سلّمہٗ اور میرے دوست افتخار احمد اعظمی صاحب تھے۔

مولانا نہایت اخلاق اور تواضع سے ملے، سفید ریش بزرگانہ صورت اور بزرگانہ ادائیں، مل کر بہت اُنس محسوس ہوا، بے تکلف سادہ، گفتگو بہت نرم اور شیریں، لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ، ملنے سے خوشی کا اظہار، اور میرے مضمون اور اُسلوبِ نگارش کی تحسین کرتے رہے، کتاب خاصی پڑھ لی تھی۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کی خدمت حدیث کا تذکرہ بارہا سنا، مگر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ آپ کی خدمت کس نوعیت کی ہے؟ اس پر مولانا نے تفصیل سے اپنی خدمت کا تذکرہ فرمایا:

ہر مسلمان جانتا ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات واحکام کی اَساس بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں، اول قرآن، دوسرے سنت، انھیں دونوں چیزوں کے مجموعے کا نام دین ہے، قرآن تو اللہ کا کلام ہے، اس کے لفظ لفظ اور اس کی ایک ایک طرزِ ادا کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، چنانچہ اس کے جمع وتدوین کا کام حق تعالیٰ نے خلافت راشدہ کے عہد میں مکمل کردیا۔ ابتداءً حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اس کا کامل نسخہ تیار کرایا، لیکن اس ایک نسخہ کے علاوہ دوسرے حضرات صحابہ کے نسخے کلمات وحروف اور حرکات وسکون اور طرزِ ادا کے جزوی اختلاف کے ساتھ پڑھے جاتے تھے، اور اپنے تلامذہ ومتعلقین کو اسی طریقہ پر تعلیم دیتے تھے، اس کی بنیاد پر اندیشہ تھا کہ امت میں اختلاف بلکہ شقاق وخلاف کا دروازہ کھل جائے گا، امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان ؓ نے اس مجموعے کی جو حضرت خلیفہ اول نے تیار کرایا تھا سرکاری طور پر نقلیں تیار کرائیں اور تمام اسلامی عملداری میں انھیں بھجوایا اور حکم نافذ کیا کہ صرف یہی نسخہ پڑھا اور پڑھایا جائے، اس کے علاوہ اور سارے نسخوں کو اکٹھا کرکے نذر آتش کردیا، اس طرح امت ایک بڑے فتنہ سے بچ گئی۔

دین کی دوسری بنیاد سنت ہے، جس کا منبع ومرجع احادیث واقوال وافعال رسول **علیہ الصلوٰۃ والسلام** ہیں، ان کے تحفظ وبقا کا تکوینی نظام دوسرے طریقے پر ظہور میں آیا، ہم دیکھتے ہیں کہ امت کی بہترین صلاحیتیں، بہترین دماغ، اعلیٰ درجے کے حافظے، صاحب ورع اور متقی شخصیتیں اللہ ورسول کی محبت میں ڈوب کر، دنیا وجہان کے تمام علوم وافکار سے منہ موڑ کر تین صدیوں تک اس مہم پر کمربستہ رہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، آپ کے احوال وسوانح اور آپ کے متعلق ایک ایک معاملہ کو محفوظ ومدوّن کرلیں، نبی ﷺ کی وفات کے بعد مختلف تبلیغی وتعلیمی اور جہادی مہمات میں آپ کے صحابہ چونکہ مختلف بلاد وامصار میں پھیل گئے تھے، اس لئے وہ لوگ جنھوں نے آپ کی صحبت نہیں پائی مگر آپ کی محبت میں غرق تھے، ان کی تسکین کا سامان یہ تھا کہ وہ

حضرات صحابہ کی خدمت میں پہونچیں اوران سے نبی ﷺ کے ارشادات واحوال معلوم کریں، پھر تو پورا عالم اسلام حرکت میں آ گیا، لوگوں نے سواریوں کے رخ ہراس طرف پھیرے جہاں جہاں انھیں رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کی خوشبو محسوس ہوئی، اس وقت کو اگر آپ تصور کی نگاہوں میں لائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہزاروں ہزار افراد مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں سرگرم سفر ہیں، اور جہاں انھیں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی حدیث مل سکتی ہے وہاں ٹھہر جاتے ہیں، خدمت میں پڑ جاتے ہیں، حدیث یاد کرتے ہیں، انھیں لکھتے ہیں، پھر خود بھی مرکز علم بن جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ نے تلاش حدیث کے لئے اتنے سفر کئے کہ اگر وہ سیدھے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے تو تین چکر پورے ہو جاتے۔

پھر ان حضرات نے یہ التزام کیا کہ جن واسطوں سے یہ حدیثیں انھیں حاصل ہوئی تھیں ایک ایک کا نام یاد رکھا اور ہر واسطے کو بالالتزام بیان کیا، اس کا نام سند رکھا، اس طرح اسناد کا ایک عظیم الشان ذخیرہ تیار ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ سند میں آئے ہوئے یہ واسطے باستثنائے صحابہ کرام سب ایک درجے کے نہ تھے، کسی کا حافظہ قوی تھا ہے، کسی کا کمزور ہے، کوئی محتاط ہے، کوئی غیر محتاط، کوئی متقی و پرہیزگار ہے اور کوئی غیر معتبر ہے، ان واسطوں کے اعتبار سے حدیثوں کے درجات اور ان کے معتبر ہونے میں فرق ہوا، ان سب کو لکھ کر مرتب کیا گیا، اس طرح احادیث کا ایک عظیم الشان ذخیرہ سینوں سے منتقل ہو کر سفینوں میں محفوظ ہو گیا۔

یہ دینی علم کی دوسری بنیاد ہے، محدثین نے بڑی محنت اور کاوش سے چوتھی صدی تک تمام حدیثوں کو ان کی سند کے ساتھ مدوّن ومرتب کر دیا، اب ہر اس مسئلے کیلئے جس کا تعلق دین سے ہے اس کی دلیل یا تو قرآن میں ہے یا ان حدیثوں میں ہے، یا پھر ان کی بنیاد اجماع یا اجتہاد و استنباط میں ہے۔

اگر کسی مسئلے کی دلیل حدیث میں ہے، تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ یہ حدیث کس درجے کی ہے؟ یہ ایک دقت طلب اور مشکل کام ہے، لیکن اس مشکل کام سے محدثین عہدہ برآ ہو چکے ہیں، اور ہر ہر حدیث پر وہ واضح حکم لگا چکے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، حسن ہے، یا ضعیف وموضوع ہے،

اب انھیں تلاش کرنے کی محنت ہے، اور اس عظیم الشان ذخیرے میں صحیح اور حسن حدیثوں کو تلاش کرنا بھی آسان نہ تھا۔

احادیث کے ذخائر میں چھ کتابوں کو قبول عام حاصل ہوا، لیکن صحیح حدیثیں انھیں چھ کتابوں میں منحصر نہیں، ان کتابوں میں صحیح احادیث کا ایک بڑا حصہ محفوظ ہے، لیکن ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی بڑا عظیم ذخیرہ ہے۔

مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک عظیم الشان منصوبہ بنایا، اور اس میں یکسوئی کے ساتھ منہمک ہو گئے، وہ منصوبہ یہ ہے کہ جہاں جہاں جس جس کتاب میں صحیح اور حسن مرفوع حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں سب کو یکجا کر دیا جائے، یہ کام بہت ہمت طلب اور پُر مشقت ہے، اس کے لئے تمام ذخائر حدیث کا مطالعہ کرنا، ان میں سے صحیح یا حسن مرفوع روایتوں کو تلاش کرنا، پھر ان کی صحت کے متعلق دلائل مہیا کرنا، انھیں مرتب کرنا، ایک طویل اور مسلسل جہد ومشقت کا عمل ہے، ایک عرصہ ہوا کہ مولانا اسی محنت وکاوش میں لگے ہوئے ہیں، وہ فرما رہے تھے کہ میری نیت ہے کہ سب صحیح حدیثیں جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے اور وہ صحت کے ساتھ ثابت ہیں، اور جو دین کی بنیاد ہیں، میں یکجا کر کے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دوں، اس کے واسطے سے حضور اکرم ﷺ کی صحبت میں میری حاضری ہو جائے اور اللہ کی رضا حاصل ہو جائے۔

مولانا نے اپنے اس عظیم منصوبہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

قسم اول: ایمان، علم، عبادات

قسم ثانی: معاملات واحکام

قسم ثالث: تفسیر، سیرۃ، مغازی، مناقب، ادعیہ، گزشتہ انبیاء واقوام وملل کے واقعات

اس منصوبہ کے دو حصے بفضل اللہ وعونہ پورے ہو چکے ہیں، جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہیں، ان کے مجموعی صفحات ۷۲۰۰ ہیں، اور ان میں حدیثوں کی تعداد ۶۸۰۰ ہے۔

اب مولانا تیسری قسم مرتب کر رہے ہیں، فرما رہے تھے کہ سیرت نبوی پر کام چل رہا ہے، غزوۂ احد تک پہونچا ہوں۔

یہ منصوبہ مولانا نے ۱۴۲۲ھ میں شروع کیا تھا، اور امید ہے کہ ۱۴۳۵ھ میں تکمیل کو ان شاء اللہ پہونچے گا۔

مولانا فرما رہے تھے کہ صحاح ستہ میں کل صحیح حدیثیں بغیر تکرار کے سات ہزار سے کچھ زائد ہیں، اور اتنی ہی ان کے علاوہ میں بھی ہیں، اس طرح تقریباً پندرہ ہزار متونِ حدیث جمع ہو جائیں گی، ان شاء اللہ، اس مجموعہ کا نام مولانا نے ''**الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل**'' رکھا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ میری تلاش وجستجو کے مطابق حدیث کے تمام ذخائر میں ساٹھ سے ستر ہزار کے درمیان حدیثیں ہیں جو تقریباً تین لاکھ سندوں سے مروی ہیں، لیکن یہ حدیثیں بکثرت سندوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مکرر سہ کرر ہیں، تکرار سے خالی کر کے جب حدیث صحیح کے متون کو منتخب کیا جائے گا تو ۱۲ سے ۱۵ ہزار کے درمیان ہوں گے۔

یہ منصوبہ جب مکمل ہوگا.....اور خدا کرے مولانا کی عمر، صحت اور جدوجہد میں برکت ہو کہ یہ عظیم الشان کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے.....تو امت کے ہاتھوں میں صحیح احادیث کا ذخیرہ یکجائی طور پر موجود ہوگا، پھر اس کی تحقیق وتنقیح کی دردسری نہ ہوگی کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا صحیح ہے۔

مولانا کو اور ان کی محنت اور جذبۂ اخلاص وعمل کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد: **مثل امتی کمثل المطر لایدری اولها خیر أم آخرها** یاد آتا ہے، یعنی میری امت کی مثال بارش جیسی ہے کہ نہ معلوم اس کا ابتدائی حصہ بہتر ہے یا اس کا آخری حصہ۔

ابتدائی صدیوں میں حضرات محدثین نے شہر شہر قریہ قریہ چل کر لمبے لمبے سفر کر کے اپنے آپ کو مشکلات میں ڈال کر صبر واستقامت کے عدیم النظیر کارناموں کے ساتھ احادیث کے ذخیرے ان کی سندوں کے ساتھ مہیا کر دیئے، ہر حدیث پر جرح وتعدیل کے قوانین کے مطابق احکام لگائے، تا کہ حدیث گھڑنے والے کی دسیسہ کاریوں سے امت محفوظ رہے، اس سلسلہ میں اتنی محنت وکاوش ہوئی، اور ہر زمانہ میں علماء نے اس کا اتنا اہتمام کیا کہ فن حدیث کا ایک بڑا کتب خانہ تیار ہو گیا، اس عظیم کتب خانے کے اوراق وصفحات سے صحیح حدیثوں کو منتخب کرنا اور ان کے صحیح

ہونے کے دلائل مہیا کرنا طول طویل اسفار کے مرتبے میں، حق تعالیٰ کی توفیق سے مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب اعظمی ۱۴۲۲ھ سے مسلسل یہ سفر کررہے ہیں، وہ اپنے موضوع میں اس درجہ منہمک ہیں کہ انھیں دیکھ کر متقدمین یاد آتے ہیں۔

احادیث کا عظیم الشان کتب خانہ ان کے پاس ہے، اور وہ شب وروز اس میں سرگرم عمل رہتے ہیں، میں ان کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اپنی قیمتی مصروفیات کے ان لمحوں میں ایک معمولی بہت معمولی آدمی کو حاضری کا موقع دیا۔

فجزاه الله خير الجزاء وبارک فی علمه وعمله وعمره ودنياه وآخرته.

☆☆☆☆☆☆

تحفۂ بہار

۱۴۰۴ھ میں میرے قلم سے مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کی سوانح حیات بنام ''حیات مصلح الامت'' شائع ہوئی، گو کہ فی نفسہ کتاب میں کوئی خاص حسن و جمال نہ تھا، مگر صاحب سوانح کی شخصیت ایسی پرکشش اور باکمال تھی کہ اس نے خود تحریرِ سوانح کے اندر جاذبیت پیدا کردی۔ بزرگوں نے، ادیبوں نے اور دوستوں نے اسے بہت پسند کیا، اس کتاب نے بہت سے اللہ والوں کی نگاہ کرم میری طرف مبذول کرادی، جن بزرگوں کی خصوصی نگاہِ کرم ادھر متوجہ ہوئی، ان میں بہار کے رہنے والے میرے نہایت محترم بزرگ الحاج ماسٹر قاسم صاحب مدظلہ بھی ہیں، حضرت موصوف کی نوازشیں اور مہربانیاں مجھے اس وقت سے حاصل ہیں، جب میں الہ آباد میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا، اس وقت چند بزرگوں کے ہمراہ حضرت ماسٹر صاحب الہ آباد تشریف لائے۔ یہ حضرات امروہہ سے واپس ہورہے تھے، معلوم ہوا کہ ان حضرات کے شیخ ومرشد حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہوی کا وصال ہوگیا ہے، اسی سلسلہ میں ان بزرگوں کا سفر ہوا تھا، واپسی میں الہ آباد بھی آئے تھے، فطری طور پر رنج وحزن کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں تھے، بس صرف تعارف کی حد تک ملاقات ہوئی، لیکن دل نے گواہی دی کہ یہ لوگ خاصانِ خدا میں سے ہیں، چہروں پر سرورِ عشق آنکھوں میں یقین کا نور صاف جھلک رہا تھا، زبانوں پر خاموشی کا پہرہ تھا، مگر انداز بتارہا تھا کہ دل میں ایمان کے جذبات موجزن ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد میری واپسی غازی پور کو ہوگئی، جہاں سے میں الہ آباد گیا تھا، وہاں حضرت ماسٹر قاسم صاحب کی عنایات کا ظہور ہوا۔ ابتداء حضرت موصوف نے اپنے دو فرزندوں مولوی محمد عاصم ومولوی محمد ہاشم سلمہما کو بغرض تعلیم میرے پاس بھیجا، پھر خود بھی کئی مرتبہ تشریف لائے، ہر

بارطبیعت ان سے مزید متاثر ہوتی رہی، جب حیات مصلح الامت چھپ کر شائع ہوئی تو تحریر فرمایا کہ ”آپ کے قلم سے اگر ہمارے شیخ حضرت مولانا سراج احمد صاحب کی سوانح بھی آجاتی تو بہت اچھا ہوتا“۔ میں نے اس حکم کو اپنے لئے غنیمت سمجھا، ایک تو اللہ والے کی سیرت، دوسرے ایک بزرگ کے حکم کی تعمیل۔ نور علی نور کا مصداق!

دل میں ٹھان تو لیا کہ یہ کام ضرور انجام دینا ہے، مگر تدریسی مشغولیات میں اس کی گنجائش کہاں؟ کہ معلومات فراہم کیجئے، انہیں ترتیب دیجئے، اس کا موقع سال میں ہونے والی دو تین تعطیلوں میں مل سکتا تھا، مگر ان تعطیلوں کا حال یہ ہے کہ وہ پہلے ہی سے اسفار کے لئے متعین ہوتی ہیں، مواعظ کے پراگرام اور جابجا دوروں کے ہنگاموں میں قرطاس وقلم کی تنہائیاں کہا نصیب؟ اسی میں بات ٹلتی رہی، دل میں یہ خیال ہوا کہ ایک سفر کر کے ماسٹر صاحب موصوف کی خدمت میں حاضری دی جائے اور وہیں سکون اور یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر یہ کام انجام دے لیا جائے۔ اپنے اس خیال کا اظہار حضرت موصوف سے بھی کر دیا، ماسٹر صاحب بہت مسرور ہوئے، شعبان ۱۴۱۰ھ کی تعطیل اس کام کے لئے متعین کرلی، مگر اس وقت دوسرے اسفار اور اچانک ناگفتنی ایسے واقعات پیش آتے چلے گئے کہ رمضان قریب آگیا، اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ کی کوئی تاریخ تھی کہ میرے عزیز دوست حافظ آفتاب عالم صاحب سلمہ مدرسہ شیخ الاسلام تشریف لائے، انہوں نے سابقہ وعدہ کی یاد دہانی کرائی۔ میں نے ارادہ کیا کہ بقرعید کی تعطیل میں وہاں کا سفر کرلوں، مگر پھر یہ بات ذہن میں آئی کہ بقرعید کے تین دنوں میں گھر رہنا ضروری ہے، اور ان تین دنوں کو نکال دوں تو کام کے دن بہت کم بچیں گے، دوسرے یہ ایام شدتِ باراں کے ہوں گے، بالخصوص جس علاقے میں جانا ہے وہ سیلاب کی کثرت کے لئے معروف ہے، پھر بات اس پر ٹھہری کہ ربیع الاول میں ششماہی امتحانات ہوتے ہیں، امتحان کے بعد ایک ہفتہ کی تعطیل ہوگی، یہ وقت سفر کے لئے مناسب ہوگا۔ چنانچہ حافظ صاحب سلمہ سے اس کا وعدہ کرلیا، انہوں نے واپس جا کر ماسٹر صاحب کو اس وعدہ کی اطلاع کر دی۔

درمیان میں موانع کی صورتیں پیش آتی رہیں، مگر اب کی عزم کیا گیا تھا، حق تعالی نے

اس کے سامنے ان رکاوٹوں کو ٹکنے نہ دیا، رکاوٹیں آتی رہیں، اور خش وخاشاک کی طرح بہتی رہیں، بہرحال حق تعالی نے مقدر فرمادیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔

روز شب کا قافلہ اپنی رفتار سے چلتا رہا، یہاں تک کہ ۷/ربیع الاول کو امتحانات ختم ہوگئے، بہار جانے والا قافلہ بھی زادوراحلہ کے ساتھ تیار ہوگیا، اس قافلہ میں ہمارے مدرسہ سے مولوی مہتاب عالم صاحب مدرس شعبہ عربی، عزیزم مولوی ہاشم سلمہ استاذ درجہ فارسی اور مدرسہ دینیہ غازی پور سے عزیزم مولوی ابوالخیر کلکتوی مدرس شعبہ عربی اور ان کے علاوہ حافظ آفتاب عالم صاحب سلمہ اور عزیزی مولوی حافظ عبدالجبار مظفر پوری شریک ہیں۔ یہ سب لوگ بھی شیخو پور میں مجتمع ہوگئے تھے، عصر کی نماز مدرسے میں پڑھ کر یہ قافلہ عازم سفر ہوا، مغرب کی نماز کے بعد اعظم گڑھ جامع مسجد میں ہم لوگ پہونچے، نماز سے فارغ ہوکر رفقا نے کھانا کھایا، عشا کی نماز کے بعد اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن کے لئے روانگی ہوئی، ٹرین کا وقت بارہ بجے کے بعد تھا، لیکن ہندوستان میں کوئی ٹرین وقت کی پابند نہیں، دو بجے کے قریب ٹرین آئی، اس سے چھپرا تک پھر چھپرا سے دوسری ٹرین پر سوار ہوکر مظفر پور پہونچے، مظفر پور میں مغرب کی نماز ادا کی، پھر بس سے دربھنگہ ساڑھے آٹھ بجے پہونچے، توقع یہ تھی حضرت ماسٹر صاحب نے کسی کو بس اسٹیشن بھیجا ہوگا، نیز میں نے اپنے عزیز دوست مولوی حبیب اللہ سلمہ کو مدھوبنی اطلاع کردی تھی، یقین تھا کہ وہ بھی آئے ہوں گے، لیکن جب ہم لوگ بس سے اترے تو ایک ہو کا عالم تھا، کوئی بھی نہ تھا۔ خیال ہوا کہ دیر ہوئی ہے شاید آنے والے مایوس ہوکر واپس چلے گئے ہوں۔ سوال تھا کہ اب کہاں جایا جائے؟ آج ہندؤوں کا تہوار ہے، دسہرہ کی دھوم دھام ہے، بس اسٹیشن ہر طرح کی سواریوں سے خالی ہے، نہ کوئی رکشہ نہ کوئی ٹمپو، نہ کوئی جیپ اور بس اسٹیشن شہر سے اتنی دور کہ سامانوں سے لدے پھندے پیدل جانا بھی ممکن نہیں، یا اللہ اب کیا ہو؟ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، سواریاں تلاش کررہے ہیں، مگر معلوم ہوا کہ سب سواریاں اور سب سواریوں کے ڈرائیور دسہرہ کے میلہ میں مگن ہیں، اور ہم چند لوگ حیران پریشان سڑک پر ایک ایک کا منہ دیکھ رہے ہیں، اتنے میں حافظ آفتاب سلمہ کے ایک شناسا جوان کے نانیہالی گاؤں کے تھے، مل گئے، انہوں نے دعوت دی کہ رات میرے مکان پر چل گزار لیجئے، یہ موقع غنیمت معلوم ہوا، مگر جائیں کیسے؟ سامان لے سڑک

پر ڈال ہم لوگ کھڑے ہوگئے، وہ بیچارے سائیکل پر سوار گشت لگاتے رہے کہ کوئی سواری ملے تو لے آئیں، بڑی مشکلوں اور بڑی دیر کے بعد ایک ٹمپو کو لے کر آنے میں کامیاب ہوگئے، اس نے جوں توں کر کے ان کے مکان تک پہونچایا، مکان خالی تھا، ان کے بچے گاؤں گئے ہوئے تھے، وہاں آرام ملا، عشا کی نماز پڑھی اور سو گئے، صبح بذریعہ بس روانگی ہوئی، یہ بس سپول جانے والی تھی اس سے ہم لوگ آشاپور تک گئے، آشاپور سے حافظ آفتاب عالم نے ایک جیپ ریزرو کی، اور اس سے ہم لوگ ساڑھے نو بجے پوہدی بیلا پہونچے، جو ہماری منزل تھی، ابھی گاؤں سے دور ہی تھے کہ حضرت ماسٹر صاحب دو آدمیوں کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے، گاڑی روک کر ان سے مصافحہ ومعانقہ کیا، پھر وہ بھی گاڑی پر بیٹھ گئے، اور بعافیت ہم لوگ مدرسہ اشرفیہ پوہدی بیلا میں داخل ہوئے۔

ماسٹر صاحب کے چہرے پر کچھ استعجاب کے اثرات تھے، بعد میں معلوم ہوا کہ کل انہوں نے مدرسہ کے ایک استاذ کو دربھنگہ ہم لوگوں کے استقبال کے لئے بھیجا تھا، ماسٹر صاحب کو معلوم تھا کہ ہم لوگ رات میں کسی طرح پوہدی بیلا نہیں پہونچ سکتے، اس لئے انہوں نے دربھنگہ شہر میں قیام کا بندوبست معقول کرادیا تھا، ماسٹر صاحب کو اس پر تعجب تھا کہ وہ مولوی صاحب کہاں چلے گئے؟۔

یہ علاقہ جہاں کا ہم نے سفر اختیار کیا تھا، اس کا قدرے تعارف کرادینا ضروری ہے، یہ خطہ دربھنگہ شہر کے پورب تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، یہاں سے ہمالیہ پہاڑ کچھ دور نہیں ہے، آج دنیا مادی اعتبار سے جس تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب دوڑ رہی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، شہروں اور مرکزی علاقوں میں چلے جایئے، تو دولت امنڈی پڑ رہی ہے، ہر روز زمین کا سینہ شق کر کے اونچی اونچی وسیع وعریض بلڈنگیں سر اٹھا رہی ہیں، سڑکیں صاف وشفاف ایک سے بڑھ کر ایک، اور پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سواریاں، موٹریں، بسیں، کاریں اور موٹر سائیکلیں کارخانوں سے نہیں، انہیں سڑکوں کے بطن سے پیدا ہو کر دوڑنے لگ جا رہی ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک ڈھلی ڈھلائی سواریاں، بجلی کی رو ایسی دوڑا دی گئی ہے جیسے اب اندھیرے کی دنیا میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، ہر طرف روشنی کی فراوانی، لیکن آپ اس علاقہ میں چلے جایئے جہاں کی

بات میں کر رہا ہوں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عروج وترقی کی دوڑ یہاں آتے آتے بالکل مدھم پڑ گئی ہے، نہ اونچی اونچی عمارتیں نظر آتی ہیں، نہ جال کی طرح پھیلی ہوئی بہترین سڑکیں، نہ رنگ برنگ سواریوں کی بہتات، نہ بجلی کے قمقمے جو رات کو دن بنائے رہتے ہیں، آشاپور سے جب ہم لوگ پوہدی کی طرف چلے ہیں تو جس زمین پر ہماری جیپ اچھل کود کر رہی تھی، نام تو اس کا سڑک ہی لیا جاتا ہے، مگر سڑک کی تعریف اس پر ہر قدم پر ٹوٹتی نظر آرہی تھی، کنکر ضرور بچھے تھے، ان کنکروں پر ڈامر کے نشانات بھی تھے، مگر ایسے ہی کہ کہیں ڈامر بہت زور دکھایا تو چند سنگریزوں پر غالب آگیا، ورنہ عام طور پر سنگریزوں کی بغاوتِ عام نے ڈامر کو شکست فاش ہی دے رکھی ہے، ہماری جیپ اسی طرح اچھل رہی تھی جیسے اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر بیل گاڑی اچھلتی ہے، ہماری ہڈیوں کا ڈھانچہ زیروزبر ہو کر رہ گیا، آٹھ دس کلومیٹر کی مسافت غالباً گھنٹہ بھر سے زائد میں پوری ہوئی، راستے میں عمارتوں کا جو منظر سامنے آیا، اس نے تو ہمارے لئے دور قدیم کی یاد تازہ کر دی، پکی اور اونچی عمارت گاہے ماہے کہیں کہیں اس طرح نظر آتی تھیں جیسے کسی نے صحرا میں کوئی پختہ عمارت تعمیر کر لی ہو، ورنہ زیادہ تر پھوس کے مکانات نظر آئے، جو کھپریل کی ستر پوشی سے بھی بے نیاز تھے، بجلی کے تار اور کھمبے بھی ضرور دکھائی دیئے، مگر جسد بے روح اور لاشۂ بے جان، شاید مہینوں کے بعد ان میں زندگی کی رو دوڑتی ہو، ہم تو ہفتہ بھر اس علاقہ میں رہے ایک منٹ کے لئے بھی کہیں بجلی کی جھلک نہیں دکھائی دی، ان پھوس کے مکانات میں ٹمٹماتے دیئے، اور بھکبھکاتی لالٹینیں کتنی روشنی پھیلاتیں؟ بجلی کے قمقموں کی عادی آنکھیں انہیں اندھیرا ہی سمجھتیں۔ یہ علاقہ مکمل سیلاب کی زد میں رہتا ہے، ایک تو ندی نالہ بہت ہیں، دوسرے ہمالیہ کی بلندی یہاں سے قریب ہے، بارش اور ندیوں کا پانی تو کم تباہی مچاتا ہے، مگر جب سیلاب کی رو ہمالیہ پہاڑ سے اترتی ہے تو پورا علاقہ تہ و بالا ہو جاتا ہے، سال کے چھ مہینے سیلاب کی نذر ہو جاتے ہیں، پھر ترقیاتی اسکیمیں آئیں تو کہاں سے آئیں؟۔

ہمارا قیام پوہدی بیلا میں تھا، یہ ایک بہت بڑی آبادی ہے، جہاں ضروریات کی تقریباً سبھی چیزیں ملتی ہیں، اس کے پاس ڈیڑھ دو کلومیٹر سے لے کر دس پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر چھوٹی بڑی بہت سی دیہی آبادیاں ہیں، جن میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد بستی ہے، آگے چند

گاؤں کا تذکرہ آئے گا، ان ساری آبادیوں میں پوہدی بیلا کو مسلمانوں کے حق میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے، کیوں کہ یہاں عربی کا ایک مدرسہ ہے، یہ مدرسہ اشرفیہ عربیہ کے نام سے موسوم ہے، اس کی بنیاد ۱۳۵۴ھ میں اسی علاقے کے مشہور بزرگ حضرت مولانا حکیم عبدالمنان صاحب ہرسنگھ پوری نے رکھی ہے۔ ہرسنگھ پور اس اس دیار کا مشہور گاؤں ہے، اس گاؤں کو حضرت مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگھ پوری کا وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، حضرت مولانا محمد عارف صاحب حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کے مرید اور حضرت شاہ محمد علی صاحب مونگیری کے خلیفہ، بہت بافیض اور بابرکت عالم تھے، نہایت سادہ مزاج، بے تکلف اور قوی النسبت لوگوں میں تھے، انہوں اس علاقہ میں بہت کام کیا، مدرسہ رحمانیہ انہیں کا قائم کردہ ہے، جو عرصہ تک علما و اکابر کا مرجع رہا، اور اب بھی ماشاءاللہ اس کا فیض جاری ہے، موجودہ امیر شریعت بہار حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نے انہیں مولانا عارف صاحب سے تربیت اور اجازت پائی ہے۔

حضرت مولانا محمد عارف صاحب کے چار صاحبزادے ہوئے، جن میں اس وقت ایک صاحب زندہ ہیں۔ بڑے حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب، ان کے بعد مولانا لطف الرحمان صاحب، اور ان کے بعد مولانا حکیم عبدالمنان صاحب، یہ تینوں بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، ان تینوں بزرگوں نے اس علاقے میں بہت کام کیا، اور اپنے نامور والد محترم کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔

مولانا حکیم عبدالمنان صاحب پوہدی میں سرکاری اسکول کے استاذ تھے، مولانا کے دل میں دین کی سچی تڑپ اور مسلمانوں کی بہی خواہی کی پر جوش لگن تھی، وہ دن رات ایک کر کے مسلمان عوام میں دینی بیداری کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے، مگر انہیں محسوس ہوا کہ ان بڈھے طوطوں کو پڑھانا بڑا مشکل ہے، تو ان کے نور فراست نے یہ راستہ دکھایا کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے ایسا ادارہ قائم کرنا چاہئے جو سرکاری مداخلت سے پاک ہو، چنانچہ انہوں نے مدرسہ عربیہ اشرفیہ کی بنیاد رکھی، اور خاموشی کے ساتھ کام شروع کر دیا، اللہ تعالی نے انہیں چند مخلص اور باہمت رفقا بھی عطا فرمائے، جن کی کوشش سے یہ مدرسہ خدمت کے میدان

میں آگے بڑھتا رہا، حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب اور حاجی محمد حسین صاحب ان کے مخلص لوگوں میں تھے، جن کی کوششوں اور کاوشوں نے مدرسہ کو پروان چڑھایا، اس مدرسہ میں اللہ تعالی نے بہت برکت عطا فرمائی، یہاں کے متعدد طلبہ اچھے عالم وفاضل بن کر دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اس پورے علاقے میں حضرت مولانا محمد عارف صاحب اور ان کے صاحبزادگان نیز مولانا سراج احمد صاحب امروہوی کی مساعی جمیلہ کے آثار وثمرات نمایاں ہیں، کم پڑھے لکھے لوگ ہیں، کم مالدار ہیں، مگر دینی جذبہ، تواضع اور اکابر کے احترام سے ان کے قلوب معمور ہیں۔

جس وقت ہم لوگ مدرسہ میں داخل ہوئے تو طلبہ واساتذہ تو خیر ملاقات اور مصافحہ کے لئے دوڑے ہی، ایک اور عجیب بات مشاہد میں آئی، جس کا تجربہ یوپی اور بہار کے مدرسوں میں کم از کم مجھے تو کبھی نہیں ہوا، کہ ان طلبہ واساتذہ کے ساتھ مدرسہ کے دونوں باورچی ہاتھ دھوکر مصافحہ کے لئے لپکے چلے آرہے ہیں، اسی طرح راج مستری اور ان کے ساتھ کام کرنے والے مزدور جو کہ سب مسلمان تھے، اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر ملاقات کے لئے دوڑے ہوئے آئے، یہ تجربہ میرے لئے بالکل نیا تھا، اور پھر نماز کے اوقات میں یہ لوگ نماز میں بھی حاضر تھے، یہ ماحول انہیں بزرگوں کی برکت کا اثر ہے۔

چند گھنٹوں کے بعد مولانا فیاض صاحب صدر المدرسین، دربھنگہ سے تشریف لائے، انہوں نے بتایا کہ میں بھی اور مولانا حبیب اللہ صاحب بھی بس اسٹیشن پر مغرب کے پہلے سے موجود تھے، جب ساڑھے سات بجے تک آپ لوگ نہیں آئے تو خیال ہوا کہ اب بہت دیر ہوگئی ہے، اب بس کا وقت بھی نکل چکا ہے، مولوی حبیب اللہ صاحب کو مدھوبنی جانے والی آخری بس ملی، وہ مدھوبنی چلے گئے، اور میں مدرسہ امدادیہ چلا گیا کہ حالات ایسے ہو رہے تھے کہ بعد میں سواری ملنا مشکل ہوجاتا جیسا کہ ہم لوگوں کے ساتھ بعد میں پیش آیا۔

چونکہ آج ہی سفر کر کے دھکے کھاتے ہوئے آئے تھے اس لئے آج کا پورا دن ملاقاتوں میں اور تکان مٹانے میں صرف ہوگیا، ویسے مجھ پر تکان کا کوئی خاص اثر نہ تھا مگر حضرت ماسٹر صاحب نے غالباً اسی خیال سے کوئی پروگرام نہ بنایا نہ بتایا، ہاں شام کو میں نے ماسٹر صاحب سے

درخواست کی کہ وہ معلومات جوانہوں نے حضرت مولانا سراج احمد صاحب علیہ الرحمہ کی سوانح حیات سے متعلق تحریری طور پر جمع کرر کھے ہیں، مجھے دے دیں، تا کہ ان کا مطالعہ کر کے سوانح کا ایک خاکہ ذہن میں مرتب کرلوں، ماسٹر صاحب نے چند کاغذات اور ایک سفر نامہ اور ملفوظات کا مسودہ عنایت فرمایا، یہ معلومات مجھے اتنے کم محسوس ہوئے کہ ان کے بنیاد پر پوری کتاب کا خاکہ بنتا محسوس نہیں ہوا، میں نے عرض کیا کہ ان معلومات سے چند صفحے کا مضمون شائع کر دیا جائے، ماسٹر صاحب نے اس کو پسند فرمایا، رات سے لے کر صبح تک میں اپنے ذہن میں ترتیب سوانح کا نقشہ بناتا رہا اور بگاڑتا رہا، اب کچھ کچھ صاف خطوط ذہن پر نمایاں ہونے لگے تھے۔

۱۰؍ربیع الاول ۱۴۱۱ھ:

آج فجر کی نماز کے بعد وعظ ہوا، وعظ کی بنیاد اس مشہور حدیثی دعا پر رکھی گئی جو حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ کو تلقین فرمائی تھی کہ:

عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ ﷺ اخد بیدہ یوماًثم قال: یا معاذ! واللہ انی لاحبک فقال لہ معاذ بابی انت وامی انا واللہ احبک قال اوصیک یا معاذ! لا تدعن فی دبر کل صلوۃ ان تقول اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک. (رواہ ابوداوٗدونسائی والترہیب ج۲ص۴۵۴)

اے معاذ! مجھے تم سے محبت ہے، لہٰذا تم نماز کے بعد یہ کبھی نہ ترک کرنا ”**اَللّٰھُم اَعِنِّی عَلٰی ذِکرِکَ وشُکرِکَ وحُسنِ عِبَادَتِکَ**“. اے اللہ! آپ اپنی یاد پر، اپنے شکر پر اور حسن عبادت پر میری مدد فرمایئے۔ اس وعظ میں حدیث کے جز یعنی **یا معاذ! انی احبک** کی مفصل تشریح کی گئی، اور قدرے ذکر پر بھی روشنی ڈالی گئی۔

وعظ سے فارغ ہو کر سوانح کے لئے فراہم شدہ معلومات کا از سر نو جائزہ لیا، گہری نظر سے ان کا مطالعہ کیا، پھر اس کی بسم اللہ کر دی۔

حضرت ماسٹر صاحب نے ایسا نظم کر دیا تھا کہ میرا وقت صبح سے ظہر کے وقت تک بالکل فارغ رہے، اس وقت نہ ملاقاتیوں کا ہجوم ہوتا نہ کوئی اور کام ہوتا، بس صبح قرطاس وقلم کی محفل ترتیب دیتا اور بارہ بجے تک ناشتہ کا تھوڑا سا وقفہ مستثنی کر کے مسلسل اسی محفل میں جما رہتا، بارہ

بجے یہ محفل برخاست کر دیتا۔ آج ابتداء کر دی، لیکن خدشہ یہ تھا کہ میرا اندازِ تحریر نہ جانے ماسٹر صاحب کو پسند آئے یا نہ آئے؟۔

اسی لئے دو تین صفحے جو آج لکھے گئے، وہ ماسٹر صاحب کو سنا دیئے گئے، انہوں نے میرے اندازوقیاس سے زیادہ پسند فرمایا، اور تحسین کی، پھر تو طبیعت کھل گئی، ظہر کی نماز کے بعد کھانے کا اور قدرے قیلولہ کا معمول قرار پایا، عصر کے قبل سوانح کے سلسلے میں مزید غور فکر کرتا رہتا، کوئی اور عارضی کام پیش آجاتا تو اس کی انجام دہی میں مشغول ہوجاتا۔

بعد نماز عصر حضرت ماسٹر صاحب نے بتایا کہ یہاں سے قریب ایک جگہ برہم پورہ ہے، آج مغرب کی نماز کے بعد وہاں پروگرام ہے، اس لئے مغرب کی نماز وہیں چل کر پڑھی جائے، تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر یہ گاؤں ہے، پوہدی سے ہم لوگ اس انداز سے چلے کہ مغرب کے پہلے وہاں پہونچ جائیں۔

یہ راستہ کھیتوں کے درمیان مینڈھوں پر تھا، نیچی اونچی مینڈھوں پر چڑھتے اترتے ٹھیک اذانِ مغرب کے وقت وہاں پہونچے، میرا خیال تھا کہ نماز کے بعد مسجد میں مصلیوں کے سامنے کچھ بیان کرنا ہوگا، مگر وہاں تو لوگوں نے اچھا خاصا جلسہ منعقد کر رکھا تھا، تھوڑی دیر مولوی ابوالخیر سلمہ نے گفتگو کی، اس کے بعد میں نے وعظ سننے کے فوائد اور اہمیت، نیز شادی بیاہ کی تباہ کن رسوم اور اللہ اور رسول کی اطاعت پر مفصل کلام کیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وعظ ہوا، اس گاؤں میں طبیعت بہت لگی، اچھے لوگ معلوم ہوئے، وعظ کے بعد عشا پڑھی گئی، اور کھانا کھا کر وہاں سے واپسی ہوئی۔

۱۱؍ربیع الاول:

آج بھی بعد نماز فجر وعظ ہوا، آج ذکر کے موضوع پر قدرے تفصیل سے کلام کیا گیا۔

سوانح کی تسوید کا کام آج زیادہ ہوا، اندازہ ہوا کہ معلومات کاغذ پر گو کم محسوس ہو رہے ہیں، مگر حضرت ماسٹر صاحب جو حضرت امروہوی کے معتمد خاص ہیں، ان سے بہت کچھ معلومات فراہم ہوجائیں گے۔ بارہ بجے تک یہ مشغولیت رہی۔

آج کا پروگرام یہ ہے کہ موضع سسونی جو پوہدی سے کہنے کو تو ملا ہوا ہے مگر میری قیام

گاہ سے کم از کم ڈیڑھ کیلو میٹر ضرور ہے، وہاں کھانا کھانا ہے، اور اس سے لگی ہوئی بستی سہجو لی میں وعظ کہنا ہے۔ میرے عزیز دوست مولوی عبدالشکور سلمہ جو مدرسہ قاسم العلوم زمانیہ غازی پور میں استاذ شعبہ عربی ہیں، مجھ سے الہ آباد میں پھر غازی پور میں پڑھا ہے، اچھی صلاحیت کے عالم ہیں، سسونی کے رہنے والے ہیں، بہت عرصہ سے ان کا بھی اصرار تھا کہ ایک بار ادھر کا سفر ضرور ہو، اب جب میرا پروگرام بنا تو اتفاق سے وہ کلکتہ گئے ہوئے تھے، کلکتہ ہی میں انہیں میرے پروگرام کی اطلاع ملی، تو از راہ سعادت مندی مدرسہ نہ جا کر گھر چلے آئے، اور برابر میرے ساتھ رہے۔ آج انہوں نے اپنے گھر ہمارے پورے قافلے کی دعوت کر رکھی ہے، ان کا گاؤں چونکہ بہت چھوٹا ہے، اور سہجو لی اس کے مقابلہ میں بڑا گاؤں ہے، اس لئے وعظ کا پروگرام سہجو لی میں رکھا ہے کہ سسونی کے لوگ بھی وہاں جا کر شریک ہو جائیں گے۔ پوہدی سے نماز مغرب پڑھ کر چلے تھوڑی دیر سسونی میں رکے، وہاں چائے پی، پھر رفقا سہجو لی چلے گئے، وہاں مولوی مہتاب عالم صاحب نے تقریر کی، اسی روز میرے ایک عزیز دوست مولوی مجاہد حسین سلمہ سیتامڑھی سے آ گئے تھے، انہوں نے تقریر شروع کی تھی کہ میں پہونچ گیا، وقت کے زیادہ ہو جانے کے خیال سے انہوں تقریر موقوف کر دی، پھر میں نے آخرت کی اہمیت اور **الدنیا مزرع الآخرة** کے تصور کی شرح کرتے ہوئے دنیا کی حیثیت کیا ہے؟ اس پر مفصل کلام کیا، مجمع خاصا تھا مگر ذرا بے ترتیب۔

نماز عشا وہیں ادا کی، پھر کھانا مولوی عبدالشکور صاحب کے یہاں آ کر کھایا، رات مدرسہ میں گذاری۔

۱۲ / ربیع الاول:

آج صبح سو کر اٹھا تو سر میں تکلیف محسوس ہوئی جو تھوڑی دیر میں شدت اختیار کر گئی، سوچا کہ آج صبح کا وعظ موقوف کر دوں مگر اس سے لوگوں کو تشویش ہوتی، اس لئے معمول کے مطابق وعظ ہوا، آج بھی حدیث مذکور کے پہلے جز یعنی ذکر کی ایک دوسرے عنوان سے تفصیل کی گئی۔

سوانح کی ترتیب کا کام ایک حد تک ہو چکا ہے، حضرت امروہوی کے طریقۂ اصلاح و تربیت پر لکھنا تھا، میں نے جناب ماسٹر صاحب سے عرض کیا کہ آپ کی حضرت سے کافی مراسلت

ہوئی ہوگی، اگر وہ محفوظ ہوں تو مجھے عنایت فرمادیں، انہوں نے ازراہ عنایت ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۹ء تک کے تمام خطوط میرے حوالے کردیئے، سر میں شدید درد کے باوجود میں نے پورے ذخیرے کا مطالعہ کرڈالا، اور جو چیزیں سوانح میں لانے کے مناسب تھیں، انہیں منتخب کرلیا، آج تحریری کام بالکل نہ ہوا، درد کی شدت میں حرکت مشکل تھی، مگر بحمد للہ مطالعہ جاری رہا۔

رات کا پروگرام آج پوہدی مدرسہ کے اندر ہی تھا، مغرب کی نماز کے بعد آس پاس کی آبادیوں سے بھی لوگ آگئے، آج چونکہ بارہ ربیع الاول ہے، فطری طور پر ذہن سیرت نبوی ﷺ کے بیان کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ سیرت پر بیان ہوا۔

۱۳؍ربیع الاول:

آج رات میں حافظ آفتاب عالم سلمہ کے خسر کے والد کا انتقال ہوگیا، اچھے آدمی تھے، نماز کا بہت اہتمام رکھتے تھے، عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی، کوئی بات نہ تھی، رات میں اچانک کوئی تکلیف ہوئی، اور نہایت سہولت سے کلمہ پڑھتے ہوئے جان دیدی، اللہ تعالی مغفرت فرمائیں۔ چونکہ فجر میں ان کے انتقال کی اطلاع ملی، اس لئے آج کے وعظ میں شکر کے متعلق بیان تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ صبر کی توضیح وتشریح بھی اس میں شامل کردی، تا کہ اہل بیت کے سامنے تسلی کا مضمون آجائے، نماز جنازہ بعد نماز ظہر ادا کی گئی۔ سوانح کی ترتیب کا کام آج نسبتاً کم ہوا، کیوں کہ آج کچھ محترم ومعزز حضرات بغرض ملاقات تشریف لائے تھے، جامعہ رحمانیہ سپول کے صدر مدرس حضرت مولانا ہارون رشید صاحب اور ایک دوسرے بزرگ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے کرم فرمایا، کچھ دیران بزرگوں سے گفتگو رہی، بہت اچھے اور متواضع لوگ تھے۔ مسودہ کا کچھ حصہ میں نے سنایا، مولانا ہارون رشید صاحب جو خود بھی تالیفی وتصنیفی ذوق اچھا رکھتے ہیں، انہوں نے بہت تحسین کی۔

بعد نماز ظہر دو بزرگوں سے ملاقات ہوئی، مولانا سعد اللہ صاحب یہ حضرت مولانا محمد عارف صاحب علیہ الرحمہ کے پوتے اور حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ جامعہ رحمانیہ سپول میں عربی کے استاذ ہیں، ذی استعداد عالم ہیں، لیکن بہت منکسر ومتواضع اور خاشع وخاضع ہیں۔ دوسرے مولانا صفی الرحمان صاحب عرف ممتاز بابو، یہ بھی حضرت مولانا

محمد عارف صاحب علیہ الرحمہ کے پوتے ہیں، مولانا حکیم عبدالمنان صاحب کے فرزند ہیں، ان حضرات سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔ میری خواہش تھی کہ اس سفر میں ہرسنگھ پور جوان حضرات کا گاؤں ہے، دیکھ لیتا، اور حضرت مولانا محمد عارف صاحب علیہ الرحمہ اور ان کے نامور صاحبزادگان کی مزارات پر فاتحہ پڑھ لیتا، ممتاز بابو نے بھی پروگرام بنا رکھا تھا، مگر اب مجبوری ظاہر کر رہے تھے کہ گاؤں کے کنارے جوندی ہے، اس میں پانی زیادہ آ گیا ہے، اب جانا ممکن نہیں رہا، افسوس کر کے رہ گیا کہ اب کیا صورت ہو سکتی ہے؟۔

آج شام کا پروگرام مرزاپور کا ہے، یہ گاؤں پوہدی سے ۵، ٦ کلومیٹر دور ہے، حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب کا وطن ثانی ہے، ماسٹر صاحب کا آبائی وطن پوہدی کے پورب پندرہ سولہ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں کھور مدن پور نامی ہے، وہاں سیلاب کی طغیانی ہر سال گھروں کو اجاڑ دیا کرتی تھی، اس کے سبب ماسٹر صاحب نے مرزاپور میں مکان بنا لیا تھا، مگر بعد میں ایک باندھ کے ذریعہ کھور کا علاقہ کسی قدر محفوظ کر دیا گیا تو ماسٹر صاحب مرزاپور سے کھور منتقل ہو گئے (اب بھی وہاں ان کی زمین وجائداد نیز مکان ہے، مگر اس میں اس وقت ان کی منجھلی لڑکی قیام پذیر ہے، جس کی شادی وہیں ہوئی ہے) طے یہ کیا گیا کہ عصر سے پہلے بیل گاڑی سے جس میں ٹائر کے پہیئے لگائے جاتے ہیں (جسے وہاں کی زبان میں ٹائر گاڑی کہتے ہیں) روانگی ہو، عصر کی نماز راستے میں ایک جگہ بگھیلا نامی ہے، وہاں مدرسہ میں پڑھی جائے، اور مغرب کی نماز مرزاپور میں ادا کی جائے، مگر ٹائر گاڑی کے آنے میں دیر ہوئی، اس لئے قدرے تاخیر سے روانگی ہوئی، ٹائر گاڑی میں مَیں، ماسٹر صاحب، مولانا سعداللہ صاحب، مولوی عبدالشکور صاحب، مولوی ابوالخیر صاحب اور مولوی ہاشم سلمہ سوار ہوئے، مولوی مہتاب عالم کو سائیکل دیدی گئی کہ وہ ٹائر گاڑی سے وحشت زدہ تھے، پوہدی سے باہر نکل کر ایک بڑے تالاب کے کنارے گاڑی روک کر عصر کی نماز ادا کی گئی، نماز کے بعد پھر گاڑی روانہ ہوئی، راستہ کیا تھا نشیب وفراز کا مجموعہ تھا، ہر قدم پر گاڑی نیچے اوپر ہوتی تھی، بعض جگہ چھوٹی موٹی نہریں بھی پار کرنی پڑیں، بیل عرصہ کے بعد گاڑی میں جوتے گئے اور کچھ بیمار بھی تھے، بار بار پتلا پاخانہ کر رہے تھے، اور گاڑی بان کو اس کی کچھ زیادہ فکر نہ تھی، گاڑی کے کھنچنے میں جو دقت تھی وہ تھی ہی، بیلوں کے مسلسل پاخانوں نے اور پیچیدگی پیدا

کردی، گاڑی بان سے احتیاط کی تاکید برابر کی جاتی رہی، مگر ہوا یہ کہ ایک مرتبہ ایک بیل نے پاخانہ کرتے ہوئے جودم ہلائی ہے تو میں، ماسٹر صاحب اور مولانا سعداللہ صاحب ٹھیک اس کی زد میں آگئے۔ چنانچہ ہم تینوں کے کپڑے خراب ہوگئے، مولانا سعداللہ صاحب نے فرمایا کہ فقہانے جو تسہیلات کتابوں میں لکھی ہیں ان کی قدر ایسے ہی مقامات میں ہوتی ہے، خیر صاحب گرتے پڑتے بکھیلا مدرسے پر ایسے وقت پہونچے جب کہ مغرب کی اذان ہورہی تھی، میرے کپڑے زیادہ خراب ہوگئے تھے، اس لئے مجھے کپڑے تبدیل کرنے کی ضرورت تھی، اور کپڑے ساتھ لئے نہیں گئے تھے، مدرسہ کے استاذ جناب مولانا اسلام الدین صاحب نے اپنے کپڑے عنایت فرمائے، انہیں پہن کر مغرب ادا کی، اور دوسرے صاحبان نے اپنے اپنے کپڑے دھولئے۔ یہاں ہم لوگوں کے آمد کی اطلاع پہلے سے تھی، اس لئے یہ حضرات چائے وغیرہ تیار کرکے انتظار ہی میں تھے۔ اس جگہ کا پانی زمین سے بہت گرم نکلتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آگ پر گرم کیا گیا ہو، پوہدی میں بھی پانی گرم ہوتا ہے مگر یہاں اس سے کہیں زائد ہے، معلوم ہوا کہ پانی میں گندھک کے اثرات زیادہ ہیں، اور غالباً یہ بات صحیح ہے، میں جب پوہدی آیا تھا تو بدن پر خارش کا خاصا اثر تھا مگر دو ہی روز میں سارا جسم صاف ہوگیا۔ نماز مغرب پڑھ کر مولوی ہاشم سلمہ سائیکل لے کر پوہدی چلے گئے، تاکہ میرے لئے اور ماسٹر صاحب کے لئے کپڑے لائیں، اور ہم کچھ دور پیدل چلے، ایک چھوٹی سی ندی پر لکڑی کا پل بنا ہوا تھا (یہ جگہ بکھیلا گھاٹ کے نام سے موسوم ہے) اسے پار کرکے ایک رکشہ منتظر تھا، ماسٹر صاحب نے مجھ کو اور مولانا سعداللہ صاحب کو رکشہ پر بٹھا دیا اور خود پیدل چلے، ندی سے گاؤں کا فاصلہ ڈیڑھ دو کلومیٹر تھا، راستہ تو ویسا ہی تھا جیسا اس علاقے میں عام طور پر پایا جاتا ہے، مگر رکشہ والا ہوشیار تھا، اس نے بخیریت گاؤں تک پہونچادیا، وہاں توبہ واستغفار اور رحمت خداوندی کے موضوع پر وعظ ہوا، سودخوری کی مذمت بھی بیان کی گئی، رات وہیں گزاری گئی۔

۱۳؍ربیع الاول:

بعد نماز فجر پھر وعظ ہوا، اس میں صحبتِ نیک کی ترغیب دی گئی، صبح حضرت ماسٹر صاحب کے گرد پانی اور تیل لے کر لوگوں نے ہجوم کیا کہ وہ دم کریں، ماسٹر صاحب انہیں سہولت

کے ساتھ نمٹاتے رہے، ریلا میری طرف بھی بڑھتا تھا مگر حضرت ماسٹر صاحب عنایت وکرم سے نہایت لطف کے ساتھ روک دیتے تھے، حضرت موصوف نے میری راحت کا جس قدر اہتمام کیا ہے وہ میری حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔ وہاں سے روانگی سے پہلے ایک کھپریل مکان میں جو بمنزلہ بیٹھک کے تھا، بیٹھے لوگوں نے بتایا کہ ۱۹۸۸ء میں جو عظیم زلزلہ آیا تھا اس میں آس پاس کے تمام مکانات منہدم ہوگئے تھے، کوئی مکان نہ بچا تھا، مگر یہ کھپریل کا کچا مکان جوں کا توں کھڑا رہا، صاحبِ مکان کہہ رہے تھے کہ اس جگہ جتنے علما اور بزرگان دین آئے ہیں سب کا قیام اسی مکان میں رہا ہے، مجھے یقین تھا کہ ان بزرگوں کی برکت سے یہ مکان جوں کا توں قائم رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہاں سے ماسٹر صاحب بذریعہ سائیکل اپنے اسکول کے لئے جو علی نگر میں ہے اور پوہدی کے قریب ہے، اور کئی روز کی تعطیل کے بعد کھلا تھا، روانہ ہوئے، اور مجھے اور مولانا سعداللہ صاحب کو رکشہ پر بٹھا دیا، دھمسائن جو مرزا پور سے قریب ہے، وہاں مولانا سعداللہ صاحب کو اپنے ایک عزیز کی عیادت کرنی تھی، ہم لوگ پہونچے تو ماسٹر صاحب پہلے سے وہاں موجود تھے، مولانا کے عزیز نہایت شریف آدمی تھے، ان سے ملاقات کرکے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اللہ تعالی انہیں صحت وعافیت بخشے۔ وہاں سے رخصت ہوکر ساڑھے گیارہ بجے قیام گاہ پر پہونچے۔

آج جمعرات ہے، سنیچر کو مدرسہ کھلنے والا ہے، پروگرام کچھ ایسا ہے کہ میرا سنیچر تک پہونچنا نظر بظاہر مشکل ہے، اس لئے خیال ہوا کہ مولوی مہتاب اور مولوی ابوالخیر کو روانہ کردوں کہ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے وقت پر مدرسہ پہونچ جائیں، مولوی مجاہد حسین کا ارادہ ہوا کہ ان دونوں حضرات کو اپنے یہاں لے جائیں، اس بنیاد پہ یہ تینوں ہم لوگوں سے پہلے پوہدی سائیکل سے آگئے تھے، جب ہم لوگ پہونچے تو یہ حضرات کھانا کھارہے تھے، کھانا کھا کر یہ لوگ فوراً روانہ ہوگئے، سیتا مڑھی سے دوسرے دن یہ لوگ غازی پور کے لئے روانہ ہوجائیں گے، اور مولوی مہتاب عالم سنیچر کو مدرسہ پہونچ جائیں گے۔

آج تحریر کا کوئی کام نہ ہوسکا، ساڑھے گیارہ بجے قیام گاہ پر پہونچا، رات کی بیداری اور دن کے سفر نے بدن کو تھکا ڈالا تھا، آتے ہی سوگیا، ظہر کے وقت آنکھ کھلی، نماز ظہر کے بعد دیکھتا

ہوں کہ میرے عزیز دوست مولانا حبیب اللہ صاحب مدھوبنی سے آئے ہوئے ہیں، ان سے مل کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔

شہر سے متصل ایک جگہ بھوارہ نامی ہے، یہاں مسلمان کثیر تعداد میں آباد ہیں، اور سب بنکر ہیں، میری مدرسی کی ابتدا بنارس جامعہ اسلامیہ سے ہوئی، وہاں بھوارا کا ایک کمسن سیدھا سادا خاموش اور بظاہر احوال نہایت غریب طالب علم قدوری کی جماعت میں پڑھتا تھا، اس کی خاموشی کی وجہ سے اس کی طرف خصوصی التفات نہ تھا، ایک دن اس نے سبق میں قدوری کی عبارت پڑھی، نہایت صاف اور شستہ اور صحیح! اب اس طالب علم کی طرف پہلی بار توجہ ہوئی، احوال دریافت کئے تو معلوم ہوا کہ یہ بچہ یتیم ہے، ماں موجود ہے دو بھائی اس سے چھوٹے اور ہیں، اس کے خالو اس غریب خاندان کی کفالت کرتے ہیں، اور ماں اپنی قوتِ بازو سے کام لے کر خرچ کے انتظام میں حصے لیتی ہے، یہ معلوم کر کے طبیعت پر بہت اثر ہوا، میں نے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا، پھر دوسرے سال میں غازی پور آگیا، تو یہ طالب علم بھی آگیا، اور یہاں سے دو سال پڑھ کر دیوبند چلا گیا، اس سے تعلق برابر قائم رہا، دیوبند سے فراغت کے بعد بھوارہ میں مدرسہ فلاح المسلمین میں تقرر کی بات ہوئی، میں نے غازی پور میں ضرورت کا ذکر کیا تو اس باوفا اور حوصلہ مند مولوی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا کہ مدرسہ فلاح المسلمین میں زیادہ تنخواہ کم از کم غازی پور کی دوگنی پر تقرر ہو رہا ہے، خاموشی سے مدرسہ دینیہ غازی پور میں قلیل تنخواہ پر کام شروع کر دیا، غالبًا تین سال تک وہاں رہا، پھر مجھ سے گھر کے کچھ حالات بتائے، جس سے اندازہ ہوا کہ اب اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا ضروری ہے، نیز اب تک اپنا گھر نہ ہونے کی وجہ سے نکاح بھی نہیں کیا تھا، اب ایک چھوٹا سا گھر بنالیا ہے، ضرورت ہے کہ گھر کی آبادی کا بھی سامان کیا جائے، چنانچہ میری اجازت کے بعد یہ گھر چلا گیا، نکاح کے معاملات میں برابر مشورہ لیتا رہا، ایک جگہ محلّہ میں ہی نکاح کی بات پختہ ہوگئی، اور نکاح کی تاریخ میری فرصت کی رعایت سے مدرسہ دینیہ کے امتحان ششماہی کے قریب متعین کی گئی، امتحان کے موقع پر ایک ہفتہ پہلے سے تیاری کے لئے اسباق بند ہوگئے، میں نکاح کی تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے بھوارہ پہونچ گیا، بہار میں شادیاں کیا ہوتی ہیں؟ خرافات کی طغیانی امنڈ پڑتی ہے، اس عزیز نے سب لوگوں سے صاف صاف کہہ دیا

کہ اس نکاح کے ذمہ دار مولانا ہیں، ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہوگا، میں نے ایک ہفتہ پہلے پہونچ کر مسلسل وعظ کا سلسلہ شروع کردیا، جس کا اثر وہاں بہت اچھا پڑا، اور سادگی کے ساتھ نکاح کی تقریب انجام پا گئی۔ اس کے بعد پھر بار بار بھوارہ جانا ہوا، یہ اس جگہ کا پہلا طالب علم تھا، جو عالم بن کر آیا تھا، پھر تو اس نے طلبہ کا سلسلہ قائم کردیا، اب اس جگہ بیسوں عالم تیار ہو چکے ہیں، اللہ تعالی نے اس کی تعلیم میں بڑی برکت رکھی، یہ شخص اب بھی مجھ سے بالکل ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا پہلے تھا، جیسی ایک بیٹا اپنے باپ سے محبت رکھتا ہے۔ اس سابق طالب علم اور موجودہ عالم کو آپ نے پہچانا؟ یہی مولانا حبیب اللہ سلمہ ہیں، اللہ تعالی اپنے لطف وکرم کے سائے میں رکھے، اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق بخشے۔

میرا ارادہ پہلے سے تھا کہ ایک روز کے لئے بھوارہ جاؤں گا، اسی غرض سے میں نے انہیں اطلاع کردی تھی، وہ دربھنگہ بس اسٹیشن پر آئے تھے، مگر ہمارا قافلہ کافی دیر میں پہونچا اس لئے وہ واپس چلے گئے تھے، میں نے دربھنگہ میں صبح اسی روز ایک شخص کے ہاتھ ایک رقعہ بھیج دیا تھا مگر جن کے ہاتھ رقعہ بھیجا تھا انہوں نے باوجود پختہ وعدہ کے غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا، اور رقعہ نہیں پہونچایا، مولانا حبیب اللہ صاحب یونہی معلوم کرنے آگئے تھے کہ میں پہونچا یا نہیں۔ اب میں بہت شش وپنج میں پڑ گیا کہ وقت تو ختم ہوگیا، پوہدی ہی میں وقت زائد لگ چکا ہے، سنیچر کو یہاں سے روانگی ہوگی، اگر سنیچر کو بھوارہ پہونچا تو اتوار کو روانہ ہو بھی جاؤں تو مدرسہ دوشنبہ کو ہی پہونچ سکتا ہوں، مجھے دونوں کی خاطر عزیز تھی، یعنی حضرت ماسٹر صاحب کے بنائے ہوئے پروگرام کو بھی رد نہیں کرسکتا تھا، اور بھوارہ جانا بھی منسوخ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد پھر وہی رہی کہ سنیچر کو بھوارہ پہونچا جائے اور وہاں سے جتنی جلد ممکن ہو، مدرسہ کے لئے روانگی ہوجائے۔

آج رات کا پروگرام پوہدی سے تقریباً چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر لیل پور نامی بستی میں ہے، اس گاؤں میں حضرت ماسٹر صاحب تقریباً پچیس سال اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے ہیں، اس لحاظ سے اس گاؤں کو خصوصیت حاصل ہے، عصر کی نماز پڑھ کر ٹائر گاڑی سے جو لیل پور سے آئی تھی، بلکہ دو گاڑیاں آئی تھیں، قدرے تاخیر سے لیل پور کے لئے روانگی ہوئی، ایک گاڑی پر

حضرت ماسٹر صاحب اور مولانا سعداللہ صاحب اور یہ ناکارہ تین نفر بیٹھے، اور دوسری گاڑی پر مولانا حبیب اللہ، مولوی عبدالشکور، مولوی ہاشم سوار ہوئے۔ پوہدی سے نکلتے نکلتے سورج غروب ہوگیا، جہاں کل عصر کی نماز ادا کی تھی آج وہاں مغرب کی نماز ادا کی گئی، آج کی گاڑیاں اچھی تھیں، بہت آرام سے لیل پور پہونچ گئے، آج طبیعت پر کسی قدر گرانی تھی، میری خواہش پر مولانا حبیب اللہ صاحب کا وعظ ہوا، اور بہت اچھا ہوا، پھر مولانا سعداللہ صاحب نے وعظ فرمایا، بالکل سیدھے سادے انداز میں، پرانے بزرگوں کے طرز پر، معاشرہ میں پھیلی ہوئی خرابیوں پر خوب انگلی رکھی، مجھے ان کا وعظ بہت پسند آیا، ان کے بعد میں نے تھوڑی دیر گفتگو کی، جس میں نیک صحبت کے فوائد اور اس کے ضمن میں بزرگوں کے احوال وواقعات بکثرت بیان کئے، آج کا پروگرام قدرے دیر تک چلا، بعد نماز عشا کھانا کھا کر چلنے کی تیاری ہوئی تو کچھ لوگوں نے اصرار کیا کہ رات یہیں گزار لی جائے، مگر ماسٹر صاحب نے میرے وقت اور راحت کی رعایت میں اسے منظور نہیں کیا، ان لوگوں نے ازراہِ محبت یہ تدبیر کی کہ اس وقت کوئی گاڑی واپس لے جانے کے لئے تیار نہیں ہے، ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ پاؤں میں بحمدللہ جان ہے، یہ کہہ کر پیدل چل دیئے، ہم لوگ بھی ساتھ ہولئے، گاؤں سے نکلتے نکلتے بیل گاڑی آگئی، اجالی رات تھی، چاند اپنے شباب پر تھا، چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی، موسم نہایت خوشگوار اور سہانا تھا، ہرے ہرے دھان کے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں پر گاڑی چل رہی تھی، اور ہچکولے کھا رہی تھی، تو عجیب لطف آرہا تھا، کئی کلومیٹر کا راستہ باتوں باتوں میں کٹ گیا، بارہ بجے کے بعد مدرسہ میں پہونچے، تو دیکھا کہ ہمارے پرانے شناسا بزرگ حاجی محمد حسین صاحب اور ان کے عالم وفاضل بھتیجے مولانا نصیر الدین صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، ملاقات ہوتے ہی میں نے شکایت کی کہ اب جب واپسی کا وقت آلگا ہے تو آپ تشریف لائے ہیں؟ کہنے لگے کہ مجھے کچھ معلوم ہی نہ تھا، کل رات میں معلوم ہوا تو آج بھاگا ہوا آیا ہوں، حالانکہ ان کا گاؤں بہت دور نہیں ہے، لیکن سیلابی ندیوں نے راستہ منقطع کر رکھا ہے، دس گھنٹے میں یہاں پہونچے تھے، ان حاجی صاحب سے زمانۂ قیام الہ آباد سے تعلق ہے، ان کے بھیجے ہوئے بہت سے طلبہ الہ آباد میں پڑھتے تھے، اس وقت یہ پوہدی بیلا کے مدرسہ میں مدرس تھے، ان کی کوششوں اور کاوشوں سے بہت سے علماء دین اور حفاظ

کرام تیار ہوئے، اب یہ اپنے گاؤں دلدل میں رہتے ہیں، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ سے بیعت ہیں، نہایت ذاکر وشاغل اور اوقات کے پابند خلیق اور ملنسار شخصیت ہیں، ان چچا بھتیجے سے مل کر طبیعت بہت مسرور ہوئی۔

۱۴؍ربیع الاول:

آج صبح کی نماز کے بعد حدیث مذکورہ کے آخری جز 'حسن عبادت' پر مفصل کلام کیا، اور اسی پر حدیث کی تشریح کا سلسلہ ختم ہوا۔ نماز کے بعد وعظ کے دوران ایک نوجوان پر نظر پڑی، جو نہایت صالح اور سراپا ذوق وشوق بنے ہوئے سن رہے تھے، وعظ کے بعد انہوں نے ملاقات کی اور بتایا کہ میں پٹنہ کا رہنے والا ہوں، حضرت ماسٹر صاحب کے خط سے اطلاع ہوئی کہ آپ تشریف لائے ہیں، تو میں فوراً آیا، یہ نوجوان حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی سے اصلاحی تعلق رکھتے ہیں، نام ان کا اطہر حسین ہے، دوسرے وقت انہوں نے بتایا کہ میں سوچ رہا تھا کہ حضرات صحابہ کے نماز کی کیا کیفیت ہوتی رہی ہوگی؟ اتفاق سے اس روز صحابہ کی نماز کی کیفیت کا تفصیلی بیان ہوا، وہ نوجوان بہت خوش ہوئے تھے کہ جو سوال ان کے ذہن میں تھا اس کا مفصل جواب مل گیا۔

آج کا پروگرام یہ ہے کہ جمعہ کی نماز سے پہلے وعظ ہوگا، پھر اس کے بعد کوئی پروگرام نہیں ہے، سوانح میں جس قدر کام باقی رہ گیا ہے حتی الامکان اسے مکمل کیا جائے، صبح بھوارہ کے لئے روانگی ہوگی، میں اسی خیال سے لکھنے میں منہمک ہوگیا، دس بجے کے قریب ماسٹر صاحب نے آکر بتایا کہ ممتاز بابو نے کہلایا ہے کہ ندی کا پانی اتر گیا ہے، اب ہر سنگھ پور آنا ممکن ہے، اس لئے سابق پروگرام میں تبدیلی کردی گئی ہے کہ عصر کے پہلے یہاں سے روانگی ہو علی نگر میں عصر کی نماز پڑھ کر ہرسنگھ پور میں مغرب کی نماز پڑھی جائے، اور وہاں وعظ ہو، فجر کی نماز کے بعد بزرگوں کی مزارات پر حاضری دی جائے، اور پھر علی نگر آکر بس سے دربھنگہ اور وہاں سے بھوارہ روانگی ہو، مولوی حبیب اللہ صبح ہی بھوارہ روانہ ہوگئے۔

جمعہ کی نماز سے پہلے اختتامی وعظ ہوا، اور جمعہ کی نماز کے بعد کھانے سے فارغ ہوکر پھر میں لکھنے مشغول ہوگیا، اور اس میں اتنا انہاک ہوا کہ مجھے وقت کا خیال ہی نہ رہا، اور ماسٹر

صاحب نے بھی کچھ نہ کہا، عصر کا وقت ہوا تو سب سامان سمیٹا جانے لگا، اب عصر کے بعد روانگی ہوگی، مولوی عبدالشکور سلمہ نے سفر میں ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا، میں نے انہیں ہرسنگھ پور جانے سے روک دیا کہ کل وہ علی نگر بس سے آجائیں اور ہم لوگ پکڑی نامی جگہ سے سوار ہوں گے، چنانچہ وہ رک گئے۔

حاجی محمد حسین صاحب اور دوسرے صاحبان پہلے ہی ہرسنگھ پور کے لئے روانہ ہوگئے، میں اور مولانا سعداللہ صاحب رکشہ سے روانہ ہوئے، اور ماسٹر صاحب سائیکل سے ابھی گاؤں ہی کا راستہ طے کررہے تھے کہ دو موٹر سائیکلیں آئیں، جنہیں ممتاز بابو نے بھیجا تھا، میں نے مولانا سعداللہ صاحب کو ایک موٹر سائیکل پر اور مولوی ہاشم کو دوسری پر بٹھادیا، اور رکشہ پر ماسٹر صاحب اور میں دونوں بیٹھے، میرا مقصد یہ تھا کہ راستہ لمبا ہے، ماسٹر صاحب سے اطمینان سے کچھ باتیں کرنے کا موقع ملے گا، نیز آج جو کچھ لکھا ہے اسے سنا بھی دوں گا۔

ہمارا رکشہ پکڑی کے قریب پہونچا تھا کہ دونوں موٹر سائیکل والے دوبارہ ہم لوگوں کو لینے کے لئے آگئے، چنانچہ بقیہ راستہ موٹر سائیکل سے طے ہوا، ہرسنگھ پور گاؤں سے متصل ایک چھوٹی سی ندی ہے، جس میں اس وقت گھٹنے تک پانی تھا، اسے عبور کرکے گاؤں میں پہونچے، مغرب کی نماز ہوچکی تھی، دو تین آدمی اور بچھڑے تھے، سب نے مل کر جماعت کی، پھر حضرت مولانا عارف صاحب قدس سرہ کے درِدولت پر حاضری دی، تھوڑی دیر کے بعد جلسہ شروع ہوا، جلسہ گاؤں کے مکتب میں ہورہا تھا، میں حضرت مولانا کے دراقدس پر لیٹا کاروائی سن رہا تھا، مولانا سعداللہ صاحب تعارفی کلمات ارشاد فرمارہے تھے، ان کے کلمات کو میں یہاں تحریر کروں کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا، مگر ان کا میرے دل پر اتنا اثر ہوا کہ بے اختیار آنکھیں بہہ پڑی تھیں، اور بڑی مشکل سے میں نے گریہ کو ضبط کیا، اس وقت کئی لوگ میرے پاس موجود تھے، اس تأثر کا تقاضہ ہے کہ اسے نقل کردوں خواہ اس سے اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی پھبتی ہی سننی پڑے، لیکن محض اس ڈر سے اتنی قیمتی بات کو میں کھونا نہیں چاہتا، اور میری نیت اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ کسی صاحب دل کے منہ سے اگر آمین ادا ہوجائے گی تو میری نجات کا ذریعہ میسر آجائے گا، اور یہ بھی بتاتا چلوں کہ میرے بعض دوستوں نے اسٹیج پر میری تعریف کے پل باندھ

دیئے تھے مگر مجھے اس سے کچھ دلچسپی نہیں ہوئی، میں سوچتا رہا کہ یہ تیر ہوا میں چلائے جا رہے ہیں، ان کا نشانہ کوئی نہیں، مگر جو کچھ میرے بزرگ حضرت مولانا سعد اللہ صاحب نے فرمایا وہ ٹھیک دل میں ترازو ہو گیا، اور اب بھی جب سوچتا ہوں تو تڑپ جاتا ہوں، انہوں نے فرمایا کہ:

میں ....کی تعریف نہیں کروں گا، کیوں کہ حکم یہ ہے کہ اگر تعریف کرنی ہو تو منہ پر نہ کرو، بلکہ پیٹھ پیچھے کرو، اور اگر کوئی برائی ہو تو پیٹھ پیچھے نہ کرو بلکہ سامنے کرو، اور اس غرض سے کرو کہ اس کی اصلاح ہو جائے، لیکن اتنا کہوں گا کہ میں تین روز سے ....کے ساتھ ہوں، قرآن میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ " **انما یخشی الله من عباده العلماء** "یعنی اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں، اور حدیث میں آیا ہے کہ " **العلماء ورثة الانبياء** " علما انبیاء کے وارث ہوتے ہیں، اور انبیاء کی وراثت مال نہیں ہے، وہ علم ہے، میں تین دن سے ....کے ساتھ ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ.....قرآن کی اس آیت اور حدیث کے اس ارشاد کے مصداق ہیں، ان میں وہ باتیں موجود ہیں، جن کا قرآن کی آیت اور حضور کے ارشاد میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ مولانا نے فرمایا ہے ان کا حسن ظن ہے، ورنہ میرا اس آیت اور اس حدیث کا مصداق نہ ہونا بالکل واضح ہے، لیکن مجھے اس کی حرص ضرور ہے کہ یہ صفات کسی طرح اس بے مایہ کو حاصل ہو جائیں، گو کہ یہ تمنا تمنائے خام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، کیوں کہ جب اپنی کاہلی سستی اور پست ہمتی اور تن آسانی پر نگاہ پڑتی ہے تو محال معلوم ہوتا ہے کہ ان صفات سے کبھی کسی وقت بھی متصف ہو سکوں گا۔ لیکن

با کریماں کارہا دشوار نیست

اسی دوران گاؤں کے ایک بزرگ کا خط آیا، نہایت خوشخط اور پاکیزہ! اول وہلہ میں یہ سمجھا کہ کسی قدیم بزرگ کی یادگار رہے، نیچے دستخط صاف پڑھا نہیں جا رہا تھا، "حسین" سمجھ میں آ رہا تھا، میں نے خیال کیا کہ بزرگوں کا خاندان ہے، ممکن ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہ کی کوئی یادگار تحریر ہو، جسے بغرض زیارت مجھے ممتاز بابو دے رہے ہوں، ابتدائی سطریں پڑھ کر بھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس خط کا مخاطب میں ہی ہوں، پورا خط پڑھ گیا تب میں چونکا کہ میرے نام خط ہے، ممتاز بابو نے بتایا کہ ایک معمر بزرگ جو اس وقت تقریباً

معذور ہیں، انہوں نے آپ کے نام لکھا ہے، خط کے انداز اور طرز تخاطب سے بہت متاثر ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہا کہ دیکھ تیری خوش نصیبی ہے کہ تجھے بزرگ حضرات کس کس طرح یاد کررہے ہیں، اگر اب بھی اپنی سرکشی وغفلت، بے ہودگی اور لغویات سے نہ باز آیا تو تف ہے تجھ پر، پھر حق تعالی سے مناجات کی کہ پروردگار! تجھ سے بہتر کون میری حقیقت جان سکتا ہے، تو میرے ناگفتہ بہ احوال کو بھی جانتا ہے، اور ان بزرگوں کے حسن ظن سے بھی واقف ہے، اور تو اس پر قادر ہے کہ اس گندے اور لاغی انسان کو واقعی انسان اور حقیقی مسلمان بنادے، تو علیم وخبیر ہے۔

يظن الناس بی خيراً وانی   لشر الناس ان لم تعف عنی

اس خط کو میں نے حفاظت سے رکھ لیا، ناظرین اسے ملاحظہ فرمالیں، اور اس سیاہ کار کے حق میں دعا فرمائیں۔

محترم ومکرم بندہ! السلام علیکم

ہم ناکاروں کو بڑی مسرت ہے کہ آپ تبلیغ دین کے عزم سے ہم نااہلوں کی بستی میں قدم رنجہ فرمارہے ہیں، اس ضعیف وناتواں کی جانب سے التماس ہے کہ وعظ ونصائح میں قرآن پاک کی تلاوت کی کمی پر اور ناتوجہی پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالیں گے، میرے خیال ناقص میں قرآن پاک سے ناتوجہی ٹیپ رکارڈنگ اور ٹی وی اور ریڈیو جیسے باجے کی ایجاد اور مسلمانوں کو اس سے دلچسپی کے باعث ہے۔ دوسری التجا یہ ہے کہ تِلک کی بھیانک رسم ورواج پر بھی شرع کی روشنی میں ارشاد ونصیحت فرمائیں گے۔   والسلام

ملتمس احقر   امداد حسین عفی عنہ

چنانچہ ہرسنگھ پور کے وعظ میں اس حکم کی تعمیل کی گئی، اور ان بزرگ کی خواہش اور حکم کی برکت اور یہاں کے بزرگوں کے روحانی اثرات تھے کہ بقول بعض بزرگوں کے یہاں کا وعظ ہر جگہ سے مؤثر اور عمدہ رہا، اس گاؤں کی فضا پر اور لوگوں پر بزرگوں کے آثار وبرکات کا بہت احساس ہوا، اکثر لوگوں پر دین داری کا نور نظر آیا، ملنے اور بات کرنے میں تواضع اور انکساری کا غلبہ۔ طبیعت بہت متاثر ہوئی۔

وعظ کے بعد عشا کی نماز ہوئی، پھر کھانا کھا کر تھوڑی کے دیر کے بعد سوگئے، چونکہ رفقا

میں اکثر لوگ ذاکر وشاغل تھے اس لئے دو بجے رات ہی سے خانقاہ کا سماں بندھ گیا، تہجد ذکر اور گریہ وزاری کا ماحول پیدا ہوگیا۔

۱۵؍ربیع الاول:

صبح کی نماز پڑھ کر حضرت ماسٹر قاسم صاحب مدظلہ کی رہبری میں حضرات اکابر کی مزارات کی زیارت کے لئے چلے، قبرستان آبادی سے قدرے فاصلے پر ہے، عید گاہ کے دروازے کے قریب رات کی رانی کا شاداب اور پھیلا ہوا درخت ہے، اسی کے سائے میں چار بزرگ آرام فرما ہیں، حضرت مولانا محمد عارف صاحب علیہ الرحمہ والد محترم ہیں، اور حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب، حضرت مولانا لطف الرحمان صاحب اور حضرت مولانا حکیم عبدالمنان صاحب علیہم الرحمۃ صاحبزادگان آس پاس ہیں، قبریں بالکل خام اور سنت کے مطابق ہیں، ہری ہری گھاسوں نے چاروں قبروں کو ڈھک دیا، لوگ کہہ رہے تھے کہ جب اس درخت پر پھول آتے ہیں تو سفید پھولوں کی چادر بچھ جاتی ہے، اس جگہ اس درجہ سکون وطمانینت محسوس ہوئی کہ دل گلاب کی طرح کھل اٹھا، بے حد انس محسوس ہوا، اور بالکل سنت کے مطابق قبریں دیکھ کر طبیعت کھل گئی، نہ اونچی پختہ قبریں، نہ قبروں کے سرہانے خوشنما کتبے، نہ کوئی چراغ اور اگربتی۔ بس ایک سادگی سی سادگی، اور اس پر برستی ہوئی لطف وکرم اور طمانینت وسکون کی بارش! کافی دیر تک وہاں کھڑے رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، اور جب چلے تو بزرگوں کی محبت اور شریعت کی عظمت سے دل معمور تھا، اب ناشتہ کرکے واپسی کی تیاری ہے، سفر کی ایک قسط ختم ہورہی ہے، لیکن ٹھہریئے، ان بزرگ سے ملاقات کرنی ہے جن کا رقعہ رات ملا تھا، میں نے ممتاز بابو سے کہا کہ اس وقت چلیں اور صاحب رقعہ سے ملاقات کرلیں، اس پر وہ انہیں اس کی اطلاع دینے چلے گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد آئے کہ امداد حسین صاحب خود تشریف لارہے ہیں، میں گھبرا گیا کہ ضعیف العمر اور معذور بزرگ کو آپ نے کیوں تکلیف دی؟ کہنے لگے کہ انہوں نے اصرار کیا ہے کہ مولانا سے ملنے مجھے جانا چاہئے، انہیں تکلیف نہیں دوں گا، ابھی ہم یہ باتیں کرہی رہے تھے کہ وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے تشریف لائے، میں لپک کر آگے بڑھا کہ ان سے ملاقات بھی کروں اور انہیں سنبھالوں بھی، ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ بینائی اتنی کمزور ہوگئی ہے

کہ آدمی کا وجود تو دیکھ لیتے ہیں مگر خدوخال نہیں دیکھ پاتے، مجھے حیرت ہوئی کہ بایں ضعیف العمری بلکہ نابینائی، رقعہ کیوں کر لکھ لیا؟ وہ بھی لالٹین کی روشنی میں۔ پوچھنے پر بتایا کہ اندازے سے لکھ لیتا ہوں، مگر پڑھ نہیں پاتا ہوں، تھوڑی دیر بیٹھے، پھر تشریف لے گئے، ناشتہ ہوا، اور میرے لئے رکشہ آ گیا، مجھے لوگوں نے زبردستی رکشہ پر بیٹھا دیا، ندی تک میں تنہا بیٹھ کر گیا، ندی میں بھی رکشہ سے اترنے نہیں دیا، لوگوں نے پیچھے سے سہارا دے کر رکشہ کو پار کر دیا، دوسری طرف جا کر حضرت ماسٹر صاحب بھی رکشہ پر بیٹھے۔ پکڑی پہونچنے کے بعد تھوڑی دیر میں لدی پھندی بس علی نگر سے آئی، مولوی عبدالشکور اس پر تھے، جگہ پہلے سے لی ہوئی تھی، آرام سے بیٹھ گئے، سب لوگوں سے آخری مصافحہ کیا اور دل میں محبت وانس کی سوغات لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا، ساتھ میں مولوی عبدالشکور صاحب، حاجی حسین صاحب، مولوی ہاشم اور پٹنہ والے اطہر حسین صاحب تھے۔

میں اپنی خوش قسمتی پر خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس پاک پروردگار نے اپنے صالح بندوں کی خدمت میں مجھے پہونچایا، اور ایک ہفتہ وہاں ان کی صحبت میں وقت بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اس دیار میں چند خاص باتیں مجھے محسوس ہوئیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ وہاں کے تمام مسلمانوں میں سادگی اور تواضع بہت ہے، جو لوگ بڑی حیثیت کے ہیں ان میں بھی ترفع اور پندار کا اثر نہیں ہے، ملاقاتوں سے مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ ان میں کوئی مالدار بھی ہوگا، نہ گفتگو میں کوئی مال کا فخر نہ طرز وانداز میں مالداری کا نشہ، اس لئے میں یہ اندازہ ہی نہیں کر سکا کہ مالی اعتبار سے کسی کی حیثیت بلند ہے، کئی علما سے ملنے کا اتفاق ہوا، جو علم ومرتبہ اور عمر میں مجھ سے کہیں فائق ہیں، مگر مجال کیا کہ کسی طرح اندازہ ہو جائے کہ وہ اپنے سے کسی چھوٹے یا کم از کم برابر کے آدمی سے مل رہے ہیں، ایسی تواضع اور ایسی کسر نفسی کہ مجھے شبہہ ہونے لگتا کہ یہ مجھی سے مل رہے ہیں یا کسی زبردست عالم اور بزرگ سے، اس کا میری طبیعت پر خاص اثر ہوا۔

حضرت ماسٹر صاحب گو اصطلاحی طور پر عالم نہیں ہیں لیکن عرصہ دراز تک بزرگوں کی صحبت میں رہے ہیں، حضرت مولانا سراج احمد صاحب کے تو خیر مرید وخلیفہ ہی ہیں، مصلح الامت

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کی صحبت میں بھی کافی وقت گزارا ہے، پھر مولانا عبدالرحمان ،مولانا لطف الرحمان صاحب کی خدمت اور صحبت کا بہت موقع ملا، اور حضرت مولانا حکیم عبدالمنان صاحب سے تو ایسا تعلق رہا ہے کہ ایک کا تصور دوسرے کے تصور کے بغیر مشکل ہے، پھر صاحبِ نسبت ہیں، ادھر کا پورا علاقہ ان کے فیض سے سرشار اور ان کا نہایت درجہ معتقد ہے، مگر بے نفسی کا یہ عالم ہے کہ کبھی اپنے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ عام آدمی سے زیادہ ان کی حیثیت ہے۔ ایک مرتبہ تو حد کردی، اور میں شرم سے پانی پانی ہوگیا، جب ہم پوہدی سے ہرسنگھ پور جارہے تھے تو ایک ہی رکشہ پر ہم دونوں بیٹھے تھے، سڑک کا حال تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں، راستہ میں ایک ندی آئی، اس پر لکڑی کا پل بنا ہوا تھا، پل کی چڑھائی سڑک سے نہایت بے اعتدالی کے ساتھ اونچی تھی، میں نے رکشہ والے سے کہا کہ رکشہ سے میں اتر جاؤں، ابھی وہ روکنے کی تیاری کررہا تھا کہ ماسٹر صاحب اتر گئے، اور مجھے اترنے نہیں دیا، اب رکشہ والا کھینچ رہا ہے اور میں کاہل آرام سے بیٹھا ہوں، مجھے محسوس ہوا کے رکشہ والے پر زیادہ زور نہیں پڑ رہا ہے، تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ کچھ دیکھا جس کا مجھے تصور نہیں تھا، یعنی میری نظریں دیکھ رہی ہیں کہ حضرت ماسٹر صاحب بنفس نفیس دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر چڑھا رہے ہیں، میں عرقِ ندامت میں ڈوب گیا مگر کیا کرسکتا تھا، چلتے ہوئے رکشہ سے کودنے کی مشق نہیں، بے حیا بن کر بیٹھا رہا، اور اپنی کاہلی کو ستارہا، اور ایسے مواقع نہ جانے کتنے آئے کہ مجھ جیسا مہمل آدمی مخدوم نظر آیا، اور وہ اپنے معتقدین ومتوسلین کے جھرمٹ میں خادم نظر آئے۔

یہی حال مولانا سعداللہ صاحب کا بھی دیکھا، ان لوگوں سے مل کر تواضع کے انداز کا سبق ملا، تواضع تو ہم جیسے لوگ بھی کرتے ہیں مگر اپنی بڑائی اور انانیت کا تحفظ کرکے، اور تواضع ان لوگوں نے بھی کیا مگر بے ساختہ! جیسے یہ لوگ اپنے کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسے ان میں نہ کوئی خوبی ہے اور نہ کوئی کمال۔

میں نے وعظ میں ان دونوں بزرگوں کو دیکھا کہ بالکل میری کرسی کے پاس بیٹھ کر اس انہماک اور غور سنتے جیسے اس وعظ کی سب سے زیادہ ضرورت انہیں کو ہے۔

(۲) اس علاقہ کے عام مسلمانوں میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ان کے دلوں میں علما کا

احترام واقعی بہت زیادہ ہے، ہم لوگوں کے علاقے میں بعض ناگفتنی وجوہ سے علما کا احترام کیا معنی ان سے ایک طرح کا استغنا ہوگیا ہے، لیکن یہاں اس استغنا کا کوئی اثر نہیں دیکھا، جب کسی راستہ سے گزرنا ہوا تو ایسا نہیں ہوا کہ کوئی مسلمان بغیر سلام کئے ہوئے گزر گیا ہو، کوشش تو یہ کرتے دیکھا کہ مصافحہ کی سعادت بھی حاصل کریں، آپ پڑھ آئے ہیں کہ مدرسہ کے باورچی راج مستریوں نے بھی لپک کر ملاقات کی تھی، ایسا بھی ہوا کہ ہم لوگ کسی راستہ سے گزر رہے ہیں، اور دور کھیت میں کوئی مسلمان ہل جوت رہا ہے، اس نے ہل روک دیا اور ہاتھ سے مٹی جھاڑ کر سلام کے بعد مصافحہ کیا، یہ برکات ہیں ان بزرگوں کے۔ اسی علاقہ میں سابق امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب کی تربیت ہوئی، ان کے دورے بھی ہوتے رہتے ہیں، مجموعی طور پر ان اکابر کے برکات مشاہدے میں آئے۔

میں ایسا کچھ محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس علاقہ میں نہ آیا ہوتا تو بڑی کمی رہ جاتی، حق تعالی کا شکر ہے کہ اس نے یہاں پہونچا دیا۔

(۳) مدرسہ اشرفیہ کے طلبہ واساتذہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، مدرسہ گو چھوٹا ہے، طلبہ کم ہیں، اور زیادہ تر چھوٹی عمر کے طلبہ ہیں، بیرونی طلبہ درجہ پرائمری اور حفظ سے لے کر عربی دوم تک ہیں، اساتذہ بچوں پر بہت شفیق ومہربان نظر آئے، چھوٹے بچے عموماً شور وغل زیادہ کرتے ہیں، ان کے کسی کام میں ترتیب اور باقاعدگی نہیں ہوتی، لیکن اس مدرسہ میں اس کے برعکس دیکھا، بچے سنجیدہ اور مہذب ہیں، میں ایک ہفتہ مسلسل ان بچوں کے کمروں کے درمیان رہا، مگر کبھی نازیبا حرکات اور شور وغل کی کوفت نہیں اٹھانی پڑی، نماز کے اوقات میں بغیر کسی تنبیہ وتادیب کے مسجد حاضر ہوجاتے، اور یہ بھی نہیں دیکھا کہ اساتذہ ان بچوں پر کوئی سختی یا درشت تادیبی کاروائی کرتے ہوں، ہمہ وقت ایک سکون کی کیفیت چھائی رہتی، مدرسہ کے صدر مدرس مولانا فیاض احمد صاحب ایک لائق اور فاضل نوجوان ہیں، میرے پروگرام میں ہر جگہ ساتھ رہے، اور ناؤنسری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ درجہ عربی کے ایک استاذ مولوی زبیر احمد صاحب میرے دوستوں میں سے ہیں، انہوں نے بہت خدمت کی، ان سے چونکہ قدیم بے تکلفی ہے اس لئے میری ہر فرمائش کے مورد یہی بنتے رہے اور نہایت خوشی کے ساتھ تعمیل کرتے تھے، ایک دوسرے استاذ مولانا نور محمد

صاحب میرے دورِ تعلیم کے ہم عصروں میں سے ہیں، لیکن اس طرح پیش آتے رہے کہ جیسے میں ان کا کوئی بزرگ ہوں، نو بجے دن میں چائے پلانے کا اہتمام بنفس نفیس کرتے تھے۔

ان حضرات میں خصوصیت کے ساتھ ہر خدمت میں پیش پیش ماسٹر سید امین اللہ کوثر صاحب تھے، یہ اپنی وجاہت کے اعتبار سے نہایت بزرگ صورت ہیں، لیکن جذبۂ خدمت کے لحاظ سے اپنے کو ہر چھوٹے سے چھوٹا رکھنے میں لطف محسوس کرتے ہیں، حضرت ماسٹر صاحب مدظلہ سے بیعت ہیں، اور بہت خوب شخص ہیں۔ غرض یہ مدرسہ اور اس مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی، اور کیوں نہ ہو؟ یہ پود لگائی ہوئی ہے حضرت مولانا حکیم عبدالمنان صاحب علیہ الرحمہ کی، اس کی آبیاری ونگہداشت میں حضرت ماسٹر صاحب اور حاجی حسین صاحب کا حصہ ہے، اور اس کو خصوصی توجہات مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اور سراج الامت حضرت مولانا سراج احمد صاحب علیہما الرحمہ کی حاصل ہے، حضرت مولانا امروہوی بیسیوں بار یہاں تشریف لائے ہیں، اور اسے نوازا ہے، حضرت ماسٹر صاحب کے خطوط میں بار بار اس مدرسہ کے لئے دعاؤں کی درخواست اور حضرت کی دعاؤں کا تذکرہ ملتا ہے، ایسے مدرسے اس زمانہ میں کمیاب ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو ترقی بخشے۔

اب اس سفر کی دوسری قسط شروع ہو رہی ہے، ہم لوگ ذرا تاخیر سے دربھنگہ بس اسٹیشن پہونچے، دربھنگہ پہونچ کر معلوم ہوا کہ پٹنہ کے لئے بسیں بند ہیں، ہندوستان کے موجودہ وزیر اعظم وی پی سنگھ نے چھوٹی ذات والوں کے لئے حکومت کے ہر شعبہ میں ریزرویشن کا قانون پاس کر دیا ہے، بڑی ذات کے ہندوؤں کو اس پر بہت غصہ ہے، وہ پورے ملک میں اس کے خلاف بغاوت اور اودھم مچائے ہوئے ہیں، ۸/ اکتوبر کو پٹنہ میں وزیر اعظم کی ریلی تھی، اونچی ذات کے ہندوؤں نے اس ریلی کو ناکام بنانے کے لئے پٹنہ کے راستوں پر بسوں کا چکہ جام کر دیا تھا، ہم لوگ بخیر وعافیت بھوارہ پہونچ گئے، وہاں کوتوالی کے پاس میرے عزیز دوست مولوی صفی اللہ اور مولوی نور اللہ کھڑے تھے، بس سے اتر کر سیدھے مدرسہ فلاح المسلمین پہونچے، ظہر کا وقت قریب تھا قدرے آرام کر کے ظہر کی نماز پڑھی پھر مدرسہ ہی میں کھانا آگیا، وہیں کھا پی کر سو گئے۔

آج کا پروگرام یہ ہے کہ زیر تعمیر مسجد میں وعظ ہوگا۔ میں بعد نماز عصر مولوی نور اللہ کے

گھر بیٹھا ہوا تھا، ساتھ میں مولوی عبدالشکور، حاجی محمد حسین صاحب اور مولوی محمد ہاشم اور مقامی متعدد علما تھے، اتنے میں ایک مولوی صاحب لنگی پہنے ہوئے ڈھیلا ڈھالا کرتا زیب تن کئے ہوئے رنگ سانولا، داڑھی پر بڑھاپے کی دھوپ چمک رہی تھی، سلام کرتے ہوئے بے تکلفی سے داخل ہوئے، مقامی علما احتراماً کھڑے ہونے لگے، میں غور سے دیکھنے لگا کہ کون صاحب ہیں؟ اچانک مولوی عطاء اللہ نے یہ سمجھ کر کہ میں نے پہچانا نہیں بول پڑے کہ یہ مولانا دبیر عالم صاحب ہیں، میں بے ساختہ کھڑا ہوگیا، اور نہایت گرم جوشی سے مصافحہ اور معانقہ ہوا۔

میں جب دارالعلوم ۱۹۶۸ میں نیا نیا پہونچا تھا، کچھ تو نئی جگہ ہونے کا اثر اور اس سے کہیں زیادہ دارالعلوم کا صدسالہ تقدس ووقار اور اس کی عظمت وہیبت دل پر بیٹھی ہوئی، ہر چیز عجیب اور پاکیزہ بلکہ مسحورکن دکھائی دیتی تھی، ایک دن گیٹ پر اعلان آویزاں دیکھا کہ دارالحدیث فوقانی میں کوئی جلسہ منعقد ہورہا ہے، دارالعلوم دیوبند میں یہ پہلا جلسہ دیکھنے کو مل رہا تھا، پرشوق اور بیتاب دل کے ساتھ دارالحدیث میں پہونچا تو جلسے کی کاروائی شروع ہوچکی تھی، اناؤنسر اعلان کررہا تھا کہ آپ کے سامنے مولوی دبیر عالم دربھنگوی تقریر کریں گے، اس پر ایک نوعمر لڑکا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں، نہایت بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ اسٹیج پر آیا، ایک ہاتھ میں کاغذات کا مختصر سا پلندہ تھا، جس بے خوفی اور بے تکلفی کے ساتھ وہ آیا تھا اسی بے تکلفی سے تقریر شروع کردی، برجستہ اور شستہ الفاظ کا دروبست اور اندازِ تکلم ایسا کہ فصاحت وبلاغت منہ چوم رہی تھیں، برمحل اشعار اس طرح درمیان درمیان میں پڑھتا چلا جاتا کہ جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑتا چلا جائے، تقریر میں شاعری کررہا تھا یا یوں کہئے کہ شاعری کو تقریر کے پیکر میں ڈھال رہا تھا، میں مبہوت و متحیر سنتا رہا، دل میں سوچتا رہا کہ ایسی برجستگی اور تقریر کی عمدگی مجھے بھی حاصل ہوسکتی ہے؟ وہ تقریر کرکے گیا تو سامعین کے دلوں پر اپنی عظمت کا سکہ بیٹھا گیا۔ پرانے طلبہ تو خیر واقف تھے، میں نیا طالب علم تھا، اس لئے قدرتی طور پر میرے اوپر زیادہ اثر ہوا۔ یہی اس وقت کے مولوی دبیر عالم تھے، وہ دورۂ حدیث سے فارغ ہوچکے تھے، اب فنون پڑھ رہے تھے، اس وقت دورۂ معقولات کو فنون کہتے تھے، اب بائیس سال کے بعد ملاقات ہوئی تو وہ لڑکا جوانی کی سرحدوں کو پار کرکے بڑھاپے کی حدوں کو چھورہا تھا، داڑھی اور سر کے بالوں نے تو مکمل بڑھاپے کا اعلان کررکھا تھا، دیر

تک باتیں ہوتی رہیں، پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ مولانا دبیر صاحب دیوبند سے اٹھے تو علی گڈھ پہونچے، طبیہ کالج میں داخلہ لیا، کبھی کبھی معلوم ہوتا رہا کہ وہ علم دین سے بغاوت کررہے ہیں، مولویوں کو آج کل کے فیشن کے مطابق بہت گرا ہوا اور آؤٹ آف ڈیٹ سمجھتے ہیں، پھر وہ یونانی حکیم ہوکر سرکاری ملازمت میں آ گئے، اور معلوم نہیں پھر کیا انقلاب آیا کہ وہ علم دین کی عظمت کی طرف پلٹے، عرصہ سے بھوارہ میں مقیم ہیں، اب سے تین چار سال پہلے میں بھوارہ گیا تھا تو اس وقت بھی معلوم ہوا تھا کہ یہیں ہیں، لیکن غالبًا کسی چھٹی میں گھر گئے ہوئے تھے، اس لئے ملاقات نہیں ہوسکی تھی، بارہا افسوس کررہے تھے کہ میں نے اپنا راستہ ترک کرکے اس راہ کو غلط اختیار کیا، اس لائن میں پیسے تو بہت ہیں مگر پیسہ تو مقصودِ زندگی نہیں ہے، بار بار مجھ سے کہتے رہے کہ جب آپ کو دیکھتا ہوں تو خوشی بھی ہوتی ہے، رشک بھی آتا ہے، آپ پڑھنے پڑھانے میں لگے رہے، آپ کے کیسے کیسے شاگرد تیار ہوگئے، آپ کا فیض مجھے بھی پہونچتا ہے کہ آپ کے شاگرد صرف اس نسبت سے کہ دیوبند میں آپ کا ہم عصر رہ چکا ہوں، میرا ادب واحترام بھی استاذ ہی کی طرح کرتے ہیں، پھر نہایت عجز وانکسار کے ساتھ کہنے لگے کہ میرے لئے مغفرت کی دعا کیجئے۔

پھر باصرار پوچھا کہ کریں گے نا؟ بار بار پوچھتے رہے، میں کیا کرتا ان کی تسلی کے لئے کہہ دیتا کہ ہاں ضرور۔ ورنہ مجھ کو اپنی حقیقت معلوم ہے کہ مجھ سے کہیں اچھا ان کا قلبی حال ہے، میں کس کھیت کی مولی ہوں کہ میری دعائیں ان کے لئے کارگر ہوں، وہ خود نہایت عمدہ اور نفیس آدمی ہیں، ان کے جذبات وخیالات اور ان کے دینی رجحان سے مجھے بہت نصیحت حاصل ہوئی، کہ ایک شخص بالکل غیر دینی ماحول میں رہتے ہوئے بھی اس قدر پختہ دین دار ہے، اور میرے تو لیل ونہار دینداروں کے درمیان بسر ہوتے ہیں لیکن مجھے ایسا جذبہ حاصل نہیں ہے۔

گو کہ مولانا دبیر عالم صاحب کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ چھوٹ گیا ہے، مگر دماغ بہت حاضر ہے، علم پر دسترس اب بھی باقی ہے، مثنوی مولانا روم کا خوب مطالعہ کئے ہوئے ہیں، اب بھی اس کے بہت سے اشعار نوکِ زبان ہیں، وعظ وتقریر کا سلسلہ بھی قائم ہے، مواعظ میں مثنوی سے بہت کام لیتے ہیں، ماشاءاللہ صاحبِ اولاد ہی نہیں کثیر الاولاد ہیں، مجھ سے اس بارے میں سوال کرنے لگے، الحمد للہ ادھر بھی کچھ یہی رنگ ہے۔ میں نے کہا کہ عشق ومحبت انسان کی

سرشت میں داخل ہے، اور غالباً تمام جذبات میں یہی جذبہ سب سے قوی ہے، اگر اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو بڑا تباہ کن ہے، اور اگر اسے شریعت کی قید میں پابند کر کے اس سے کام لیا جائے تو نہایت بیش قیمت اور عمدہ نتائج نکلتے ہیں، ہم لوگوں کا عشق چونکہ قید شریعت میں ہے اس لئے کثرت اولاد کا تماشہ دیکھتے جایئے۔ اکبر مرحوم نے فرمایا ہے۔

عاشقی قید شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

اس پر ہنسے اور داد دی۔ عشا کی نماز زیر تعمیر مسجد میں پڑھی گئی، پہلے یہ مسجد چھوٹی تھی، ۱۹۸۸ء کے زلزلے میں یہ مسجد بھی متأثر ہوئی، مولانا حبیب اللہ صاحب نے اسے شہید کر کے دوبارہ توسیع وتعمیر کا منصوبہ بنایا، چنانچہ اس میں کافی وسعت پیدا کر دی گئی، دیواریں چھت تک آگئی ہیں، چھت ڈھالنی باقی ہے، اسی کے انتظامات ہو رہے ہیں، عشا کی نماز کے بعد مسجد میں ہی پروگرام ہے، میں نے اپنے وعظ میں اس طرف توجہ دلائی کہ ماضی قریب میں صوبہ بہار دو ہولناک تباہیوں میں ڈوب کر ابھرا ہے، ایک تو ۱۹۸۸ء کے زلزلے میں شمالی بہار کا پورا خطہ زیر و زبر ہو کر رہ گیا، دوسرے ۱۹۸۹ء میں بھاگل پور کا خونیں فساد، ان دو تباہیوں کے بعد یہاں کے مسلمانوں کی کمر ٹوٹ گئی، ایسے موقع پر اہل اسلام کو خلوص دل سے خدا کی جانب رجوع کرنا چاہئے، اس سلسلے میں مبسوط بیان ہوا۔ وعظ کے بعد کھانا کھا کر مدرسہ میں آرام کیا۔

۱۷/ربیع الاول اتوار:

آج صبح کی نماز کھنڈ کی مسجد میں پڑھی، نماز کے بعد چونکہ کسی قسم کے پروگرام کا اعلان نہ تھا اس لئے میں مصلیٰ پر بیٹھا رہا، لیکن دیکھا کہ تمام مصلی جوں کی توں اپنی جگہوں پر خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی جا نہیں رہا ہے، تو میں نے لوگوں کا عندیہ دریافت کیا، مولوی عطاء اللہ نے بتایا کہ یہ لوگ منتظر ہیں کہ آپ کچھ بیان کریں گے، میں نے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر سورہ مائدہ کے آخری رکوع سے پہلے والے رکوع کی تلاوت کی، یعنی ''**یوم یجمع اللہ الرسل**'' اور اس کا ترجمہ اور تفسیر بیان کی، اس رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصی تذکرہ ہے، اور یہ کہ یہود علما آپ کے دشمن ہو گئے تھے، اسی ذیل میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ

والسلام کے علماءِ سو کا تذکرہ آ گیا ہے، اور قدرے تفصیل سے ان کی علامات اور احوال پر گفتگو کی، چونکہ لاؤڈ اسپیکر لگا دیا گیا تھا اس لئے دوسری مسجدوں بھی سے مصلی آ گئے تھے، اس بیان کا اثر وہاں کے علما پر زیادہ ہوا۔ مولانا حبیب اللہ صاحب نے کہا کہ یہاں کہ نوجوان علما و مدرسین کے سامنے ایک مجلس میں کچھ کہہ دیجئے، چونکہ بھوارہ کے علما براہ راست یا بالواسطہ مجھ سے پڑھے ہوئے ہیں، اس لئے میں نے اسے منظور کرلیا، لیکن یہ تاکید کردی کہ جو حضرات مجھ سے تلمذ کا تعلق نہیں رکھتے اس کی اطلاع انہیں نہ کرنا، کیوں کہ ایسے لوگوں کے سامنے کچھ کہنے کا مجھے حوصلہ نہیں ہے، تلامذہ کی بات اور ہوتی ہے، ان کو چونکہ ابتدا سے کہنے سننے کی بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے اب بھی کچھ حجاب اور تکلف نہ ہوگا، لیکن مدرسہ کے ایک استاذ مولانا مطیع الرحمان صاحب جو ذی استعداد اور سلیم الطبع عالم ہیں ان کا اصرار تھا کہ وہ بھی اس مجلس میں شرکت کریں، اور وہ خود کو اس طرح پیش بھی کرتے ہیں جیسے میرے احباب، گو تکلف تو ہوا مگر ان کی خاطر شکنی کا یارا نہ تھا، اس لئے وہ تشریف لائے۔

گیارہ بجے دن میں عزیزم مولوی نور اللہ سلمہ کے مکان پر یہ مجلس منعقد ہوئی، گھنٹہ بھر ان سے گفتگو ہوتی رہی، ان لوگوں پر اچھا اثر پڑا۔

چونکہ میرے پاس وقت کم ہے، کل ہی روانگی کا ارادہ ہے، اس لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ پروگرام مرتب کرلو، جہاں جہاں بیان کی ضرورت ہو، آج ہی وقت مقرر کرلو، چنانچہ آج دو جگہ پروگرام ہے، ایک پروگرام کسی محلّہ کی مسجد میں ہے، اس کا نظم کرنے والے مولوی سمیع اللہ اور مولوی ابوذر تھے، مغرب کے بعد اولاً مولوی دبیر عالم صاحب نے کچھ دیر تقریر فرمائی، پھر میں بیٹھا اس وقت یاد نہیں آرہا ہے کہ وہاں کیا بیان ہوا۔

عشاء کی نماز وہاں پڑھ کر مولوی حبیب اللہ کے گھر کے آنگن میں جو خاصا وسیع ہے، یہ جلسہ منعقد ہوا، اور اس میں خاص طور سے فرمائش کی گئی کہ مستورات کے متعلق خصوصیت کے ساتھ وعظ و پند ہونا چاہئے، شروع میں مولانا ہارون رشید صاحب مدظلہ صدر المدرسین مدرسہ فلاح المسلمین نے تھوڑی دیر کچھ بیان فرمایا، اس کے بعد متعلقہ موضوع پر میں نے تقریباً سوا گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو کی، بعد میں معلوم ہوا کہ عورتوں نے بہت پسند کیا، اور یہ تو میں نے بھی محسوس کیا

کہ بالکل خلاف عادت عورتیں نہایت صبر وسکون کے ساتھ تقریر سنتی رہیں، ورنہ عموماً تجربہ یہ ہے کہ جہاں چار عورتیں جمع ہوئی، انہیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں ایسا انہماک ہوتا ہے کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ سننے آئیں ہیں یا سنانے؟!

آج دن بھر کی چار تقریروں نے تھکا ڈالا، آدھی رات کے قریب بستر پر جانے کا موقع ملا۔

۱۸؍ربیع الاول۔ دوشنبہ:

آج صبح نیند کا بہت زیادہ اثر تھا، آج ہی بعد نماز فجر واپسی کا ارادہ ہے، اس لئے نماز کے بعد وعظ نہیں ہوا، ایک عزیز کو بس اسٹیشن اور ریلوے اسٹیشن بھیجا کہ معلوم کرے کہ بسیں یا ریلیں بخیریت چل رہی ہیں یا نہیں؟ اطلاع ملی کہ توڑ پھوڑ اور ہنگامہ اتنا ہے کہ پٹنہ کی لائن پر نہ کوئی بس جارہی ہے نہ کوئی ٹرین، مجبوراً ارادہ فسخ کرنا پڑا، لیکن دماغ اتنا بوجھل تھا اور طبیعت اتنی مضمحل تھی کہ آج کسی پروگرام کا حوصلہ نہیں ہوسکا۔

عصر کی نماز کے بعد مولانا دبیر عالم صاحب کے گھر پر حاضری دی، اور وہاں چائے پی، مغرب کی نماز کے بعد عزیزم مولوی سہیل سلمہ کے گھر گئے، اور وہاں دیر تک مجلس رہی، آج کی رات بہت آرام سے گزری۔

۱۹؍ربیع الاول۔ سہ شنبہ:

آج روانگی کا پروگرام ہے، فجر کی نماز کے بعد آج سورہ مائدہ کے آخری رکوع کی تفسیر بیان کی گئی۔ ناشتہ سے فارغ ہوکر بس اسٹیشن پہونچے، دربھنگہ کی بس تیار تھی، احباب سے رخصت ہوکر بس پر بیٹھے، ایک گھنٹہ میں دربھنگہ پہونچے، وہاں دوسری بس سے مظفر پور اسٹیشن پر پہونچے، تو بڑی بھیڑ دیکھی، تین دن کے بعد آج گاڑیاں چلی تھیں، ویشالی ایکسپریس آنے ہی والی تھی، اللہ کے فضل سے باوجود ازدحام کے جگہ اچھی مل گئی، تقریباً چار بجے دیوریا پہونچے، وہاں سے مئو جانے کے لئے فی الحال کوئی سواری نہ تھی، سوچا گیا کہ اب کہاں جایا جائے؟ خیال ہوا کہ کسی مسجد میں چل کر عصر کی نماز پڑھی جائے، پھر آگے کا پروگرام بنایا جائے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قریب ہی مسجد ہے، وہاں پہونچے تو وہ جامع مسجد تھی، نماز پڑھ کر ایک وجیہ وشکیل شخص کو دیکھا کہ وہ مسجد میں

گھڑی ٹھیک کرا رہے ہیں، ان سے ملاقات کے لئے آگے بڑھا تو وہ خود لپکے، ملاقات کے بعد تعارف ہو، یہ مولانا اشفاق احمد صاحب ہیں، مشہور واعظ مولانا جمال الدین چترویدی کے داماد، انہوں نے بتایا کہ وہ اس مسجد کے امام ہیں، اور مسجد کے ملحقہ مدرسہ کے صدر مدرس۔ کہنے لگے کہ ہم آپ کو یہاں جلسہ میں دعوت دینے والے تھے، مگر آپ کا پتہ معلوم نہ تھا۔ مغرب اور عشا کی نماز وہاں پڑھ کر اسٹیشن آگئے، کچھ دیر کے بعد چوری چورا ایکسپریس آئی، اس سے تقریباً بارہ بجے مئو پہونچے، مئو سے اعظم گڑھ جانے والی گاڑی کھڑی تھی، اس پر جا سوار ہوئے، اور تقریباً ڈیڑھ بجے رات میں اعظم گڑھ آگئے، باقی رات جامع مسجد میں گزار کر صبح مدرسہ پہونچ گئے، ساتھ میں مولوی عبدالشکور صاحب سلمہ اور مولوی ہاشم سلمہ ہیں، یہ سفر بہت خوشگوار اور بابرکت رہا، اگر میری تقریروں اور دینی کاموں پر دینی کام کا اطلاق درست ہو تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس سفر میں حق تعالی نے اپنے دین کی خدمت کی جتنی توفیق بخشی کم سفروں میں اس کا اتفاق ہوا، ایک تو مسلسل بزرگوں اور اللہ والوں کی صحبت نصیب رہی، دوسرے ایک تالیفی کام ہوگیا، تیسرے اتنے سے سفر میں ۱۹ وعظ ہوئے، اللہ تعالی اپنے فضل وکرم سے قبول فرمائیں۔

ناظرین سے دعائے خیر کی التجا ہے کہ پاس میں کوئی پونجی نہیں سوائے رحمت خداوندی اور دوستوں کی محبت کے، اور بحمد للہ یہ کچھ کم نہیں ہے، مگر اپنا ظرف جب بالکل خالی نظر آتا ہے تو جس طرح ایک غریب آدمی جو دونوں وقت روٹی تو کھالیتا ہے مگر پاس میں کوئی نقدی نہیں رکھتا، وہ اپنی غربت پر نظر کرتا ہے تو ایک ہوک سی اٹھتی ہے، یہی حال بعینہ میرا بھی ہے کہ رحمت خداوندی اور دوستوں کی محبت کے سہارے جی تو رہا ہوں مگر جب دل کی جھولی خالی دیکھتا ہوں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

اس سفرنامہ کا مقصود تعلیٰ اور اظہار خودی نہیں ہے، چونکہ اس سفر سے طبیعت میں انشراح بہت ہوا، اس لئے مناسب سمجھا کہ اسے قلم بند کردوں، پڑھنے والوں کو معلوم نہیں کوئی فائدہ پہونچے یا نہیں؟ میرا اپنا فائدہ ہے، اس لئے یہ کوئی بیکار عمل نہیں معلوم ہوا، اس میں اگر خود پسندی، ادعاء اور تعلیٰ محسوس ہو تو ناظرین اسے میرا عیبِ نفس سمجھ کر اللہ کے حضور میرے لئے استغفار کردیں۔

سفر بنگلہ دیش

۱۶؍تا ۱۸؍شوال ۱۴۱۸ھ بروز ہفتہ تا دوشنبہ بنگلہ دیش کے مرکزی شہر ڈھاکہ سے چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر بمقام ٹنگی ایک بڑا تبلیغی اجتماع ہوا، یہ اجتماع ہر سال ہوتا ہے اور کافی بڑے پیمانے پر ہوتا ہے، وہاں کے لوگوں کے پرانے تجربے کے بنا پر اس کا ہر انتظام، حسن انتظام کا آئینہ دار ہوتا ہے، بالخصوص دوسرے ممالک کے شرکا اور جماعتوں کے لئے تو وہ نظم ہوتا ہے کہ باید وشاید! ان کی رہائش، ان کے خورد ونوش، ان کی بشری ضروریات اور ان کی راحت وآرام کا جو انتظام واہتمام بنگلہ دیش کے اس عظیم اجتماع میں دیکھا ان کی نظیر ذرا مشکل سے ملے گی، پھر انتظام جن لوگوں سے متعلق تھا، ان کی محبت، ان کی خاکساری، ان کے بچھے جانے کا دلآویز انداز بلکہ ان کی ہر ہر ادا دیدنی تھی، تین دن کا اجتماع تھا مگر شرکاءِ اجتماع کی آمد کئی روز پہلے سے ہو رہی تھی، اور اجتماع کے ختم ہونے کے کئی دن بعد تک بہت سے لوگ وہاں رہے، اس پوری مدت میں ٹنگی کا یہ وسیع وعریض میدان انسانوں، دیندار انسانوں کا ایک بڑا شہر بن گیا تھا، بڑے سکون کے ساتھ اجتماع کے پروگرام چلتے رہے، اصل تقریریں اردو میں ہوتیں، اسٹیج سے ان کا بنگلہ زبان میں ترجمہ نشر ہوتا، اور اسٹیج کے نیچے مختلف زبانوں کے ترجمان اپنے اپنے حلقوں میں ترجمے کرتے رہتے، اجتماع کی ایک مفصل اور دلچسپ روداد ہے خاکسار نے اپنے روزنامچے میں اسے قدرے تفصیل سے لکھ لیا ہے، فرصت ملی تو مکمل سفرنامہ کتابی شکل میں ترتیب دینے کا ارادہ ہے۔[۱]

راقم الحروف کا مشغلہ درس وتدریس ہے، اس میں جب موقع مل جاتا ہے تو عوام کے درمیان بھی حاضری کی توفیق مل جاتی ہے، تبلیغی جماعت اور تبلیغی احباب سے بھی رابطہ رہتا ہے، بڑے جلسوں اور بڑے اجتماعات سے مناسبت نہیں ہے، اس لئے ان میں شرکت کا اتفاق کم بلکہ

بالکل نہیں ہوتا۔ بنگلہ دیش جانے کا ارادہ عرصہ سے تھا اور مقصد یہ تھا کہ وہاں کے مدرسوں کو دیکھا جائے اور وہاں کے علما سے ملاقاتیں کی جائے، بنگلہ دیش سے محبت وتعلق کی دو خاص وجہیں اور بھی اس سفر کی محرک بنتی رہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہی علاقہ ہمارے جونپور کے مشہور بزرگ اور صاحبِ ارشاد وہدایت شیخ، حضرت مولانا کرامت علی صاحب جون پوری نور اللہ مرقدہ کی تبلیغی و عرفانی کوششوں کا مرکز ومحور رہا ہے، بنگلہ دیش ہی کے مشہور شہر رنگ پور میں ان کی قبر مبارک بھی ہے۔ دوسرے ہمارے مرکز عقیدت ومحبت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ نے بھی عرصہ دراز تک سلہٹ کو نوازا ہے، ان حضرات اکابر سے جو تعلق ہے اس کی بھی کشش بنگلہ دیش کی طرف کھینچ رہی تھی، لیکن ایک دوسرا ملک بن جانے کی وجہ سے سفر میں جو قانونی دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں ان کی وجہ سے جب چاہیں سفر کرلیں، ایسا ممکن نہیں ہے، یہ اجتماع عالمی اجتماع ہوتا ہے، اس کی وجہ سے ویزا ملنے میں سہولت ہوتی ہے، اور بہت سے احباب کی رفاقت بھی بہم ہوجاتی ہے، پھر اتفاق سے یہ وقت بھی ایسا تھا کہ ہمارے عربی مدارس میں ابھی داخلے ہوتے رہتے ہیں، درس وتدریس کا کچھ زیادہ حرج بھی نہ ہوتا، ان مصالح کے پیش نظر اس وقت سفر اختیار کیا گیا۔

بہر حال اجتماع میں شرکت رہی، چار دن اور پانچ راتیں اجتماع گاہ میں گزریں، اجتماع کے ہر پروگرام کو غور سے دیکھا، ماشاء اللہ بنگلہ دیش میں تو اجتماع ہی تھا، لوگ پروانوں کی طرح امنڈ کر آرہے تھے، دوسرے تقریباً بیس ممالک کے دیندار حضرات دین اور اشاعتِ دین کے جذبہ سے سرشار ایک میدان میں جمع ہوگئے تھے، دین میں اللہ نے کتنی کشش رکھی ہے اور دلوں میں اس کا کتنا احترام وتقدس ہے، اس کا اندازہ ایسے اجتماعات سے خوب ہوتا ہے، لاکھوں کا مجمع تھا مگر کہیں شور وغل نہ نزاع وتکرار، نہ ہٹو بچو، نہ پولیس کی ضرورت، نہ کوئی بدامنی، بس یہ دین کا احترام، اللہ کی محبت اور ایمانی اخوت تھی کہ سب ایک تسبیح کے دانے نظر آرہے تھے۔ بڑی خوبیاں تھیں اس مجمع میں۔ اللہ تعالی تمام مسلمانوں کو دین وایمان کی محبت سے سرشار کرے۔

تین دن اجتماع کی ہماہمی میں گزرے، اب پروگرام یہ تھا کہ یہاں کے دینی عربی مدارس میں حاضری دی جائے، علما وطلبہ سے ملاقاتیں کی جائیں، بنگلہ دیش ہمارے لئے ایک

اجنبی ملک ٹھہرا، نہ یہاں کے مدارس سے واقفیت اور نہ یہاں کے علما سے روابط، کہاں سے ابتدا کی جائے؟ مدارس کہاں کہاں ہیں؟ کچھ خبر نہیں، بنگلہ دیش میں جس زبان کی حکمرانی ہے اس سے ہم لوگ بالکل نابلد اور اردو یہاں بالکل ناپید۔ زبان کے مسئلے میں عجب رجحان یہاں دیکھا کہ بنگلہ زبان کے علاوہ یہ حضرات کسی اور زبان کے لکھنے اور بولنے کے روادار نہیں ہیں، ہم لوگ شش وپنج میں تھے کہ ایک صاحب ملے، وہ بہت صاف اردو بول رہے تھے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے معہد ملت مالیگاؤں میں اپنی پوری تعلیمی زندگی گزاری ہے، ان سے مل کر بہت انس معلوم ہوا، یہ مولانا عبدالرحیم صاحب تھے، وہ ٹنگی کے قریب ہی ایک مدرسہ کے نائب مہتمم ہیں، معلوم ہوا کہ مہتمم صاحب بھی تشریف فرما ہیں، یہ مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند ہیں، تھوڑی دیر میں وہ بھی تشریف لائے، مفتی صاحب موصوف عرصہ تک بمبئی میں رہ چکے ہیں، اردو اور بنگلہ کے عمدہ خطیب ہیں، بہت دیندار اور باحوصلہ ہیں، انہوں نے چند برس پہلے جامعہ عثمانیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا ہے، ان سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی، وہ اپنے مدرسے میں لے گئے، دیر تک بنگلہ دیش کے دینی اور تعلیمی احوال پر گفتگو ہوتی رہی، بنگلہ دیش میں کچھ لوگوں کی طرف سے تحریک چل رہی ہے، اور موجودہ حکومت اس کی مدد کر رہی ہے کہ لڑکیوں کو تعلیم اور ملازمت کے نام پر پردہ سے باہر نکالا جائے، اس کے لئے شہر شہر اور قریہ قریہ میں مختلف انداز سے کوششیں ہو رہی ہیں، مال ودولت اور دوسرے ترغیبات سے کام لیا جا رہا ہے، اس کے نتیجے میں مسلمان عورتوں کی بڑی تعداد گھروں سے باہر آ گئی ہیں، علما اس کے تدارک اور علاج کی فکر میں ہیں، مگر اس منہ زور سیلاب پر بندھ باندھنا بڑا مشکل نظر آ رہا ہے، مفتی عبدالقیوم صاحب نے اسی مجبوری سے لڑکیوں کا بھی دینی اقامتی مدرسہ کھولا ہے اور پردہ کے اہتمام کے ساتھ چلا رہے ہیں کہ تعلیم کے نام پر جہاں بے تحاشا سرکاری اسکولوں اور بد دینی کے مراکز کی طرف لڑکیاں بھاگ رہی ہیں، وہیں کچھ بچیاں ان مدارس دینیہ میں بھی تعلیم حاصل کر لیں گی، اللہ تعالی خیر فرمائیں۔

ہمارے ہندوستان کے مدارس کی طرح بنگلہ دیش میں بھی دینی مدارس دو طرح کے ہیں بعض مدارس کا تعلق گونمنٹ سے ہے، انہیں حکومت سے امداد ملتی ہے، ان مدرسوں کو وہاں کی

اصطلاح میں ''سرکاری مدارس'' کہاجاتا ہے، ان کی تعداد بہت ہے، مگرسب بے روح، بے جان کوئی رونق نہیں، دینی چہل پہل نہیں۔ دوسرے وہ مدارس ہیں جوحکومت کے تعاون سے آزاد ہیں، انہیں وہاں ''قومی مدارس'' کہاجاتا ہے، دین اور دینی تعلیم کی آبروانہیں مدارس سے ہے۔ ماشاءاللہ قومی مدارس بھی ملک میں بہت ہیں، اور بڑے بڑے ہیں، اکثر مدارس میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے، جامعہ عثمانیہ تو ابھی چند برسوں سے قائم ہے، وہاں ابتدائی درجات کی تعلیم ہے لیکن قدیم مدارس میں دورۂ حدیث تک نظم ہے، مفتی عبدالقیوم صاحب نے میزبانی کا حق اداکردیا جامعہ عثمانیہ جس جگہ ہے اس کا نام ''ستائیس'' ہے، اور ضلع غازی پور ہے۔

مفتی عبدالقیوم صاحب کی رہنمائی میں ہم لوگ ڈھاکہ شہر کے ایک مدرسہ ''مرکز الفکر الاسلامی'' میں پہونچے، یہ ادارہ شہر کے باہر ایک مقام پر واقع ہے، اس کے بانی اور روح رواں مولانا مفتی عبدالرحمان صاحب مدظلہ ہیں، یہ ایک معروف مدبر صاحب نسبت اور بااثر عالم اور فقیہ ہیں، حضرت مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئی علیہ الرحمہ کے مرید اور خلیفہ ہیں۔

یہ ادارہ دوسرے مدارس کے برعکس اوپر کے درجہ سے شروع کیا گیا ہے، یعنی پہلے افتا کا درجہ قائم کیا گیا، پھر تخصص فی الحدیث کا، اس کے بعد دورۂ حدیث کا، اور اب مشکوۃ شریف کا بھی درجہ کھول دیا گیا، یہاں محنتی اور ذی استعداد اساتذہ کا اچھا اجتماع ہے۔ ڈھاکہ کے اور مدارس میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، ہر جگہ طلبہ ماشاءاللہ کثیر تعداد میں نظر آئے، چندروز ڈھاکہ میں رہ کر بنگلہ دیش کے دوسرے مشہور شہر جو علم وفضل کے اعتبار سے بہت پہلے سے معروف ہے، چاٹگام جانا ہوا، اس کو آج کل ''چیٹا گانگ'' کہتے ہیں، چاٹگام کے حلقے میں بہت بڑے بڑے مدارس ہیں، تین مدرسے بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

ایک دارلعلوم معین الاسلام ہاٹ ہزاری، یہ بنگلہ دیش کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، اور پرانا بھی ہے، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا ضمیر الدین صاحب علیہ الرحمہ اور ان کے رفقا کا قائم کیا ہوا ہے، اس مدرسہ میں طلبہ کی تعداد چار ہزار ہے، دورۂ حدیث میں آٹھ سو طلبہ ہیں۔

دوسرا مدرسہ، مدرسہ ضمیر یہ قاسم العلوم پیٹہ ہے، چاٹگام سے ۲۲/۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر

پٹیہ ایک قصبہ ہے، وہیں یہ عالیشان مدرسہ ہے، عمارت کی وسعت اور خوبصورتی کے لحاظ سے یہ بنگلہ دیش کا ممتاز مدرسہ ہے، اس کے مہتمم مولانا ہارون صاحب مدظلہ بہت فعال اور زیرک عالم ہیں، اس مدرسہ کے بانی حضرت مولانا مفتی عزیزالحق صاحب نوراللہ مرقدہ ہیں، جو حضرت مولانا ضمیرالدین صاحب چاٹگامی علیہ الرحمہ کے خلیفہ تھے، اس مدرسہ میں تقریباً ساڑھے تین ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں، اس مدرسہ کے تعلقات عرب ممالک سے بہت مستحکم معلوم ہوتے ہیں، اس کی متعدد شاخیں ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی کام کرتی ہیں، اب اس مدرسہ کا نام جامعہ اسلامیہ ہے۔

تیسرا مدرسہ، مدرسہ اسلامیہ خبیری ہے، یہ بنگلہ دیش کا قدیم ترین مدرسہ ہے، مولانا مفتی عزیزالحق صاحب نے یہیں تعلیم حاصل کی تھی۔

ان مدارس میں ماشاء اللہ دینداری کے نمایاں اثرات محسوس ہوئے، طلبہ کی وضع قطع شرعی نظر آئی، اساتذہ میں بھی تدین کا رنگ غالب تھا۔

بنگلہ دیش میں طلبہ کی مہمان نوازی کا بھی خاصا ذوق دکھائی دیا، ہاٹ ہزاری کے مہتمم صاحب نے بتایا کہ چار ہزار طلبہ میں ۲۱۰۰ رطلبہ مختلف آبادیوں میں بطور مہمان رہتے ہیں۔

البتہ ایک چیز بہت شدت سے محسوس ہوئی، وہ یہ کہ بنگلہ دیش سے اردو زبان کا تقریباً خاتمہ کردیا گیا ہے، صرف دینی مدارس کے اوپر کے درجات میں بنگالی زبان بنام اردو بولی جاتی ہے، یعنی زبان تو اردو ہوتی ہے مگر لب ولہجہ ایسا بنگالی ہوتا ہے کہ ہم یوپی والے اس کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، اردو کی کتابیں بہت کمیاب بلکہ ناپید ہیں۔ اللہ تعالی اس ملک کو اپنے حفظ وامان میں رکھے، اور دین اسلام اور دینداری کو فروغ بخشے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) متذکرہ بالاتحریر مجلّہ المآثر شوال تا ذوالحجہ ۱۴۱۸ھ مطابق فروری تا اپریل ۱۹۹۸ء میں بطور اداریہ شائع ہوئی تھی، یہ حضرت مولانا کے سفر بنگلہ دیش سے متعلق مختصر تأثرات ہیں جو اس میں نقل ہوئے، مستقل سفرنامے کا ارادہ تھا مگر اس کو ترتیب نہیں دے سکے، ہاں ذاتی روزنامچے میں تاریخ وار تفصیل سے لکھا ہے، آئندہ سطور میں سفر بنگلہ دیش ہی کے عنوان سے روزنامچے کی ترتیب پر مفصل سفرنامہ ملاحظہ فرمائیں۔

سفر بنگلہ دیش

۱۳؍شوال ۱۴۱۸ء:

آج نارکل ڈانگہ کلکتہ سے بنگلہ کے لئے روانگی ہے، ہم لوگوں کو آٹھ بجے کی لوکل ٹرین سے ہندوستان کے سرحدی شہر بن گاؤں جانا ہے، مگر بعض رفقا کے تاخیر سے آنے کی وجہ سے وقت پر سیالدہ اسٹیشن پر نہ پہونچ سکے۔

ہم لوگ اسٹیشن پہونچے تو آٹھ بجے والی لوکل جا چکی تھی، اب نو بجے ٹرین تھی، اس سے روانہ ہوئے اور سوا گیارہ بجے بن گاؤں اسٹیشن پر اترے، وہاں سے آٹو رکشہ کے ذریعے سرحد تک گئے، جس کا فاصلہ بن گاؤں سے پندرہ بیس کلو میٹر ہوگا، ہندوستان میں اس کا نام ہری داس پور ہے، اور بنگلہ دیش کی سرحد کا نام بنیا پول ہے۔

اس سفر میں ہمارا قافلہ پندرہ آدمیوں پر مشتمل ہے، امیر قافلہ حافظ محمد ابراہیم صاحب ہیں، قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔ حاجی انور حسین صاحب، مولوی محمد شفیع صاحب، شاہجہاں بھائی، مولوی منظور الحق سلمہ، صغیر احمد، حافظ غلام حیدر سلمہ، فضل اللہ وغیرہ۔

ہم لوگوں کا پروگرام یہ بنا ہے کہ سرحد سے براہ راست ڈھاکہ نہ جایا جائے، بلکہ اس سے بہت پہلے شہر جیسور میں حافظ محمد ابراہیم صاحب کے پھوپھی زاد بھائی جناب شرف الدین صاحب رہتے ہیں، رات میں وہاں قیام کیا جائے، حافظ صاحب نے کلکتہ سے جیسور فون کر دیا تھا، چنانچہ وہاں سے ان کے ایک رشتہ دار شہادت حسین صاحب ایک گاڑی لے کر آ گئے تھے، جس میں آسانی سے دس آدمیوں کی گنجائش ہے۔

سرحد پار کرنے کا معاملہ بڑا سخت ہوتا ہے، انسانی حد بندیوں نے زمین کے مختصر فاصلے

کو اتنا دور دراز کر دیا ہے کہ اتنی مسافت طے کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں، تبلیغی اجتماع کی وجہ سے مسافروں کا ہجوم بہت تھا، اور سرحد کا عملہ سست رو بھی تھا، پاسپورٹ اور ویزا کی قانونی جانچ اور اندراج میں گھنٹوں لگ گئے، خدا خدا کر کے اس مرحلہ سے نجات ملی، اور چند قدم کا فاصلہ طے کر کے بنگلہ دیش کے اندر پہونچے، تو وہاں بھی وہی سخت مرحلہ درپیش تھا، یہاں شہادت حسین صاحب کی وجہ سے آسانی ہوئی، ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی، وہیں ایک مسجد میں نماز پڑھی، اسلامی ملک ہونے کا یہ فائدہ فوراً نظر آیا کہ وہیں ایک نہیں کئی مسجدیں نظر آئیں، یہاں پر تبلیغی اجتماع کے کارکن موجود تھے، جو اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے بسوں کی سہولت کا انتظام کئے ہوئے تھے، نماز کے بعد طویل انتظار کے بعد پاسپورٹ کی انکوائری مکمل ہوئی، چار بجے کے بعد ہم لوگ جیسور کے لئے روانہ ہوئے، ایک گاڑی اور کرایہ پر لی گئی، ہم لوگوں کو بھوک خوب لگی ہوئی تھی، جیسور سے پہلے ایک بڑا بازار پڑا، وہاں عصر کی نماز پڑھی گئی، نماز کے بعد وہیں ایک ہوٹل میں کھانا کھایا گیا، مغرب کی نماز کے وقت جیسور پہونچے، شرف الدین صاحب کے مکان کے قریب ایک مسجد میں اپنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، نماز کے بعد شرف الدین صاحب کے بڑے بیٹے سے ملاقات ہوئی، انہوں نے خوب خاطر مدارات کی، والد ابھی دوکان پر تھے، وہ عشا کے بعد آئے، انہوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا، بہت اہتمام کے ساتھ کھانا کھلایا، رات کو انہیں کے گھر قیام رہا، رات بعافیت گزری، شرف الدین صاحب نے راحت کا پورا اہتمام کیا۔

۱۴، ۱۵، ۱۶ر شوال:

ہمارے قافلہ کے پانچ ساتھی علی الصباح ایک بس سے اجتماع گاہ کے لئے روانہ ہو گئے ہم لوگوں کا پروگرام سواری کی دقت کی وجہ سے یہ ہوا کہ جس گاڑی سے کل آئے تھے (جسے یہاں میکرو کہا جاتا ہے) وہی گاڑی ریزرو کر لی جائے اور اس سے اجتماع گاہ جایا جائے، اجتماع گاہ ڈھاکہ کے قریب ایک مقام پر ہے جس کا نام ٹنگی ہے، میکرو ۳۱۰۰ میں طے ہوئی، اس پر ہم دس آدمی اور ایک شرف الدین صاحب سوار ہوئے، دقت تو ہوئی مگر چونکہ سب اپنے ہی رفقا تھے اس لئے ذہنی اعتبار سے انس رہا، وحشت نہیں ہوئی۔

فجر کی نماز سوا چھ بجے ہوئی، نماز کے بعد مسجد میں مختصر سا وعظ ہوا، ناشتہ کے بعد قافلہ سفر

کے لئے تیار ہوا، دس بجے دن میں ہماری گاڑی چلی، کافی دور تک سڑک معمولی تھی مگر جب ڈھاکہ کی شاہراہ شروع ہوئی تو وہ مسلسل اچھی ملتی چلی گئی، جیسور سے ڈھاکہ کا فاصلہ تقریباً تین سو کلومیٹر ہے۔ اس سفر میں ایک نیا تجربہ ہوا، ڈھاکہ سے سو کلومیٹر قبل ایک دریا ملا، جس کا نام ''بُدّا'' ہے، سڑک یہیں ختم ہوجاتی ہے، اس دریا پر پل نہیں ہے، بنگلہ دیش تو دریاؤں اور ندیوں کا ملک ہے، ہر تھوڑی دیر اور فاصلے کے بعد کوئی نہ کوئی ندی آہی جاتی ہے، حکومت نے سب پر پل بنوا رکھے ہیں، مگر بدا کا عرض اتنا زیادہ ہے کہ اس پر ابھی تک پل نہیں بن سکا ہے، معلوم ہوا کہ کہیں اس پر پل بن رہا ہے، مگر ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے، وہ تیار ہوگا تو شاید پندرہ بیس کلومیٹر کا ہوگا۔

بدا کو جہاز سے پار کرنا تھا، یہ جہاز پھیری کہلاتے ہیں، یہ اسی مقصد کے لئے بنائے جاتے ہیں کہ ان پر بسیں اور ٹرک نیز دوسری گاڑیاں سوار کردی جائیں، اور وہ جہاز انہیں دوسری طرف اتار دیتے ہیں، پانی زیادہ ہوتا ہے تو جہاز کا یہ سفر قدرے مختصر ہوتا ہے، کیوں کہ جہاز سیدھا دوسرے کنارے پہونچ جاتا ہے، لیکن جب پانی کم ہوتا ہے تو اس کا سفر طویل ہوجا ہے، اور بہت دیر میں دوسرے کنارے پہونچتا ہے، اس جہاز تک گاڑیوں کا پہونچنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے، بڑا شدید ہجوم ہوتا ہے، گھنٹوں گاڑیوں کو لائن میں کھڑے رہنا پڑتا ہے، جہاز دوسری جانب سے گاڑیوں کو لے کر آتا ہے، گاڑیاں یکے بعد دیگرے اترتی ہیں، اور آگے پیچھے چلتی رہتی ہیں، اگر کوئی ڈرائیور ذرا بدعنوانی کردیتا ہے (اور بدعنوانی یہاں عام ہے) تو پیچھے تمام گاڑیاں رک جاتی ہیں، ہم لوگوں کی گاڑی بھی اسی بندعنوانی کا شکار ہوئی، اور گھنٹوں پھنسی رہی، بڑی مشکلوں سے گاڑی دریا تک پہونچی، تھوڑی دیر میں جہاز گاڑیوں سے بھر گیا، ۱۸؍ بڑی گاڑی بسیں اور ٹرک تھے، اور تین چھوٹی گاڑیاں تھی، ان گاڑیوں کے مسافر تھے، اور ان کے سامان تھے، ہم لوگ دو بجے جہاز میں سوار ہوئے، اور اسی پر ظہر کی نماز پڑھی، جہاز پر وضو اور استنجا کا انتظام ہے، ڈھائی بجے کے بعد جہاز کا لنگر اٹھا، اور دو گھنٹے تک مسلسل چلتا رہا، اور ساڑھے چار بجے کے بعد دوسرے کنارے پر پہونچا، خوش قسمتی سے ہماری گاڑی آگے ہی تھی، اس لئے ہم لوگ جلدی اتر گئے، اور بعجلت ڈھاکہ کی شاہراہ پر پہونچ گئے۔ ڈھاکہ یہاں سے اسی پچاسی کلومیٹر ہے، سات بجے کے

قریب اجتماع گاہ میں پہونچے، یہاں باہر آنے والے مہمانوں کا استقبال کرنے والے لوگ موجود ہیں، انہوں نے ہم لوگوں کو ایک اچھے خیمے میں پہونچا دیا جو ہندوستان اور پاکستان کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔

یہ اجتماع گاہ ایک بہت بڑا میدان ہے، اسی میدان میں خیموں کا ایک شہر آباد ہے، بنگلہ دیش کا یہ اجتماع ایک مدت سے ہوتا آرہا ہے، اس لئے یہاں کے لوگوں کو اس کا بڑا تجربہ ہو گیا ہے، وہ سارا انتظام نہایت سلیقے سے کرتے ہیں۔

یہ لوگ خیموں کو بڑے منصوبہ بند طریقے سے لگاتے ہیں، چونکہ بہت سے ملکوں کی جماعتیں آتی ہیں، اس لئے ہر ملک کے لئے الگ الگ خیمے لگائے جاتے ہیں، اور ہر دو خیمہ کے درمیان ایک کشادہ راستہ رکھا جاتا ہے جس میں گاڑیاں بسہولت دونوں طرف آجا سکیں، بنگلہ دیش کے علاوہ دوسرے ملکوں کی جماعتوں کے لئے شیڈ کے خیمے بنائے گئے ہیں، اور شیڈ ہی سے چاروں طرف سے انہیں گھیرا گیا ہے، دھوپ کی گرمی اور رات کی سردی سے بچاؤ کے لئے ان شیڈوں کے نیچے ٹاٹ کے پردے لگا دیئے گئے ہیں، خیمے نہایت آرام دہ ہیں، زمین پر چٹائیوں کا فرش بچھایا گیا ہے، انہوں چٹائیوں پر لوگ اپنے اپنے بستر لگاتے ہیں۔ ہم لوگ جس خیمے میں پہونچائے گئے، وہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لئے مختص ہیں، عربوں کے لئے الگ خیمے ہیں، اسی طرح الگ ملکوں کے لئے علیحدہ خیمے، اکثر خیموں میں کئی کئی ملکوں کے لوگوں کو جمع کیا گیا ہے۔ سعودی عرب، ملک شام، نائیجیریا، افغانستان، پاکستان، برما، ہندوستان اور انڈونیشیا کی جماعتیں نمایاں ہیں، اور خیموں پر اہل انتظام کی نگرانی بہت چوکس ہے، اس حلقے میں بنگلہ دیشی عوام کو آنے کی مطلق اجازت نہیں ہے۔ ہر راستے پر مستعد کارکن جماعت کی شکل میں میں کھڑے رہتے ہیں، جو باہر سے آنے والوں کا استقبال کرتے ہیں ان کی رہنمائی کرتے ہیں، ان کو خیموں میں پہونچاتے ہیں، کوئی اور شخص داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے روکتے ہیں، اس سلسلے میں ان رضا کاروں کی کارکردگی بہت عمدہ ہے۔ اس پورے علاقہ میں جگہ جگہ عارضی بیت الخلا اور غسل خانے بکثرت اور نہایت عمدہ قسم کے بنائے گئے ہیں، اور ہر وقت ان کی صفائی ستھرائی کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور وضو خانے بھی نہایت وافر مقدار میں ہیں۔ غرض سہولت کا بہت اچھا نظم ہے، وضو

خانوں میں تازہ بلکہ گرم پانی کا انتظام کیا گیا ہے، خیموں کے اسی حلقے میں مہمانوں کے کھانے کے لئے ایک بہت وسیع پنڈال بنایا گیا ہے، پورا پنڈال چٹائیوں کے فرش سے ڈھکا ہوا ہے، ہر ملک کی غذا اور مزاج کی رعایت کرتے ہوئے الگ الگ حلقے بنائے گئے ہیں، اہل عرب کا حلقہ الگ ہے، ہندوستان و پاکستان کا حلقہ الگ ہے، ہندوستان میں بھی اہل بنگال و آسام کا حلقہ جدا ہے۔ انتظام اس طرح ہے کہ چار چار آدمیوں کا گروپ ایک دسترخوان پر بٹھایا جاتا ہے، ایک بڑی سینی میں روٹیاں، ایک بڑے پیالے میں سالن، ایک چھوٹی پلیٹ میں سلاد، ایک پیالی میں اچار اور اسی سینی میں چاول دے دیا جاتا ہے، یہ سارا سامان اسی سینی میں ہوتا ہے، وہ چاروں افراد مشترکہ طور پر کھاتے ہیں۔

دو دو رضا کار پنڈال کے ہر دروازے پر کھڑے رہتے ہیں، وہ جانے والوں کو محبت سے سلام کرتے ہیں، انہیں بیٹھنے کی جگہ بتاتے ہیں، پھر دوسرے رضا کار کھانا لاتے ہیں، کچھ اور رضا کار ہر وقت روٹیاں، سالن، چاول اور پانی لئے پھرتے ہیں، جس کو جو ضرورت ہوتی ہے فوراً حاضر کرتے ہیں، اور بڑی محبت سے پیش کرتے ہیں، بڑی خوش اسلوبی سے تمام مہمانوں کو کھانا کھلا کر بآسانی فارغ کر دیتے ہیں، اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے، پنڈال کے باہر ہاتھ دھونے کے لئے ٹونٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں، اور رضا کار بھی مستعد رہتے ہیں، صابون کا انتظام بھی ہے، سالن بکری اور گائے کے گوشت کا ہوتا ہے، جس میں آلو، لوکی، پپیتہ اور گاجر مل کر کے پکایا جاتا ہے، اس مجموعہ کا شوربہ بڑا لذیذ اور ہاضم ہوتا ہے، تلی ہوئی مچھلیاں بھی رہتی ہیں، کبھی کبھی عمدہ قسم کی بریانی بھی دی گئی۔ پنڈال کے باہر ایک طرف بڑی بڑی کیتلیوں میں چائے لئے چند افراد بیٹھے رہتے ہیں، جن لوگوں کی خواہش ہوتی ہے انہیں خندہ پیشانی سے چائے پلاتے ہیں، اس سے آگے بڑھئے تو کھانا پکانے کا وسیع و عریض حلقہ ہے، جس میں بے شمار چولہے بنے ہوئے ہیں، اور بہت سے تندور گڑے ہوئے ہیں، ان میں گیس سے آگ جلتی ہے، اسی حلقے میں ایک احاطہ میں بہت سی بکریاں، بھیڑیں، اور گائے بیل بندھے ہوئے ہیں، جنہیں دونوں وقت ذبح کیا جاتا ہے، اسی حلقے میں ناریل کے پھل جن میں صرف پانی ہوتا ہے جنہیں بنگال میں ’’ڈابھ‘‘ کہا جاتا ہے، بافراط رکھے ہوتے ہیں، جس مہمان کو خواہش ہو بے تکلف لے سکتا ہے، یہ سارا انتظام مفت

ہے اور غیر ملکی مہمانوں کے لئے ہے، اس میں ملکی حضرات کا حصہ نہیں ہے۔

بنگلہ دیشی عوام کے لئے ایک بہت وسیع وعریض پنڈال کپڑوں کے خیموں کا تاحد نظر بنایا گیا ہے، جس کو حلقہ وار تقسیم کر دیا گیا ہے، یہ حضرات اپنے گھروں سے کھانے پکانے کا انتظام لے کر آتے ہیں، حتی کہ اپنے ساتھ لکڑیاں بھی لاتے ہیں، یہ لوگ پنڈال کے باہر میدان میں روکھا پھیکا پکا کر کھالیتے ہیں۔ یہی پنڈال جلسہ گاہ بھی ہے، اسی میں اسٹیج بنا ہوا ہے، اسی پنڈال میں پانچوں وقت نماز ہوتی ہے، نماز کا انتظام یہاں اس طرح کیا گیا ہے کہ اذان سے پہلے نماز کے وقت کا اعلان کر دیا جاتا ہے، یہ اعلان لاؤڈ اسپیکر سے ہوتا ہے، لیکن اذان بغیر لاؤڈ اسپیکر کے ہوتی ہے، اذان کے بعد مسلسل اعلان ہوتا رہتا ہے، لوگوں کو بلایا جاتا ہے، ہر ہر خیمے میں رضا کار پھرتے رہتے ہیں، اور پنڈال میں جانے کی تاکید کرتے رہتے ہیں، کوشش کرتے ہیں کہ خیموں میں جماعت نہ ہو، انتظام کی سہولت کے لئے غیر ملکی مہمانوں کے لئے نماز کا الگ حلقہ بنا دیا گیا ہے، اس حلقہ میں جانے کا ایک خاص راستہ بنایا گیا ہے، اس حلقے میں اور اس راستے پر رضا کار دو رویہ کھڑے رہتے ہیں جو مہمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں، اور بنگلہ دیشی عوام کو ادھر آنے سے روکتے ہیں، یہ طریقہ اگر چہ مستحسن نہیں معلوم ہوتا مگر انتظام اور حالات کی مجبوری کی وجہ سے ایسا کرنا پڑتا ہے، البتہ غیر ملکی حضرات پر پابندی نہیں ہے کہ وہ اس حلقے میں ضرور جائیں، وہ دوسرے مقامات پر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اذان، اقامت اور نماز سب بغیر لاؤڈ اسپیکر کے ہوتی ہے، اس لئے نماز ہونے تک ہر پل لاؤڈ اسپیکر میں اعلان ہوتا رہتا ہے کہ اب اتنا وقت باقی رہ گیا ہے، اب اذان ہونے والی ہے، اب اقامت ہوگی، مکبرین کا انتظام بہت زبردست کیا گیا ہے، اسٹیج پر میرا اندازہ ہے کہ پندرہ بیس مکبر ہوں گے، یہ امام کی تکبیر کو ایک ساتھ بہت قوت کے ساتھ بلند آواز سے دوسروں تک پہونچاتے ہیں، پھر سارا میدان مکبرین کی آواز سے گونجنے لگتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کی سہولت کے اس دور میں یہ انتظام کچھ عجیب سا لگا، علما عام طور سے نماز و اذان میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز قرار دیتے ہیں، ابھی ڈھاکہ شہر میں تو جانا نہیں ہوا لیکن اجتماع گاہ کی قریبی آبادیوں سے اذان کی آوازیں بکثرت آتی رہتی ہیں، پھر معلوم نہیں اس عظیم اجتماع میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال

ممنوع کیوں ہے؟ البتہ اذان سے پہلے اور اذان کے بعد، اس کے ہونے کی اطلاع اسی سے دی جاتی ہے۔ اب علما اسے سمجھیں کہ یہ طریقۂ تثویب ممنوع میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر اذان و اقامت اور نماز لاؤڈاسپیکر سے ہوتی تو بہت سے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے، جمعہ کی دونوں اذان اور خطبہ البتہ لاؤڈ اسپیکر سے ہوا مگر نماز جمعہ میں لاؤڈ اسپیکر ممنوع رہا۔

تبلیغی اجتماعات میں تقریریں بہت ہوتی ہیں، اور بہت لمبی ہوتی ہیں، جمعہ کے روز تعلیم کے نام پر خیمے میں تقریر شروع ہوئی تو بہت دراز ہوئی، جمعہ کی نماز کے بعد ایک صاحب کی تقریر اسٹیج پر عربی زبان میں ہوئی، اس کا بنگلہ میں ترجمہ ہوا، یہ ترجمہ تو اسٹیج سے نشر ہو رہا تھا، اسٹیج کے نیچے غیر ملکیوں کے حلقوں میں کئی زبانوں کے لوگ اپنی اپنی زبان میں ترجمہ کرتے رہتے ہیں، عصر کی نماز کے بعد مغرب تک بنگلہ میں تقریر ہوئی، مغرب کی نماز کے بعد مولانا احمد لاٹ صاحب کی تقریر اردو میں ہوئی، اور ساتھ ہی ساتھ اسٹیج ہی سے بنگلہ زبان میں ترجمہ بھی نشر ہوتا رہا۔ ساڑھے چھ بجے تقریر شروع ہوئی اور ان سطور کے تحریر کے وقت جب کہ سوا نو بج چکے ہیں، تقریر کا سلسلہ جاری ہے، تھوڑی دیر کے بعد تشکیل شروع ہوئی، پونے دس بجے تشکیل بند ہوئی، اس وقت اعلان ہوا کہ اب اذان ہوگی، ہم لوگوں نے خیمے میں پہلے ہی عشا کی نماز پڑھ لی۔

آج فجر کی نماز کے بعد ایک صاحب کا وعظ ہوا، شروع میں انہوں نے متعدد آیات اور احادیث نہایت صحت کے ساتھ پڑھیں، جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ عالم ہیں، لیکن جب تقریر شروع ہوئی تو محسوس ہوا کہ عالم نہیں ہیں، کیوں کہ پھر اخیر تک انہوں نے کسی آیت اور کسی حدیث پر کلام نہیں کیا، ان کی طویل تقریر کا مضمون صرف یہ تھا کہ ”ساری دنیا کی ہدایت کی فکر کرنا پوری امت کی ذمہ داری ہے“۔ اسی بات کو وہ بتکرار بیان کرتے رہے اور تقریر لمبی ہوتی رہی، طول ممل کی کامیاب مثال! (یہ بھائی عبدالوہاب صاحب، امیر جماعت پاکستان تھے)

ہم لوگ جلسہ گاہ کے اس حصے میں بیٹھے تھے جو عربوں کے لئے مختص تھا، ایک صاحب تقریر کا عربی ترجمہ کر رہے تھے، وہ آج کل کے عربوں جیسی عربی بول رہے تھے، تقریر کا سلسلہ آٹھ بجے کے قریب تک چلتا رہا، اس کے بعد ناشتہ کی فرصت دی گئی، دس بجے الگ الگ خیموں میں تعلیم کے نام سے تقریروں کا سلسلہ پھر چلا، ہمارے خیمے میں ایک صاحب تقریر کر رہے تھے،

ان کی آواز جادو جگا رہی تھی، انداز بیان بہت دلچسپ تھا، الفاظ وعبارت کی بندش خاصی دلکش تھی، مگر پوری تقریر خودساختہ احادیث وواقعات سے بھری ہوئی تھی، تقریر کیا تھی؟ عجائب وغرائب کی گلزار تھی، کوئی روایت اول سے آخر تک صحیح نہیں بیان کی، اس تقریر سے بہت وحشت ہوئی، ان تقریروں سے عوام کا جو ذہن بنے گا وہ کچھ بھی ہو دینی ذہن نہ بنے گا، یہ شخص موضوع روایات کا امام معلوم ہوتا ہے، میں نے ان موضوع روایات کا ایک نوٹ تیار کیا ہے جس پر مستقبل میں مضمون لکھنے کا ارادہ ہے[۱] سوا بارہ بجے اس تقریر سے نجات ملی، ظہر کی نماز ہم لوگوں نے خیمہ میں اپنی جماعت سے ڈیڑھ بجے کے پہلے پڑھ لی، پھر اعلان ہوا کہ ڈیڑھ بجے اذان ہوگی، اور دو بجے جماعت ہوگی۔ یہاں سب نظم وضبط قابل تعریف ہے مگر نماز کا جو نظم کیا گیا ہے وہ سمجھ سے باہر ہے۔

پونے پانچ بجے عصر کی نماز بڑی جماعت کے ساتھ ادا کی، عصر کی نماز کے بعد ایک صاحب، سابق حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب علیہ الرحمہ کے طرز وانداز میں بولتے رہے، معلوم ہوا کہ ان کے صاحبزادے مولانا زبیر الحسن صاحب ہیں، یہ تقریر مختصر تھی، مغرب کی اذان ۵۔۵۵ پر ہوئی، نماز کے بعد کوئی صاحب تقریر کر رہے ہیں، اس وقت ۶۔۳۷ ہوئے ہے ہیں، دس منٹ قبل تقریر شروع ہوئی ہے۔

۱۷؍شوال:

آج اجتماع میں آدمیوں کا ہجوم بہت آیا، دوسرے ملکوں کے لوگ بھی بکثرت آئے، کالے گورے ہر طرح کے آنے والے ہیں، فجر کے بعد جن صاحب کی تقریر ہوئی ان گلا نہایت پھنسا ہوا تھا، اس لئے کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم لوگ تھوڑی دیر مجمع میں بیٹھ کر چلے آئے، دن کے معمولات حسب معمول چلتے رہے، عصر کی نماز کے بعد مجلس نکاح منعقد ہوئی، مولانا زبیر صاحب نے خطبۂ نکاح پڑھا، اور بہت سے نکاح ہوئے، مغرب کی اذان تک ایجاب وقبول کا سلسلہ چلتا رہا۔ مغرب کی نماز کے بعد پاکستان کے مفتی زین العابدین صاحب کی تقریر ہوئی، یہ تقریر عام تبلیغی تقریروں کے برخلاف عالمانہ ہوئی، انہوں نے مردم سازی کی اہمیت پر زور دیا۔ یہ تقریر جلد ہی ختم ہوگئی، سوا آٹھ بجے تشکیل شروع ہوئی۔

۱۸؍شوال:

آج دعا ہوگی، معلوم ہوا کہ اسٹیج تبدیل کردیا گیا ہے، آج مجمع بہت ہوگا، ہر روز اعلان ہوتا تھا کہ تمام لوگ میدان میں نماز پڑھیں، لیکن آج اعلان ہوا کہ خیمے ہی میں نماز ہوگی، میدان میں نماز ۵-۵۰ پر ہوئی، اور اعلان ہوا تھا کہ خیمے میں نماز چھ بجے ہوگی، چنانچہ میدان کی نماز کے پورا ہونے کے بعد یہاں نماز شروع ہوئی، مگر مصیبت یہ ہوئی کہ ایک صاحب نے مسلسل تقریر شروع کردی، طاقتور لاؤڈ اسپیکر ہونے کی وجہ سے مسلسل خیمے میں آواز آتی رہی، اس سے پوری نماز متاثر رہی۔ کاش اتنی دیر تک اسٹیج پر خاموشی رہتی، جب کہ وہیں سے چھ بجے نماز کا حکم ہوا تھا، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغی اجتماع کا حاصل صرف تقریر اور تشکیل ہے، بولنا اور مسلسل بولتے رہنا۔ الفاظ کی بہتات مگر معانی نہایت قلیل! ساری تقریروں کا حاصل یہ ہے کہ ”دعوت سب سے بڑا کام ہے، یہ پوری امت کی ذمہ داری ہے“۔ قرآن وحدیث میں خواہ کسی عمل کی فضیلت بیان کی گئی ہو، سب کو دعوت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔

فجر کی نماز کے بعد ایک صاحب کی تقریر ہوئی، غالباً یہ پاکستانی تبلیغی جماعت کے امیر بھائی عبدالوہاب ہیں، انہوں نے ایک حدیث کا مضمون ذکر کیا، جس میں اللہ تعالی نے فرشتوں کو دنیا کی سب سے طاقت ور مخلوق کی خبر دی ہے، فرشتوں نے پہاڑوں کو سمجھا تھا، اللہ نے بتایا کہ لوہا اس سے زیادہ طاقت ور ہے، پھر بتایا کہ آگ اس سے زیادہ قوی ہے، پھر فرمایا کہ پانی میں اس سے زیادہ طاقت ہے، پھر ارشاد ہوا کہ ہوا اس سے زیادہ زورآور ہے، پھر اخیر میں بتایا کہ مومن کے دائیں ہاتھ کا ایسا صدقہ جس کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو، اس سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کو مقرر صاحب نے بجائے صدقہ کہنے کے اس طرح تعبیر کیا کہ ”مومن کے دائیں ہاتھ سے نکلنے والا عمل جس کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو، اور اسے دعوت قرار دیا“۔ یہی انداز تبلیغی تقریروں کا ہوتا ہے کہ مضمون کوئی ہو اسے دعوت بنا دیا جائے۔

اعلان ہوا کہ ساڑھے آٹھ بجے دعا کی مجلس ہوگی، ساڑھے آٹھ بج گئے تو یکے بعد دیگرے لوگ آنے لگے کہ پنڈال میں جلد چلو، تھوڑا سا بیان ہوگا پھر دعا ہوجائے گی، امیر صاحب نے کہا کہ دس بجے چلا جائے گا، لیکن اتنے لوگ ہانکنے کے لئے آنے لگے کہ ہم لوگ ساڑھے نو

سے پہلے پنڈال میں پہونچ گئے، آج بہت ہجوم تھا، بڑی مشکل سے تھوڑی سی جگہ بیٹھنے کی ملی، مولانا سعد بن مولانا محمد ہارون بن مولانا محمد یوسف صاحب سابق رئیس التبلیغ کی تقریر ہو رہی تھی جگہ جگہ اس کے ترجمے ہو رہے تھے، تقریر بہت طویل ہو گئی، اس کا بنگلہ ترجمہ اس سے بھی طویل تھا، تقریر تھی کہ ٹھہرنے کا نام نہ لیتی تھی، دھوپ کی گرمی پریشان کر رہی تھی، سب بدحواس تھے، مگر تقریر جاری تھی، اور اس میں بجز تکرار کے کوئی خاص مضمون بھی نہ تھا، اسی دوران بنگلہ دیش کا صدر جمہوریہ بھی آ گیا، ایک خاص جگہ اسٹیج کے پہلو میں بنائی گئی تھی، اسی میں وہ بیٹھا، سوا بارہ بجے غالبًا کسی کے کہنے سے تقریر کا سلسلہ رکا، اس کے بعد مولانا زبیر الحسن صاحب بن مولانا انعام الحسن صاحب علیہ الرحمہ نے دعا شروع کی، خیر انہوں نے مہربانی کر کے بیس منٹ پر دعا ختم کر دی، دعا میں ناقابل بیان ہجوم تھا۔ اللہ تعالیٰ کرم فرماویں۔

مجمع دعا کے بعد آہستہ آہستہ چھٹنے لگا، ہجوم کی وجہ سے اس کے چھٹنے کی رفتار بہت سست تھی، عصر کی نماز کے بعد مولانا محمد ابراہیم صاحب خادم خاص حضرت مفتی محمود الحسن صاحب علیہ الرحمہ اور مولانا محمد فاروق صاحب صاحب خلیفہ حضرت مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی۔

بعد نماز مغرب ایک صاحب ملے، انہوں نے بتایا کہ وہ معہد ملت مالیگاؤں کے تعلیم یافتہ ہیں، مولانا محمد حنیف صاحب ملی کے شاگرد، نام ان کا مولانا عبدالرحیم صاحب ہے۔ ان سے باتیں کر کے طبیعت کو بہت خوشی ہوئی، وہ یہیں ٹنگی سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں ’’ستائیس‘‘ کے ایک مدرسہ جامعہ عثمانیہ دارالعلوم کے نائب مہتمم اور مدرس ہیں، انہوں نے بتایا کہ مدرسہ کے مہتمم مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب بھی تشریف فرما ہیں، وہ بہت عرصہ تک ممبئی میں رہ چکے ہیں، یہاں کے بہت اچھے خطیب ومقرر ہیں، پھر وہ جا کر انہیں بلا لائے، ان سے جو گفتگو شروع ہوئی تو دل کی کلی کھلتی چلی گئی۔ بنگلہ دیش آنے کے میرے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ تھا کہ یہاں کے مدارس میں حاضری دوں، اور یہاں کے علما سے ملاقات کروں، یہ دونوں ایسے مخلص اور محبوب ملے کہ انہیں ہم لوگوں نے غیبی امداد سمجھا، میں نے ان کے سامنے اپنا پروگرام رکھا، انہوں نے بڑی محبت سے کہا کہ اس کی ابتدا ہمارے مدرسے سے ہو، انہوں نے وعدہ کیا کہ میں کل آٹھ، نو بجے آ کر اپنے ساتھ آپ حضرات کو لے جاؤں گا۔

۱۹ ؍ شوال:

نو بجے مفتی عبدالقیوم صاحب گاڑی لے کر آئے، ہم چھ آدمی، حافظ محمد ابراہیم صاحب حاجی انور صاحب، مولوی محمد شفیع صاحب، عبداللطیف صاحب، عزیز غلام حیدر سلمہ اور میں، ان کے ساتھ ان کے مدرسہ پر گئے، یہ ضلع غازیپور ہے، یہاں کبھی ایک راجہ تھا، جس کے مختلف مقامات پر ستائیس کچہریاں تھیں، اس جگہ ترتیب کے لحاظ ستائیسویں کچہری تھی، اسی بنا پر اس مقام کا نام ستائیس ہے، بنگلہ دیش میں اس کا تلفظ ''ستیش'' ہے۔ مفتی عبدالقیوم صاحب یہاں دس بارہ سال سے مدرسہ چلا رہے ہیں، ایک مدرسہ لڑکیوں کا ہے، اور ایک لڑکوں کا۔ لڑکیوں کے مدارس یہاں کی ایک مجبوری ہے جسے دوسری جگہ ان شاء اللہ ذکر کروں گا۔ (اس مجبوری کا ذکر سفر بنگلہ دیش کے پہلے حصے میں ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں) استانیوں اور لڑکیوں کو مفتی صاحب نے پس پردہ بیٹھا دیا، اور مدرسہ کے اساتذہ اور ہمارے رفقا سامنے بیٹھے، مفتی صاحب کی فرمائش پر کچھ دیر میں نے گفتگو کی، مفتی صاحب نے بنگلہ میں اس ترجمہ کیا، پھر وہاں سے اٹھ کر اصل مدرسہ میں آئے، وہاں طلبہ اور اساتذہ انتظار میں بیٹھے تھے، تھوڑی دیر مولوی محمد شفیع صاحب کا بیان ہوا، پھر مختصر سی گفتگو میں نے کی، وہیں کھانا کھایا، ظہر کی نماز پڑھی، اور پھر بشوندھرا حضرت مولانا مفتی عبدالرحمان صاحب مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ ایک ادارہ چلا رہے ہیں، جس کا نام ''مرکز الفکر الاسلامی'' ہے، اس میں تخصص فی الفقہ اور تخصص فی الحدیث کے درجات ہیں، اور ان کے علاوہ دورۂ حدیث شریف، مشکوٰۃ شریف اور حفظ کے درجات ہیں، مولانا بڑے فعال اور صائب الفکر شخصیت اور ذہن کے مالک ہیں، دیر تک علمی اور دینی باتیں کرتے رہے، جن سے ان کے وسیع علم، اصابت فکر، اعتماد علی اللہ اور ایمانی قوت کا اندازہ ہوتا رہا۔ مفتی صاحب موصوف حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب نوراللہ مرقدہ کے خلیفہ ہیں، وہاں کے دوسرے اساتذہ سے بھی ملاقاتیں رہیں، طبیعت کو بہت انس محسوس ہوا۔

مفتی صاحب کے یہاں سے اٹھ کر ہم لوگ حاجی جمیل الدین صاحب کلکتہ والے کے بڑے بھائی حاجی بشیرالدین صاحب کے گھر آئے، مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب نے اپنی گاڑی سے پہونچایا۔ رات یہاں گزاری، حاجی صاحب بہت خلیق اور مہربان آدمی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں

عافیت دارین سے نوازے۔

۲۰؍شوال:

کل کی بھاگ دوڑ میں تکان بہت ہوگئی تھی، نہائے دھوئے بھی کئی دن ہوگئے تھے، آج ذرا فراغت ملی تو سب ساتھیوں نے اطمینان سے نہایا اور تکان مٹائی۔

آج کا پروگرام یہ ہے کہ مدنی نگر جا کر حضرت مولانا ادریس صاحب خلیفہ حضرت مدنی قدس سرہ سے ملاقات کی جائے، حاجی بشیر صاحب نے باوجودیکہ آج ان کی تین گاڑیاں مولانا ابراہیم صاحب خادم خاص حضرت مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی قدس سرہ کے قافلہ میں چل رہی تھیں، ہم لوگوں کے لئے اپنی خاص گاڑی عنایت فرمادی، اور ایک امیر مولوی امداد الحق صاحب کو ہمارے ساتھ لگادیا، ان کے ساتھ تقریباً بارہ بجے ہم لوگ مدنی نگر کے لئے روانہ ہوئے، اندازہ نہ تھا کہ یہ جگہ کتنی دور ہے، ایک تو ڈھاکہ شہر بہت بڑا، ہجومِ مراکب کی وجہ سے جگہ جگہ گاڑی کو دیر تک رکنا پڑا، پھر شہر سے باہر نکلے تو کم از کم پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر یہ جگہ ملی، ہم لوگ پونے دو بجے دارالعلوم مدنی نگر پہونچے، یہ مدرسہ مولانا محمد ادریس صاحب کا قائم کیا ہوا ہے، اس کی عمر آٹھ دس سال سے زیادہ نہیں ہے، مگر ماشاءاللہ عمارت کے لحاظ سے بہت وسیع وعریض ہے، طلبہ کی تعداد بھی بہت ہے، مگر افسوس یہ ہوا کہ مولانا سے ملاقات نہیں ہوئی، وہ اپنے وطن سندیپ گئے ہوئے ہیں، اور ۲۸؍شوال کو واپس تشریف لائیں گے۔ سندیپ چاٹگام کے قریب ایک جزیرہ ہے، آج ہمیں چاٹگام جانا ہے، دل میں قصد ہوا کہ چاٹگام پہونچ کر ان سے ملاقات کا شرف حاصل کریں گے، ان کے بڑے صاحبزادے مولانا فیض اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی، یہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ ہیں، ۱۹۹۳ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی ہے، خانوادۂ مدنی کے اثرات سے منور ہیں، عجلت میں بہت عمدہ ضیافت کی، طبیعت خوش ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ مولانا بہت حوصلہ مند طبیعت کے مالک ہیں، وہ جگہ جگہ مدارس قائم کرتے ہیں، اب تک ۸۸؍ مدارس قائم کرچکے ہیں، ماشاءاللہ بنگلہ دیش کے علما میں دینی تعلیم کا خاصا جوش ہے، اور ایسا ہونا اس ملک کے لئے بہت ضروری ہے، یہاں کے عام باشندوں کو دیکھئے تو ہندو اور مسلمان کا امتیاز نہیں محسوس ہوتا، حکومت کی رو بھی اسلام کے بالکل خلاف ہے، اگر یہ علما سر اور دھڑ کی بازی نہ لگادیں تو یہ ملک

ہندوؤ اور انگریزوں کے شکنجے میں پھنس کر رہ جائے گا۔

تین بجے وہاں سے واپسی ہوئی، اور چار بجے کے بعد قیام گاہ پر پہونچے۔

آج رات میں چاٹگام روانہ ہونا تھا، شاہجہاں بھائی نے سات ٹکٹ انٹرسٹی ٹرین سے ریزرو کرالئے ہیں، ۱۱ر بجے شب میں ٹرین ہے، اسٹیشن پہونچے تو ٹرین کھڑی تھی، یہ اسٹیشن بھی عجیب ہے، عمارت بالکل سادہ ہے مگر بہت خوبصورت ہے، پلیٹ فارم بہت وسیع ہیں، باہر سے عمارت دیکھئے تو بالکل کمل کا پھول معلوم ہوتی ہے، ایسا ریلوے اسٹیشن ابھی تک نظر سے نہیں گزرا تھا، چھوٹی لائن کی ٹرین انٹرسٹی بھی بہت خوبصورت ٹرین ہے، بیٹھنے کے لئے بسوں کی طرح دونوں طرف دو دو آدمیوں کی نشست گاہیں ہیں، بیچ میں اچھی خاصی جگہ ہے۔ اس ٹرین میں نماز پڑھنے کے لئے مخصوص جگہ ہے، ہرے رنگ کی یہ ٹرین بہت اچھی رفتار سے چلتی ہے، لیکن چھوٹی لائن کی اور لمبی ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ہلتی ہے، ٹکٹ صرف بیٹھنے کا تھا، لیٹنا ممکن نہ تھا، اس لئے بیٹھے بیٹھے اونگھنے سے بہت زحمت ہوئی، رات بھر ٹرین چلتی رہے۔

۲۱ر شوال:

صبح چھ بجے ٹرین چاٹگام پہونچی، وہاں حاجی بشیر الدین صاحب کا آدمی موجود تھا، ان کی کار پر اور ایک آٹو رکشہ پر جسے یہاں ٹیکسی کہتے ہیں، لد کر ہم لوگ حاجی صاحب کے مکان پر پہونچے، یہاں قدرے آرام کیا اور ناشتہ کر کے دارالعلوم معین الاسلام ہاٹ ہزاری جانے کا پروگرام بنا۔ ہاٹ ہزاری کا یہ مدرسہ بہت قدیم اور بڑا ہے، حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کے خلیفہ حضرت مولانا ضمیر الدین صاحب چاٹگامی اور مولانا حبیب اللہ صاحب اس کے بانی تھے، یہ مدرسہ طلبہ کی تعداد کے اعتبار سے بہت بڑا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے کہا کہ دارالعلوم دیوبند سے بھی یہ بڑا مدرسہ ہے، ہاٹ ہزاری قریب آیا تو نگاہوں کو تلاش ہوئی کہ مدرسے کے آثار نظر آئیں، مگر کم نظر آئے، مدرسے میں حاضری ہوئی، یہ مدرسہ بہت گنجان عمارتوں پر مشتمل ہے، اندر پہونچے تو عجیب طرح کی بو کا احساس ہوا، جس سے سانس گھٹنے لگی، پانی تالاب، ناریل کے درختوں سے بھرا ہوا یہ مدرسہ عجیب بند بند سا لگتا ہے، طلبہ کی تعداد واقعی بہت ہے، سات آٹھ سو طلبہ تو صرف دورۂ حدیث میں ہیں، معلوم ہوا کہ کل چار ہزار طلبہ ہیں، صفائی کی طرف زیادہ توجہ

نہیں ہے، مہتمم صاحب مولانا احمد شفیع صاحب کے بارے معلوم ہوا کہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے خلیفہ ہیں۔ جی چاہا کہ کتب خانہ کی زیارت کریں مگر وہ بند تھا، اور مہتمم صاحب نے اس کے کھلوانے کی طرف توجہ نہیں دی، مہتمم صاحب نے بتایا کہ ۲۱/سو طلبہ کی جاگیر [۲] اطراف کی آبادیوں میں ہے، اور باقی کو مطبخ سے کھانا دیا جاتا ہے، جاگیر والے طلبہ عصر کی نماز کے بعد اپنی اپنی جاگیروں پر چلے جاتے ہیں، رات کو وہیں رہتے ہیں، صبح کھانا کھا کر مدرسہ میں آتے ہیں، ساڑھے دس بجے سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، درمیان میں ظہر کی نماز کا وقفہ ہوتا ہے، عصر کی نماز کے وقت چھٹی ہوتی ہے۔

ظہر کی نماز مدرسہ کی مسجد میں ادا کی، نماز کے بعد ایک استاذ مولانا محمد ہارون صاحب ملے، ظہر کے پہلے وہ ترمذی شریف کا درس دے رہے تھے، اس میں تھوڑی دیر کے لئے ہم لوگ بیٹھے تھے، اردو میں پڑھا رہے تھے مگر بنگالی لہجہ ہونے کی وجہ سے ہم پوری بات نہیں سمجھ پا رہے تھے، اب وہ ملے اور بہت اخلاق سے ملے، پھر ایک دوسرے استاذ مولانا ارمان صاحب کے پاس لے گئے، یہ معمر آدمی ہیں، شاعری کا ذوق رکھتے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں، یہاں دیر تک بیٹھنا ہوا، انہوں نے چائے پلائی۔ آج دن بھر بارش ہوتی رہی، ہم لوگ ایک کرایہ کی گاڑی سے آئے تھے، رہبر ہمارے ایک صاحب خالد نامی تھے، جو حاجی بشیر الدین صاحب کے یہاں ملازمت کرتے ہیں، وہی ہم لوگوں کے رہبر متعین کئے گئے تھے، کرایہ والی گاڑی واپس ہوگئی تھی، وہاں ایک بڑا آٹو رکشہ منگوایا گیا، اور اس سے اسی دیار کے مفتی اعظم حضرت مولانا فیض اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے مدرسہ روانہ ہوئے۔ اس مدرسہ میں تعلیم شرح وقایہ تک ہے، مگر طلبہ کی تعداد دو ہزار ہے، یہاں تھوڑی دیر ٹھہرے، ایک صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل ملے، بہت لطف ومحبت کے ساتھ پیش آئے، یہاں طلبہ سے بھی قدرے گفتگو ہوئی، اچھے بچے محسوس ہوئے۔

مفتی فیض اللہ صاحب بعض مسائل میں متفرد بلکہ متشدد تھے، انہوں نے بہت سے رسائل لکھے ہیں، جن میں ان کے تفردات موجود ہیں، جی چاہا کہ یہ رسائل حاصل کر لئے جائیں، مگر وہاں اتفاق سے کوئی رسالہ نہ مل سکا، ایک صاحب نے بتایا کہ ہاٹ ہزاری بازار میں ملیں گے یہ جگہ ہاٹ ہزاری سے نو دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، ہمیں لوٹ کر ہاٹ ہزاری جانے کا موقع نہ

تھا، انہیں فاضل دیوبند سے گزارش کی کہ آپ وہ رسائل لے کر چاٹگام شہر تشریف لائیں، شہر میں ان کے بچے وغیرہ رہتے ہیں، ہم وہاں قیمت ادا کر کے لے لیں گے، انہوں وعدہ بھی کیا مگر معلوم نہیں کیا عذر مانع ہوا کہ وہ تشریف نہیں لائے؟۔

مدرسہ فیضیہ سے نکل کر کچھ فاصلے پر ایک اور مدرسہ تجوید القرآن فیضیہ میں حاضری ہوئی، اس میں چند منٹ رہے، نائب مہتمم صاحب ملے، وہ بہت خلوص کے ساتھ رکنے کے لئے اصرار کر رہے تھے، مگر موقع نہ تھا، کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا، رفقا بھوکے تھے، اس لئے عجلت تھی، واپس لوٹ کر چاٹگام میں عصر کی نماز ادا کی اور کھانا کھایا۔

۲۲ رشوال:

آج جمعہ کا دن ہے قصد یہ ہوا کہ قصبہ پٹیہ میں ایک بڑا مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم ہے، جس کا نام اب اہل عرب کے ذوق کی رعایت کرتے ہوئے الجامعۃ الاسلامیہ کر دیا گیا ہے، آج اس کی زیارت کی جائے، کل چند مدرسوں میں جا کر جو تجربہ ہوا تھا اس کی روشنی میں یہ خیال ہوا تھا کہ جائیں گے، ایک نظر دیکھیں گے، کسی سے ملاقات ہوئی تو ہوئی نہ ہوئی تو نہ ہوئی، بس جلد ہی لوٹ آئیں گے، ہمارے رہبر محمد خالد صاحب بتا رہے تھے کہ وہاں سے واپسی میں خبیری مدرسہ میں چلیں، ان کا گھر وہاں سے قریب ہے، اور جمعہ کی نماز بھی وہیں پڑھی جائے، گیارہ بجے ہم لوگ چاٹگام سے نکلے، تقریباً بارہ بجے مدرسہ میں پہونچے، اس مدرسہ کی عمارت سلیقے کی اور کشادہ نظر آئی، گھٹن نہیں محسوس ہوئی، یہاں کے مہتمم صاحب سے ڈھاکہ میں ملاقات ہو چکی تھی، ایک دو صاحب سے ملاقات ہوئی مگر انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی، مہتمم صاحب کو معلوم کیا گیا تو پتہ چلا کہ وہ موجود ہیں، خوشی ہوئی، ہمارے رہبر نے ان کی آفس میں بیٹھا دیا، اور خود ان کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے، جو آفس کے اندر ہی تھا، مگر ادھر سے کوئی آواز نہیں آئی، اتنے میں ایک صاحب اندر تشریف لائے مگر اس طرح جیسے انہوں ہم چار پانچ آدمیوں کے وجود کو دیکھا ہی نہیں، میں آخری سرے پر بیٹھا تھا، جب وہ میرے قریب آئے تو سلام کر کے میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، اس کے بعد وہ چونک کر سب سے مصافحہ کرنے لگے، ایسا محسوس ہوا جیسے اب انہوں نے دیکھا ہو، ہم نے مہتمم صاحب تک اپنی آمد کی اطلاع پہونچانے کو ان سے کہا، وہ چلے گئے اور

تھوڑی دیر کے بعد آکر حکم سنایا کہ مہمان خانہ میں تشریف لے چلیں، ہم لوگ مہمان خانے میں آگئے، یہاں انہوں نے چائے پلائی، اور پھر مدرسہ کی تفصیلات اور اس کے کارنامے بیان کرنے لگے، اتنے میں جمعہ کی اذان ہوگئی، میں وضو سے فارغ ہوکر مسجد کی طرف چلا تو انہوں نے فرمایا کہ جمعہ سے قبل پندرہ منٹ تقریر کردیں، میں نے حکم کی تعمیل کردی، مہتمم صاحب مولانا محمد ہارون صاحب نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد مہتمم صاحب سے ملاقات ہوئی، یہ بہت فعال اور حوصلہ مند بزرگ ہیں، دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر انہیں مولوی صاحب کے ساتھ مدرسہ کو دیکھنے کے لئے بھیج دیا، مدرسہ کی عمارتیں بہت عمدہ ہیں اور اکثر چار منزلہ ہیں، اس کے چار پانچ احاطے ہیں، کتب خانہ بھی دیکھا خاصا نظر آیا۔

واپس آکر کھانا کھایا، یہاں کا عجیب دستور ہے، کھانے پر میزبان شریک نہیں ہوتا، مہتمم صاحب تو سرے غائب تھے، مولوی صاحب جو ہمارے ساتھ پھر رہے تھے، وہ بھی دسترخوان پر بٹھا کر چلے گئے، کھانے کے بعد مہتمم صاحب تشریف لائے، انہوں نے مدرسہ کی عمارتوں کا البم اور کلینڈر دیا، اس مدرسہ کے بانی ایک بزرگ عالم حضرت مفتی عزیز الحق صاحب علیہ الرحمہ ہیں، ان کی سوانح حیات ’’تذکرۂ عزیز‘‘ بھی عنایت کی، غلام حیدر سلمہ نے ایک کتاب قیمۃً خریدی، اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے گاڑی پر آئے، اور چاٹگام کی طرف واپس ہوئے، کچھ دور چل کر محمد خالد صاحب نے گاڑی کو ایک ضمنی راستہ پر موڑ دیا، تین چار کلومیٹر چلنے کے بعد خبیری کے مدرسے میں پہونچے، یہ مدرسہ اس علاقہ کا سب سے قدیم مدرسہ ہے، حضرت مفتی عزیز الحق صاحب نے یہیں مکمل تعلیم حاصل کی تھی، فراغت کے بعد دیوبند اور سہارن پور تشریف لے گئے، پھر بارہ تیرہ سال تک یہیں پڑھایا، اس کے بعد پٹیہ والا مدرسہ قائم کیا، اس لحاظ سے خبیری کا یہ مدرسہ اس علاقے کے لئے ام المدارس ہے۔

وقت کم تھا، تھوڑی دیر وہاں ٹھہرے، یہ بھی خوب کشادہ جگہ میں سلیقہ کی عمارتوں پر مشتمل ہے۔ عصر کی نماز چاٹگام کی شاہی مسجد میں ادا کی، یہ بہت بڑی اور زمین سے کافی اونچائی پر ہے، جماعت ہوچکی تھی، ہم لوگوں نے اپنی جماعت خارجِ مسجد اس کے احاطہ میں کرلی۔

رات کو ایک صاحب ہرداس پور ضلع مئو کے رہنے والے ملے، وہ اب یہاں کے شہری

ہیں، صاحب حیثیت معلوم ہوئے، محمد رضوان نام ہے، ان سے مل کر طبیعت کو بہت انس ہوا، انہوں نے صبح ناشتہ کی دعوت دی، ہم لوگوں کو سات بیس کی انٹرسٹی سے واپس جانا ہے، انہوں نے کہا کہ ان شاء اللہ گاڑی پر بروقت پہونچا دوں گا۔

۲۳؍شوال:

آج ناشتہ محمد رضوان صاحب کے یہاں ہوا، سب کچھ تیار کر رکھا تھا، اپنی گاڑی پر لے گئے، ناشتہ سے فارغ کر کے انہوں نے اپنی گاڑی سے اسٹیشن پہونچا دیا، ہم لوگ آرام سے سوار ہو گئے۔

آج یہاں شہید دیوس منایا جا رہا ہے، پاکستان کے زمانے میں سرکاری زبان اردو تھی، بنگالیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا، حکومت نے گولی چلوادی، جس میں کئی آدمی مر گئے، یہی مسئلہ بنگلہ دیش بننے کا پیش خیمہ بنا، ان مرنے والوں کی جگہ جگہ یادگاریں بنادی گئی ہیں، اور لوگ ان پر پھول چڑھاتے ہیں، پھول چڑھانے والے مرد بھی اور عورتیں بھی جھنڈ کی جھنڈ ننگے پاؤں سڑک پر نظر آرہے تھے، بالکل ہندوانہ رسم! اور اس میں زیادہ تر ہندو ہی تھے بھی، مسلمان کم۔ ایک مسلمان ملک میں یہ کافرانہ رسم دیکھ کر بہت وحشت ہوئی۔ اللہ تعالی معاف کریں۔

۲۰۔۱۱؍ پر ٹرین چلی اور ڈیڑھ بجے ڈھاکہ اسٹیشن پر پہونچی، وہاں سے ہم لوگ حاجی بشیر الدین صاحب کے یہاں آئے، حاجی صاحب کراچی جا چکے تھے، ظہر کی نماز پڑھی، کھانا کھایا حضرت مفتی عبد الرحمان صاحب کو ٹیلیفون کیا، انہوں نے حکم دیا کہ رات کا کھانا یہیں کھایئے، چنانچہ انہوں نے عشا کے پہلے گاڑی بھیج دی، اور ہم لوگ ان کے مدرسہ پر حاضر ہو گئے، ان کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی، اس لئے ہم لوگوں کی ان سے ملاقات نہ ہو سکی، معلوم ہوا کہ وہ سو گئے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد وہاں کے ایک مدرس مفتی انعام الحق صاحب نے ایک صاحب کا تعارف کرایا کہ بہت مجاہد ہیں، بابری مسجد جب شہید ہوئی تھی تو انہوں نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ لانگ مارچ کیا تھا، بارڈر تک گئے تھے، اس وقت بنگلہ دیش میں ان کی ایک اچھی سیاسی حیثیت ہے، اس کے ساتھ ساتھ الجامعۃ العربیۃ القرآنیۃ لال باغ ڈھاکہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث

بھی ہیں، ابھی یہ تعارف چل ہی رہا تھا کہ ایک صاحب بہت مستعد، چاک وچوبند آتے ہوئے نظر آئے، بہت خوش مزاج، عمر پچاس کے لگ بھگ، معلوم ہوا کہ یہی صاحب ہیں جن کا تعارف ہو رہا تھا، ان سے مل کر طبیعت کو بڑا انس معلوم ہوا، یہ ہیں مولانا فضل الحق امینی، انہوں نے دعوت دی کہ کل لال باغ تشریف لائیں، ظہر کی نماز میں وہاں جانا طے ہوا۔

۲۴؍شوال:

آج مفتی عبدالرحمان صاحب کے ادارہ میں سب طلبہ واساتذہ روزے سے ہیں، چھ روز شوال کے روزے یہ لوگ رکھیں گے۔

ہم لوگ بشوندھرا سے بذریعہ آٹو رکشہ مالی باغ کے مدرسہ میں آئے، جہاں مفتی شفیق الاسلام صاحب سے ملنا تھا، مگر معلوم ہوا کہ اب وہ مدرسہ میں نہیں ہیں، وہاں سے نکلے تو آٹو رکشہ ہی سے لال باغ کے مدرسہ میں آئے، یہ پرانا ڈھاکہ ہے، ظہر کی نماز ہو چکی تھی، اپنی جماعت کی، نماز کے بعد کھانا کھایا، اس کے بعد مولانا امینی کے حکم سے طلبہ واساتذہ کے مجمع میں آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ خطاب کیا، وہاں سے فارغ ہو کر ڈھاکہ کی مشہور مسجد بیت المکرّم میں آئے، یہ مسجد باہر سے خانہ کعبہ کے مثل دکھائی دیتی ہے، بہت بڑی مسجد ہے، اسی میں عصر پڑھی، مغرب پڑھی، عشا پڑھی، بنگلہ دیش میں یہ پہلا اتفاق ہے کہ مسلسل تین نمازیں جماعت سے مسجد میں ادا کی گئیں، ورنہ اب تک قیام گاہ ہی میں جماعت ہوتی رہی ہے، عشا کے بعد شاہجہاں صاحب کے بہنوئی علاؤالدین صاحب کے یہاں دعوت تھی، وہاں آکر کھانا کھایا، پھر حاجی بشیرالدین صاحب کے یہاں آکر سو گئے۔

۲۵؍شوال:

آج ڈھاکہ سے روانگی ہے، بس کے آٹھ ٹکٹ خریدے گئے، وقت ساڑھے دس بجے شب کا ہے، اس سے بَدّ اندی تک جائیں گے، ندی کو لانچ سے عبور کریں گے، اس پار دوسری بس ملے گی، اس سے جیسور تک جائیں گے، جیسور کچھ دیر ٹھہرنا ہے، ڈھاکہ سے جیسور کا کرایہ سو روپیہ ہے، یہ عام بس ہے، اے سی ہوتا تو ۱۸۰؍روپے کرایہ ہوتا۔

رات کا کھانا حاجی بشیرالدین صاحب کے یہاں کھایا، کھانے کے بعد ان کے یہاں

کے منتظم علاؤالدین نے گاڑی سے ہم لوگوں گب تلی بس اڈہ پر پہونچایا، آدمی زیادہ تھے اور گاڑی میں گنجائش کم تھی، اس لئے ایک آٹو رکشہ بھی کیا گیا، بس میں سوار ہو گئے، وہ پونے گیارہ بجے کھلی، آرام دہ بس نہ تھی، راستہ بھی بن رہا تھا اس لئے بہت خراب تھا پون بجے دریا کے کنارے پہونچے سامان اتار کر لانچ میں سوار ہوئے، وہ تھوڑے سے وقفہ کے بعد آدھ پون گھنٹہ میں دوسری طرف اتار دی، وہاں سے پھر اسی کمپنی کی دوسری بس پر ہم لوگ سوار کر دیئے گئے، دو بجے کے بعد بس چلی اور ساڑھے پانچ بجے جیسور کی جامع مسجد کے پاس اتار دیا

۲۶؍شوال:

فجر کی نماز جیسور کی جامع مسجد میں پڑھی، یہ مسجد خاصی وسیع اور سہ منزلہ ہے، لیکن صفائی کا اہتمام نہیں ہے، مچھر اتنے کہ اب تک کسی جگہ اتنے مچھر سے سابقہ نہیں پڑا تھا، نماز پڑھ کر شرف الدین صاحب کے مکان پر آئے، وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، آج یہیں قیام ہے۔

مغرب کی نماز کے بعد وہاں ایک مدرسہ، مدرسہ قاسمیہ میں اساتذہ کے درمیان قدرے گفتگو ہوئی، یہ مدرسہ درجہ حفظ اور ہدایۃ النحو کی جماعتوں پر مشتمل ہے، عشا کی نماز کے بعد وہیں مسجد میں وعظ ہوا، زبان کی اجنبیت عجیب چیز ہے، اس سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔

۲۷؍شوال:

آج بنگلہ دیش سے واپسی ہے، میکرو سے جیسور سے بنیاپول آئے، وہاں قانونی مراحل کی تکمیل سے فرصت ہوئی اور لوکل سے سیالدہ واپس آئے، ساڑھے چھ بجے شام کو نارکل ڈانگہ کلکتہ مسجد پہونچے۔

۲۹؍شوال:

آج جمعہ کی نماز سے پہلے آدھ گھنٹہ وعظ ہوا۔ ’’**واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً**‘‘ موضوع تھا، کل الیکشن ہونے والا ہے، میں نے تلقین کی کہ ووٹ دینے کے سلسلے میں اپنی رائے پر قائم رہیں لیکن لڑائی جھگڑے سے احتراز کریں۔

جمعہ بعد سے شکم میں تکلیف شروع ہوئی، جو بڑھتے بڑھتے عشاء کے وقت غیر معمولی ہوگئی، عشا کی نماز جماعت سے نہیں پڑھی، آج ہی ساڑھے گیارہ بجے روانگی ہے، سوا دس بجے

ڈاکٹر آیا، انجکشن لگایا، قدرے راحت ہوئی تو عشا کی نماز پڑھی، اور پونے گیارہ بجے ہوڑہ کے لئے نکل پڑا، ٹرین وقت پر تھی۔

ٹرین کو صبح ساڑھے نو بجے مغل سرائے پہونچ جانا چاہئے تھا، مگر وہ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ پہونچی، ٹھیک گیارہ بجے پلیٹ فارم پر لگی، منشی جی اور محمد عارف سلمہ گاڑی لے کر پہونچے تھے، مولانا غلام رسول صاحب کو اطلاع کی تھی مگر نہ آسکے، بنارس میں تھوڑی دیر حاجی منظور صاحب کے یہاں ٹھہرے، معلوم ہوا کہ مفتی ابوالقاسم صاحب آج حج کے لئے جارہے ہیں، وقت نہ تھا کہ ان سے ملاقات کرتا، ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔

ظہر کی نماز دیوگاؤں میں پڑھی، حاجی کبیر صاحب (برادر نسبتی مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ) سے ملاقات ہوئی، بہت اچھی طرح ملے، رانی کی سرائے میں مولوی محمد شفیع صاحب اتر گئے، عصر کی نماز کے وقت مدرسہ پہونچے، معلوم ہوا کہ بھیرہ حاجی محمد صدیق صاحب کے والد مظفر حسین کا انتقال ہوگیا، کئی اساتذہ وہیں ہیں، اور مبارک پور میں قاضی اطہر صاحب علیہ الرحمہ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا ہے، مولوی حکیم الدین صاحب وہاں گئے ہیں۔

آج بھائی محمد بلال کے فرزند مولوی عبدالقدوس سلمہ کا ولیمہ ہے، مغل سرائے میں ارادہ کیا تھا کہ سیدھا بھیرہ چلا جاؤں مگر طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ہمت نہ پڑی۔

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) مضمون لکھنے کا ارادہ تو شاید شرمندۂ عمل نہ ہوسکا مگر ہاں حضرت والد صاحب کے روزنامچہ میں ''موضوعات یونسی'' کے عنوان سے ہم کو ایک صفحہ ملا ہے جو بنگلہ دیش کے اجتماع ہی سے متعلق ہے، ہم ذیل میں کچھ موضوع روایات بطور عبرت ونصیحت کے درج کرتے ہیں۔

[۱] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ '**ھنیئا لک یاعمر!**' عمر! تمہیں خوش خبری ہو کہ میری امت کے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے، حضرت عمر نے عرض کیا کہ یہ تو بہت کم ہیں، تب فرمایا کہ ان ستر ہزار میں سے ہر ایک ستر ہزار کو جنت میں لے جائے گا، حضرت عمر نے اسے بھی کم محسوس کیا، تو حضور نے اتنا ہی اور بڑھایا۔

[۲] حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتقال کے وقت چوراسی ہزار کے مقروض تھے، حضرت ابن عمر نے

لوگوں سے کہا کہ میرے باپ کا قرضہ معاف کردو، اور اسے مجھ سے وصول کرلو، لوگوں نے کہا کہ جب ہم نے عمر کو معاف کیا تو عمر کے بیٹے کو بھی معاف کردیا۔

[۳] حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے حمزہ! اگر صفیہ کا خوف نہ ہوتا تو تجھے دفن نہ کرتا، اور ایسے میدان میں چھوڑتا کہ درندے جانور تمہاری بوٹیاں نوچتے، پھر تم میدان قیامت میں مختلف جگہوں سے اکٹھا ہو کر آتے۔

[۴] حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آخر زمانے میں ایک آدمی کی محنت سے پچاس آدمیوں کا نتیجہ نکالیں گے۔

[۵] حضرت عبداللہ بن مبارک کی دوکان پر یہود ونصاری کا ہجوم کرنا اور مہینوں انتظار کرنا اور یہ کہنا کہ ہم کپڑا اسی دوکان سے خریدیں گے، کیوں کہ ان کی دوکان کے کپڑوں کے پہننے سے ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ دعوت کے کام کی برکت تھی۔

[۶] کچھ لوگوں سے فرشتے کہیں گے کہ جنت میں چلو، وہ انکار کردیں گے، فرشتے پوچھیں گے کہ پھر کہاں جاؤ گے؟ وہ کہیں گے ''جہنم میں'' اور پھر جہنم میں جا کر بہت سے لوگوں کو جہنم سے نکالیں گے۔

اس سے عمومی اور خصوصی گشت ثابت کیا۔ قرآن میں ہے ”**ما لھٰذاالرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق**“ اس سے عمومی گشت نکلتا ہے۔ بازار میں گشت کریں گے، تاکہ مسجد کو بھریں، پھر یہی لوگ جہنم میں گشت کریں گے، تاکہ جنت کو بھریں۔

[۷] حضرت عبداللہ بن مسعود کی ٹانگوں کا وزن احد پہاڑ کے برابر ہے۔ صہیب رومی حوض کوثر پر حضور کے ہاتھوں سب سے پہلے پانی پئیں گے۔ ابو درداء سے فرشتے سب سے پہلے مصافحہ کریں گے۔ جنت سلمان وعمار کی مشتاق ہے۔ معاویہ بن معاویہ کا انتقال ہوا تو اس روز سورج میں روشنی ہر روز سے بہت زیادہ تھی، آپ نے بتایا کہ ستر ہزار فرشتے سورج کے ساتھ آئے تھے۔ انتقال مدینہ میں ہوا، حضور اس روز تبوک میں تھے، جنازہ تبوک میں لایا گیا، بقیع میں دفن کئے گئے۔ ''ان سب کے پیچھے ایک محنت تھی''۔

[۸] دعوت کے کام پر سو سو نسلوں تک اللہ رعایت کرے گا۔ (حضرت جی)

[۹] دین اور دین کی محنت اسے ملے گی جسے اللہ پسند کرے گا۔

(۲) جاگیر پہلے عام طور سے مدارس کے نظام کا ایک حصہ ہوا کرتی تھی جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ مدرسہ کے اطراف اور محلّہ کے لوگ اپنی حیثیت کے اعتبار سے طلبہ کو اپنے یہاں بطور مہمان کھلانے کی ذمہ داری لے لیتے تھے، جو طلبہ جس گھر میں متعین ہوتا وہ گھر مدارس کے اصطلاح میں اس طلبہ کی جاگیر کہی جاتی تھی۔

تبصرے

(۱) وقفۃ مع اللامذہبیۃ
(۲) مسائل غیر مقلدین
(۳) فیضان محبت
(۴) تقریر دلپذیر
(۵) الفوز الکبیر
(۶) صدیق اکبر۔ ایک انسان کامل
(۷) مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینے میں
(۸) افادات صدیق
(۹) حیات ابوالمآثر
(۱۰) مقالات ابوالمآثر
(۱۱) نصرۃ الحدیث (عربی)
(۱۲) تعدیل رجال بخاری
(۱۳) دارالاسلام اور دارالحرب
(۱۴) بیمہ اور اس کا شرعی حکم
(۱۵) عظمت صحابہ
(۱۶) ابطال عزاداری
(۱۷) رحمۃ اللہ الواسعۃ (تین تبصرے)
(۱۸) اللؤلؤ والمرجان فی لطائف القرآن
(۱۹) مسئلہ امام مہدی
(۲۰) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں
(۲۱) زندگی سے لطف اٹھایئے

نام کتاب : وقفة مع اللامذهبيه فی شبه القارة الهنديه
مؤلف : مولانا ابوبکر غازی پوری
صفحات : ۳۸۹
قیمت : درج نہیں
ناشر : المکتبۃ الاثریہ قاسمی منزل سیدواڑہ غازی پور

مثل مشہور ہے کہ چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں اور گیڈر کی شامت آتی ہے تو شہر کی جانب بھاگتا ہے۔ ہمارے ملک میں، ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے والوں کا ایک ٹولہ ہے جو اپنے عمل اور سیرت واخلاق کے لحاظ سے حدیث اور سنت کی تعلیمات کے ٹھیک برعکس ہے، لیکن اپنا بورڈ ''اہل حدیث'' کے عنوان سے سجائے ہوئے ہے، اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے، بس یہی ڈیڑھ سو سال کے لگ بھگ سے اس کا وجود ہے، میاں نذیر حسین صاحب بہاری ثم دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء) اس کے بانی اول ہیں، پھر اس کے بطن سے رفتہ رفتہ متعدد مسائل پیدا ہوئے، رفع یدین، آمین بالجہر، قرأۃ خلف الامام، آٹھ رکعت تراویح، ایک مجلس کی تین طلاق تین نہیں ایک ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل پر چیلنج بازیاں ہوئیں، اس وقت سے اب تک ان مسائل پر اتنا شور وغوغا مچایا گیا جیسے مقلدین بالخصوص احناف ان مسائل میں یکسر خلافِ سنت عمل کرتے چلے آرہے ہوں، اور اس پر مزید یہ کہ تقلید کی وجہ سے ہر مقلد شرک کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ علماءِ احناف نے ان سب مسائل میں اپنا موقف واضح اور قوی دلائل سے ثابت کیا، مگر وہاں ایک انکار کا انکار رہا، اب تک اس حلقہ سے (حلقۂ غیر مقلدین سے) اسی طرح کے مسائل پر تحریری وتقریری پٹاخے پھوڑے جاتے رہے، لیکن انہیں محسوس ہوا کہ اب ان پٹاخوں میں دم نہیں، صرف آواز ہو کر رہ جاتی ہے، نہ کسی کا چہرہ جھلستا ہے، نہ کسی کے آنکھ سے پانی

آتا، اور نہ کوئی اس پر چونکتا۔ اس ٹولے کا وجود چونکہ منفی بنیادوں پر ہے، اس کی زندگی صرف اس پر ہے کہ کسی کی نفی کرتا رہے، اسی لئے سال بسال یہ منفی اشتہارات سے اپنی زندگی بڑھاتا رہتا تھا، مگر اب پرانے منفی مسائل کی جب جان نکل گئی تو اسے نئے میدان کی تلاش ہوئی، اب وہ وقت آیا کہ گیڈر کی شامت آئے، اب تک ان مسائل علمیہ پر زور آزمائی تھی، جو دور صحابہ سے مختلف فیہ چلے آرہے تھے، اور یہ سب مسائل بجز معدودے چند، وہ تھے جو ائمہ اربعہ میں کسی نہ کسی کے یہاں معمول بہا تھے، اس لئے اس کی آبرو ان بزرگوں کے دامن میں کسی حد تک محفوظ رہ جاتی تھی، مگر اب جو شامت آئی تو ان مسائل کو چھوڑ کر غیر مقلدیت کا گیڈر علماءِ اہل حق، جن کے ذریعہ ہندوستان کے اندر دین اور علم دین کی آبرو اللہ تعالی نے باقی رکھی ہے، جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اللہ کے دین کی حفاظت کی ہے، یعنی علماء دیوبند۔ غیر مقلدیت کا گیڈر ان کی آبادی کی طرف دوڑنے لگا۔ کسی صاحب نے عربی میں ایک کتاب تیار کی، اور اس میں قدم بقدم مشہور بریلوی مقرر ارشد القادری کی بدنام زمانہ کتاب ''زلزلہ'' کی پیروی کی، نام اس کا اس کے دوہرے مصنف نے ''**الديوبندية تعريفها وعقائدها**'' رکھا۔ جس طرح زلزلہ میں ارشد القادری نے اپنے مسلک کی روایتی فنکارانہ خیانت سے کام لے کر علما دیوبند کے سر بے بنیاد اتہام والزام لگائے ہیں، اور ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کی ہیں جن کا انہیں کبھی تصور بھی نہیں آیا، اور جس طرح اس نے جزئی واقعات کی رائی کو اصول وکلیات کا پہاڑ بنادیا ہے، اور جس طرح اس نے اپنے مزعومات وخیالات کو علمائے دیوبند کے سر پر چپکا کر انہیں داغدار بنانے کی کوشش کی ہے، ٹھیک اسی طرح الدیوبندیۃ کے مصنف نے خیانت، الزام تراشی کی بنیادوں پر دجل وفریب کی عمارت کھڑی کی ہے، غیر مقلد مصنف نے بریلویت کی تقلید کی۔ بس فرق یہ رہا کہ بریلوی نے اردو میں کتاب لکھی، اور غیر مقلد نے عربی میں کتاب لکھی، کیوں کہ اسے اہل عرب کو فریب دینا تھا۔

یہ ایک نازک سوال ہے کہ ہندوستان یا پاکستان میں بیٹھ کر یہاں کا مصنف دیوبندیت کی تردید عربی میں کیوں تحریر کرتا ہے، کیا ہند وپاک کی عوام کو وہ مزعومہ دیوبندیت کے مشرکانہ عقائد واعمال پر متنبہ کر چکا ہے کہ اب اس سے آگے بڑھ کر وہ اہل عرب کے سامنے اس کی گمراہی

پیش کرتا ہے؟ اگر یہ کام واقعی خلوص سے، اللہ تعالی کو راضی کرنے کے لئے اور مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لئے کیا گیا ہے تو ضرورت تھی کہ اسے اردو میں لکھا جاتا، تا کہ ہندوستان و پاکستان کی عوام اس سے باخبر ہوجاتی۔ جہاں دیو بندیت کا اصل فروغ وشیوع ہے۔ لیکن بات یہ نہیں ہے، بات یہ ہے کہ عرب کی سرزمین سونا اگل رہی ہے، سیال سونا، جو وہاں سے بہہ بہہ کر دوسروں ملکوں میں بھی جارہا ہے، ہندوستان و پاکستان سے غیر مقلدین کا یہ ٹولہ کثیر تعداد میں سیال سونے کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پہونچ گیا، اور وہاں اس نے جا کر یہ ظاہر کیا کہ ہندوستان ایک کفر زدہ ملک ہے، جہاں مسلمان کہلانے والے بھی مشرک ہیں، سنت کے بجائے بدعت ان کا شعار ہے، ان کے درمیان ہم صرف ہم (یعنی غیر مقلدین) توحید خالص کے علم بردار ہیں، سنت کے داعی اور بدعت سے برسر پیکار ہیں، اور اے اہل نجد! اے آل سعود! اے آل الشیخ محمد بن عبدالوہاب! ہم ہیں ٹھیک ٹھیک آپ کے نقش قدم پر! عقائد میں بھی! اعمال میں بھی! آپ حضرات نے جو فرمادیا، جو لکھ دیا، ہم ہیں اس پر بے سوچے سمجھے لبیک کہنے والے، ہم اپنا دین و ایمان، عقیدہ ونظریہ سب کچھ آپ کے قبضہ واختیار میں سونپتے ہیں، جو چاہے آپ تصرف کریں۔ بس اس کی قیمت یہ ہے کہ اپنی بے تحاشہ دولت کی زکوۃ ہمیں دیتے رہیئے۔ یہ سودا وہاں بخوشی منظور ہوا، ہندوستان و پاکستان میں غیر مقلدین کے حلقے میں زکوۃ وصدقات کی نہریں جاری ہوگئیں، خستہ حال مسجدیں، لق ودق عمارت میں تبدیل ہوگئیں۔ مدارس کے جھونپڑے محلوں میں بدل گئے۔ جگہ جگہ بڑے اسپتال کھل گئے، لڑکیوں کے کالج وجود میں آگئے، غرض دولت کے رنگا رنگ مظاہر ہونے لگے۔

لیکن ملک عرب صرف غیر مقلدین کی میراث تو نہیں ہے، قلیل تعداد میں سہی فاضلین دیوبند بھی وہاں پہونچنے لگے، ان کی تعداد ہندوستان میں غیر مقلدین سے بدرجہا زائد ہے، لیکن ان حضرات نے مجموعی اعتبار سے تحصیل دولت کو کبھی اپنا نصب العین نہیں بنایا، انہوں نے دین کی خدمت کو ہی اپنا شعار بنا رکھا ہے، اس لئے ان حضرات کو حصول دولت کے لئے وہاں جانے کا خیال نہیں آیا، ہاں تحصیل علم کے لئے تھوڑے سے افراد پہونچ گئے۔ یہ حضرات محنت وکاوش، تقوی وتدین، اور امانت ودیانت میں خاصے ممتاز ہوتے تھے، غیر مقلدین کو اندیشہ ہوا کہ کہیں

ان کی عظمت اہل عرب کے قلوب پر نقش نہ ہوجائے، بس ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ فاضلین دیوبند پہنچنے نہ پائیں۔ اس فرقہ کا تو مشن ہی منفی ہے، خوب مخالفت کی، اور اس میں خاصے کامیاب بھی رہے، لیکن ان کی کوششوں کے باوجود علماء دیوبند کا اثر ونفوذ پھیلتا ہی رہا، اور ادھر پانچ چھ برس کے عرصہ میں ایک عجیب گل یہ کھلا کہ شاہ فہد کا عظیم الشان پریس جو مختلف زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیر چھاپ کر دنیا کے گوشے گوشے میں بھیج رہا ہے، اس نے اردو زبان میں اشاعت کے لئے جس ترجمہ وتفسیر کا انتخاب کیا وہ کسی غیر مقلد کا ترجمہ نہیں۔ کیوں کہ ان کا دامن تو اس سے خالی ہے، وہاں صرف منفی لٹریچر کی بہتات ہے۔ ایک حنفی عالم کا ترجمہ اور حنفی عالم ہی کی تفسیر کا انتخاب کیا۔ اور یہ دونوں بزرگ علمائے دیوبند کے پیشوا ومقتدا ہیں۔ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا، اور تفسیر ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی کی۔ بس غیر مقلدیت میں کھلبلی مچ گئی، بہت غل مچایا کہ اس تفسیر پر پابندی لگاؤ، اس میں شرک کی تعلیم ہے، سلف کے عقیدے سے ہٹی ہوئی ہے، کئی مرتبہ سننے میں آیا کہ اب اس کی اشاعت بند ہوگئی، مگر پھر دیکھا تو اس کی تقسیم واشاعت اسی شان کے ساتھ جاری ہے۔

اسی طرح بنگلہ زبان میں جس ترجمہ وتفسیر کا انتخاب ہوا وہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن کی تلخیص ہے، جو ان کے ایک شاگرد نے کی ہے۔ خادم الحرمین الشریفین ملک فہد کے پریس سے علمائے دیوبند کے ترجمہ وتفسیر کی اشاعت ہو، غیر مقلدیت کا حسد اسے کیوں گوارا کرتا، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہر وہ حربہ اختیار کیا جانا ضروری ہوگیا جس سے دیوبندیت کی ساکھ اہل عرب کے نزدیک مجروح ہو، تاکہ جو مال انہیں وہاں سے حاصل ہو رہا ہے اس میں تقسیم کا خدشہ باقی نہ رہے۔

شاید یہی خدشہ تھا جس نے الدیوبندیہ نامی کتاب عربی میں لکھوائی، اور اس میں جی بھر کر اہل عرب کو علمائے دیوبند سے بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔ اہل عرب عقیدۂ توحید کے باب میں بہت حساس ہیں، اور اس میں ایک حد تک ان کو غلو ہے، ان کے نظریۂ توحید کی روشنی میں قرون سابقہ کے بھی بہت سے علما ومشائخ بھی موحد باقی نہیں رہتے۔ الدیوبندیہ کے مصنف نے علمائے دیوبند کی طرف وہ باتیں خوب چمکا کر منسوب کیں، جن سے علمائے نجد وحجاز کی حساسیت متأثر

ہوتی۔ موجودہ علماء نجد وحجاز کو تصوف سے بہت بعد ہے، اور علمائے دیوبند کا امتیازی وصف تصوف واحسان ہے، اسے اس کتاب کے مصنف نے اکابر دیوبند کا جرم عظیم بنا کر پیش کیا ہے۔

لیکن یہ گیڈر کی شامت ہی تھی کہ اس نے شہر کا رخ کیا، علمائے دیوبند کو اختلافی مسائل سے زیادہ دلچسپی نہیں، ان کے سامنے دینی وتعلیمی مثبت امور اتنے زیادہ ہیں کہ انہیں کو پورے طور پر انجام دینا مشکل ہورہا ہے، لڑائی جھگڑے کے لئے کہاں سے وقت نکالیں، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ سب لوگ کان میں تیل ڈالے پڑے رہیں، لگانے والے الزام لگاتے رہیں، باندھنے والے بے بنیاد بہتان باندھتے رہیں، اور یہ بے حس وحرکت پڑے رہیں۔

آخر غیرت حق کو جلال آگیا، فاضل گرامی مولانا ابوبکر غازی پوری نے اس چیلنج کو قبول کیا، اور انہوں نے علمائے دیوبند کی طرف سے صفائی نہیں پیش کی، ان کا دفاع نہیں کیا، کیوں کہ جھوٹ کا کوئی علاج نہیں، دجل وفریب کا کوئی جواب نہیں، اور اس ٹولہ کے حق میں ڈیڑھ سو سال سے یہی تجربہ ہورہا ہے کہ اس کو جتنا حقیقت حال سے باخبر کیا جاتا ہے، اتنے ہی زور سے یہ مزید شور مچاتا ہے۔ انہوں نے علمائے دیوبند پر لگائے گئے الزامات کے جواب دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی، کیوں کہ چاند پر تھوکنے سے چاند پر کوئی اثر نہیں پڑتا، خود تھوکنے والے کا منہ آلودہ ہوتا ہے، البتہ انہوں نے اہل عرب کے سامنے غیر مقلدوں کی اصل حقیقت کھول کر رکھ دی۔ مولانا موصوف عربی زبان پر اہل زبان کی طرح قدرت رکھتے ہیں، انہوں نے عربی میں ہی زیر نظر کتاب لکھی، اور اہل عرب کے سامنے ایک قد آدم آئینہ رکھ دیا کہ اس میں وہ غیر مقلدین جوان کی بغل میں گھسے ہوئے ہیں، کے خدوخال خوب واضح طور پر دیکھ لیں۔

مولانا موصوف نے بڑی کدوکاوش سے اکابر غیر مقلدین کی کتابیں حاصل کیں، انہیں تدقیق وتحقیق سے پڑھا، اور ان کی روشنی میں غیر مقلدیت کا اصل حلیہ پیش کیا۔ ان کی کتاب پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ رافضیوں کے بعد اپنے عقائد ونظریات کو چھپانے میں کوئی فرقہ کامیاب ہوا ہے تو وہ یہی فرقۂ غیر مقلدین ہے، اور تقیہ کا استعمال شیعوں کے بعد اسی ٹولے نے کیا ہے۔ مولانا نے نام رکھنے سے لے کر اب تک کے انجام تک ہر ہر مسئلہ پر گفتگو کی ہے، اور بتایا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے متبعین اور ان کے عقائد وافکار سے، غیر مقلدین کو کوئی مناسبت نہیں ہے،

بلکہ ان کے اکابر نے دولت سیال نکلنے سے پہلے پہلے ہمیشہ وہابیوں کی مخالفت ہی کی ہے، خاکسار کو اعتراف ہے کہ، اور میری طرح بہت سے لوگ اعتراف کریں گے کہ ہم لوگ غیر مقلدوں کی اصل حقیقت سے کم واقف تھے، اس کتاب نے جس طرح ان کو روشنی میں لا کھڑا کیا ہے، اس سے پہلے ان کے خدوخال اتنے نمایاں نہیں ہوئے تھے۔

نام رکھنے میں اضطراب:

مولانا نے سب سے پہلا دلچسپ انکشاف اس فرقہ کے نام رکھنے کے سلسلے میں کیا ہے انہوں نے بتایا کہ اس فرقہ نے اپنا نام ابتداء موحدین رکھا، ایک مدت تک یہ نام رہا، پھر نہ جانے کیوں اسے ترک کردیا، اب انہوں نے اپنا نام محمدی رکھا۔ چنانچہ اس فرقہ کی کتابیں مثلاً ’’مذہب محمدی‘‘، تعلیم محمدی‘‘ ’عقیدۂ محمدیہ‘‘ وغیرہ ہیں، پھر اس خوف سے کہ یہ نسبت کہیں محمد بن عبدالوہاب کی طرف نہ سمجھ لی جائے، اسے بدل کر غیر مقلد رکھ لیا، انہیں اس پر فخر تھا کہ وہ کسی امام کی تقلید نہیں کرتے، پھر اسے بھی ترک کردیا۔ بعض علما نے کوشش کی اور باقاعدہ سرکار انگریزی سے ’’اہل حدیث‘‘ کے نام سے منظوری لی، یہی لقب ان میں جاری رہا۔ ادھر کچھ عرصہ سے جب عرب میں دولت امنڈنے لگی، اور ان کی نگاہِ حرص وہاں پڑنے لگی، تو اب انہیں اہل عرب سے چپکنا تھا، انہوں نے دیکھا کہ اہل عرب زیادہ تر علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیرو ہیں، اور خود سلف کی طرف منسوب کرکے ’’سلفی‘‘ کہتے ہیں، انہوں نے بھی اپنے کو بدل کر سلفی اور اثری کہنا شروع کردیا، یہاں تک کہ اپنے مدارس ومراکز تک کے نام بدل ڈالے، لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا ہے کہ ان کے اغراض کے لئے لفظ سلفی مفید تر ہے یا اثری؟۔ (وقفۃ مع اللا مذہبیہ ۲۸)

ماضی وحال کے غیر مقلدین میں فرق:

پھر مولانا نے تفصیل سے بتایا کہ آج کل جو لوگ غیر مقلد کہلاتے ہیں ان میں اور ان کے گزشتہ اکابر میں نظریات واعتقادات کا کتنا فرق ہے؟ خدا جانے یہ فرق حقیقۃً ہے یا فرقہ حاضرہ کا یہ نفاق ہے؟ کہ اس کا عقیدہ کچھ ہے اور ظاہر کچھ کرتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند باتیں آپ بھی سن لیں۔

(۱) ان کے اکابر تصوف کے قائل اور اس پر عامل تھے، اور آج کے غیر مقلدین اسے شرک وبدعت سے کم ماننے کے لئے تیار نہیں۔

(۲) ان کے اکابر شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے سخت خلاف تھے، اور ان کی طرف منسوب ہونے کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے تھے، جب کہ فرقۂ حاضرہ اس نسبت کو اپنے لئے باعث صد نازش وافتخار سمجھتا ہے۔

(۳) اکابر غیر مقلدین، شیخ محی الدین بن عربی کو ولایت کے اعلی مقام پر سمجھتے بلکہ انہیں خاتم الولایت المحمدیہ قرار دیتے تھے، اور آج کل کے غیر مقلدین علامہ ابن تیمیہ کی تقلید میں انہیں بدترین کافر قرار دیتے ہیں۔

(۴) اس فرقہ کے اکابر نظریۂ وحدۃ الوجود کو دین وشریعت کی اصل اور اساس قرار دیتے تھے اور آج کا گروہ بظاہر اس کا شدید مخالف وناقد ہے۔

(۵) آج کل کے غیر مقلدین بظاہر غیر اللہ کے وسیلے کے مخالف ہیں، اور غیر اللہ سے استمداد واستعانت کو حرام وناجائز کہتے ہیں حالانکہ یہ باتیں ان کے اکابر کے نزدیک جائز تھیں۔

(۶) فرقۂ حاضرہ کو قبور اور اہل قبور سے سخت بیزاری ہے، جب کہ ان کے اکابر قبروں سے برکت حاصل کرنے اور ان کی تعظیم کرنے کے قائل تھے۔

(۷) یہ لوگ تین مسجدوں کے علاوہ اور کہیں کے سفرِ عبادت کو حرام سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے بہت سے اکابر اسے جائز سمجھتے تھے۔

(۸) موجودہ غیر مقلدین کو تعویذ وعملیات سے سخت بیزاری ہے، اور ان کے اکابر وسلف کے یہاں تعویذات کا معمول رہا ہے، وہ اس موضوع پر کتابیں لکھتے بھی تھے، اور بیچتے بھی تھے۔

(۹) آج کل کے غیر مقلدین شیعوں سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں، حالانکہ ان کے اکابر شیعوں جیسے عقیدے رکھتے تھے۔ (وقفۃ مع اللامذہبیہ ۳۱، ۳۲)

مولانا نے ان سب عنوانات پر کتاب میں تفصیل کے ساتھ غیر مقلدوں کے اکابر کی کتابوں کے حوالوں سے قوی دلائل پیش کئے ہیں۔ ہر ہر عنوان قابل ملاحظہ اور باعث عبرت ہے کہ آدمی جب خوف خدا سے دور ہوتا ہے تو کس ضلال بعید میں جا پڑتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ موجودہ غیر مقلدین اپنے ان اکابر کی مدح وثنا کرتے تھکتے نہیں، یہی اکابران کے لئے مایۂ فخر وناز ہیں، لیکن کیا بات ہے کہ جو باتیں ان کے نزدیک جائز مسلم تھیں، عین دین وایمان تھیں، وہی باتیں ان اصاغر کے نزدیک ناجائز وحرام اور شرک و بدعت بن گئیں؟ اگر وہ ان کے نزدیک واقعۃً شرک وبدعت ہیں تو اپنے ان اکابر سے برأت کیوں نہیں ظاہر کرتے؟ انہیں مشرک اور بدعتی کیوں نہیں قرار دیتے؟ اور اگر یہ لوگ ان کے عقائد ونظریات درست سمجھتے ہیں اور دل سے یہ لوگ بھی وہی اعتقاد رکھتے ہیں تو اہل عرب اور اہل نجد کے ساتھ کیوں چپکے ہوئے ہیں؟ جب کہ معلوم ہے کہ وہ اس کے سخت مخالف ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ شیعوں کے تقیہ ہی کا ایک شعبہ معلوم ہوتا ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب:

یہاں ہم چند نمونے ان کے عقائد وخیالات کے پیش کرتے ہیں۔ دیدۂ عبرت درکار ہے۔

آج کل کے غیر مقلدین شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تعریف کرنے سے نہیں تھکتے، لیکن ان کے اکابران کو کس نظر تحقیر سے دیکھتے تھے، ملاحظہ ہو۔ غیر مقلدوں کے امام نواب سید صدیق حسن بھوپالی ان کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ''محمد بن عبدالوہاب (نہ شیخ نہ علامہ نہ شیخ الاسلام) فلاں امریکی کرنل نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس صدی کے آغاز میں فرقۂ وہابیہ نے زور پکڑا، یہ فرقہ تمیم کے ایک فرد محمد بن عبدالوہاب کی طرف منسوب ہے، جو درعیہ کا باشندہ تھا''۔ (۴۶، بحوالہ التاج المکلل)

ترجمان الوہابیہ ص ۳۱ میں نواب صاحب لکھتے ہیں کہ:

> 'نجدی مذکور ہندوستان کبھی نہیں آیا، اور نہ اہل ہند سے اس کا کوئی تعلق ہے، نہ وہ اس کے شاگرد ہیں، اور نہ انہوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی ہے.....اس نجدی کی مذہبی دعوت حجاز اور نجد سے آگے نہیں بڑھی، وہابیوں کا مسلمان کے ساتھ جہاد صرف نجد وحجاز میں تھا'۔ (ص ۴۷)

مشہور غیر مقلد عالم حافظ عبداللہ غازی پوری ''ابراء اہل حدیث واہل القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ہمارا نام جو وہابی رکھ دیا گیا ہے، یہ بالکل غلط ہے، اہل حدیث صرف کتاب وسنت کا اتباع کرتے ہیں، اور اپنے لئے اہل حدیث اور اہل سنت کا نفیس لقب اختیار کرتے ہیں'' ۔ص ۴۹

اس عبارت کا بین السطور پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے متبعین کا عمل کتاب وسنت پر نہیں ہے، اور وہ نہ اہل حدیث ہیں، اور نہ اہل سنت ہیں۔

آگے لکھتے ہیں کہ:

> ''اہل حدیث اسی وجہ سے سابق ائمہ کی جانب بھی اپنے آپ کو منسوب نہیں کرتے، انہیں تو حنفی، شافعی، مالکی، یا حنبلی ہونا گوارا نہیں، پھر وہ محمد بن عبدالوہاب کی طرف نسبت کو کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں؟.......پھر یہ عبدالوہاب نجدی، جو وہابیوں کا پیشوا ہے، خود حنبلی تھا، اور اہل حدیث مقلدین کے کسی مسلک کی تقلید نہیں کرتے، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ابن عبدالوہاب نجدی کے پیرو ہوجائیں؟ اہل حدیث اور وہابیوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے'' ۔(ص ۵۰)

اللہ اکبر......وہابی کا لقب اہل حدیث کے اصولوں سے میل نہیں کھاتا، وہ اس لقب پر کبھی راضی نہیں ہیں، بلکہ اسے وہ گالی سے بدتر شمار کرتے ہیں'' ۔(۵۱)

نواب سید صدیق صاحب ''ترجمان الوہابیہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''جو شخص ہمیں وہابی کہتا ہے وہ ہمیں گالی دیتا ہے......وہ شخص جو نجد میں پیدا ہوا، اور اس کے ماننے والوں نے مسلمانوں سے جنگ چھیڑی، وہ مقلد حنبلی تھا'' ۔(ص ۵۲)

غیر مقلدوں کے یہاں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جو قدر وقیمت ہے وہ ان عبارتوں سے واضح ہے، اور بقول مولانا عبداللہ کے عبدالوہاب کے پیرووں اور غیر مقلدوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے، مگر اب شاید مسلک بدل گیا ہے یا غیر مقلدوں نے حصول زر کے لئے تقیہ کی چادر اوڑھ لی ہے۔

مشہور غیر مقلد عالم و پیشوا مولانا ثناء اللہ امرتسری اپنی کتاب ''مذہب اہل حدیث'' کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

> ''اس جیسے اعتقادات واقوال......یعنی وہ اعتقادات واقوال جو شیخ محمد بن عبدالوہاب انبیاء واولیا کے حق میں رکھتے ہیں، ہم اہل حدیثوں کے نزدیک کفر ہے، ہمارے اعتقادات ایسے نہیں ہیں'' ۔(ص ۵٦)

غور کیجئے، پہلے جو اعتقادات غیر مقلدوں کے نزدیک کفر تھے، اب وہ عین ایمان بن چکے ہیں۔

شیخ محی الدین بن عربی کا مرتبہ ومقام غیر مقلدین کی نظر میں:

غیر مقلدین کے امام اول، شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین دہلوی کا قول ان کے سوانح نگار نے ''حیات بعد الممات'' میں نقل کیا ہے کہ ''محی الدین بن عربی خاتم الولایۃ المحمد یہ ہیں''۔ (ص ۷۱)

نواب صدیق حسن صاحب نے ''التاج المکلل'' میں شیخ محی الدین بن عربی کا طویل تذکرہ لکھا ہے، ان پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب دیا ہے، اور آخر میں دعا کی ہے:

فجزاه الله عنا وعن سائر المسلمين وافاض علينا من انواره وكسانا من حلل اسراره وسقانا من حميا شرابه وحشرنا فى زمرة احبابه بجاه سيد اصفياءه وخاتم انبياءه صلى الله عليه وسلم وشرفه وكرمه وعلمه. (ص ۷۸)

اللہ تعالی انہیں ہماری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے، اور ہم پر ان کے انوار کا فیضان جاری کرے، اور ہم کو ان کے اسرار کی خلعت پہنائے، اور ہم ان کی شراب تند پلائے، اور ہمارا ان کے احباب کے زمرہ میں حشر فرمائے، سید اصفیاء خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے کے واسطے سے۔

نواب صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''حاصل یہ کہ ان کے مقامات وکرامات بے شمار ہیں، جنہیں کئی جلدوں میں بھی نہیں پورا کیا جا سکتا، اللہ تعالی کی حجت ظاہرہ اور آیت باہرہ تھے''۔ (ص ۸۰)

یہ وہی شیخ محی الدین بن عربی ہیں، جن کو علامہ ابن تیمیہ اور ان کے ماننے والے ''**اکفر من الیہود والنصاری**'' کہہ کر بھی تسکین نہیں پاتے، لیکن آج کے غیر مقلدین میاں نذیر حسین اور نواب صدیق حسن کو بھی اپنا پیشوا مانتے ہیں، اور علامہ ابن تیمیہ کو بھی اپنا مقتدا قرار دیتے ہیں، بڑے اطمینان سے دو ناؤ پر پاؤں رکھے ہوئے ہیں۔

؎ یار ما یک دار دو آں نیز ہم

اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہے۔

تصوف اور غیر مقلدین:

غیر مقلدوں نے اس دور میں تصوف اور صوفیہ کی مخالفت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے، اور یہ محض عرب کے وہابیوں کی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے، ورنہ ان کے اکابر بالخصوص شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین صاحب اور نواب والا جاہ سید صدیق حسن صاحب دونوں صوفیہ طریق پر بیعت تھے، میاں نذیر صاحب مریدوں کو بیعت بھی کرتے تھے۔ (ص ۱۰۵)

چنانچہ اس کی تفصیل میاں صاحب کی مستند سوانح ''حیات بعد الممات'' میں دیکھی جاسکتی ہے، اور نواب صاحب اور ان کے فرزند نور الحسن صاحب دونوں حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب گنج مرادابادی کے ہاتھوں پر بیعت تھے، اور ان کے والد مولانا اولاد حسن صاحب حضرت سید احمد شہید کے ہاتھوں پر بیعت تھے۔ نواب صاحب نے ذکر کیا ہے کہ ان کے ہاتھوں پر تقریباً دس ہزار آدمی بیعت تھے۔ (ص ۱۰۷)

لطف یہ کہ یہ تینوں غیر مقلد تھے، نواب صاحب تو غیر مقلدیت کے پیشوا ہی ہیں۔ اب اس تضاد یا نفاق کو آج کے مجتہدین حل کریں۔

تعویذات اور غیر مقلدین:

علامہ ابن تیمیہ اور ان کے پیرووں کے نزدیک تعویذ گنڈے کو گلے میں باندھنا مشرکانہ اعمال شمار کیا جاتا ہے، آج کل فرقۂ غیر مقلدین بھی اپنی عادت کے مطابق انہیں کی راگ میں لے ملا رہا ہے، لیکن ان کے اکابر کا حال اور خیال یہ نہیں تھا۔ نواب والا جاہ سید صدیق حسن صاحب نے تو تعویذات کی ایک مستقل کتاب ہی لکھی ہے، اس کا نام ''کتاب التعاویذ'' ہے، نواب صاحب اس کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس رسالہ میں ہم وہ ماثور دعائیں اور صحیح اعمال تحریر کریں گے جن کا تعلق ان عوارض و آفات سے ہے جو انسان کو زندگی میں اور مرنے کے بعد پیش آتے ہیں، یہ سب دعائیں اور اعمال ہم کو ہمارے مشائخ [سے] پہونچے ہیں، اور ہمیں ان کی طرف سے ان سب کی اجازت ہے''۔ (ص ۱۶۶)

اور فرماتے ہیں کہ:

> ’’انہیں مشائخ اور اہل علم نے اس طرح کی جھاڑ پھونک کا ذکر کیا ہے، مخلوق میں اس کا نفع مشاہد ہے، میں بھی ان چیزوں کو گھر کے چھوٹے بچوں کے لئے استعمال کرتا ہوں، جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ،،القول الجمیل‘ میں ذکر کیا ہے‘‘۔ (ص ۱۶۷)

اس کے بعد مولانا ابوبکر صاحب نے اس میں درج بہت سی ادعیہ ماثورہ اور اعمال صحیحہ کے نمونے پیش کئے ہیں۔ اب خدا جانے کیا صحیح ہے؟ تعویذات صحیح ہیں؟ یا ان کا انکار صحیح ہے؟ اقرار کریں تو اہل عرب خفا ہوتے ہیں، انکار کریں تو غیر مقلدیت ہاتھ سے جاتی ہے۔

کتاب کے آخر میں نواب صاحب نے باقاعدہ ان تمام اعمال، تعویذات اور دعاؤں کی اجازت اپنی اولاد واحفاد کو دی ہے، اور بڑی شدت اور تاکید کے ساتھ وصیت فرمائی ہے کہ ان کو اپنی اولاد کے لئے اور دوسرے حاجت مند مسلمانوں کے لئے استعمال میں لائیں، کیوں کہ اچھا آدمی وہی ہے جو لوگوں کو نفع پہونچائے‘‘۔ (ص ۱۸۴)

غیر مقلدین اور قبروں کی خدمت گزاری:

غیر مقلدین شور مچاتے ہیں کہ قبروں کی مجاورت اور ان سے برکت حاصل کرنا ممنوع اور حرام ہے، حالانکہ ان کے مشہور اور بڑے عالم نواب وحید الزماں صاحب حیدرآبادی اپنی کتاب ’’نزل الابرار من فقہ النبی المختار‘‘ میں لکھتے ہیں کہ:

> ’’اولیاء اللہ کی قبروں کی خدمت گزاری اور مجاورت، حصول برکت کے لئے اس میں کچھ حرج نہیں، یہ عمل امت کے بہت سے صلحا وفضلا سے منقول ہے‘‘۔ (ص ۲۰۴)

اور اپنی کتاب ’’ہدایۃ المہدی‘‘ میں لکھتے ہیں:

> ’’اور رہی مجاورت اور خدمت گزاری تو کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ نبی یا ولی کی قبر کی مجاورت شرک ہے‘‘۔ (ص ۲۰۴)

سبحان اللہ! ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

قبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا:

علامہ ابن تیمیہ کے نزدیک علاوہ تین مسجدوں کے اور کسی مقام کے لئے بہ نیت عبادت

سفر کرنا حرام ہے، اسی لئے وہ نبی کریم ﷺ کی قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنے کو حرام قرار دیتے ہیں۔ آج کل غیر مقلدین بھی انہیں کی لے میں لے ملا رہے ہیں، حالانکہ ان کا مسلک یہ نہیں ہے۔ ان کا مسلک وہی ہے جو ان کے بڑے عالم نواب وحیدالزماں صاحب حیدرآبادی نے لکھا ہے، فرماتے ہیں:

> ''بہت سے علماء سلف وخلف نے انبیاء وصالحین کی قبروں کی زیارت کے لئے سفر کو جائز قرار دیا ہے، تو کیا یہ لوگ کافر ومشرک تھے.....؟''۔ (ص ۲۲۷)

ہمارے اصحاب میں شیخین (علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم) نے ان فیوض وبرکات اور لذائذ قلبیہ کا انکار کیا ہے، جو انبیاء وصالحین کی قبروں کی زیارت سے حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارے بہت سے اصحاب مثلاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے نامور صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے خلیفہ حضرت سید احمد شہید نے اس کا اثبات کیا ہے، اور متقدمین میں سے امام شافعی اور علامہ ابن حجر مکی بھی اس کے قائل ہیں، اور حضرات صوفیہ تو سبھی اس پر متفق ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ مشاہد اور مجرب ہے، اور اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے''۔ (ہدایۃ المہدی۔ ص ۲۲۷)

کچھ ٹھکانا ہے ان تضادات کا، یہ سب اس حرص وہوس کا نتیجہ ہے جو اس فرقہ کے قلب میں اجتماعی طور سے جاگزیں ہے، اس کا اشارہ جدھر ہوتا ادھر لڑھک جاتے ہیں۔

قبروں کا طواف:

کسی بھی قبر کا طواف اور اس کے سامنے تعظیمی افعال کا بجالانا، علامہ ابن تیمیہ اور ان کے پیروؤں کے نزدیک صرف گناہ نہیں بلکہ شرک ہے، مگر غیر مقلدین کے گلے میں یہاں بھی ہڈی پھنسی ہوئی ہے، نواب وحیدالزماں صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''اگر کوئی تعظیمی افعال بجالایا جائے، مثلاً قبر کا طواف کیا، یا اسے بوسہ دیا، یا وہاں مؤدب کھڑا ہوا، یا رکوع کیا، یا سجدہ کیا، خواہ وہ کسی نبی کی قبر ہو یا ولی کی، اور اس کی نیت صاحب قبر کی تعظیم اور اسے سلام کرنا ہو، نہ کہ قبر کی عبادت، تو ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا، تاہم مشرک نہ ہوگا''۔ (ہدایۃ المہدی۔ ص ۱۵)

انبیاء واولیا سے استغاثہ:

کسی مصیبت میں غیر اللہ کو پکارنا، ان سے فریاد کرنا، ظاہر ہے کہ کھلا ہوا شرک ہے، آج کل کے غیر مقلدین اس سلسلے میں بڑی سختی برتتے ہیں، لیکن اپنا اصل مسلک اسی شدت سے چھپاتے ہیں۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ مصائب ومشکلات میں انبیاء واولیا اور صالحین سے فریاد کی جاسکتی اور انہیں پکارا جاسکتا ہے۔

چنانچہ نواب وحید الزماں صاحب نے اپنی کتاب ''ہدیۃ المہدی'' میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے، اور آخر میں لکھتے ہیں:

> ''اس بحث سے بداہۃً یہ بات معلوم ہوگئی کہ غیر اللہ کو پکارنا یا اس کی طرف متوجہ ہونا، یا ان سے مدد چاہنا، ایسے امور میں جن پر مخلوق کو قدرت ہوتی ہے، یا غیر اللہ کے بارے میں نفع وضرر کا اعتقاد رکھنا، ایسے امور میں جن پر مخلوق قادر ہوتی ہے، یا غیر اللہ کے بارے میں نفع وضرر کا اعتقاد رکھنا کہ اللہ کے ارادے اور اذن سے ایسا کرسکتے ہیں، یہ شرک اکبر نہیں ہے''۔ ص ۲۴۷

پھر حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ شرک کیوں کر ہوسکتا ہے؟ حالانکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے ''**وماهم بضارين به من احد الا باذن الله**''. اور یہ جادوگر کسی کو نقصان نہیں پہونچا سکتے مگر اللہ کے اذن سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ساحر اللہ کے اذن سے ضرر پہونچا سکتا ہے۔ صاحب جامع البیان نے اپنی تفسیر کے آغاز میں نبی ﷺ سے استغاثہ کیا ہے، اگر غیر اللہ سے مطلق استغاثہ شرک ہوتا تو لازم آئے گا کہ صاحب جامع البیان مشرک ہوں، اگر ایسا ہے تو ان کی تفسیر پر کیوں کر اعتماد ہوسکتا ہے، حالانکہ تمام اہل حدیث نے ان کی تفسیر کو قبول کیا ہے''۔ (ص ۲۴۸)

اور فرماتے ہیں کہ:

> ''اگر کسی نے غلبۂ محبت اور استغراق میں غائب کو حاضر فرض کرکے پکارا، مثلاً 'یا رسول اللہ' کہا یا 'یا علی' کہا یا 'یا حیدر' کہا یا 'یا مدار' کہا یا 'یا سالار' کہا یا 'یا محبوب' کہا یا 'یا غوث' کہا...... یا ایسے امور میں استغاثہ کیا یا استعانت چاہی جس پر اللہ کے نیک بندے انبیاء واولیا قادر ہیں تو اس سے آدمی اسلام سے خارج نہیں ہوتا''۔ (ہدیۃ المہدی۔ ص ۱۶)

نواب وحید الزماں صاحب مزید لکھتے ہیں:

''سید علامہ نواب صدیق حسن خان نے ایک طول قصیدہ میں لکھا ہے:

یاسیدی، یا عروتی ووسیلتی   یا عدتی فی شدة ورخاء
قد جئتک بابک ضارعاً متضرعا   متأوّها بنفسی الصعداء
مالی وراک مستغاث فارحمنی   یا رحمة للعالمین بکائی
(ص۲۴۹)

اے میرے سردار، اے سہارا اور وسیلہ، اے بدحالی وخوشحالی میں میرے مددگار، میں آپ کے دروازے پر گریہ وزاری کرتا اور آہ وبکا کرتا ہوا آیا ہوں، آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جس سے میں مدد چاہوں، تو اے رحمۃ للعالمین میرے رونے پر رحم فرمائیے۔

پھر لکھتے ہیں کہ:

''یہ سوال مردہ سے نہیں ہے، بلکہ صلحا کی ارواح سے ہے، اور روحیں مردہ نہیں ہوتیں، نہ فنا ہوتیں، بلکہ وہ حساس اور باخبر رہتی ہیں، بالخصوص انبیاء وشہدا کی روحیں، کہ وہ بحکم خدا زندہ ہیں..... ہاں یہ ضروری ہے کہ استعانت واستغاثہ ان کی قبروں کے پاس ہو، کیونکہ جب وہ زندہ تھے تو دور سے نہیں سنتے تھے تو مرنے کے بعد دور سے کیسے سنیں گے''۔ (ص۲۴۹ ہدیۃ المہدی۔ ص۲۰)

اور لکھتے ہیں:

''اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ عوام جو یا رسول اللہ اور یا علی یا غوث وغیرہ کہتے ہیں تو صرف اس طرح پکارنے سے ان کے شرک کا حکم ہم نہیں کریں گے''۔ (ہدیۃ المہدی ص۲۴ ص۲۴۹)

مزید ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں کہ:

سید (یعنی نواب صدیق حسن خان) نے اپنی تالیف میں لکھا ہے

قبلۂ دیں مددے   کعبۂ ایماں مددے
ابن قیم مدد ے   قاضی شوکاں مددے

ص۔ ۲۵۰

ان اقتباسات کو پڑھئے اور بتائیے کہ بریلویوں اور غیرمقلدین میں کیا فرق ہے؟ یہ

باتیں ان کا معمولی فرد نہیں لکھ رہا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں ہوں یا نواب وحید الزماں، یہ ان کی مایۂ ناز شخصیتیں ہیں۔

غیر مقلدوں کی ستم ظریفیاں:

غیر مقلدیت بے لگام شاخوں اور کانٹوں کا جنگل ہے، جتنی ڈفلی اتنا راگ، کوئی کچھ کہہ رہا ہے، اور کوئی کچھ۔ کچھ ٹھکانا نہیں کب کون کیا کہنے لگے؟ ایک صاحب ہیں، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، جن کے بارے میں ''جہود مخلصہ'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

> ''شیخ عبداللہ روپڑی متوفی ۱۳۸۷ھ اپنے زمانہ میں حدیث کے علماء کبار میں تھے، مولانا وزیرآبادی اور امام عبدالجبار غزنوی سے تعلیم حاصل کرکے فراغت پائی، کتاب وسنت پر گہری نظر رکھتے تھے، اور دوسرے علوم وفنون پر بھی بہت وسیع نگاہ تھی، پوری زندگی درس وافادہ، تصنیف وتالیف میں اور سنت وسلفیت کے نشر واشاعت میں بسر کی''۔ (ص۲۷۲)

بیوی کی خوشامد:

اب سنئے، یہ صاحب جو کتاب وسنت پر گہری نظر رکھتے تھے، فرماتے ہیں:

> ''شریعت نے ازدواجی زندگی کی خوشگواری اور میاں بیوی کے درمیان الفت ومحبت کا بہت اہتمام کیا ہے، یہاں تک کہ اس کے لئے خدا کے اوپر بھی جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے''۔ (فتاوی اہل حدیث۔ ص۳۷۰۔ ص۲۷۲)

بیوی کو کبیدگی وناگوار خاطری سے بچانے کے لئے قدرے جھوٹ بول دینے کی اجازت تو ضرور ہے، مگر اللہ پر جھوٹ بولنا پناہ بخدا! یہ تو کھلا ہوا ظلم ہے۔ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں ''**فمن اظلم ممن كذب على الله**''. اس سے بڑا ظالم کون ہے؟ جو خدا پر جھوٹ بولتا ہے۔ اس ظلم عظیم کے باوجود یہ شخص محض اس لئے کہ غیر مقلد ہے، اور ائمہ کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے۔ کبار علماء الحدیث میں ہے، کتاب وسنت پر گہری نظر رکھتا ہے، سنت وسلفیت کی نشر واشاعت کرتا ہے۔ استغفر اللہ

عیسیٰ علیہ السلام پر افتراء:

ایک اور غیر مقلد صاحب ہیں، شیخ عنایت اللہ وزیرآبادی، وہ خود اپنے بارے میں لکھتے

ہیں، میرا مذہب پہلے دن سے اہل حدیث کا مذہب ہے۔ حافظ عبداللہ غازی پوری سے پورا استفادہ کیا ہے، مولانا عبدالستار کلانوری اور مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی اور مولانا عبدالوہاب ملتانی کے شاگرد ہیں۔ (العطر البلیغ)

ان شیخ عنایت اللہ وزیر آبادی کی ایک کتاب ''عیون زمزم فی میلاد عیسیٰ بن مریم'' ہے، اس میں انہوں نے اپنی دانست میں دلائل کا زور لگا دیا ہے کہ حضرت مریم منکوحہ تھیں، اور عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے نہیں بلکہ باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔

یہ عقیدہ خالص کفر ہے جو ایک غیر مقلد نے ظاہر کیا ہے، اور صرف ظاہر ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی ہے۔ مولانا ابوبکر صاحب نے عیون زمزم کے متعلقہ صفحات کے فوٹو بھی شامل کتاب کر دیئے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ:

> ''ہم کو نہیں معلوم کہ ہندو پاک کے کسی غیر مقلد عالم نے اس گندی کتاب کا رد لکھا ہو، جب کہ یہ لوگ تقلید اور مقلدین کا رد لکھنے میں بہت تیزی دکھاتے ہیں، شاید عنایت اللہ اثری کا گناہ صرف اس لئے معاف کر دیا گیا ہو کہ وہ غیر مقلد تھا، اور ائمہ مجتہدین پر زبان طعن دراز کئے رہتا تھا''۔ (ص ۲۷۵)

رافضیوں سے مناسبت:

غیر مقلدوں کے قابل فخر ائمہ میں سے نواب وحید الزماں صاحب حیدرآبادی ہیں، ان کی کتاب ہدیۃ المہدی کے حوالے گزر چکے ہیں۔ ان کی ایک تحریر پڑھئے، اور غور کیجئے کہ شیعوں میں اور ان میں کچھ حد فاصل باقی رہی یا نہیں؟ لکھتے ہیں:

> ''اگر ہمارے دور میں سیدنا علی اور معاویہ کے درمیان جنگ ہوئی ہوتی تو ہم علی کے ساتھ ہوتے، پھر اس کے بعد امام حسن بن علی کے ساتھ ہوتے، پھر ان کے بعد امام حسین بن علی کے ساتھ، پھر ان کے بعد علی بن حسین کے ساتھ، پھر ان کے بعد امام باقر کے ساتھ، پھر ان کے بعد امام جعفر بن محمد صادق کے ساتھ، پھر ان کے بعد امام موسی بن جعفر کے ساتھ، پھر ان کے بعد امام علی بن موسی الرضا کے ساتھ، پھر ان کے بعد امام محمد بن علی الجواد کے ساتھ، پھر ان کے بعد امام علی بن محمد ہادی تقی کے ساتھ، پھر ان کے بعد امام حسن بن علی عسکری کے

ساتھ، پھر اگر ہم باقی رہے تو ان شاء اللہ امام محمد بن عبداللہ المہدی الفاطمی المنتظر کے ساتھ ہوں گے''۔ (ص ۲۹۷)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ بارہ ائمہ حقیقت میں یہی وہ امرا ہیں جن پر سید المرسلین ﷺ کی خلافت منتہی ہوتی ہے، اور یہی حضرات آسمان ایمان ویقین کے آفتاب ہیں...... اور رہے بنی امیہ اور بنی عباس تو یہ ائمہ دین نہ تھے، بلکہ ان میں سے اکثر چور ڈاکو تھے، مسلمانوں کا خون بہاتے تھے، اور ان لوگوں نے زمین کو ظلم وجور سے بھر دیا تھا''۔ (ص ۲۹۸)

اور اخیر میں دعا کرتے ہیں:

''اے اللہ! ہمارا حشر انہیں بارہ ائمہ کے ساتھ فرما، اور ہم کو ان کی محبت پر تا قیامت قائم رکھ''۔ (ہدیۃ المہدی۔ ص ۱۰۳۔ ص ۲۹۸)

اگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ کسی غیر مقلد عالم کی عبارت ہے تو ہر شخص بے ساختہ یہی سمجھے گا کہ کسی شیعہ کی کتاب کا اقتباس ہے۔ کیا حضرات اہل حدیث نے یہ عبارت نہیں دیکھی ہے، یا یہ کہ فی الحقیقت ان کا عقیدہ یہی ہے؟''۔

دعویٰ امامت:

غیر مقلدین نے تقلید سے تو آزادی حاصل کر لی، مگر پھر ایسا منہ کے بل گرے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، اس حلقہ سے اتنی بھانت بھانت کی بولیاں بولی گئیں ہیں کہ غیر مقلدیت کو سمجھنا چیستاں سے کم نہیں ہے۔ قادیان کی جھوٹی نبوت کا سرا بھی غیر مقلدیت سے ملتا ہے، قادیانی کا خلیفۂ اول نور الدین پہلے غیر مقلد تھا، انکار حدیث کا فتنہ ایک غیر مقلد کے گھر سے اٹھا۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کے پیدائش کا فتنہ انگیز نظریہ غیر مقلد کے آستانہ سے نکلا۔ حضرت میاں نذیر حسین صاحب شیخ الکل فی الکل کے ایک مشہور شاگرد، غیر مقلدوں کے بڑے عالم مولانا عبدالوہاب ملتانی دہلوی ہیں، ان کا دعوی تھا کہ میں امام وقت ہوں، وہ فرماتے ہیں: جس شخص نے امام وقت کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، اور مر گیا، وہ جاہلیت کی موت مرا، اور جس نے امام کے حکم کے بغیر زکوۃ ادا کی، اس کی زکوۃ نہیں ادا ہوئی، اسی طرح امام کی اجازت کے

بغیر نہ نکاح صحیح، نہ طلاق، اور اس زمانہ میں جو کوئی اور امامت کا دعوی کرے اس کو قتل کرنا واجب ہے"۔ (۳۰۰، ۳۰۱)

جنون! واللہ جنونِ فاحش! یہ غیر مقلدیت کے کارنامے ہیں۔

خلفائے راشدین میں افضل کون ہے؟:

مولانا وحید الزماں صاحب حیدر آبادی کی کتاب "ہدیۃ المہدی" عجائبات کی زعفران زار کھیتی ہے، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "رسول اللہ ﷺ کے بعد امام برحق ابوبکر ہیں، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی، پھر حسن بن علی۔ ہم نہیں جانتے کہ ان پانچوں میں کون افضل ہے؟ اور اللہ کے نزدیک کن کا مرتبہ اونچا ہے؟ البتہ ہر ایک کے فضائل ومناقب بہت ہیں، اور فضائل کی کثرت تو سیدنا علی اور امام حسن بن علی کے لئے ہے، اس لئے کہ یہ صحابی ہونے اور اہل بیت ہونے دونوں فضیلتوں کے جامع ہیں، یہی محققین کا قول ہے"۔ (ص۳۰۴)

اہل سنت تو اس بات کے قائل ہیں اور اس پر اجماع ہے کہ خلفائے راشدین کی افضلیت خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے، لیکن نواب صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ:

> "اکثر اہل سنت والجماعت کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد سب سے افضل ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی ہیں، لیکن اس پر شارع کی طرف سے کوئی قطعی دلیل نہیں ہے، اور نہ اس پر قطعی اجماع ہے، اور اگر اجماع ہے تو ظنی اجماع ہے"۔ (ص۳۰۴)

اس کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ غیر مقلدیت، اہل سنت سے خارج ایک فرقہ ہے۔

صحابہ کے بارے میں غیر مقلدوں کا عقیدہ:

اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ پوری امت محمدیہ میں صحابہ سب سے افضل ہیں، ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی بھی غیر صحابی سے فضیلت میں بڑھا ہوا ہے، لیکن نواب وحید الزماں کی عبارت ملاحظہ ہو، وہ خیر القرون قرنی کے سلسلہ میں ہدیۃ المہدی میں لکھتے ہیں:

> "اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بعد کے زمانے میں کوئی ایسا شخص نہ ہو جو اگلے زمانے

والوں سے افضل ہو، اس لئے کہ امت کے بہت سے بعد کے علما عوام صحابہ سے علم ومعرفت اور اشاعت سنت میں افضل تھے، اور اس کا کوئی عاقل انکار نہیں کرسکتا‘‘۔ (ص ۳۰۷)

صحابہ کی مخالفت تو غیر مقلدین کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، شاید ان کو ہوس ہو کہ غیر مقلدین صحابہ سے بڑھ جائیں، یہی مولانا وحیدالزماں صاحب اپنی ایک اور اہم کتاب ’’نزل الابرار‘‘ ج ۳۔ ص ۹۴ میں لکھتے ہیں کہ:

’’اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ میں بعض لوگ فاسق تھے، جیسے ولید، اور اسی طرح کی بات معاویہ، عمرو، مغیرہ اور سمرہ کے باب میں کہی جائے گی‘‘۔ (ص ۳۳۱)

استغفر الله، معاذالله حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بطور خاص لکھتے ہیں کہ:

’’معاویہ کو ان نفوس قدسیہ پر قیاس کرنا کیوں کر جائز ہوگا؟ جب کہ معاویہ نہ مہاجرین میں ہیں، نہ انصار میں، اور نہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں رہے، وہ تو ہمیشہ رسول اللہ ﷺ سے لڑتے رہے، اور اسلام لائے تو فتح مکہ کے دن ڈر کے مارے ایمان لائے، پھر یہی ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عثمان کو مشورہ دیا تھا کہ علی اور زبیر اور طلحہ کو قتل کر ڈالیں‘‘۔ (لغات الحدیث، مادہ عشم۔ ص ۳۳۱)

پھر اس سے بڑھ کر لکھتے ہیں کہ:

’’مومن صادق جس کے دل میں ذرہ کے برابر بھی نبی ﷺ کی محبت ہوگی، وہ کبھی اس کو جائز نہیں قرار دے گا کہ معاویہ کی مدح کی جائے، اور ان کی تعریف کی جائے‘‘۔

ہم اہل سنت والجماعت کا طریقہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام کے بارے میں سکوت اختیار کرتے ہیں، یہی اسلم واحوط راستہ ہے، لیکن یہ انتہائی جرأت کی بات ہے کہ معاویہ کے حق میں تعظیم کے کلمات بولے جائیں، مثلاً ان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا جائے، اللہ تعالی اس سے ہماری حفاظت فرمائے‘‘۔

مزید ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

’’وہ ان بادشاہوں میں سے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کا خون بہایا ہے، یہ چور اور زبردستی کے حاکم تھے‘‘۔ (ص ۳۳۲)

یہ ہے سلفیت، یہ ہے اثریت، یہ ہے اہل حدیثیت، کوئی بتائے کہ اس میں اور رافضیت

میں کیا فرق ہے؟ یہاں تک کہ ہم نے کتاب کے چند مباحث کی تلخیص کردی، اسی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ غیر مقلدیت کس قسم کا فتنہ ہے؟ کتاب میں اور بھی بہت سے دلچسپ مباحث ہیں، جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، وہ اس سے بہت کم ہے، جو ہم نے ذکر نہیں کیا، عربی داں حضرات اصل کتاب سے استفادہ کریں۔

کتاب میں طباعت کی غلطیاں ہیں، لیکن اتنی ضخیم کتاب میں اتنی غلطیوں کا رہ جانا قابل مواخذہ نہیں ہے، البتہ کہیں کہیں آیت نقل کرنے میں غلطی ہوگئی ہے، آیات کے سلسلے میں زیادہ احتیاط سے پروف دیکھنا چاہئے۔ صفحہ ۳۲۸ پر ”**المنافقون والمنافقات بعضهم اولياء بعض**“ چھپ گیا۔ یہ ”**بعضهم من بعض**“ ہے۔

اسی طرح صفحہ ۳۲۹ میں ”**ومن يشاق الرسول ممن بعد ما تبين**“ ہوگیا، صحیح ”**من يشاقق الرسول من بعد ما تبين**“ ہے۔ صفحہ ۳۷۳ کے بعد ترتیب گڑبڑ ہوگئی ہے، ۳۷۳ کے بعد کی عبارت ۳۷۵ پر آگئی ہے، اس کے بعد ۳۷۴ پر، پھر اس کے بعد ۳۷۶ پر، اس سے قاری کو الجھن ہوتی ہے۔

ایک بہت دلچسپ بحث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید دہلوی سے متعلق ہے، غیر مقلدین ان دونوں بزرگوں کو اپنا امام وپیشوا مانتے ہیں، اگرچہ یہ بالکل غلط اور تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے، لیکن مولانا ابوبکر صاحب نے اسے علی سبیل الفرض تسلیم کرکے غیر مقلدیت کے خلاف زبردست حجت قائم کی ہے۔ ہم ان شاء اللہ اگلے شمارے میں اس کا اسلوب تبدیل کرکے قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔

ماخذ: الماثر۔ اپریل، مئی، جون (۱۹۹۶)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : مسائل غیر مقلدین ۔ کتاب وسنت اور مذہب جمہور کے آئینے میں
مصنف : مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری
صفحات : ۴۰۴
ناشر : المکتبۃ الاثریہ قاسمی منزل سیدواڑہ روڈ غازی پور
قیمت : ۱۲۵/۰۰ روپئے

چند ماہ پیشتر مولانا ابوبکر غازی پوری کی ایک عربی تصنیف ’’وقفۃ مع اللا مذہبیۃ‘‘ کا تعارف ان سطور میں تحریر کیا گیا تھا، اب انہوں نے فرقہ اہل حدیث ہی کے سلسلے میں یہ دوسری کتاب اردو میں مرتب کی ہے۔ فرقہ اہل حدیث ایک غیر معتدل اور نا آشنائے انصاف فرقہ ہے، اس نے اسلام کو اپنے مختصر سے ٹولے میں محدود کر دینا چاہا، یہ لوگ اپنے کو متبع سنت اور پیرو قرآن قرار دیتے ہیں، یہاں تک تو کوئی حرج نہیں، مگر ستم یہ کرتے ہیں کہ دوسرے تمام مسلمانوں کو اتباع قرآن وسنت سے منحرف گردانتے ہیں، بلکہ شاید کافر ومشرک سمجھتے ہیں۔ ان کے حلقے سے ایک کتاب ’’الدیوبندیہ‘‘ شائع ہوئی، جو رازداری کے ساتھ عرب ممالک میں تقسیم ہو رہی ہے، ہندوستان میں تلاش کیجئے تو مشکل سے ملے گی، اس کتاب نے علماء دیوبند پر ظلم وجور کے تیر بے محابا چلائے ہیں، اور یہ عدوان وطغیان کی تمام حدوں کو پھلانگ گئی ہے۔ مذکورہ کتاب نے مولانا ابوبکر صاحب کی توجہ نام نہاد اہل حدیثوں کی بنیادی کتابوں کی طرف منعطف کرائی، جو ان کے ائمہ متقدمین نے تصنیف کی ہیں۔ یہ کتابیں عام طور سے دستیاب نہیں ہیں۔ بڑی کوشش اور محنت سے مولانا نے انہیں حاصل کیا، ان کتابوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ کتاب وسنت کی جس پیروی اور اتباع کا یہ فرقہ مدعی ہے، اس کی اسے ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ اس فرقہ کے علما وعوام کے حالات تو بغیر کسی کتاب کی مدد کے ہی برملا اعلان کرتے ہیں کہ اتباع کتاب وسنت کا صرف نعرہ ہی نعرہ

ہے۔ کیوں کہ جماعتیں اپنے علوم وافکار اور عقائد ونظریات ہی کے زیر اثر تشکیل پاتی ہیں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس جماعت کا ماحول ومعاشرہ قرآن وسنت سے منحرف ہے پھر ہم کیسے یقین کرلیں کہ ان کے مسائل وفتاوی قرآن وسنت کے مطابق ہوں گے؟ مولانا محمد ابوبکر صاحب ان کے گھر میں گھسے تب تفصیلاً معلوم ہوا کہ باہر بورڈ کیا لگا ہوا ہے، اور اندر کھیل کیا ہورہا ہے؟ ان کے محراب ومنبر کا جلوہ کچھ ہے، لیکن چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند۔ مولانا نے اسی ”کار دیگر“ کو اکٹھا کیا ہے۔ چند نمونے آپ بھی دیکھ لیں۔

(۱) فرقہ اہل حدیث کے نزدیک بیک وقت چار عورتوں سے زائد کو نکاح میں رکھنا جائز ہے۔

(۲) فرقہ اہل حدیث کا مسلک یہ ہے اگر کسی کا گھر مسجد سے دور ہو تو اس پر جمعہ کی نماز واجب نہیں، اگر چہ وہ اذان سنتا ہو۔

(۳) اس کے نزدیک مال تجارت میں زکوۃ نہیں ہے۔

(۴) شیعوں نے جواذان میں ”**حی علی الصلوۃ**“ کی جگہ ”**حی علی خیر العمل**“ کو اپنا شعار بنالیا ہے، فرقہ اہل حدیث کے نزدیک اس پر انکار نہیں کرنا چاہئے، اور چونکہ یہ کلمہ بھی مرفوع اور صحیح حدیث سے ثابت ہے، اس لئے واجب القبول ہے۔ (اس فرقہ کو شیعوں سے بڑی مناسبت ہے)

(۵) اس فرقہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی حاجی وقوف عرفہ سے پہلے اپنی بیوی سے ہم بستر ہوجائے تو اس کا حج فاسد نہ ہوگا۔

(۶) اس فرقہ کے نزدیک ایک بکری کی قربانی بہت سے لوگوں کی طرف سے کافی ہے۔

(۷) اس فرقہ کا مذہب یہ کہ وضو میں پاؤں دھونے کے بجائے اس پر مسح کر لینا کافی ہے۔

(۸) اس فرقہ کے نزدیک دو وقت کی نماز کسی بھی دنیاوی ضرورت سے ایک وقت میں پڑھی جاسکتی ہے۔

(۹) اس فرقہ کے یہاں قرآن کریم بلا وضو اور بلا غسل چھونا جائز ہے۔

(۱۰) عورت مرد کی امامت کرسکتی۔

(۱۱) سجدہ تلاوت بغیر وضو کے بھی درست ہے۔

(۱۲) ایک میل کے سفر سے آدمی مسافر ہو جاتا ہے، وہ نماز میں قصر کرے۔

(۱۳) ماں باپ اور اولاد کو زکوۃ دینی جائز ہے۔

(۱۴) جس کو بھوک اور پیاس کا تقاضا سخت ہوتا ہو، اس پر روزہ رکھنا فرض نہیں ہے۔

(۱۵) فرقہ اہل حدیث کے نزدیک جو شخص روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو اس کو روزہ کا فدیہ دینا واجب نہیں ہے۔

(۱۶) کافر کے پیچھے کسی نے نماز پڑھی، بعد میں اس نے اپنا کافر ہونا بتایا تو نماز ہو گئی، دہرانا واجب نہیں ہے۔

(۱۷) غیر مقلدوں کا مذہب ہے کہ جب نماز بلا عذر شرعی چھوڑ دی گئی ہو تو اس کی قضا نہیں ہے۔

(۱۸) جوتے پہن کر نماز پڑھنا مسنون ہے۔

(۱۹) جن دواؤں یا جس خوشبو میں شراب ملی ہو، ان کا استعمال جائز ہے۔

(۲۰) ایک مد (تقریباً ۱۸ ار لیٹر) شراب کا شوربا پاک ہے۔

(۲۱) شراب سے گوندھا ہوا آٹا اور اس سے پکی ہوئی روٹی ہو تو اس کا کھانا جائز ہے۔

(۲۲) مشت زنی (ہاتھ سے منی نکالنا) جائز ہے، بلکہ بعض اوقات واجب ہے۔

(۲۳) منی، خون، شرمگاہ کی رطوبت، شراب سب پاک ہے، اور سور کے علاوہ تمام حیوانات کا پیشاب پاک ہے۔

(۲۴) حضرت ابوسفیان، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن عاص، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہم کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہنا نہیں چاہئے۔

فرقہ اہل حدیث کے سینکڑوں جدید اور تازہ مسائل میں سے یہ چند ایک بطور نمونے کے ذکر کئے گئے ہیں۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

کتاب کا لب ولہجہ سخت ہے، مگر یہ اس تعدی اور ظلم کا جواب ہے جو غیر مقلدین کی

طرف سے احناف پر مسلسل ہوتا رہتا ہے، لیکن حنفی عالم خواہ کتنا ہی سخت لب ولہجہ اختیار کرنا چاہے، غیر مقلدوں کے عشر عشیر کو نہیں پہونچ سکتا۔ مولانا نے ان کے سخت الفاظ اور دشنام طرازیوں کے نمونے بھی کتاب میں پیش کئے ہیں۔ کتاب میں مسائل کی فہرست نہیں ہے، اس کے بغیر کتاب میں بڑی کمی محسوس ہوتی ہے، غیر مقلدوں کے ہذیانات سے واقفیت کے لئے کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ماخذ: انوار العلوم۔ ستمبر (۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : فیضان محبت
مرتب : حضرت مولانا قمر الزماں صاحب
صفحات : ۲۱۶
ناشر : مکتبہ دارالمعارف ۴۶۶/۷/۴۰ بخشی بازار الہ باد
قیمت : درج نہیں

امام معرفت ومحبت حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی قدس سرہ اس دور اخیر میں جب کہ قلوب واذہان پر مادیت ودنیا پرستی کے غلبہ نے ایسا تسلط کیا ہے کہ معرفت و روحانیت کی تمام راہیں تقریباً مسدود ہوگئی ہیں، اس دور ظلمت میں حضرت اقدس کا وجود اللہ تعالیٰ کی برہان اور محبت وروحانیت کا اعلیٰ نشان تھا، جن لوگوں نے حضرت کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے، انہیں اس گزارش کی صداقت میں ذرا بھی تأمل نہیں ہوگا، لیکن جنہوں نے آپ کی زیارت نہیں کی ہے وہ بھی آپ کے جلووں کی جھلکیاں ''فیضان محبت'' میں دیکھ سکتے ہیں۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت اقدس محبت وعرفان کے بحر مواج تھے، جب یہ سمندر لہراتا تھا تو کبھی کبھی منظوم کلام اور اشعار کے آبدار موتی ساحل پر بکھر جاتے تھے، انہیں آبدار موتیوں کو پرویا گیا تو اس نے عرفان محبت کا نام پایا، یہ نام اتنا برمحل اور اتنا بامعنی ہے کہ اس کی داد نہیں دی جاسکتی، جگر مرحوم نے مستی کے عالم میں ایک شعر کہا تھا، شعر کیا ہے، اظہار حقیقت کا نقش دوام ہے۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انساں کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام تو ہے عرفان محبت عام نہیں

یعنی محبت کا فیض تو سارے عالم کو حاصل ہے، ہر ایک میں اس کی استعداد وصلاحیت

موجود ہے، مگر محبت کی شناخت ومعرفت جس سے اس کے تقاضوں کی تکمیل ہوسکے، خاص خاص لوگوں کو ہوتی ہے۔

حضرت اقدس انہیں خواص بلکہ اخص الخواص میں سے تھے، جن پر عرفان محبت کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ حضرت نے اس عرفان کو اشعار میں سمویا، مگر عرفان محبت، پھر عرفان محبت ہے۔ اس کا عام قلوب واذہان تک پہونچنا آسان نہ تھا، حالانکہ حضرت کے اشعار اعلی شعریت کے حامل ہونے کے باوجود نہایت سادہ اور سہل ہیں، اور شاید ان کی سادگی ہی ان کے عمیق ودقیق معانی کی تہوں میں پہونچنے سے مانع بن گئی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ ’’حضرت احمد پرتاب گڑھی کے کلام کی ایک صفت یہ تھی کہ وہ زبان نہایت سادہ اور بظاہر کسی دقت سے خالی لکھتے تھے، ان کے شعر میں سلاست اور صفائی حد اعجاز تک پہونچی ہوئی تھی، لہٰذا ان کے کلام میں سلوک وعرفان کے باریک نکتے اس طرح پنہاں ہوکر آتے تھے جس طرح بقول غالبؔ

نبض خس میں شعلۂ پنہاں ہوتا ہے

یعنی جب خسؔ کو حرارت پہونچے تو وہ روشن ہو ورنہ وہ محض ایک پرکاہ ہے، اسی طرح حضرت پرتاب گڑھی کا کلام عام لوگ پڑھیں یا سنیں تو اکثر لاعلمی یا توجہ کی کمی یا درجۂ فہم کی پستی کے باعث سرسری گزر جائیں، بقول میرؔ:

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

اور یہ واقعہ ہے کہ حضرت مولانا کا ہر شعر اپنے اندر شریعت وطریقت اور حقیقت و معرفت کا ایک جہانِ معنی رکھتا ہے، لیکن اس جہانِ معنی تک رسائی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ مولانا قمر الزماں صاحب مدظلہ ایک صاحب نظر عالم اور صاحب دردومحبت اہل دل ہیں، جنہوں نے ابتداء مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کے خوان کرم سے استفادہ کیا، پھر حضرت پرتاب گڑھی علیہ الرحمہ کی خدمت میں طویل مدت گزاری، وہ علم و معرفت اور شریعت وطریقت دونوں کے جامع ہونے کے ساتھ نہایت صاحب ذوق بھی ہیں،

انہوں نے حضرت کی حیات میں عرفان محبت کے فیضان کو عام کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے حضرت کے اشعار کی تشریحات اس طرح لکھیں کہ ان میں شریعت وطریقت اور معرفت ومحبت کے جس قدر رموز واشارات تھے، سب کھل کر نمایاں ہوگئے، اور پھر مزید یہ کہ انہیں قرآن و حدیث اور علما ومشائخ کے اقوال سے اس طرح مدلل کیا کہ کسی کو مجالِ تردد باقی نہ رہے۔ اس طرح حضرت کے علوم ومعارف عام بھی ہوئے اور مدلل بھی۔

اس خاکسار نے فیضان محبت کو پڑھ کر حضرت کی خدمت میں ایک مرتبہ عرض کیا تھا کہ حضرت! عرفانِ محبت تو عام نہ تھا، مگر مولانا قمر الزماں صاحب مدظلہ نے فیضانِ محبت لکھ کر اسے بھی عام کردیا۔ حضرت یہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔

یہ کتاب اہل شریعت کے لئے اور اہل طریقت کے لئے بھی اور عام اردوخواں حضرات کے لئے بھی ایک راہنما اور دلیل ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ کتاب شریعت وطریقت کی جامع بھی ہے اور حضرت اقدس کے احوالِ باطنی کو نمایا بھی کرتی ہے، اس سے مردہ دلوں کو زندگی اور زندہ دلوں کو تازگی ملتی ہے۔

بات تو ذرا طویل ہوجائے گی، مگر تشریحات کا ایک نمونہ پیش کئے بغیر دل اور قلم راضی نہیں ہورہے۔ حضرت کا ایک شعر ہے۔

کہنے کی نہیں بات یہ، کہتا ہوں مگر خیر
پھرتا ہے نگاہوں میں محالات کا عالم

''محالات کا عالم'' آپ نے کچھ سمجھا؟ اب اس کی تشریح سنئے، کس قدر برمحل اور معرفت افزا ہے۔ پہلے مصرعہ کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حضرات اہل اللہ اگر اپنا کوئی حال بہ مصلحت یا بضرورت ظاہر فرماتے ہیں تو ایسا عنوان اختیار فرماتے ہیں جس سے کسی قسم کی انانیت اور خودی کا اظہار نہیں ہوتا، بلکہ ہر ہر حرف سے تواضع ومسکنت، خوف وخشیت کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے، چنانچہ حضرت والا کے مندرجہ بالا شعر کے پہلے مصرع کو ملاحظہ فرمائیں کہ کس قدر احتیاط کے ساتھ فرمارہیں۔
>
> کہنے کی نہیں بات یہ، کہتا ہوں مگر خیر

پھر دوسرے مصرع۔

پھرتا ہے نگاہوں میں محالات کا عالم

کی شرح فرماتے ہیں کہ:

> ''جو چیزیں اس عالم دنیا میں محالات میں سے ہیں، مثلاً رویت جنت ودوزخ اور اسی طرح دیدار الٰہی وغیرہ، تو جب طالب صادق ریاضت ومجاہدہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے نسبت و تعلق قوی کر لیتا ہے، اور اللہ جل شانہ کی عبادت ''ان تعبد الله كانك تراه'' کے حال سے ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے حجابات مرتفع فرما دیتے ہیں، اور ایسے حال حضور سے نوازتے ہیں جس سے مغیبات کا گویا انہیں مشاہدہ ہونے لگتا ہے''۔

کس قدر عمدہ شرح ہے، واقعی توفیق خداوندی کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، اور حضرت اقدس کی روح مبارک کو خوش رکھے۔ زیر نظر نسخہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے نفع کو عام فرمائیں۔

ماخذ: المآثر۔ جون، جولائی، اگست (۱۹۹۷ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : تقریر دلپذیر
مصنف : حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی متوفی ۱۲۹۷
تحقیق : مولانا عبدالرشید بستوی
صفحات : ۴۰۵
ناشر : شیخ الہند اکیڈمی۔ دارالعلوم دیوبند
قیمت : ۱۲۰/۰۰ روپئے

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں دین اسلام کے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک واضح برہان تھے، ان کا عظیم کارنامہ دارالعلوم آج بھی زندہ و تابندہ ہے، اس کے علاوہ حضرت نے مختلف موضوعات پر متعدد تصنیفات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ تصنیفات کیا ہیں؟ علم وتحقیق کے شہ پارے ہیں، کسی مسئلہ پر دلائل پیش کرنے پر آتے ہیں تو عقلیں حیران ہوجاتی ہیں کہ یہ غامض اور عمیق علوم کہاں سے آرہے ہیں؟ جن باتوں کی طرف عموماً علما کے اذہان نہیں پہونچتے، وہاں سے وہ دلائل وشواہد کے موتی چنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحریر کردینے کے بعد بھی مشکل ہی سے ان کا ادراک ہوتا ہے۔ ان کی کتابیں اچھوتے مضامین، گہرے اور مضبوط دلائل اور بلند معانی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کا سمجھنا عالم کی ذہانت وذکاوت کا امتحان ہے، ان میں علوم ومعارف کا بیش بہا خزانہ ہے، لیکن غالباً ان کے دشوار ہونے کی وجہ سے کما حقہ ان کی طرف توجہ نہیں دی جاسکی، کتابیں حضرت کی چھپتی رہتی ہیں، مگر ایسی کہ ان سے استفادہ دشوار ہوتا ہے، کتابت کی اغلاط، طباعت کی خرابی اور کاغذ کی فرسودگی کی وجہ سے کوئی پڑھنے کی ہمت بھی کرے تو دو ایک صفحہ پڑھ کر ہمت ہار جائے۔ البتہ بعض کتابوں کی عمدہ کتابت و طباعت بلکہ تسہیل کا بھی اہتمام ہوا، مگر وہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

اب پھر ارباب دارالعلوم دیوبند کو اس کی طرف توجہ ہوئی، ایسا لگتا ہے کہ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی تصنیفات پر جدید طرز تحقیق کے مطابق کام ہوگا۔ چنانچہ اس کی پہلی کڑی زیر تبصرہ کتاب ''تقریر دلپذیر'' خوبصورت طباعت اور عمدہ کاغذ کے ساتھ اہل علم کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم کی طرف سے اس کتاب کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس کتاب میں حضرت نانوتوی نے اسلام کے بنیادی عقائد توحید ورسالت وغیرہ کا اثبات اور ان کے ذیل میں بہت سے مسائل کی توضیح وتشریح نہایت محکم اور معقول انداز میں کی ہے۔

کتاب کی تحقیق مولانا عبدالرشید صاحب بستوی نے کی ہے، تحقیق کا کام خاصا دشوار ہے، مولانا نے اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔

تقریر دلپذیر کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، پہلا ایڈیشن مطبع صدیقی بریلی سے حضرت کی حیات میں شائع ہوا تھا، اس وقت کتاب کے ۱۷۰ صفحات تھے، کتاب نا تمام تھی، پھر تقاضے ہوئے کہ اسے مکمل کر دیا جائے، حضرت نے قلم اٹھایا، مگر اب بھی نا تمام رہ گئی، دوسرا ایڈیشن اضافہ شدہ مطبع بحر العلوم لکھنو سے ۲۸۰ صفحات پر شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ کے زیر نگرانی مطبع قاسمی دیوبند سے شائع ہوا۔

مولانا بستوی نے زیر نظر نسخہ دوسرے اور تیسرے ایڈیشن کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا ہے، متن کی بنیاد مطبع بحر العلوم والے نسخے کو قرار دیا ہے، اس کی اہمیت کیا ہے؟ مولانا بستوی اس کا تعارف کراتے ہیں:

> ''اس نسخے میں اہمیت اس بنا پر ہے کہ یہ حضرت نانوتوی کے نسخۂ دستخطی کی بعینہ نقل ہے۔ نیز شروع میں فہرست مضامین شامل کی گئی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ کتاب ہذا کی حضرت نانوتوی کی طرف سے تکمیل کے بعد غالباً یہ پہلا ایڈیشن ہے جس میں حضرت کی عبارت میں کسی قسم کی تبدیلی یا حذف واضافہ نہیں کیا گیا ہے، حتی کہ الفاظ کے املا میں بھی کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی گئی ہے''۔ (ص ۱۷)
>
> دوسرا نسخہ جو مولانا میاں صاحب نے شائع کیا، اس کی اہمیت کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں بعض عنوانات کا اضافہ ہوا ہے، پیراگراف قائم کئے گئے ہیں، اور بعد کے تمام ایڈیشن اسی کی

نقل ہیں''۔(ص ۱۸)

پھر فاضل محقق نے بتایا کہ ان خوبیوں کے باوجود دونوں نسخوں میں کچھ خامیاں تھیں۔

بحرالعلوم کا ایڈیشن عنوانات، پیراگراف، صحیح اردو املا اور رسم الخط کے اصول کی رعایت سے یکسر عاری مسلسل مضمون کے مانند پھیلتا چلا گیا ہے، اور کتاب کے خاتمے پر ہی یہ سلسلہ رکا ہے، دوسرے نسخے میں ان خامیوں کی کچھ اصلاح تو کر دی گئی ہے مگر بعض ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جن سے کتاب کی استنادی حیثیت یقیناً مجروح ہوتی ہے، مثلاً اصل کتاب میں موجود تابع اضافات اور فارسی تراکیب کو بدل کر اردو کے قالب میں ڈھال دیا گیا، یا سہولت کی خاطر بعض الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے''۔(ص ۱۸)

(۱) فاضل مرتب نے بحرالعلوم والے نسخے کو بنیاد بنایا ہے، اور جہاں جہاں مطبع قاسمی والے نسخے میں اس سے کچھ اختلاف ہے اسے حاشیہ میں لکھ دیا ہے۔

(۲) انہوں نے زیر نظر ایڈیشن میں اس بات کا خصوصیت سے اہتمام کیا ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت اور آپ کے الفاظ میں ہرگز کسی قسم کی تبدیلی نہ آنے پائے۔

(۳) اور کوشش یہ کی ہے کہ کومے، فل اسٹاپ، سوالیہ نشان، ڈیش، سیمی کولن اور قوس کی علامتوں کے ذریعہ کتاب کے مضمون ومفہوم کو سہل اور واضح کر دیں۔

(۴) نیز یہ کہ جو الفاظ مشکل اور پیچیدہ تھے ان کے مرادی مفہوم فرہنگ آصفیہ اور آصف اللغات جیسے معتبر ومستند اردو لغات کی مدد سے حاشیے پر لکھ دیئے ہیں۔

(۵) اگر کہیں کوئی لفظ مفید معنی بڑھایا گیا ہے تو اسے قوسین میں کر کے نمایاں کر دیا ہے۔

(۶) البتہ بعض الفاظ کے املا کو ضرور درست کیا ہے، مثلاً ''اوس'' کہ جگہ ''اس۔'' ''پھونچا'' کی جگہ ''پہنچا''۔ ''تسپر'' کی جگہ ''پھر'' وغیرہ۔

(۷) نئے عنوانات کے لئے زیادہ تر مطبع بحرالعلوم کے نسخے سے مدد لی گئی ہے، اور نئے پیراگراف لگانے کے سلسلے میں مطبع قاسمی کے نسخے کو پیش نظر رکھا گیا ہے، مؤخر الذکر نسخے میں کہیں کہیں مفید حواشی بھی تھے، انہیں بھی ذکر کر دیا گیا ہے''۔(ص ۱۹)

یہ اس ایڈیشن کی خصوصیات ہیں، ماشاء اللہ فاضل محقق نے خوب محنت کی ہے، اللہ تعالی

انہیں جزائے خیر دے، لیکن کتاب کے مطالعہ کے بعد فاضل محقق اور سربراہ شیخ الہند اکیڈمی سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) میرے سامنے بحر العلوم والا نسخہ نہیں ہے، مگر کتاب چونکہ اسی کی نقل ہے، اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں، اور بعض بڑی فاش غلطیاں ہیں، یہ گو کہ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے دستخطی نسخہ کی بعینہ نقل ہے، جس میں حضرت کی عبارت میں کسی قسم کی تبدیلی یا حذف واضافہ نہیں کیا گیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ غلطیاں حضرت نانوتوی ہی کی ہوں گی، کاتب کی کارفرمائیاں کون نہیں جانتا؟ مطبع قاسمی والے نسخے میں ان غلطیوں کی تصحیح ہے، مگر دو ایک جگہوں کو چھوڑ کر یہ ساری غلطیاں زیر نظر ایڈیشن کے متن میں شامل کردی گئیں ہیں، اور حاشیے میں اس کو بھی ذکر کردیا ہے۔ صحیح طریقۂ عمل یہی تھا کہ اغلاط کی اصلاح کرکے متن مرتب کیا جاتا اور حاشیہ میں وضاحت کردی جاتی، جیسا کہ دو ایک جگہ کیا گیا ہے، متن میں کتابت کی غلطی کو برقرار رکھنا اور حاشیہ میں اس کی تصحیح کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

ص۱۵۱	متن	انھوں نے	صحیح	نبیوں نے
ص۱۶۸	″	قبجہ کے برابر	صحیح	قیمت کے برابر
ص۲۲۷	″	کمی زیادتی، طاقت کی کمی زیادتی پر	صحیح	کمی زیادتی طاقت کی، لطافت کی کمی زیادتی
	متن	موقوف ہے	صحیح	پر موقوف ہے

اس طرح کی اور بھی متعدد مثالیں نظر سے گزریں۔

(۲) املا کے جدید طریقے جو آج کل بعض لوگ رائج کرنا چاہتے ہیں وہ اس لائق نہیں ہیں کہ آنکھ بند کرکے انہیں تسلیم کرلیا جائے، بالخصوص پرانے علما کی تحریرات کو جدید طرز املا پر ڈھالنے کی کوشش سے بعض اوقات الجھنیں پیش آسکتی ہیں۔

مثلاً حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی عبارت میں متعدد بار ''سو، چونکہ'' کے لفظ آئے ہیں، ان کی کتابت جدید طرز کے مطابق ''سوچوں کہ'' ہوئی ہے، اور کمپیوٹر نے 'سوچوں' کو ایک ساتھ

کر دیا اور 'کہ' کو الگ کر دیا، اس سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لفظ سوچنے سے مشتق تو نہیں ہے؟۔

'اوس' اور 'پھونچا' کا املا غلط تو نہیں ہے کہ اس کو درست کیا جائے، ہاں یہ کہنا چاہئے کہ بدل دیا گیا ہے، لیکن 'تسپر' کو بدل کر 'پھر' کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر کے لفظ سے 'تسپر' کا مفہوم ادا نہیں ہوتا، 'تسپر' کے معنی عموماً 'باوجودیکہ' ہیں۔

(۳) کتاب میں کتابت کی غلطیوں کی بھر مار ہے، ایک تو حضرت نانوتوی کی تحریریں یوں ہی عام فہم نہیں ہوتیں، اس پر کتابت کی غلطیوں نے اور مشکل پیدا کر دی ہے، ایک دو مثالیں اس کی بھی ملاحظہ ہوں۔

(الف) ص۸۰ پر ایک عنوان ہے ''استدلال کا مدار بلاغت پر''۔ اس میں بلاغت کے لفظ نے بڑی الجھن پیدا کی، غور کیا تو ''ملازمت'' کا لفظ ہونا چاہئے۔

(ب) ص۸۹ پر ہے ''اور اعتدال فراخ جاتا رہا''۔ یہاں فراخ کا لفظ کسی طرح حل نہیں ہوتا تھا، ایک دوسرے نسخے میں اسے تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ ''اعتدال کا مزاج'' ہے۔

(ج) ص۹۰ پر ہے ''پھر سارے اعضاء کو سر سے پا تک ایک شئ سی بنایا ہے''۔ اس 'شئ سی' نے بہت خلجان پیدا کیا، بہت غور کرنے بعد اور دوسرے نسخے کو دیکھنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ یہ ''ایک سی شئ'' ہے۔ دوسرے نسخے میں ''ایک ایسی شئ'' ہے، اس میں 'ایسی' کا لفظ بے محل ہے، وہ بھی سہو کتابت ہے۔

(د) ص۱۰۸ پر ہے ''اگر روح ہوائی کوئی اور چیز ہے''۔ اس عبارت میں ''روح غیر ہوائی'' ہونا چاہئے۔ کاتب نے اس کا عکس کر دیا ہے۔

(۵) ص۱۴۳ پر ہے ''وہ اس کی دعوت (رغبت) طبع ہوتی ہے''۔ اللہ جانے قوسین کے لفظ 'رغبت' سے دعوت کا معنی بتانا مقصود ہے یا اس کی تصحیح منظور ہے؟ یہاں لفظ ''مرغوب طبع'' ہے۔

غرض کتابت کی غلطیاں بے شمار ہیں، تبصرہ نگار نے اس کی فہرست مرتب کر کے مولانا بستوی کے پاس بھیج دی ہے، دوسو سے زائد کتابت کی غلطیاں ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کتابت کے بعد تصحیح کا اہتمام نہیں ہوا ہے۔ کمپیوٹر سے کتابت ایک بہت نازک عمل ہے، اس کی تصحیح مشین کے پاس بیٹھ کر کرانی چاہئے، ورنہ آسمان کو آسان اور زمین کو مشین بنتے دیر نہیں لگے گی۔ ص۲۴۸

پر ڈیڑھ دوسطر عبارت مکمل چھوٹ گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایڈیشن اغلاط کتابت میں پچھلے ایڈیشنوں سے بہت بڑھ گیا ہے، بہت اہتمام سے دوبارہ تصحیح کرانے کی ضرورت ہے، ورنہ اس نسخے کو پڑھ کر وہ لوگ بھی جو کچھ سمجھ سکتے ہیں، چکرا جائیں گے، نفی اور اثبات کا عکس تو متعدد جگہوں پر ہے۔

ایک دلچسپ غلطی کتاب کے محقق سے ایک لفظ کے معنی بتانے میں ہوئی ہے۔ مولانا کی عبارت ہے:

''جیسے روڑکی کے گودام میں کسی نے دیکھا ہو کہ ایک کل سے دوسری کل چلتی ہے''۔

اس میں ''روڑکی'' کا معنی بتانے کی محقق نے کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''روڑکی''، پتھر توڑ کر روڑے اور کنکر بنانے والی مشین''۔ (ص ۱۳۷)

حالانکہ بات یہ ہے کہ روڑکی سے روڑکی شہر مراد ہے، وہاں ابتداء انگریزوں نے ایک کارخانہ قائم کیا تھا، اس کی مشینوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس اطراف میں غالبًا وہ پہلا کارخانہ تھا، اس لئے اس کی خاص شہرت اور اہمیت تھی، ہمارے بزرگوں کی تحریرات اور ملفوظات میں متعدد جگہوں پر اس کا ذکر آیا ہے۔

شیخ الہند اکیڈمی نے یہ کام تو بہت اچھا شروع کیا ہے کہ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی کتابوں کو جدید طرز پر خوبصورت انداز میں شائع کرے، مگر اس کے لئے جتن اور محنت کی ضرورت ہے، اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

ماخذ: المآثر۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر (۱۹۹۷)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : الفوز الکبیر فی اصول التفسیر
عربی ترجمہ : مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
طباعت اور کاغذ : اعلیٰ
ناشر : مکتبہ حجاز دیوبند

حق تعالی کا ارشاد ہے: **وربک یخلق مایشاء ویختار**. تمہارا رب جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور انتخاب فرماتا ہے۔ اس اصول خداوندی کے تحت زمان ومکان، افراد واشخاص اور دستور وقانون ہر ایک میں خلق وانتخاب کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، اللہ کی مشیت جس زمانہ میں جس کام کے لئے جس کو چاہتی ہے، چن لیتی ہے، اور پھر اسے اس کام کا مرکز بنا کر اس کا فیضان عام کیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں حق تعالی کی حکمت بالغہ نے علم اور دین کے فیضان وبقا کے لئے عین اس وقت جب کہ مسلمانوں کی حکومت زوال کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی، ایک عبقری شخصیت، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا انتخاب فرمایا، اور ان کو علم وہدایت کا ایسا مرکز بنایا کہ آج علم کی جو بھی بہار دکھائی دے رہی ہے، اس کا فیضان اسی مرکزی شخصیت سے وابستہ ہے۔ ہندوستان میں علم حدیث کی عام اشاعت انہیں کے مدرسۂ فیض کی برکت ہے، قرآن کریم کا فارسی ترجمہ انہیں نے کیا، اور پھر ان کے اخلاف واحفاد نے اردو میں ترجمے کئے۔

قرآن فہمی کا دروازہ بھی ان کے لئے حق تعالی کی طرف سے کھولا گیا، یوں تو قرآن کریم کی تفسیریں چھوٹی بڑی بہت سی لکھی گئیں، اس سلسلے میں اصول وقواعد بھی مرتب ومنضبط کئے گئے، علماء اسلام نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ **شکر اللہ مساعیهم وتقبل منهم**

لیکن حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو قرآن فہمی اور اسرار دین کے سمجھنے کی جو خاص

استعداد اللہ کی جانب سے ودیعت کی گئی تھی، اس کی بنیاد پر تفسیر کے سمجھنے میں اور سمجھانے کی ایک قریب الفہم اور مختصر راہ کھلی، جو بہت واضح بھی ہے کہ اس کے سمجھنے میں دشواری بھی نہ ہو، اور بہت مختصر بھی، کہ آدمی کم سے کم وقت میں قرآن کریم کے مضامین ومطالب کا ادراک کر لے۔ شاہ صاحب نے تفسیر کے اصول وقواعد کو ایک مختصر سے رسالہ میں قلم بند فرمایا۔

مولانا عبیداللہ صاحب سندھی علیہ الرحمہ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس سرہ کی خدمت میں رہ کر جب تفسیروں کا مطالعہ کرنا چاہا، اور تفسیر اور اصول تفسیر کی مفصل کتابیں دیکھ ڈالیں، مگر تفصیلات سے فہم کی الجھنیں کچھ بڑھ ہی گئیں تو انہوں نے حضرت شیخ کی خدمت میں اپنی مشکل رکھی، شیخ نے فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب محدث دہلوی کا ایک مختصر سا رسالہ ''الفوز الکبیر'' ہے، اسے پڑھ لو۔ مولانا سندھی نے بیان کیا کہ اس کے پڑھنے سے مشکلات کی تمام گرہیں کھل گئیں، اور قرآن فہمی کی راہ ہموار ہوئی۔

یہ رسالہ حضرت شاہ صاحب نے فارسی زبان میں تالیف فرمایا ہے، دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں اس کا عربی ترجمہ شامل کیا گیا، اس ترجمہ پر مترجم کی حیثیت سے علامہ محمد منیر الدمشقی کا نام چھپا ہوا ہے، لیکن ان کی شخصیت معلوم نہیں ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کے حوالے سے اس کے دوسرے مترجم مولانا سلمان ندوی صاحب نے بتایا کہ یہ کسی ہندوستانی ہی عالم کا کیا ہوا ترجمہ ہے، لیکن مطبع منیریہ دمشق سے شائع ہوا ہے، مترجم نے اپنے نام کا اخفا کیا اور صاحب مطبع کے نام سے یہ رسالہ شائع ہوا۔

لیکن اس ترجمہ میں کچھ تسامحات تھے، بعض جگہ مطلب کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی، تصحیح کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے کتابت کی غلطیاں بھی بہت ہوگئی تھیں، ضرورت تھی کہ ترجمہ کا مقابلہ اصل سے کیا جاتا، غلطیوں کی تصحیح کی جاتی، اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند نے پیش رفت کی، انہوں نے الفوز الکبیر کی عمدہ شرح ''العون الکبیر'' کے نام سے عربی میں لکھی، اس میں ان جگہوں کی نشان دہی کی، اور اسے حل کیا، اس شرح میں انہوں نے اصل ترجمہ کو متن بنایا تھا، اور شرح میں اس کی تصحیح کی تھی۔

لیکن ظاہر ہے کہ درس کے وقت میں طالب علم کے پاس وہی پرانا ترجمہ ہوتا ہے، اور

الجھنیں پیش آتی رہتی ہیں، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ از سرنو اس کا عربی ترجمہ کر کے شائع کیا جائے۔ یہ خدمت ندوۃ العلما لکھنو سے مولانا سلمان حسنی ندوی صاحب نے اب سے کچھ مدت پہلے انجام دی تھی، انہوں نے نئے اسلوب میں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا، تاہم درس کے حلقوں میں پرانا ہی ترجمہ جاری رہا، اور ناشرین اسے ہی چھاپتے رہے۔

اب حضرت مفتی صاحب نے ان دونوں ترجموں کو سامنے رکھ کر تیسرا ترجمہ کیا، جو ماشاءاللہ ہر لحاظ سے عمدہ اور مکمل ہے، ترجمہ کی زبان فصیح اور سلیس ہے، اسلوب دلنشیں ہے، ذیلی عنوانات کا اہتمام کیا ہے، ہر پیراگراف نئی سطر سے شروع کیا ہے، اس طرح اس کو پڑھنا اور اس سے استفادہ کرنا نہایت آسان ہو گیا ہے۔

اور بڑا کام یہ کیا ہے کہ مختصر حواشی اور تعلیقات سے اس کی ہلکی پھلکی گویا شرح کر دی ہے، مشکل الفاظ کے معانی تحریر کئے ہیں، ضرورت محسوس ہوئی ہے تو عربی الفاظ کے ترجمے اردو میں بھی کر دیئے ہیں۔

شاہ صاحب نے کتاب میں جن آیات کو بطور اشارہ کے اختصار کی غرض سے لکھا ہے، ان کے حوالے سورہ اور آیت نمبر کے ساتھ درج کر دیئے ہیں، حدیثوں کے حوالے ذکر کئے ہیں، جن اصول وقواعد کی شاہ صاحب نے اختصار کے خیال سے مثالیں نہیں پیش فرمائیں کہ قرآن سے مناسبت رکھنے والا خود سمجھ لے گا، ان کی مثالیں مختصر الفاظ میں تحریر کر دی ہے، اسی طرح کتاب میں جن علما اور مفسرین کے نام آئے ہیں، ان کا مختصر لفظوں میں تعارف کرا دیا ہے۔

غرض یہ ترجمہ اصل میں متن ہی ہے، لیکن اس کے مفید حواشی نے اسے گویا حل کر دیا ہے، اس طرح اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے بغایت مفید ہو گئی ہے۔

یہ کتاب اس لائق ہے کہ پرانے ترجمہ کے بجائے اسے نصاب میں رکھا جائے، مفتی صاحب کی یہ کوشش مشکور ہے، اور موصوف تمام اہل درس کے شکریے کے مستحق ہیں۔

ماخذ: المآثر۔ فروری، مارچ، اپریل (۱۹۹۹ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : صدیق اکبر۔ایک انسان کامل
ترجمہ وتلخیص : پروفیسر مولانا بدرالدین الحافظ سابق صدرشعبہ عربی بنارس ہندویونیورسٹی
ناشر : مکتبہ وحیدیہ ۵۳۷ ذاکرنگراوکھلا، نئی دہلی ۲۵
کتابت وطباعت : عمدہ
قیمت : ندارد

یہ کتاب مشہورمصری ادیب عباس محمودالعقاد کی کتاب ’’عبقریۃ الصدیق‘‘ کا ترجمہ اور اس کی تلخیص ہے۔ عباس محمود نے عبقریۃ کے عنوان سے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارے فاضل مترجم کوان عبقریات سے خاص دلچسپی اورمصنف کے ساتھ خاصا حسن ظن ہے، اسی دلچسپی اورحسن ظن کا نتیجہ ہے کہ موصوف نے ’’عبقریۃ الصدیق‘‘ کوترجمہ وتلخیص کے لئے منتخب کیا، لیکن جن وجوہ سے انہوں نے دلچسپی اورحسن ظن کا اظہار کیا ہے، افسوس ہے کہ تبصرہ نگارکوان سے اتفاق نہیں ہے۔ کتاب کی اورمصنف کی جوخوبیاں فاضل مترجم نے اپنے مقدمہ میں ذکر کی ہیں، ان میں واقعیت کم ہی نظر آتی ہے۔ عباس محمودعقاد نے حضرت صدیق اکبررضی اللہ عنہ کی عبقریت کو بیان کرنے کے لئے جوطرزتعبیر اختیارکی ہے، وہ عجیب نامانوس سی ہے، اس پراسلامی علامت کم، اوراستشراق کا اثر زیادہ ہے، اس سے صدیق اکبرکی شخصیت بجائے نمایاں ہونے کے کچھ دبی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے، اس وقت ہمارا موضوع عقاد کی کتاب پرتبصرہ نہیں ہے، ورنہ اس کی تفصیل قدرے عرض کی جاتی، یہاں مقصد کتاب کے ترجمہ وتلخیص پرتبصرہ کرنا ہے۔

کتاب جب ہاتھ میں آئی تو اس حسن ظن کے ساتھ مطالعہ شروع کیا کہ فاضل مترجم عربی ادب پراچھی دسترس رکھتے ہیں، شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی کے صدرگرامی قدررہے

ہیں، اردو کا بھی نکھرا ہوا ذوق رکھتے ہیں، لیکن جب مطالعہ شروع کیا تو ایسی عبارتیں نظر سے گزرنے لگیں جو پیچیدگی، اغلاق اور تعقید معنوی سے لبریز تھیں، قلم کی ہکلاہٹ دیکھ کر حیرت ہونے لگی کہ عربی اور اردو کا ادیب ایسی ناقابل فہم عبارت لکھتا ہے، بعض جگہ ایسا محسوس ہوا کہ ترجمہ ہی غلط ہوگیا ہے، لیکن اصل کتاب سامنے نہ تھی، اس لئے فیصلہ کرنا دشوار تھا، خیال ہوتا تھا کہ شاید عقاد صاحب اسم بامسمی ہوں کہ وہ خود بعض دوسرے مصری ادیبوں کی طرح دشوار اور پیچیدہ عبارت لکھتے ہوں۔ پھر ایک جگہ سے اصل کتاب ''عبقریۃ الصدیق'' منگوائی، اور ترجمہ کا اصل سے مقابلہ کیا تو اندازہ ہوا کہ:

غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

عقاد صاحب اتنے پیچیدہ نویس نہیں ہیں، جتنی پیچیدگی مترجم صاحب نے پیدا کردی ہے، یہ پیچیدگی زیادہ تر اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ مترجم نے اصل عبارت کے مفہوم کو کماحقہ سمجھا نہیں۔

مثال کے لئے عقاد کے مقدمہ کی ایک عبارت ملاحظہ فرمائیے۔ عقاد نے لکھا ہے کہ مصر کے مشہور ادیب استاذ احمد امین نے ہیکل پاشا کی کتاب ''الصدیق'' اور عقاد کی ''عبقریہ عمر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

"بقیت مسئلة هامة! کثیرا ما اختلفت وجهة نظر الکتاب فیها وهی ان العظیم مهما عظم له خطآت والا ماکان انسانا والعصمة لله وحده، فهل واجب المترجم له ان یعرض لکل ذالک فی تفصیل فیذکر کل ماله ویشید بذکره ویذکر خطآته وینقدها...... اوواجبه فقط تجلیلة نواحی العظمة والتاویل والدفاع الدائم عن نواحی الخطا؟.

انا الی الرای الاول اوجب متاسیا بابی بکر وعمر نفسیهما والمؤلفان الفاضلان الی الرای الثانی امیل.

والواقع اننا الی الرای الثانی امیل کما قال زمیلنا الاستاذ ولکنه المیل الذی نحده بما قدمناه من حدود نحتج له بما بیناه من اسباب". (ص۱۲)

مطلب یہ ہے کہ یہاں ایک اہم مسئلہ اور ہے، اوراس میں مصنفین کے نظریے مختلف ہیں، وہ مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی بڑا آدمی خواہ کتنا ہی بڑا ہو، اس میں کچھ خامیاں اور غلطیاں بھی ہوتی ہیں، ورنہ وہ انسان ہی نہ ہوگا۔ تو کیا سوانح نگار کی ذمہ داری یہ ہے کہ عیب وہنر سب کو تفصیل سے بیان کرے، خوبیوں کو سراہے، اور خامیوں پر نقد کرے؟ یا یہ کہ صرف اس کی عظمتوں کو بیان کرے اور خطاؤں کی تاویل کرے اوران کا دفاع کرے؟۔

احمد امین کہتے ہیں کہ میں پہلی رائے کی طرف رجحان رکھتا ہوں، اور میرا یہ رجحان خود ابوبکراور عمر کی سیرت اوران کے طریقۂ کار کی پیروی اور اقتداء کے اثر سے ہے، ہیکل پاشا اور عقاد کا رجحان دوسری رائے کی جانب ہے۔

عقاد اس پر لکھتے ہیں کہ واقعہ یہی ہے کہ ہمارا رجحان دوسری ہی رائے کی جانب ہے، جیسا کہ استاذ احمد امین نے فرمایا، لیکن اس رجحان کے کچھ حدود وآداب ہیں جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اور کچھ اسباب ہیں جن سے ہم اس رائے کے حق میں استدلال کرتے ہیں۔

یہ اس عبارت کا صاف ستھرا اور واضح مفہوم ہے، لیکن فاضل مترجم نے اس کو کیا سمجھا اوراس کو کس طرح پیش کیا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

> ’’اس سلسلے میں میرے فاضل محقق دوست احمد امین نے میری کتاب ’عبقریہ عمر‘ اور ہیکل پاشا کی کتاب ’الصدیق‘ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک مسئلہ تمام مصنفین کے لئے نہایت اہم ہے، اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی انسان ہو، وہ جتنا بھی عظیم تر ہوتا جائے گا، اس کے ساتھ غلطیاں اور خطائیں بھی ہوں گی، ورنہ وہ انسان ہی نہیں ہوسکتا، عصمت تو صرف اللہ کے لئے ہے[۱] تو کیا ہر سوانح نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان باتوں کو تفصیل سے بیان کرے، اس میں تعریفی پہلو بھی آئیں، اور خطاؤں پر بھی تنقید ہو؟....... یا ایک سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ عظمت کے تمام گوشوں کو اجاگر کرے اور خطاؤں کا مکمل دفاع کرے‘‘؟۔

یہاں تک ترجمہ غنیمت ہے، صرف خط کشیدہ جملہ محاورہ اور فصاحت سے گرا ہوا ہے، اور ترجمہ کے لحاظ سے بھی ناقص ہے، لیکن اس کے بعد کا ترجمہ بالکل ہی ناقابل فہم ہے، اگلی عبارت بھی احمد امین ہی کی ہے، مگر فاضل مترجم نے اسے عقاد کی عبارت سمجھ لیا ہے، فرماتے ہیں:

> ’’میری رائے میں فاضل استاذ کی پہلی رائے درست ہے، خاص طور پر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر کے حق میں، اور دوسری رائے کے حق میں ہمارا میلان تو ہے مگر کچھ حدود کے ساتھ‘‘۔ (ص ۱۳، ۱۴)

احمد امین نے سوانح نگاری کے سلسلے میں دو نظریات ذکر کئے ہیں، ایک یہ ہے کہ صاحب سوانح کے تمام معائب ومحاسن کو تفصیل سے ذکر کیا جائے، دوسرے یہ کہ محاسن کو بیان کیا جائے اور معائب کی تاویل کی جائے اور ان کا دفاع کیا جائے۔ اور بتایا کہ خود ان کا رجحان پہلی رائے کی جانب ہے، کیوں کہ ان کے خیال میں یہی طریقۂ کار حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی سیرت سے اخذ ہوتا ہے۔ احمد امین اپنے اس مزعومہ طریقہ کے اختیار کرنے میں صدیق وعمر کی پیروی سمجھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہیکل پاشا اور عقاد دوسری رائے کے حق میں رجحان رکھتے ہیں۔ لیکن مترجم نے اس کا نقشہ ہی الٹ دیا، وہ سمجھے کہ عقاد کے خیال میں احمد امین کی بیان کردہ پہلی رائے درست ہے، یعنی معائب ومحاسن دونوں کا بیان کرنا سوانح نگار کی ذمہ داری ہے، بالخصوص حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے حق میں تو یہی رائے متعین ہے کہ ان کے حالات کو لکھنے والا ان کے عیب وہنر کو منظر عام پر لائے۔ (استغفر اللہ)

یہ غلط در غلط بات ہے جس سے عقاد کا دامن پاک ہے انہوں نے عقاد کے ذمہ لگا دی۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

فہم اور ترجمہ کی غلطیوں کے حیرت ناک نمونے اس کتاب میں بکثرت ہیں، بلکہ تقریباً ہر صفحے پر ہیں۔ ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو، عقاد کی عبارت ہے:

”عاش ابو قحافه حتى رأى ابنه خليفة يرفع صوته على اناس لم يكن فى مكة ارفع منهم صوتاً واعظم خطراً“. (ص ۱۵)

مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کے والد گرامی حضرت ابوقحافہ نے طویل عمر پائی، انہوں نے وہ وقت بھی دیکھا کہ ان کے فرزند وقت کے خلیفہ ہیں، اور ان کی آواز ایسے لوگوں پر بھی بلند ہو رہی ہے، جن سے زیادہ بلند آواز والا اور جن سے زیادہ عزت وعظمت کا مالک مکہ میں کوئی اور نہ تھا۔

یہ صاحب جن کے اوپر حضرت ابوبکر کی آواز کے بلند ہونے کا تذکرہ عقاد نے کیا ہے، اپنے وقت کے سردار مکہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ہیں۔ چنانچہ چند سطروں کے بعد ان کے واقعہ کو عقاد نے لکھا ہے۔

اس تفصیل کے پس منظر میں فاضل مترجم کا ترجمہ ملاحظہ ہو، بات کتنی بدل گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''صدیق اکبر کے والد بزرگوار ابوقحافہ آپ کی خلافت تک بقید حیات رہے، اور مکہ معظّمہ میں ان سے زیادہ بلند آواز اور خطرناک صورت کا کوئی آدمی نہ تھا''۔

خط کشیدہ فقرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''**لم یکن فی مکة ارفع منهم صوتا واعظم خطراً**'' کا [ترجمہ] کیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ **منهم** ضمیر کا مرجع ابوقحافہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ نیز اس ترجمہ کی صورت میں اس جملہ کا تعلق **علی اناس** سے کیا ہوگا؟ اور **اعظم خطراً** کا ترجمہ ''خطرناک صورت'' کیوں کر ہوگا؟۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے جس واقعے کی طرف اوپر عقاد نے اشارہ کیا ہے، اسے چند سطروں کے بعد ذکر کیا ہے۔ عبارت یہ ہے:

''**دعا الخلیفة بابی سفیان لامر انکره، فاخذته الحدة التی کانت تراجعه فی بعض ثورات نفسه**''. (ص۱۶)

خلیفہ نے حضرت ابوسفیان کو ان کے کسی معاملہ میں طلب فرمایا، جو انہیں پسند نہ تھا، اس سے ان کے کلام میں قدرے تیزی آ گئی، جو بعض اوقات ہیجان طبع کے وقت ان پر طاری ہو جایا کرتی تھی۔

اس مضمون کو مترجم نے یوں ادا کیا ہے:

> ''ایک دن صدیق اکبر نے حضرت ابوسفیان کو بلایا، انہوں نے تعمیل حکم میں کچھ تأمل کیا۔ (غالبا یہ **لامر انکره** کا ترجمہ ہے) اس پر صدیق اکبر ناراض ہو گئے، کلام میں ترشی آ گئی، حالانکہ وہ ذرا سا احساس ہونے پر ندامت کی طرف جھک جاتے تھے۔ (یہ غالباً **کانت تراجعه** کا ترجمہ ہے) اور نفس سے محاسبہ کرتے تھے۔ (یہ مفہوم **فی ثورات نفسه** سے شاید

اخذ کیا ہو) **انالله وانا اليه راجعون**

اسی واقعہ میں فاضل مترجم نے ایک جملہ "**لقد عدوت طورک**" کا ترجمہ کیا ہے "تونے اپنے طریقۂ کار سے دشمنی کی"۔ حالانکہ **عدوت** کے معنی تجاوز کرنے کے ہیں، مترجم نے اسے عداوت سے ماخوذ سمجھا، لیکن اس کے لئے **عادیت** کا لفظ آتا ہے۔

یہ کتاب اغلاط کا عجائب خانہ ہے، کوئی صفحہ ترجمہ کی غلطی سے شاید ہی خالی ہو، اور غلطیاں بھی ایسی کہ ناقابل توجیہہ! بعض ابواب تو اول سے آخر تک اغلاط کا مجموعہ ہیں۔

عقاد نے ایک عنوان قائم کیا ہے۔ "**مفتاح شخصيته**" اس عنوان کے تحت عقاد نے دور کی کوڑی اٹھانے کی کوشش کی ہے، جو خود محل نظر ہے، اس پر ترجمہ کی غلطیوں نے مزید سیاہی پھیر دی ہے، ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں:

"كان ابوبكر كما رأينا عصبى المزاج ،دقيق البنية خفيف اللحم صغير التركيب، تكوين يغلب على اصحابه احد امرين ان كانوا من كرام النحيزة فهم مطبوعون على الاعجاب بالبطولة والايمان بالابطال. وان كانوا من لئام النحيزة فهم مطبوعون على الحسد والكبر وهما ضرب من الاعجاب المعكوس يودى اليه انعكاس الطبعية".

عقاد کے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مزاج میں حمیت تھی، دبلے بدن اور کم گوشت والے تھے، جسمانی لحاظ سے مختصر تھے، مزاج اور جسم کی یہ وہ بناوٹ ہے کہ اس طرح کے لوگ اگر طبعاً شریف ہوں تو کمالات سے متأثر ہونا اور صاحب کمال پر دل سے ایمان رکھنا ان کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے، اور اگر یہ لوگ رذیل اور پست ہوں تو ان کی سرشت میں حسد اور مکروفریب راسخ ہوتا ہے، حسد اور مکروفریب درحقیقت ایک "تأثر معکوس" ہے، جو ان کی الٹی طبیعت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔

اب عقاد کے اس بات کی ترجمانی مترجم کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے، اور اسے عقاد کی عبارت میں تلاش کیجئے۔ لکھتے ہیں:

"صدیق اکبر کے مزاج میں خاندانی اور وراثتی استقلال تھا، وہ جسمانی لحاظ سے کم

گوشت والے ایک معمولی بدن کے انسان تھے، تو ناقدین کے ذہن میں اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس معمولی جسم میں وہ حیرت انگیز حد تک بہادر کیسے تھے؟ کیا قوی الجسم اور بہادر اسی شکل کے ہوتے ہیں؟۔

اس سلسلے میں یہاں دوقسم کے مفکرین سامنے آتے ہیں، اگر وہ شریف الطبع ہیں، تو آپ شخصیت سے بہرحال متأثر ہوں گے، اوران کی شجاعت ان کی نگاہ میں اعلی مقام حاصل کرے گی، اور اگر یہ دنی اور نچلی طبیعت کے لوگ ہیں تو ان میں حسد ومکر پیدا ہوگا، اور اس کے نتیجے میں وہ طبعی الجھن اور فکرمندی کے شکار رہیں گے''۔ (ص۴۳)

اللہ جانے یہاں دوقسم کے مفکرین کہاں سے آگئے؟۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

ایک لطیفہ اور ملاحظہ ہو، عقاد نے غیر معمولی اصحاب کمال یعنی عبقری افراد کی کچھ علامات ایک اطالوی مفکر کے حوالے سے نقل کی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

''فيكون العبقری طويلا بائن الطول اوقصيرا بين القصر ويعمل بيده اليسریٰ او يعمل بكلتا اليدين ويلفت النظر بغزارة شعره اوبنزارة الشعر على غير المعهود فی سائر الناس''. (ص٦٦)

مطلب یہ ہے کہ عبقری کبھی غیر معمولی لمبے قد کا ہوتا ہے، اور کبھی بہت پستہ قد ہوتا ہے، وہ اپنے بائیں ہاتھ یا دونوں ہاتھ سے کام کرتا ہے، اس کے بال عام لوگوں کے برخلاف کبھی غیر معمولی طور پر اتنے زیادہ یا کبھی اتنے کم ہوتے ہیں کہ نگاہیں ان پر بے ساختہ اٹھتی ہیں۔

اب ملاحظہ ہو، فاضل مترجم نے اسے کیا بنادیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مثلاً ایک عبقری واضح طور پر طویل القامت ہوگا، یا واضح طور پر پستہ قد ہوگا، بائیں ہاتھ سے کام کرتا ہوگا یا دونوں ہاتھ سے''۔

یہاں تک تو ترجمہ صحیح ہے، لیکن **''يلفت بغزارة شعره او بنزارة الشعر على غير المعهود فی سائر الناس''** کے ترجمہ میں عجب گل کھلایا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اور کسی سمت دیکھنے میں اپنے بالوں کی کثرت سے بھی کام لے گا، اور بلا لحاظ سب

لوگوں پر نظر ڈالے گا‘‘۔ (ص ۶۰)

خدا جانے اس چیستاں کا کیا مطلب ہے؟۔

مولانا بدر الدین الحافظ ہمارے کرم فرما ہیں، انہیں ہمارے تبصرے سے تکلیف تو ضرور ہوگی، تاہم ان سے گزارش ہے کہ ترجمانی اور تلخیص کے لئے مزید غور وفکر اور محنت سے کام لیں۔ ہاں یہ بھی عرض ہے کہ عقاد جیسے مشکوک ادیبوں کی تحریروں کا اگر ترجمہ نہ ہو تو امت کے حق میں یہی بہتر ہے۔

ماخذ: المآثر۔ اگست، ستمبر، اکتوبر (۱۹۹۹ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

یہ تعبیر غلط ہے۔ عصمت اللہ کی صفت نہیں ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کی صفت ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ عصمت ہوگی تو انسان، انسان نہ رہے گا۔ انبیاء کرام معصوم ہونے کے ساتھ انسان ہی ہیں۔

نام کتاب : مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینے میں
مؤلف : مفتی محمد ڈینڈ رولوی
ناشر : دارالعلوم جامعہ نذیریہ کاکوسی شمالی گجرات
کتابت وطباعت اور کاغذ : اعلی درجہ کا معیاری
قیمت : ندارد

ہندوستان کے ظلمت کدہ میں اسلام کی روشنی کس طرح پہونچی، اور کن کن مرحلوں سے گزری، کہاں کہاں چمکی، اور کب کب بجھی؟ اور بجھنے کے بعد کس کس طرح دوبارہ چمکی، کن کن بزرگوں سے اللہ تعالی نے دین کی خدمت لی، ان کے اثرات ماضی میں کیا تھے، اور اب تک کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں؟ یہ ایک طویل اور دلچسپ داستان ہے، جو تابناک بھی ہے اور عبرت خیز بھی! اس میں درس استقامت بھی ہے اور جوش وولولہ بھی! تاریخ کے صفحات نے اس دلچسپ داستان کے بہت سے ٹکڑوں کو محفوظ رکھا ہے، اور بہت سے ٹکڑے فراموش بھی کردیئے ہیں۔ بہت سے اصحاب حوصلہ ماضی کے تہ بہ تہ ملبوں کو کرید کران بزرگوں کے کارناموں کو حال کی روشنی میں لانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان کا حوصلہ قابل داد ہے اور لائق احترام۔

صوبہ گجرات سمندر کے ساحل پر آباد ہے، یہاں اسلام کی روشنی اسلام کے ابتدائی ادوار میں ہی چمکی تھی، اور اس کے بہت سے علاقے نور اسلام سے خوب منور ہوئے، بڑے بڑے علما ومحدثین اور مشائخ وصوفیا کے انفاس قدسیہ سے یہ صوبہ معطر ہوا، غیر مسلم قومیں بکثرت مسلمان ہوئیں۔

انہیں نومسلموں میں ایک قوم وہ ہے جس کے اسلام لانے اور عہد بعہد ان کی ہدایت و ضلالت کی داستان کا یہ کتاب مرقع ہے۔ اس قوم کا نام مصنف کتاب نے 'مومن قوم' بتایا ہے،

بمبئی وغیرہ میں اس قوم کے افراد بکثرت ہیں، جن کا نمایاں امتیاز دین داری اور دیانت داری ہے۔ بمبئی میں عام زبان میں اسے ''چلیا'' کہا جاتا ہے، اس قوم کا تعلق جماعت تبلیغ سے بہت گہرا ہے، مشہور مبلغ حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری علیہ الرحمہ جن کے خطابت سے بے شمار لوگ دین کی راہ پر لگے، اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ یہ قوم کس بزرگ کے ہاتھ مسلمان ہوئی؟ پھر کیوں کر جہالت کے دریا میں ڈوبی؟ پھر کس بزرگ کے طاقتور ہاتھوں اور زبردست روحانیت سے متاثر ہوکر جہالت وضلالت کے دریا سے ابھری؟ اور پھر کن لوگوں نے ضلالت کے طوفانوں سے بچا بچا کر اسے راہ مستقیم پر برقرار رکھا؟ اور دین داری میں پختہ کرتے رہے، ان کی مفصل داستان مصنف نے نہایت تحقیق کے ساتھ بیان کی ہے۔

اس کتاب میں ان بزرگوں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ سب سے پہلے بزرگ جنہوں نے اس قوم کو اسلام کی روشنی بخشی، وہ سید کبیر الدین حسن علیہ الرحمہ ہیں، جن کے متعلق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ:

> ''ان سے بکثرت کرامات اور خرق عادت کا ظہور ہوتا تھا، اور ان کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ ان کے ہاتھ پر بکثرت کفار مسلمان ہوئے، ممکن نہ تھا کہ کسی کو وہ اسلام کی دعوت دیں اور وہ مسلمان نہ ہو، جماعت کی جماعت ہندوؤں کی آتی تھی اور مشرف بہ اسلام ہوکر لوٹتی تھی''۔

مومن قوم بھی اسی طرح مسلمان ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان پر ان صوفیاء ومشائخ کا بڑا احسان ہے، جن کی روحانیت کے آفتاب سے کفر وشرک کی ظلمت شب اچانک کافور ہوجایا کرتی تھی، مومن قوم کے مسلمان ہونے کی داستان تو تبصرہ ہی میں سن لیجئے، باقی مفصل داستان اصل کتاب میں پڑھئے، لکھتے ہیں:

> ''اس کا واقعہ مومن قوم میں بطریقۂ تواتر مشہور ہے کہ ہندوؤں کا ایک قافلہ کاشی کی تیرتھ گاہ کی جاترا کے لئے جارہا تھا، ان قافلہ والوں سے سید کبیر الدین نے فرمایا کہ اس قدر دور جانے کی ضرورت کیا ہے؟ میں تمہیں تمہارے کاشی کی تیرتھ گاہ کی زیارت یہیں سے کرادوں، بشرطیکہ تم اسلام مذہب قبول کرلو، جاتریوں نے منظور کیا، آپ نے فرمایا کہ تیرتھ گاہ کی نشانیاں

> اور علامتیں نامزد کرلو، اس کے بعد آپ نے اپنی کرامت سے جاتریوں کو تیرتھ گاہ کی زیارت کرا دی۔ چنانچہ تمام جاتریوں نے مذہب اسلام قبول کیا اور مومن سے موسوم اور مومنہ سے مشہور ہوئے''۔ (ص۵۹)

اسلام لانے کے بعد عرصہ تک یہ قوم گمراہی کے دلدل میں پھنسی رہی، اس دلدل سے انہیں بزرگ کی اولاد میں ایک روحانی شخصیت سید پیر مشائخ علیہ الرحمہ نے نکالا، انہوں نے دیوان مشائخ کے نام سے ایک بہت مفصل کتاب منظوم مرتب کی، جس میں اسلام کی تمام تعلیمات کا تفصیلی بیان ہے، یہ کتاب گجری زبان میں ہے، جو اردو سے بہت قریب ہے۔ مصنف نے اس کے اقتباس بکثرت نقل کئے ہیں، یہ اشعار بہت مؤثر اور دردوسوز سے لبریز ہیں، اس کتاب نے مومن قوم میں ایک خوشگوار انقلاب بر پا کیا۔ یہ بزرگ اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کے ہیں۔ صرف ۴۲ر سال کی مختصر عمر میں انہوں نے مومن قوم کو دین کی سچی راہ پر لا کھڑا کیا۔

ان کے بعد ماضی کی تہیں جس قدر کم ہوتی گئیں، حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ سامنے آتے گئے۔ آخر میں مصلح قوم حضرت مولانا نذیر احمد صاحب علیہ الرحمہ اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری کا مفصل تذکرہ ہے۔

یہ کتاب تاریخ اقوام میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، اور لائق مطالعہ! اس سے قوموں کی نفسیات، ان میں کام کرنے کا طریقہ، مخالفین کی ریشہ دوانیاں، نصرت حق اور اہل حق کے غلبہ کا ایک دلآویز مرقع سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالی اس خدمت کو قبول فرمائے، اور تمام مسلمانوں کے لئے عموماً اور قوم مومن کے لئے خصوصاً مفید بنائے۔

ماخذ: المآثر۔ نومبر، دسمبر، جنوری (۱۹۹۹۔۲۰۰۰)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : افادات صدیق۔ ملفوظات حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد
مرتب : مولانا مفتی محمد زید صاحب
ناشر : ادارہ افادات اشرفیہ ہتورا باندہ
صفحات : ۴۲۴
طباعت : عمدہ
قیمت : ۱۰۰ روپئے

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی علیہ الرحمہ اس دور اخیر میں علم وفضل، تقوی وطہارت، سخت کوشی ومجاہدہ، فنائیت وتواضع اور خلوص وللٰہیت کے وہ پیکر جمیل تھے جس کا اعتراف سب نے کیا ہے، ان صفات حمیدہ کا اثر یہ تھا کہ وہ محبوب القلوب بن گئے تھے۔ وہ ظاہراً ایک فقیر بے نوا تھے، لیکن جس طرف نکل جاتے نگاہیں فرش راہ ہوتیں اور انسانوں کا جم غفیر ان کے جلو میں ہوتا، اور وہ ان سب کے درمیان اس طرح رہتے جیسے یہ سارا ہجوم یہ ساری خلقت ان کے لئے نہیں کسی اور کے لئے اکٹھا ہوئی ہیں، وہ اس دور میں اسلام کی حقانیت کے نشان اور دین کی ابدیت کی برہان تھے، وہ ظاہر وباطن ہر اعتبار سے صدیق تھے، سچائی، خلوص اور تواضع وبے نفسی ان کی خاص پہچان تھی، وہ جو کچھ بولتے تھے وہی کرتے تھے، اور جو کچھ کرتے تھے وہی بولتے تھے، ان کا ظاہر وباطن بالکل یکساں تھا، وہ اللہ کے مخلص بندے تھے، اور اخلاص کی زبان سے بولتے تھے۔

یہ کتاب ان کے ان ملفوظات وارشادات کا مجموعہ ہے، جن کا تعلق طلبہ وعلما اور مدارس ومکاتب سے ہے، ان کے تلمیذ خاص مولانا مفتی محمد زید صاحب جو ہر وقت مدرسہ میں ان کے ساتھ حاضر باش رہا کرتے تھے، وہ ان ملفوظات کو قلم بند کرتے رہتے تھے، اور پھر موقع بموقع

انہیں دکھالیا کرتے تھے، انہوں نے ملفوظات کے ایک بڑے ذخیرہ سے منتخب کرکے یہ کتاب تیار کی ہے، اس کتاب کو پڑھ کر حضرت مولانا کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

علما وطلبہ اور مدارس کے ذمہ داروں کے لئے یہ کتاب ایک بیش بہا نعمت ہے، اور ”از دل خیزد بر دل ریزد“ کی بہترین مصداق ہے۔ کتاب کا ہر ہر لفظ سوز دل میں ڈوبا ہوا ہے۔ بڑی سعادت کی بات ہوگی کہ یہ کتاب ہر طالب علم، ہر عالم اور ہر مدرس کے ہاتھ میں ہو، اور اس کا مسلسل مطالعہ کرتے رہیں، تاکہ آنکھوں کی راہ سے دل میں اس کے مخلصانہ مضامین اترتے رہیں۔

مولانا محمد زید صاحب شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ مفید کتاب مرتب کی اور اسے شائع کیا۔

ماخذ: المآثر۔ نومبر، دسمبر، جنوری (۱۹۹۹۔۲۰۰۰)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : حیات ابوالمآثر
مرتب : ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی
ناشر : المجمع العلمی، مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مئو
صفحات : ۷۳۲
قیمت : درج نہیں

۱۰؍رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ کی شام کو جب آفتاب غروب ہورہا تھا، ٹھیک اسی وقت آسمان علم وفضل کا بھی ایک آفتاب تاباں غروب ہورہا تھا، ایک مسافر جو زندگی بھر علم وتحقیق کی راہوں پر چلتا رہا، ان راہوں پر بھی جن پر قافلے مسلسل گزرے ہیں، جو جانی پہچانی راہیں ہیں، اوران راہوں پر بھی جن کے آثار ونشان مٹ چکے ہیں، جن پر کوئی بھولا بھٹکا مسافر بھی شاید ہی گزرا ہو، اس مسافر نے ان ناپید راہوں کو تلاش کیا، ان کے آثار ومعالم کو نمایاں کیا، چلنے والوں کے لئے انہیں ہموار کیا، ان پیچیدہ راستوں کو تلاش کرتا کرتا یہ مسافر بوڑھا ہوگیا، تھک گیا، عمر کی ترانوے منزلیں طے کرکے اب کمر کھولنے کی تیاری کررہا تھا اور بالآخر علم وتحقیق اور فضل وکمال کی دنیا کو جگمگا کر روپوش ہوگیا۔

جب یہ مسافر زندگی کی منزلیں طے کرتا رہا لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، جب اس نے کمر کھول دی دی تو اس کے نقوش پا کی تلاش ہوئی، قدردانوں نے مطالبہ کیا کہ ترانوے منزلوں پر پھیلے ہوئے اس سفر کی داستان کاغذ کے صفحات میں سمیٹ دی جائے، تاکہ دیکھنے والے بیک نگاہ اسے دیکھ سکیں۔ اس طویل سفر کے نقوش وآثار کو تلاش کرنا ایک مشکل کام تھا، مگر اللہ تعالی جس کے لئے آسان فرمادیں اور واقعی اللہ نے آسان فرمادیا۔

اس مسافر علم وتحقیق یعنی محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا علامہ حبیب الرحمان

الاعظمی نوراللہ مرقدہ کے نواسے جناب مولانا ڈاکٹر مسعو احمد الاعظمی کے لئے اللہ نے یہ کوہ کنی آسان فرمادی، مولوی مسعود احمد سلمہ اس راہ میں نو وارد ہیں، اور اپنے علمی سفر کا آغاز کررہے ہیں، وہ اپنے نانا جان کے نقوش پا کی تلاش میں نکلے، قدرت نے یاوری کی، غیب سے ان کے لئے انتظام ہوئے، اور انہوں نے ایک مکمل جامع اور نہایت محققانہ تذکرہ ’’حیات ابوالمآثر‘‘ کے نام سے مرتب کرکے چاہنے والوں کے ہاتھوں میں دیدیا، مرتب نے سچ لکھا ہے کہ:

’یہ جو کچھ آپ کے سامنے ہے وہ ’رحمان‘ کا کرم اور اس ’حبیب‘ کی کرامت ہے‘۔ (ص ۲۶)

اللہ کا کرم جب اہل اللہ کی کرامت کی صورت اختیار کرتا ہے تو ایسے ہی کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا اعظمی علیہ الرحمہ نے اپنی حیات میں فرمایا تھا کہ ’’میری سوانح عمری میرے خطوط سے لکھی جاسکتی ہے‘‘ (ص ۲۷)۔ یہ بات مولانا مسعود احمد صاحب سلمہ کے دل میں بیٹھ گئی، اللہ تعالی نے انہیں ایسا موقع عطا فرمایا اور ایسی فرصت بخش دی کہ حضرت کے لکھے ہوئے خطوط اور چھوٹی بڑی پرچیاں جن پر حضرت نے مختصر اشارات اور اجمالی چیزیں لکھ رکھی تھیں، ان میں بیشتر تحریر ان کی نگاہ کے سامنے سے گزر گئیں۔ ہوا یہ کہ حضرت کے وصال کے بعد ’’مکتبہ مولانا حبیب الرحمان الاعظمی‘‘ کے نام سے ایک وسیع کتب خانہ تعمیر کیا گیا، تعمیر مکمل ہوگئی تو حضرت کا سرمایۂ علمی جو بلند پایہ علمی و تحقیقی کتابوں، خود حضرت کی تصانیف، مسودات اور خطوط پر مشتمل تھا، اسے سلیقہ سے اس مکتبہ میں منتقل کرنے کا مرحلہ سامنے آیا، اس مرحلہ میں مولانا مسعود احمد صاحب علی گڑھ میں اپنی تعلیم کی تکمیل کرکے گھر آچکے تھے، اور ابھی کوئی علمی مشغلہ شروع نہیں کیا تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ نے اپنے صاحبزادگان مولانا ازہر رشید اور مولانا انور رشید کے ساتھ اس کام پر اپنے بھانجے کو بھی مامور کیا۔ تینوں حضرات نے بہت شوق و ذوق سے کتابوں کی منتقلی کا مرحلہ انجام کو پہونچایا۔ اس دوران مولانا مسعود احمد صاحب کے سامنے وہ تمام تحریریں آگئیں جن کی ضرورت سوانح حیات لکھنے کے لئے پڑسکتی تھی، انہوں نے بغور ان کا مطالعہ کیا، اور انہیں کی روشنی میں سوانح کی ترتیب کا کام شروع کردیا، مواد سارا موجود تھا، انہیں تصنیف کے پیکر میں ڈھالنا تھا، طبیعت باذوق تھی، ترتیب کا سلیقہ قدرت کا عطیہ ہے، ذہانت و ذکاوت موروثی ہے، مرتب ہوکر جو کتاب سامنے آئی تو ہر اعتبار سے معیاری تھی، ترتیب بھی، معلومات بھی، اسلوب نگارش بھی۔ نہ بہت مختصر، نہ اتنی مفصل کہ دیکھنے والا گھبرا کر رکھ دے۔

یہ تذکرہ نہایت مستند اور بہت باوثوق ذرائع سے مرتب کیا گیا ہے، کیوں کہ اس میں بنیادی معلومات زیادہ تر حضرت ہی کی تحریروں سے حاصل کی گئی ہیں۔

سب سے زیادہ اندیشہ اس بات کا تھا کہ آپ کی طالب علمی پر تقریباً چوتھائی صدی کا عرصہ بیت گیا ہے، اس وقت کے حالات تفصیلی طور پر شاید نہ ملیں، لیکن اللہ کی مہربانی ہے کہ اس دور کے بیشتر حالات مفصل طور پر منتشر اوراق وخطوط میں جابجا ملتے گئے، اور لائق مصنف نے جب انہیں ترتیب دیا تو دور تعلم کا بہترین مرقع تیار ہوگیا۔ کہاں کہاں پڑھا؟ کن کن اساتذہ سے پڑھا؟ کون کون سی کتابیں پڑھیں؟ ڈھونڈھنے والے کو سب کچھ اس میں مل جائے گا۔

ایک باب میں حضرت کے اساتذہ کا مفصل تذکرہ ہے، جن حضرات کے سامنے حضرت نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، وہ خود علم وفضل کے اساطین تھے، ان سے حضرت اقدس نے خوب اکتساب فیض کیا، اور مجموعۂ کمالات بن کر روشن ہوئے۔

ایک باب میں آپ کی تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں کا مفصل ذکر ہے، آپ کی زندگی کا سب سے نمایاں اور روشن دور یہی ہے۔ دارالعلوم مئو، مظہرالعلوم بنارس میں تدریس کا مختصر سا وقت گزرا، اس کے بعد آپ نے مفتاح العلوم مئو کو جو پہلے ایک معمولی مدرسہ تھا، اپنی علمی وتدریسی خدمات سے اتنا بلند کیا کہ سارے ہندوستان میں اس کا شہرہ ہوگیا، تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ چلتا رہا، اور ایک سے ایک بیش قیمت علمی وتحقیقی تحفے آپ کی بارگاہ قلم سے امت کو ملتے رہے۔

پھر آپ کے بلند پایہ تلامذہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن میں حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مئوی، حضرت مولانا منظور نعمانی، حضرت مولانا حسین صاحب بہاری، حضرت مولانا قاری ریاست علی صاحب بحری آبادی رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ دوسرے اساطین علم کا نام ہے۔

ایک مستقل باب میں حضرت اقدس کے اخلاق وعادات اور اوصاف وکمالات اور ذوق وکیفیات کو بیان کیا گیا ہے، حضرت جہاں ایک بلند پایہ محدث وفقیہ تھے، وہیں ایک صاحب دل سالک راہ طریقت بھی تھے، اللہ کے ذکر کی حلاوت سے آشنا، سالکین کے مربی، حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے دست اقدس پر بیعت تھے، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کے خلیفہ تھے۔

حضرت نے ابتداءِ عمر میں جب کہ طالب علم تھے، شاعری بھی کی ہے، اچھی غزلیں کہتے تھے، امیر مینائی مرحوم کے شاگرد وسیم خیرآبادی سے اصلاح لیتے تھے، یہ مشغلہ صرف تین چار سال رہا پھر اسے ترک کر دیا، شاعری کے نمونے بھی کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

حضرت کی شان اور علوئے مرتبت کا آپ کے بلند پایہ معاصر علما نے بلکہ آپ کے اکابر نے بھی اعتراف کیا، علمائے عرب نے بھی اور علمائے عجم نے بھی، مصنف سلمہ نے ان اعترافات کو اس سلیقہ سے اکٹھا کر دیا ہے کہ حضرت کی رفعت وعظمت نمایاں ہو جاتی ہے۔

حضرت نے 'وفیات الاعیان' کے نام سے اپنے دور میں وفات پانے والے علما اور مشائخ کی تاریخ وفات ضبط کی ہے، اور مختصر لفظوں میں ان بزرگوں کے احوال اور اپنا ان کے ساتھ تعلق بیان کیا ہے۔ یہ بیان کہیں عربی میں ہے، کہیں فارسی میں، کہیں اردو میں، جو بھی زبان لکھی ہے، نہایت فصیح وبلیغ زبان لکھی ہے۔ مشہور محدث حافظ ابن حجر کی طرح آپ بھی فطری ادیب تھے، ادب کی شان ہر جگہ نمایاں رہتی ہے، اس سے جہاں ان بزرگوں کی سنین وفات معلوم ہوتے ہیں، وہیں حضرت کی نگاہ میں جو ان کا مرتبہ تھا اور حضرت سے جو ان کا تعلق تھا وہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ مرتب نے بڑے حسن ذوق سے اس کا انتخاب کیا ہے۔

آخر میں آپ کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین ومقالات اور تصانیف کی فہرست بھی شامل کتاب کر دی ہے۔ اس طرح یہ تذکرہ حضرت محدث اعظمی کی حیات طیبہ کا ایسا آئینہ ہے جس میں حضرت کی زندگی کا ہر گوشہ اجمالاً ہی سہی دیکھا جا سکتا ہے۔ مصنف سلمہ بہت ہی لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے سوانحی ادب میں ایک بہت ہی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اللہ تعالی ان سے مزید خدمت لے۔

کتاب کی طباعت اور کاغذ کا معیار حضرت مولانا رشید احمد اعظمی کے حسن ذوق کا آئینہ دار ہے۔ ۳۲۷ صفحات کی یہ کتاب علم وادب اور تاریخ کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے، اللہ تعالی اس کی خوشبو اور اس کے حسن کو عام فرمائیں۔

ماخذ: المآثر۔ اگست، ستمبر، اکتوبر (۲۰۰۰)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : مقالات ابوالمآثر (جلد اول)
مرتب : مولانا مسعود احمد الاعظمی
صفحات : ۴۰۶
قیمت : ۱۴۰/۰۰ روپئے
ملنے کا پتہ : مدرسہ مرقاۃ العلوم پوسٹ بکس (۱) مئو ۲۷۵۱۰۱ یوپی

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نوراللہ مرقدہ علم وتحقیق کی دنیا میں رسوخ فی العلم، اصابت رائے اور تنقید صحیح کی ایک روشن علامت تھے، ایک تو خداداد صلاحیت علم اور سلامتی فکر بے مثل تھی، پھر ایسے اساتذہ کی صحبت نصیب ہوئی جو اپنے دور کے جید، ثقہ اور معتبر علما تھے، اس لئے حضرت محدث جلیل نے کبھی کوئی ایسا نظریہ قبول نہیں کیا جو منہج صحیح اور مسلک اہل سنت سے ذرا بھی منحرف ہو، اور نہ ایسے کسی نظریے سے دھوکہ کھایا، اور دینی غیرت و صلابت اس درجہ حضرت اقدس کو حاصل تھی کہ اگر فرد یا کسی جماعت نے مذہب حق سے ذرا بھی انحراف کی راہ نکالی اور اندیشہ ہوا کہ عام مسلمان اس سے مبتلائے وسوسہ ہوجائیں گے، یا اس منحرف راہ کو اختیار کرلیں گے، یا دین وشریعت کے دامن پر کچھ دھبہ آجائے گا، تو حضرت اقدس تحفظ دین وشریعت کے جذبے سے اس کا تعاقب فرماتے، زبان سے بھی اور قلم سے بھی۔

جس دور میں حضرت محدث جلیل نے اصطلاحی طالب علمی کا دور پورا کیا اور خدمت علم ودین کے لئے تدریسی اور تصنیفی میدان میں اترے تو گمراہ فرقوں اور منحرف افراد کے ساتھ بطور خاص دو ٹولیوں سے آپ کا سابقہ پڑا۔ ایک ٹولی اپنے کو اہل حدیث کہتی ہے، اور دوسری ٹولی اہل قرآن کے نام سے خود کو موسوم کرتی ہے۔ اہل قرآن کا مطلب یہ ہے کہ اسے حدیث کے حجت و برہان ہونے سے انکار ہے۔ اہل حدیث فرقہ خود آپ کے مئو میں ایک نئی طاقت بن کر ابھر رہا تھا

اور مختلف طریقوں سے عوام الناس کو اپنے دائرے میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، اس زمانہ میں اس فرقہ کو خاص کمک پنجاب سے مل رہی تھی، مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم اس تحریک میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے، ان کے علاوہ دوسرے پنجابی علما بھی ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

محدث جلیل علیہ الرحمہ نے اس فرقہ کا تعاقب کیا، اور اس کے استدلال واجتہاد کے تمام تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے، اس موضوع پر حضرت نے طالب علمی کے دور سے ہی مضامین و مقالات لکھنے شروع کر دیئے تھے، جو ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے، حضرت کی وفات کے بعد ادارہ المآثر کو مسلسل اس کا خیال رہا کہ حضرت کے علمی جواہر پارے جو قدیم رسائل کی پھٹی پرانی گڈڑیوں میں مستور ہیں، انہیں از سر نو مرتب کر کے علم کے قدردانوں کے ہاتھوں میں پیش کیا جائے۔

اللہ کو جب کوئی کام منظور ہوتا ہے تو اس کے اسباب مہیا فرما دیتے ہیں۔ حضرت مولانا کے جواہر پاروں کے جمع و ترتیب کی توفیق حضرت ہی کے اہل میں سے آپ کے نبیرۂ سعید مولانا مسعود احمد الاعظمی سلمہ کو ملی، انہوں نے اپنے خال محترم حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کے حکم سے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو پرانے بوسیدہ اوراق سے نکال نکال کر مرتب کیا۔ اہل حدیثیت (غیر مقلدیت) کی تردید اور ان کے تعاقب میں آغاز کار میں حضرت نے جو مقالات لکھے تھے، جتنے مل سکے، انہوں نے سلیقے سے مرتب کیا، اور شروع میں ایک مفید اور پر مغز پیش لفظ لکھا (جس میں تمام مقالات کا اجمالی تعارف بھی شامل ہے) اب چار سو صفحات کا یہ مجموعہ حضرت مولانا کے علم و فضل، مطالعہ و تحقیق، نقد و نظر اور نقل و درایت کا چمن زار ہے جو اہل علم کو دعوت دید و مطالعہ دے رہا ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۹ مقالات شامل ہیں، تبصرہ و تعارف کی ان مختصر سطروں میں سب کا تعارف اجمالا بھی نہیں کرایا جا سکتا، اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مقالات اس صاحب علم کے قلم سے صادر ہوئے ہیں، جس کا نام دراست و تحقیق کے لئے عالی مرتبہ سند ہے۔

ماخذ: ضیاء الاسلام۔ جولائی (۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : نصرۃ الحدیث (عربی)
مصنف : محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب الاعظمی
مترجم : مولانا مسعود احمد الاعظمی
صفحات : ۲۰۵
قیمت : درج نہیں
ناشر : دار رحاب طیبہ مدینہ منورہ
ملنے کا پتہ : مدرسہ مرقاۃ العلوم پوسٹ بکس (۱) مئو ۲۷۵۱۰۱

اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا ہے کہ مولانا کو جہاں اس فرقہ سے مقابلہ کرنا پڑا جو حدیث کی علم برداری کا مدعی بن کر فقہ کا انکار کرتا ہے، وہیں ان لوگوں کا بھی تعاقب کرنا پڑا جو صرف قرآن کریم کو حجت و برہان مانتے ہیں، اور حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ یہ فتنہ زور وشور کے ساتھ پنجاب سے اٹھا، کوئی صاحب عبد اللہ چکڑالوی تھے، انہوں نے اس فتنے کو آگے بڑھایا، اس فتنہ میں ذاتی طور پر کوئی دم خم نہ تھا، کیوں کہ انکار حدیث کا نظریہ نہ عقل کے نزدیک قابل قبول ہے، اور نہ نقل ودرایت کے لحاظ سے قابل اعتنا ہے، مگر خواہ کتنی ہی بے عقلی کی بات ہو، ہر آواز کے پیچھے چلنے والوں کی ایک ٹولی جمع ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ اس غلط نظریہ نے بھی کچھ شور کرنے والوں کو پالیا، نیاز فتح پوری، حافظ اسلم جیراج پوری، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ انہیں بے جا شور کرنے والوں میں ہیں۔ ایک اور صاحب تھے، نام ان کا غالباً مقبول حسین تھا، وہ بھی اس جرگہ میں شامل تھے، انہوں نے حق گو کے لقب کی نقاب چہرہ پر لگائی، اور ایک کتاب لکھی ’’میں منکر حدیث کیوں ہوا؟‘‘ اور اس میں حدیث اور مشائخ حدیث کے خلاف خوب زہر افشانی کی، اہل حدیث کہلانے والوں کی ہمت تو پڑی نہیں کہ حدیث کے خلاف ہفوات وخرافات بکنے والوں کے منہ میں لگام دیتے، بلکہ ان کے مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے ذاتی پریس سے اس غلیظ

کتاب کی طباعت ہوئی۔

حضرت محدث جلیل کے مطالعہ سے جب یہ کتاب گزری تو غیرت حق کو جلال آیا، اور ایک نہایت بیش قیمت علمی وتحقیقی کتاب ''نصرۃ الحدیث'' کے نام سے وجود میں آئی، اس کا مقدمہ حضرت نے اتنا نفیس، محققانہ اور دل نشیں لکھا ہے کہ اب کوئی بھی ایسا شخص جس کے سر میں ذرا بھی مغز ہوگا، انکار حدیث کی طرف رخ نہیں کرے گا۔

یہ کتاب حضرت نے اردو زبان میں لکھی تھی، عرصہ سے تقاضا تھا کہ اسے عربی زبان میں منتقل کیا جائے تا کہ وہ علماء عرب جو حضرت مولانا کے تلامذہ میں یا حضرت کے قائل ومعترف اور عقیدت مند ہیں، وہ بھی اس بیش قیمت کتاب سے مستفید ہوسکیں۔ جب حضرت کی کتابوں اور ان کے مضامین ومقالات کے جمع وترتیب کا بیڑا حضرت کے خلف الرشید مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ نے اٹھایا، تو یہ دیرینہ تقاضا بھی سامنے آیا، حضرت کے علوم کی خدمت کی تو نبیرہ سعید مولانا مسعود احمد الاعظمی کو میسر آئی، تو یہ سعادت بھی ان کے لئے آسان ہوگئی، انہوں نے محنت وہمت سے کام لے کر کتاب کا معیاری عربی ترجمہ مکمل کیا، حضرت اقدس کے شاگرد رشید شیخ محمد عوامہ نے اس پر مقدمہ لکھا، اور اپنے انتظام میں دائرہ رحاب طیبہ مدینہ منورہ سے بہت عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا۔

ماشاءاللہ! اصل کتاب کا تو کہنا ہی کیا، ہندوستان کے تمام علمی حلقوں میں نہ صرف اس کی پذیرائی ہوئی تھی بلکہ ہر طبقہ علم نے اس قلمی جہاد پر سرور انبساط محسوس کیا، اور اسے اس موضوع پر حرف آخر قرار دیا، اور یہ بالکل سچ ہے کہ اس کتاب نے منکرین حدیث کی کمر توڑ دی، اور وہ سرنگوں ہوکر رہ گئے۔ پھر اس کا ترجمہ جو مولانا مسعود احمد کے قلم سے ہوا تو اس کے بارے میں میرا احساس یہ ہے کہ اگر حضرت اقدس حیات ہوتے تو بے حد مسرور ہوتے، اور بہت دعائیں دیتے، اور کیا عجب کہ عالم برزخ میں ان کی روح خوش ہو رہی ہو۔

اللہ تعالیٰ عزیز مترجم کو جزائے خیر دے، اور ان کی علمی وقلمی صلاحیتوں کو بیش از بیش خدمت دین کی توفیق ارزانی فرمائے اور حضرت اقدس کے علوم وتحقیقات سے وابستہ رکھے، انہوں نے اہل عرب کے لئے بھی حضرت کی تحقیقات سے استفادہ آسان فرمادیا۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔ جولائی (۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : تعدیل رجال بخاری
تصنیف لطیف : محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نور اللہ مرقدہ
صفحات : ۲۳۷
ناشر : المجمع العلمی مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو
قیمت : تجویز نہیں
ملنے کا پتہ : مدرسہ مرقاۃ العلوم پوسٹ بکس (۱) مئو ۲۷۵۱۰۱

ایک بزرگ عالم کا قول ہے کہ عالم انسانیت کو سب سے زیادہ نقصان یہودیت سے پہونچا ہے، اور عالم اسلام کو سب سے زیادہ نقصان رافضیت سے پہونچا، اس فرقہ نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کا حلیہ بگاڑنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے، اس فرقہ نے اسلام پر چوطرفہ حملہ کیا ہے، لیکن علماء اسلام نے ہر محاذ پر انہیں ناکام بنایا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مدار قرآن وسنت پر ہے، اور سنت وحدیث کا صحیح ترین مجموعہ صحیح بخاری شریف ہے، اور سب جانتے ہیں کہ احادیث کی صحت کا مدار راویوں کے معتبر ہونے پر ہے، ایک رافضی عالم اٹھا، اور اس نے صحیح بخاری کے معتبر اور محکم راویوں پر سخت حملے کئے، انہیں مجروح اور ناقابل اعتبار قرار دینے کی مذموم کوشش کی ہے اور رافضیوں کی عادت کے مطابق خوب تبرا بازی کی اور قلب وزبان کی نجاست کو کاغذ کے صفحات پر پھیلایا۔ اور اسے ''رجال بخاری'' کے نام سے شائع کیا۔

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمہ کی غیرت اسلامی اور حمیت دینی نے اس کتاب کا تعاقب کیا، مولانا نے علم وتحقیق کی گہرائی میں اتر کر اتنا موثر اور حقیقت افروز جواب تحریر فرمایا کہ ایک طرف اگر اس سے ایمان تازہ ہوتا ہے، نور بصیرت عام ہوتا ہے، ذہانت اور نکتہ رسی کی دنیا روشن ہوتی ہے تو دوسری طرف شیعوں کی خیانت، ان کی دروغ بافیاں

اوران کی مضحکہ خیز قلابازیاں سامنے آتی ہیں۔ امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی علیہ الرحمہ نے اس کتاب کی تقریظ میں لکھا ہے کہ:

> ’’جواب بحمداللہ شافی وکافی ہے اورحق یہ ہے کہ اہل سنت کے ذمے ایک قرض تھا، جس کوممدوح نے ادا کیا۔ مولف رجال بخاری کی خیانت اور جہالت کی کارروائیاں جوگرفت کی ہیں وہ ہر شخص نہیں کرسکتا تھا‘‘۔

حضرت سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے تجویز فرمایا کہ:

جواب بے حد متین، سنجیدہ، مدلل اورفن وتحقیق کے اعتبار سے کافی وشافی ہے۔

علماء وطلبۂ حدیث کیلئے نہایت بیش قیمت علمی تحفہ ہے، کاغذ اور کتابت وطباعت معیاری ہے۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔فروری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : دارالاسلام اور دارالحرب
تصنیف : محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہٗ
صفحات : ۱۱۷
ناشر : مذکور سابقاً
قیمت : تحریر نہیں
ملنے کا پتہ : اوپر مذکور ہوا

ایک زمانہ تھا کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو عروج بخشا تھا۔ اہل اسلام جس طرف نکل گئے، ان کی دھاک بیٹھ گئی، حکومتیں تبدیل ہوگئیں، کفر کی سلطنتیں بکھریں، اسلام کی حکمرانی قائم ہوئی، دارالحرب تبدیل ہو ہو کر دارالاسلام بن گئے۔ پھر کچھ صدیوں کے بعد حالات بدلنے لگے۔ اہل اسلام کی وابستگی تعلیمات اسلام کے ساتھ کمزور پڑنے لگی، اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی ہوا اکھڑنے لگی، ان کی حکومتیں ٹوٹنے لگیں۔ اسلام کو اسلام کے ماننے والوں کو مٹایا تو نہ جاسکا مگر ان کی سیاسی قوت وشوکت، ضعف واضمحلال کا شکار ہوتی چلی گئی۔ اسلام چونکہ ایک مکمل نظام حیات ہے۔ یہ انسانی زندگی کے ہر حال اور ہر کیفیت سے تعرض کرتا ہے، اس لئے اس نئی صورت حال سے بھی تعرض کرنا ضروری ہ، جہاں پہلے اسلامی حکومتیں تھیں، اب ان کی جگہ کفار ومشرکین کی بالادستی قائم ہوگئی۔ اس ملک اور جگہ کی اب شرعی حیثیت کیا ہے؟ وہاں کیلئے اسلامی احکام کیا ہیں؟ علماء اسلام نے اس مسئلہ کا حل پیش کیا۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے مکمل سقوط کے بعد مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی، اور انگریزوں کا اقتدار مسلط ہوگیا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ملک کے دو حصے ہوگئے، ایک حصہ پر اہل اسلام کا اقتدار قائم ہوا، دوسرا حصہ جمہوریت کے نام سے کفر وشرک کی گود میں باقی رہا۔ مسلمانوں کی سلطنت کے ختم

ہونے کے بعد یہ سوال بار بار اٹھا کہ ہندوستان اب دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ متعدد علماء کی طرف سے اس باب میں مختلف رائیں سامنے آئیں، کسی نے اسے دارالحرب بتایا، اور کسی نے دارالاسلام قرار دیا، اور اس اختلاف کی بنیاد پر ان احکام شرع کے بیان میں بھی اختلاف ہوا، جس کا تعلق کسی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے سے ہے۔

بڑی ضرورت تھی کہ ان دونوں رایوں کے درمیان محاکمہ کیا جائے، اور افراط وتفریط سے بچ کر متعدل راہ متعین کی جائے، محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمہ اللہ جن کی فقہی بصیرت بھی مسلم ہے، انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور نہایت مدلل اور مکمل محاکمہ فرمایا، اور حق کو اس طرح واضح کر دیا کہ اب کسی قیل وقال کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کتاب پہلے قسط وار مضامین کی شکل میں ۱۹۶۷ء میں ماہنامہ البلاغ بمبئ میں چھپی تھی۔ پھر مجلّہ المآثر میں اسے شائع کیا، اب صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کے اہتمام سے کتابی شکل میں بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ کتاب کیا ہے؟ فقہی حکمت وبصیرت کا ایک اعلیٰ شاہکار ہے، اس کا ہر صفحہ علم وآگہی کا خزینہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی افادیت کو عام فرمائیں۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔ فروری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : بیمہ اور اس کا شرعی حکم
اثر خامہ : محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی
وشیخ عبداللہ ناصح علوان
ترتیب وترجمہ : مولانا مسعود احمد الاعظمی
صفحات : ۸۰
قیمت : درج نہیں
ناشر و ملنے کا پتہ : اوپر مذکور ہوا

انسان جب آخرت سے غافل ہوا اور دنیا اور دنیاوی زندگی کو اس نے معبود ومقصود قرار دیا تو انسانی زندگی نت نئے مسائل کا شکار ہوئی۔ اس دنیا میں حیات جاوید اس کا مقدر تو نہ بن سکی، مگر انسان نے ہر ممکن کوشش کی کہ اپنے کو موت سے اور اس کے خطرات سے بچا لیجئے۔ یہ کوشش مختلف عنوانوں سے انسانی زندگی میں داخل ہوئیں، انہیں عنوانوں میں ایک عنوان انشورنس اور بیمہ بھی ہے۔ جب اس کا رواج شروع ہوا تو اسلامی احکام میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ ایک سوال ابھرا، اور جب کہ انسانی عادت ہے کہ جب کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے تو زاویۂ نظر کے اختلاف سے اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، یہاں بھی جواز وعدم جواز کی راہیں مختلف ہوئیں، اس سلسلے میں محدث جلیل حضرت مولانا اعظمی کی ایک مختصر تحریر نہایت منصفانہ اور مدلل دستیاب ہوئی تھی، جسے مجلّہ المآثر شمارہ (۲) جلد (۳) میں شائع کیا گیا تھا، مولانا مسعود احمد صاحب نبیرۂ حضرت محدث کبیر کو حضرت کے کتب خانے میں ’’حکم الاسلام فی التامین ‘‘ کے نام سے اس موضوع پر شیخ عبداللہ ناصح علوان کا ایک مختصر رسالہ ملا۔ جس میں انھوں نے اختصار سے دونوں فریق کے درمیان محاکمہ کیا ہے، مولانا مسعود احمد صاحب نے اس رسالہ کا ترجمہ کیا اور حضرت

محدث کبیر کی تحریر کو ابتداء میں شامل کر کے بیمہ کے موضوع پر ایک مکمل رسالہ کر دیا، اس رسالہ سے بیمہ کی شرعی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس کے عدم جواز پر اطمینان ہو جاتا ہے، مزید یہ کہ نئے نئے مسائل پر غور کرتے وقت ایک عالم دین کا زاویہ نظر کیا ہونا چاہئے، اس رسالہ سے اس کی بھی رہنمائی ہوتی ہے، بہت غور و تدبر سے مطالعہ کرنے کی چیز ہے۔

ماخذ: ضیاء الاسلام۔ فروری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : عظمت صحابہ
مؤلف : محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ
صفحات : ۹۰
طباعت وکتابت : عمدہ
قیمت : درج نہیں
ناشر: المجمع العلمی ، مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مدرسہ مرقاۃ العلوم پوسٹ بکس نمبر ۱، مئو، یوپی

ہمارا دین ، دین اسلام ایک امانت ہے ، جسے حق تعالیٰ کی جناب سے برگزیدہ فرشتے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام لائے ، اور رسول امین ﷺ کے سینہ مبارک کے حوالے کیا، رسول امین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ امانت اپنے اصحاب وتلامذہ کے سپرد کی ، اور ان کی امانت ودیانت پر کامل اعتماد کیا، اور اس لئے اعتماد کیا کہ حق تعالیٰ نے ، خالق علیم وخبیر نے ان کے قلوب کو تقویٰ کے لئے پرکھ کر ان سے دائمی رضامندی کا اعلان کردیا ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کی یہ امانت جیسی انھیں ملی تھی بعینہٖ اپنے بعد والوں تک پہونچادی۔ صدیاں گزر گئیں، اور وہ دین جسے حضرات صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کر کے دنیا میں پھیلایا تھا آج بھی تر وتازہ حالت میں موجود ہے، رسول اکرم ﷺ کے بعد اس جہاں پر سب سے بڑا احسان انھیں حضرات کا ہے۔ اگر کوئی شخص صحابہ کی خردہ گیری یا عیب چینی کرتا ہے، تو وہ در پردہ دین کی بنیاد ڈھا رہا ہے، اس لئے جس کسی نے بھی صحابہ کی شان میں نازیبا بات کہی علماء راسخین کو جلال آیا ہے، غیرت دین نے ایسے لوگوں کو للکارا ہے۔ بنارس کا کوئی بابا خلیل داس تھا ، اس کی عاقبت رُسوا ہوئی کہ اس نے ایک کتاب ''اصحاب رسول اللہ اور معاویہ کی صحابیت'' کے نام سے لکھ کر صحابہ کرام کے ناموس پر عموماً اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت پر خصوصاً اپنے رافضیانہ ذہن کی غلاظت اچھالی۔

حضرت محدث کبیرؒ کی غیرت دینی کو جلال آیا، آپ نے اس فتنہ کا تعاقب کیا، تمہید کی عبارت اس جلال کی ترجمان ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''آج کل بنارس میں ایک شخص مسمیٰ خلیل داس نے حضرت معاویہ ﷜ پر لعن طعن کے جواز کا فتویٰ دے کر ایک نیا فتنہ برپا کر رکھا ہے، اس باب میں شخص مذکور کی اب تک کئی تحریریں شائع ہو چکی ہیں اور ہر چند کہ یہ تحریر کسی مستند عالم یا محقق کی نہیں ہیں، اور اس لحاظ سے وہ بالکل ناقابل التفات ہیں اور ہر سنجیدہ واقف کار ایسے نابلد کو منہ لگانے میں عار محسوس کرتا ہے تاہم چونکہ ان تحریروں سے ناواقف عوام غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں اس لئے میں بغرض اظہار و تائیدِ حق اور بقصدِ ہدایت خلق و رفع غلط فہمی عوام اپنے کو اس شخص کے مقابل پیش کرنے کی ذلت گوارا کرتا ہوں، اور حق تعالیٰ کی توفیق سے حضرت معاویہ کے باب میں جو بات حق اور اہل سنت والجماعت کا اجماعی مسلک ہے، اس کو مدلل اور واضح طور پر لکھتا ہوں''۔ **واللہ حسبی ونعم الوکیل**

پھر واقعی مولانا نے جو کچھ لکھا، تحقیق کا حق ادا کر دیا، مقام صحابیت کو ایسا روشن کر دیا، اور اس سلسلے میں اعتراضات و اشکالات کا ایسا اطمینان بخش جواب دیا اور خصوصاً حضرت معاویہ ﷜ کی طرف سے ایسا دفاع کیا کہ انصاف پسند دل مطمئن اور ہر صاف دماغ شخص علم و تحقیق سے مالا مال ہو جائے۔ بہت نفیس اور محققانہ مباحث نہایت سہل اور بلیغ عبارات میں بیان کر دئے گئے، جن سے اہل علم کے علم میں اضافہ ہو، اور عوام الناس بھی مسئلے کو خوب سمجھ جائیں، اور ایمان میں تازگی پیدا ہو۔

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : ابطال عزاداری
مؤلف : محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی
صفحات : ۹۴
طباعت وکتابت : عمدہ
قیمت : درج نہیں

کسی کتاب یا مضمون کے مستند ہونے کے لئے محدث کبیر علیہ الرحمہ کا نام کافی ہے۔

یہ وہ شخصیت ہے، جس نے علم تحقیق کے میدان میں اور غیرت دینی وعلمی کے باب میں ایک امتیازی شناخت حاصل کرلی ہے۔ محدث کبیر کی تحریر خواہ مختصر ہو، خواہ مفصل سند ہوتی ہے، تعزیہ سازی اور عزاداری، جو شیعوں کا دین ومذہب ہے، اور اہل سنت کے نزدیک شرک وبدعت ہے، اس میں بہت سے سنی بھی مبتلا ہیں، اور ایک رافضی نے تو دیدہ دلیری کی حد کردی، اس نے ثابت کرنا چاہا کہ عزاداری مذہب اہل سنت میں بھی ایک اہم فریضہ ہے۔

حضرت مصنفؒ نے اس خیال اور اس نظریہ کا ابطال نہایت عمدگی اور تحقیق سے کیا ہے، یہ ہے تو ایک مختصر سا رسالہ مگر علم وتحقیق کا گنجینہ اور ذہانت وذکاوت نیز قوت استدلال اور اثبات حق کا صاف شفاف آئینہ ہے، یہ رسالہ آج سے ۶۵/سال قبل لکھا گیا تھا، جو دارالمبلغین لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ ”الداعی“ میں ۱۳۶۱ھ میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ بقول ناشر:

> ”تعزیہ داری اور دیگر مراسم عزاداری کے حرام وبدعت ہونے پر اتنی جامع اور مفصل ومدلل تحریر مشکل ہی سے ملے گی، اس اعتبار سے اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد اور اہم رسالہ ہے“۔

ماخذ: ضیاء الاسلام۔ فروری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغہ
شارح : حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
صفحات : جلد اول ۸۲۱۔ جلد دوم ۷۴۴
طباعت : نہایت عمدہ اور معیاری
قیمت : درج نہیں
ناشر : مکتبہ حجاز دیوبند یوپی

ارواح ثلٰثہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ کی روایت سے بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ حضرت نانوتوی فرماتے تھے کہ: ’’مشاہیر امت میں تین قسم کے افراد گزرے ہیں۔

(۱) بعض ایسے ہیں کہ حقائق شرعیہ میں ان کا ذہن طول وعرض میں چلتا ہے، جیسے امام رازی کہ ہر مسئلے میں پھیلتے زیادہ ہیں، اور ترتیب وتفصیل وتہذیب مواد میں زیادہ مستعد ہیں۔

(۲) بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذہن علو کی طرف زیادہ چلتا ہے، جیسے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ حقائق میں اس قدر بلند پرواز ہیں کہ اصحاب ذوق کو بھی ان کے مدارک تک پہونچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

(۳) اور بعض ایسے ہیں جن کا ذہن عمق کی طرف زیادہ دوڑتا ہے، جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہ ہر مسئلہ کی تہ اور اصلیت کا سراغ لگا لیتے ہیں، اور ایسی اصل قائم فرما دیتے ہیں کہ سیکڑوں تفریعات اس سے ممکن ہو جاتی ہیں۔ (ارواح ثلٰثہ۔ ص ۲۸۵)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کا جو تعارف حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ نے

کرایا ہے اس کا اندازہ شاہ صاحب کی تصانیف کے مطالعہ ہوتا ہے، واقعی اس قدر بلند پروازی ہے کہ ان کے قریب تو کیا ان کی گرد تک پہونچنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عبقریت اور ان کی عظمت شان کے تعارف میں تو بہت لکھا گیا ہے، ان کے تلامذہ اور ان کے خلفا کا تعارف بھی خوب ہوا، ان کے فیض علمی کا سلسلہ جو ہندوستان میں جاری ہوا اور اخیر میں دارالعلوم دیوبند ان کے فیضان علم وحکمت کا مرکز بنا، اس کے اثرات کی تفصیلات خوب لکھی گئی گئیں، لیکن اس علوئے ذہن اور حقائق میں بلند پروازی کی وجہ سے انہوں نے خود جو کچھ لکھا ہے ان کی تشریح کم کی گئی، بلکہ علما کا اشتغال بھی ان کے ساتھ کم ہی رہا۔

حق تو یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر مدارس میں حضرت شاہ صاحب کی کتابیں بطور تخصیص کے سہی داخل درس ہوتیں، ذہین طلبہ کی ایک معتد بہ جماعت ان سے استفادہ کرتی، مگر ایک رسالہ الفوز الکبیر کو چھوڑ کر ان کی کوئی کتاب باقاعدہ داخل درس نہیں ہوئی، اور اس بھی حال یہ ہے کہ الفوز الکبیر کی اصل زبان فارسی ہے، اس کا عربی میں ترجمہ کسی دمشقی عالم نے کیا ہے، وہی ترجمہ درس میں داخل ہے، اس میں ترجمہ کے متعدد اغلاط ہیں، پھر مزید کرم اس پر یہ ہے کہ پوری کتاب درس میں نہیں داخل ہے، اس کا صرف ایک جز ہے، اور جتنا حصہ ہے وہ بھی جلالین شریف کے ضمن میں بھاگتے دوڑتے گزار دیا جاتا ہے، طلبہ کو اس کی خبر نہیں ہوتی کہ یہ کن بلند حقائق کا مخزن ہے؟۔

دوسری کتاب جس کے بہت تھوڑے سے اجزا متفرقاً پڑھائے جاتے ہیں، وہ حجۃ اللہ البالغہ ہے، دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ اپنے مسلسل اسفار اور مصروفیات کے درمیان کبھی کبھی کچھ موقع نکال کر حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے تھے، ان کا ذہن ودماغ بڑا حکیمانہ تھا، وہ معارف ولی اللہی کو بہت خوب سمجھتے تھے، اور ان کی تفصیل وتشریح کی بے مثال قدرت رکھتے تھے۔ یہاں میں حضرت مولانا سالم صاحب مدظلہ کی تحریر کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں، جس سے یہ پتہ چلے گا کہ دارالعلوم دیوبند میں حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس کیسے شروع ہوئی؟ اور اس سلسلہ میں حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کا کیا مقام تھا؟ حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”(مولانا عبیداللہ صاحب) سندھی جب جلا وطنی ختم کر کے وطن واپس آئے اور پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، تو بعد مغرب حضرت مہتمم صاحب کے پاس گھر پر تشریف لائے، طلبہ کافی تعداد میں ساتھ آ گئے، جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا، مولانا سندھی رحمہ اللہ نے حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ سے پہلا سوال یہ کیا کہ ”کیا حجۃ اللہ البالغہ دارالعلوم میں پڑھائی جاتی ہے؟“ حضرت مہتمم صاحب نے نفی میں جواب دیا، اس پر موصوف نے ناگواری کے ساتھ فرمایا کہ اسی پر تو ہمارے فکر کی بنیاد ہے، اس کا پڑھانا بے حد ضروری ہے، اور ابھی اس کی پڑھائی شروع کی جائے، کتاب منگائیے۔

حضرت مہتمم صاحب نے اپنے کتب خانے سے کتاب لانے کا (حکم) احقر کو فرمایا، کتاب آئی تو خیال تھا کہ خود مولانا سندھی کچھ پڑھائیں گے، لیکن انہوں نے کتاب حضرت مہتمم صاحب کو دے کر فرمایا کہ عبارت پڑھیے، حضرت نے عبارت پڑھی، اور منتظر رہے کہ حضرت مولانا سندھی اب کچھ فرمائیں گے، مگر انہوں نے حضرت مہتمم صاحب سے فرمایا کہ جو عبارت آپ نے پڑھی ہے اس کا ترجمہ کیجئے، انہوں نے ترجمہ کیا، پھر فرمایا کہ اب اس کا مطلب بیان کیجئے، حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ مطلب آپ بیان فرمائیں تو فرمایا نہیں، آپ ہی بیان فرمادیں۔ اس پر حضرت مہتمم صاحب نے فکر ولی اللہی کی اصولی حیثیت کو موضوع بنا کر تقریر فرمائی، اس عرصہ میں طلبہ کا بڑا مجمع وہاں جمع ہو گیا، تقریر قریباً نصف گھنٹہ ہوئی، جسے مولانا نے بڑے انہماک سے سنا، ختم تقریر پر نہایت پر جوش انداز میں فرمایا کہ الحمدللہ علوم ولی اللہی جماعت میں ابھی زندہ ہے، اور تاکید فرمائی کہ اس کا درس آپ مسلسل دیں۔ چنانچہ حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ نے اس کے بعد بہ تسلسل حجۃ اللہ البالغہ کا درس کافی عرصہ تک دیا“۔

اس درس میں شرکت کی سعادت اس خاکسار تبصرہ نگار کو ۱۳۸۹ھ میں ہوئی، حضرت مہتمم صاحب کی مصروفیت اور مسلسل اسفار کے باعث درس بہت تھوڑا سا ہو سکا تھا۔

عرض کرنے کی غرض یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے علوم ومعارف اتنے بلند ہیں کہ ان تک رسائی نہایت مشکل ہے، ان کے سمجھنے کے لئے اسی طرح کی ذہنی بلندی کی ضرورت ہے، جو حضرت شاہ صاحب کو حاصل تھی، پھر ایک خاص طرح کا ذوق ووجدان بھی شرط ہے، جس کے

باعث ان علوم سے مناسبت پیدا ہو، ہمارے مدارس میں جو کتابیں زیر درس ہیں، تراجم، حواشی اور شروح کے میدان میں ان کی اتنی خدمت ہوئی ہے کہ ان کی مدد سے اساتذہ بے تکلف درسی کتابیں پڑھا لیتے ہیں، اس کے برخلاف شاہ صاحب کی کتابوں کے ترجمے تو بے شک ہوئے ہیں، مگر شرح پر کسی نے ہاتھ نہیں لگایا اور ان ترجموں کا جو حال ہے، ان پر ایک مترجم کا تبصرہ یہ ہے کہ:

> ''اس کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) کے اردو تراجم پہلے بھی ہو چکے ہیں، لیکن وہ ترجمے کیا ہیں؟ ایک چیستاں ہیں، جس میں مغلق مقامات کو اور بھی مغلق کر دیا گیا ہے، اکثر الفاظ مفردہ کا ترجمہ الفاظ مفردہ سے کیا گیا ہے، جس سے مطلب کی وضاحت تو درکنار الجھاؤ بڑھ گیا ہے''۔
> (برہان الٰہی از مولانا محمد اسماعیل گجراتی)

لیکن خود اس ترجمہ ''برہان الٰہی'' پر حضرت مفتی سعید احمد صاحب کا تبصرہ یہ ہے کہ:

> ''مگر یہ آخری ترجمہ بھی سابقہ تراجم سے بہتر نہیں ہے، مترجم نے بے شک جگہ جگہ شاہ صاحب کے مختصر الفاظ کو جملوں اور سطروں سے واضح کیا ہے، مگر ''من چہ سرایم وطنبورۂ من چہ سراید'' کا مصداق ہے''۔ (ج۱ص۳۰)

غرض نہ ٹھکانے کا ترجمہ نہ شرح، پھر شاہ صاحب کی بلند پایہ کتابوں کو پڑھانے کے لئے ہاتھ لگائے تو کون لگائے، دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو اس کتاب سے بڑی مناسبت تھی، اور وہ اسے خوب پڑھاتے بھی تھے، مگر حضرت کا قیام مدرسے میں کم ہوتا اور جتنا ہوتا، اس میں مشغولیات پیچھا نہ چھوڑتی تھیں، نتیجہ یہ ہوتا کہ کتاب کا درس بہت کم ہو پاتا۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت مہتمم صاحب کے وصال کے کئی برسوں بعد حجۃ اللہ البالغہ کا درس ۱۴۰۸ھ میں حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ سے متعلق ہوا، مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ:

> ''میں نے یہ کتاب حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب قاسمی قدس سرہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) سے پڑھی، حضرت کو شاہ صاحب کے علوم پر کمال قدرت حاصل تھی، مگر افسوس کہ درس میں چند ہی ابواب شامل تھے، کاش حضرت سے پوری کتاب، یا

کتاب کا معتد بہ حصہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوتی''۔ (ج۱ص۳۱)

مفتی صاحب موصوف بے شرح اور بے حاشیہ کی کتاب مسلسل ۱۲/۱۳ سال سے پڑھا رہے ہیں، اس کے لئے ان کو کتنی جانکاہی کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کو اس کتاب کا بنظر غائر مطالعہ کا اتفاق ہوا ہو، پڑھانے کا مسئلہ لکھنے سے مشکل ہے، پڑھانے میں تو ہر لفظ اور ہر جملہ کا حل کرنا ضروری ہے، ورنہ طالب علم آگے چلنے نہیں دے گا، اور لکھنے کا مسئلہ تو یہ ہے کہ بقول ایک بزرگ عالم کے کہ'' لکھنا کیا مشکل ہے، جو نہیں آئے گا اسے چھوڑ دیں گے''۔

مفتی صاحب پڑھاتے ہیں اور دیوبند کے منتخب طلبہ کو پڑھاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کے لئے بڑی تیاری کرنی پڑتی ہوگی، ایک عرصہ تک پڑھا لینے کے بعد ظاہر ہے کہ اس کے مشکلات پر عبور حاصل ہوجانا یقینی ہے۔ اب مولانا کو یہ خیال آیا کہ اس کی شرح لکھنی ضروری ہے، یہ بڑی دشوار گزار راہ تھی، اس راہ کی دشواری کو ایک اور صاحب نظر عالم حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ حدیث وتفسیر ندوۃ العلما لکھنو کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں، وہ مفتی صاحب مدظلہ کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''آپ نے اس راہ کی جن مشکلات کا ذکر کیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہی بلکہ اسی جیسی کچھ اور دشواریوں کی وجہ سے راقم نے سوچ سوچ کر بلکہ کر کے ہمت ہاردی......راقم بھی عرصہ سے حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس کا مکلّف بنا ہوا ہے، اس لئے مبتلیٰ بہ کی رائے زیادہ باوزن ہونی چاہئے''۔ (ج۲ص۲۶)

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ نے کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی شرح لکھنے کا حوصلہ ایک عرصہ کی تدریس کے بعد کرلیا، اللہ نے ان کو علوم ولی اللہی سے مناسبت عطا فرمائی، یہ ان کا پہلا کارنامہ نہیں ہے، اس سے پہلے انہوں نے شاہ صاحب کے رسالہ الفوز الکبیر کی عربی زبان میں شرح لکھی ہے جو بہت معتبر اور باوقار ہے، اس کے بعد انہوں نے الفوز الکبیر کے رائج ترجمے کے نقص کو محسوس کر کے اس کا مستقل عربی ترجمہ کیا جو صحت وامانت کی ضمانت ہے۔ اب حضرت مفتی صاحب کا اس باب میں تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ اور اس کی سہل اور جامع شرح لکھی، اور حضرت شاہ صاحب غامض اور بلند پایہ معارف کو علما کے لئے

سہل فرما دیا۔

شاہ صاحب کی یہ کتاب احکام شریعت کے اسرار ورموز اوران کی حکمتوں کے بیان میں ہے، یہ ایک مشکل اور غامض فن ہے، اس کے ساتھ ہی نہایت نازک، شریعت کی روح کو پہچاننا، اس کے مطابق حکمتوں کو اخذ کرنا، اس کی عقلی مصلحتوں کی تفصیل کرنا فی نفسہ بھی ایک مشکل کام ہے، اور پھر جب یہ بھی پیش نظر رہے کہ عموماً اس فن کو موضوع بنا کر متقدمین نے اس سے تعرض نہیں کیا ہے، کہیں کہیں بعض احکام کے ضمن میں ان کی مصلحتیں بیان کی گئی ہیں، مگر مستقلاً اسے موضوع بنا کر شریعت کے تمام مسائل کے معارف وحقائق بیان کرنے کا التزام نہیں کیا گیا ہے، تو اس کی دشواریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ شاہ صاحب مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، انہوں نے اپنی خداداد ذکاوت وبصیرت سے جو کچھ لکھا وہ علوم اسلامیہ کا عظیم سرمایہ ہے، لیکن ایک تو فن اچھوتا، دوسرے مصنف انتہائی ذہین وذکی اور نہایت بلند پایہ صاحب ذوق، ایسا شخص جب کلام کرتا ہے تو اپنے مرتبہ ومقام سے کلام کرتا ہے، اور اس کا سمجھنا متوسط ذہن والوں کو تو کیا اعلی ذہن والوں کو مشکل ہوتا ہے، پھر نیا فن ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ اصطلاحیں اور علامتیں وضع کرنی پڑتی ہیں، ان اصطلاحوں اور علامتوں کے مفہوم کو سمجھنا بہت دشوار ہوتا ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ مصنف نے خود اس کی واضح تفصیل وتشریح نہ کی ہو۔

مفتی صاحب موصوف نے شرح کی تمہید میں بہت سچی بات لکھی ہے کہ:

> ''شاہ صاحب قدس سرہ عرش پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، شرح میں ان مضامین کو جب تک فرش پر نہ لایا جائے بات نہیں بن سکتی، شاہ صاحب کی ہر بات انوکھی ہوتی ہے، ہر مصنف کی باتوں کو حل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ مراجع ومصادر مل جاتے ہیں، مگر شاہ صاحب کی کوئی بات کسی کتاب میں نہیں ملتی''۔ (ج ا ص ۳۰، ۳۱)

بہر حال کام تو مشکل تھا، مگر حق تعالی نے حضرت مفتی صاحب مدظلہ کو جن صلاحیتوں اور کمالات سے نوازا ہے، ان سے کام لے کر بفضلہ تعالی انہوں اس مشکل کو سر کرلیا، عرش کے مضامین کو فرش پر لا کر سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے، لیکن جو مضمون بلند اور مشکل ہے وہ تو بلند اور مشکل ہی ہوگا، خواہ اسے کتنا ہی آسان کیا جائے، اور نیچے اتارا جائے۔ یہ کتاب درحقیقت ان

علما کے لئے ہے، جوشاہ صاحب کے علوئے خیال اور بلندئ علم کی وجہ سے ان کی عظمت پر ایمان بالغیب سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کرتے تھے، اس شرح نے ان علوم ومعارف کوقریب ترکردیا ہے اور شاہ صاحب کی عظمت کوغیب سے شہود بنادیا ہے۔

شاہ صاحب کی یہ کتاب دوحصوں میں منقسم ہے، پہلے والے حصے میں وہ اصولی قواعد بیان کئے گئے ہیں جن سے احکام شرعیہ کی حکمتیں اور مصلحتیں مستنبط ہوتی ہیں، تمہیدی مضامین کے ساتھ مطبوعہ حجۃ اللہ البالغہ کے ص۱۶۱صفحات پر یہ حصہ پھیلا ہوا ہے، یہ حصہ مشکل اور غامض مضامین پر مشتمل ہے، کتاب کا دوسرا حصہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات عالیہ کے تفصیلی اسرار وحکم کی وضاحت وشرح میں ہے، یہ حصہ گویا کہ احادیث رسول اللہ ﷺ کی ایک موضوع کے اعتبار سے شرح ہے، یہ حصہ ۲۴۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، حضرت مفتی صاحب نے پہلے حصے کی شرح دوجلدوں میں مکمل کی ہے۔ جلد اول ۸۲۱ صفحات پر مشتمل ہے، اور جلد دوم ۷۴۴ پر، اس ۱۶۱ صفحات کی شرح مجموعی اعتبار سے کم بیش ساڑھے پندرہ سو صفحات پر محیط ہے۔

اللہ تعالی نے حضرت مفتی صاحب مدظلہ سے ایک بڑا کام لیا ہے، انہوں نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے اس کتاب کو پڑھایا، اس کے بعد معانی ومطالب کو اپنے اندر جذب کیا، پھر طالب علموں کو اس سے سیراب کیا، کچھ طالب علموں نے مفتی صاحب کی درسی تقریروں کو ٹیپ ریکارڈ میں ضبط کیا، پھر اسے صفحات کاغذ پر منتقل کر کے حضرت مفتی صاحب کی نظر اصلاح کے لئے پیش کیا، مفتی صاحب نے ان کی تہذیب وترتیب کی، مگر چونکہ پوری کتاب داخل درس نہیں ہے، اس لئے وہ حصہ جو درس میں شامل نہیں ہے، اس کی علیحدہ شرح لکھنی پڑی۔

شرح کا انداز حضرت مفتی صاحب نے یہ اختیار کیا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی مسلسل عبارتوں کو مختلف پیراگرافوں میں تقسیم کر کے ہر پیراگراف کا ایک مستقل عنوان قائم کیا، جس سے اجمالی طور پر اس پیراگراف کا مضمون ذہن میں آجاتا ہے، پھر جو کچھ حضرت شاہ صاحب نے اس پیراگراف میں تحریر فرمایا ہے، مصنف نے اس کی مفصل تقریر وتشریح اپنے لفظوں میں فرمائی، اس تشریح میں حضرت شاہ صاحب کی ہر بات ممکنہ سہل انداز میں ادا کردی ہے، تشریح کی ضرورت ہوئی تو تشریح کردی، موقع کی مناسبت سے اگر ترتیب میں کچھ تبدیلی پیدا کرنے کی

ضرورت محسوس ہوئی تو اسے کر دیا۔ غرض جو کچھ حضرت شاہ صاحب کہنا چاہتے ہیں اسے آسان اسلوب میں لکھ دیا ہے، اس طرح کہ نہ حضرت شاہ صاحب کی کوئی بات چھٹی اور نہ اس کے مفہوم میں کوئی تغیر ہوا۔

اس کے بعد شاہ صاحب کی متعلقہ عبارت ضروری اعراب کے ساتھ لکیروں کے چوکھٹے میں نقل کی گئی ہے، اس کے بعد عبارت کا نہ آزادانہ، نہ تحت اللفظ بلکہ درسی انداز کا ترجمہ کر دیا ہے، تاکہ علما وطلبہ جس عبارت کا ترجمہ دیکھنا چاہیں، انہیں بے تکلف وہ ترجمہ مل جائے اور عبارت اس کی مدد سے حل ہو جائے۔

اس کے بعد جس بات یا جس جملہ کی تشریح مزید کی ضرورت ہوئی، اسے تشریح کے عنوان سے تحریر فرما دیا ہے، اس کے ضروری لغات یا ترکیب وغیرہ کی تشریح کر دی ہے، اس طرح یہ کتاب اہل علم کے ہر طبقہ کے لئے مفید ومعاون بن گئی ہے۔

اگر کوئی صاحب کسی وجہ سے صرف حجۃ اللہ کے مضامین ومعارف پر عبور حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لئے ابتدائی تقریر کافی ہے، حجۃ اللہ البالغہ کے تمام مضامین تسہیل وتشریح کے ساتھ اس میں آ گئے ہیں، کوئی صاحب حجۃ اللہ البالغہ کو لفظاً لفظاً حل کرنا چاہیں تو یا ابتدائی تقریر کو حجۃ اللہ پر منطبق کرنا چاہیں تو ان کے لئے عبارت اور اس کا ترجمہ موجود ہے، اور ساتھ ساتھ لفظوں کم مختصر تشریح وتحقیق بھی۔ کسی صاحب کو یہ کتاب پڑھانی ہے تو ان کے لئے یہ شرح ایک مکمل استاذ کا کام دے گی، اس سے نہ صرف عبارت حل ہوگی بلکہ کس انداز سے اسے پڑھایا جائے، کس طرح اس کے مضامین طلبہ کے ذہن میں اتارے جائیں؟ اس کی بھی اس سے رہنمائی حاصل ہوگی۔

شاہ صاحب کی کتابوں کے شارح کے سامنے ایک دشواری اور آتی ہے، وہ یہ کہ شاہ صاحب عملاً تو حنفی ہیں، مگر علم حدیث میں شاگرد ایک بہت بڑے شافعی عالم کے ہیں، جن کی خدمت میں وہ عرصہ تک رہیں، اس طرح ان کے نظریات پر فقہ شافعی کی گہری چھاپ ہے، پھر یہ کہ وہ ایک مجتہدانہ دماغ رکھتے ہیں، ایسا صاحب نظر عالم جب تدریس وتصنیف کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو قدم قدم پر اس کی انفرادیت نمایاں ہوتی رہتی ہے، انہیں اثرات کے ماتحت وہ

کہیں کہیں حنفی ہونے کے باوجود احناف سے الگ راہ اختیار کرتے ہیں، کسی کسی مسئلہ میں ان کی رائے منفرد ہوتی ہے، کہیں وہ نظریاتی اعتبار سے شوافع کے ہم قدم نظر آتے ہیں، اور ان کے مجتہدانہ دماغ اور بصیرت کا اثر یہ ہے کہ بر خود غلط مجتہدین یعنی غیر مقلدین انہیں اپنے مسلک غیر مقلدیت میں گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ ان کا دامن اس داغ سے پاک ہے۔

یہاں شارح کو دشواری پیش آتی ہے کہ شاہ صاحب تو بعض مسائل میں حنفیت سے نظری طور پر جدا راہ اختیار کرتے ہیں، انہیں ان مسائل یا ان کے اصول میں ضعف محسوس ہوتا ہے، حالانکہ نہ ان مسائل میں غلطی ہے اور نہ ان کے اصول میں ضعف ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک صاحب نظر جس پہلو سے اس مسئلہ کو دیکھ رہا ہے وہ پہلو نگاہوں پر چھا گیا ہے، اور دوسرا پہلو خفیف سا ہو کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ سے اسے ضعف محسوس ہوتا ہے، اس کی تفصیل طویل ہے، اس کے بیان کا یہ محل نہیں ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کی شرح میں ایسے بھی مرحلے آئے ہیں، مگر مفتی صاحب کی بصیرت کا کمال ہے کہ انہوں نے ان مباحث کو بڑی خوبی کے ساتھ حل کیا ہے، حنفیت کے جن اصولوں کو شاہ صاحب نے کمزور قرار دیا ہے، حضرت مفتی صاحب نے سنجیدہ اور علمی وقار کے ساتھ ان کا دفاع کیا ہے، اور حضرت شاہ صاحب کے ادب واحترام میں بھی کسی طرح کی کمی نہیں ہونے دی ہے، اور ان مباحث میں الجھ کر غیر مقلدوں نے حضرت شاہ صاحب کو اپنے مسلک میں گھسیٹنے کی جو ناروا کوشش کی ہے، حضرت مفتی صاحب نے اس کا بھی قلع قمع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو، رحمۃ اللہ الواسعہ جلد دوم ص ۷۳۲ سے آخر کتاب ۷۴۴ تک۔

اسی طرح کہیں کہیں شاہ صاحب کے ظاہر کلام سے کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے یا ہو سکتی ہے، اس غلط فہمی کو بھی حضرت مفتی صاحب نے شرح میں دور کرنے کا اہتمام کیا ہے، مثلاً اسباب تحریف میں حضرت شاہ صاحب نے استحسان کو بھی ذکر کیا ہے، اس بحث میں انہوں نے استحسان کی تعریف کی ہے، اور اس کے ذیل میں یہودیوں کے ایک استحسان کی مثال پیش کی ہے، پھر اس کی مذمت علما کے کلام سے بیان کی ہے، یہ سارا کلام بہت عمدہ اور صحیح ہے، لیکن یہاں ایک غلط فہمی کا قوی امکان ہے، وہ یہ کہ فقہائے احناف کے یہاں استحسان کی اصطلاح بکثرت رائج

ہے، اور فقہ کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیاس کے مقابلہ میں استحسان کے اندر قوت زیادہ ہوتی ہے، یہاں سوچنے والا سوچ سکتا ہے کہ شاہ صاحب استحسان کو اسباب تحریف میں قرار دے رہے ہیں، اور احناف کے یہاں اس کا درجہ قیاس ظاہر سے بڑھا ہوا ہے، تو یقیناً شاہ صاحب فقہ حنفی اور اصول احناف کے مخالف ہیں، اور یہ فقہائے احناف دین میں تحریف کے مرتکب ہیں، شاہ صاحب کا کلام قدرے مجمل ہے، حالانکہ شاہ صاحب نے اس بحث کے آخری فقرہ سے غلط فہمی کا یہ دروازہ بند کر دیا ہے، مگر وہ اتنا مجمل ہے کہ جب تک اس کی تفصیل مستحضر نہ ہو، کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے اس اجمال کی تفصیل کر کے غلط فہمی کے ہر دروازے کو بند کر دیا ہے۔

جزاه الله خير الجزاء وبارک في علمه ومعرفته

مفتی صاحب کا یہ کارنامہ واقعی قابل مبارک باد ہے، وہ سب اہل علم کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک بڑے قرض سے علما دیوبند کو سبک دوش کر دیا ہے۔ کتاب کی کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد سب ماشاء اللہ بہت معیاری اور دیدہ زیب ہیں، اتنی بڑی کتاب میں ترجمے اور کتابت کی معمولی فروگزاشت کا ہونا محل تعجب ہے اور نہ باعث مواخذہ! بعض جگہ تعبیرات ترمیم کے لائق ہیں، مگر جن خوبیوں کی یہ کتاب حامل ہے ان کے مقابلے میں یہ کوتاہیاں قابل گرفت نہیں۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔ مئی (۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ جلد سوم
شارح : مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہ
صفحات : ٦٩٦
قیمت : درج نہیں
ناشر : مکتبہ حجاز دیوبند (سہارن پور)

دار العلوم دیوبند کے مشہور ومقبول استاذ حدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ نے مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی نہایت نافع اور شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی شرح لکھنے اور شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے، اس کی ابتدائی دو ضخیم جلدوں کا مفصل تعارف ماہنانہ ضیاء الاسلام بابت ماہ صفر ۱۴۲۳ھ میں خاکسار کے قلم سے آچکا ہے، اس میں اصل کتاب اور اس کی شرح کی خصوصیات پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جا چکی ہے۔

اللہ تعالی کی خاص مدد ہے، اور مولانا موصوف کے خلوص اور ان کی دھن اور لگن کی یہ برکت ہے کہ بغیر کسی معتد بہ وقفہ کے شرح کی تیسری جلد بھی شائع ہو کر علما وطلبہ کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔

اس جلد سے کتاب کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں حضرت شاہ صاحب نے اسلامی احکام وتعلیمات کے اسرار وحکم کو احادیث کی روشنی میں تفصیلاً بیان کیا ہے، جن کے علم سے احکام الٰہی کی گہرائیوں میں اترا جا سکتا ہے، اور جن کے پڑھنے سے ایک سلیم الطبع شخص کو اسلام کے دین حق ہونے پر مکمل شرح صدر ہو جاتا ہے۔

اس جلد کا آغاز ایمان وعقائد کی تفصیلی حکمتوں کے بیان سے ہوا ہے، اور اس سلسلے کی

حدیثوں کی شرح اس میں لکھی گئی ہیں، ایمان، کفر، تصدیق، سکینت قلبی، نفاق اور اخلاص کی علامتیں، گناہوں کی تفصیل، کبائر وصغائر کا بیان، شیطان کی وسوسہ اندازیاں، فرشتوں کی جانب سے الہام، مجازات اور تقدیر کے مسائل، نیز کتاب وسنت کو مضبوط پکڑنے کے سلسلے میں اصولی باتیں، غرض ایمان وعقائد کے متعلق نہایت عمدہ اور ضروری مباحث کی تفصیل اس جلد کے آغاز میں بیان کی گئی ہے۔

ایمان وعقائد کی تفصیلی گفتگو کے بعد حضرت شاہ صاحب نے طہارت، وضو، غسل، تیمّم، پانی وغیرہ کے مباحث پر ان کے اسرار وحکم پر کلام فرمایا، پھر نماز کے ابواب واحکام کی حکمتوں کو تحریر فرمایا۔ شاہ صاحب کا کلام تو شاہ صاحب ہی کا ہے، اس کی خصوصیات وامتیازات پر پہلے گفتگو کی جا چکی ہے، پھر مولانا نے اس غوامض کی تہوں میں اتر کر اس کو واضح کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔

شرح کے ضمن میں مولانا نے بہت سے نفیس مباحث تحریر فرمائے ہیں، اور اصل کتاب کی فہرست کے ساتھ سہولت استفادہ کے لئے ان نفیس فوائد کی فہرست بھی مرتب کر دی ہے۔ اہل علم حضرات کے لئے یہ کتاب ایک بیش قیمت تحفہ ہے، اللہ تعالی اصل کتاب کی طرح اس شرح کو بھی حسن قبول سے نوازیں۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔ جنوری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ (مکمل پانچ جلدوں میں)
مؤلف : حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
صفحات : ۳۶۰۸
طباعت وکتابت : عمدہ
قیمت : درج نہیں ہے
ناشر : مکتبہ حجاز دیوبند، یوپی

امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے خصوصی امتیازات میں ایک اہم امتیاز اس کے علمی کمالات ہیں، رسول اکرم ﷺ امی تھے، اور امیوں میں بھیجے گئے تھے، مگر اللہ نے آپ کو وہ علم عطا کیا تھا، جس کی وجہ سے آپ سراپا علم وحکمت بن گئے۔ پھر آپ نے اپنی امت میں علم وحکمت کے ذوق کی وہ روح پھونکی، کہ ایک دنیا کی دنیا علم کے نور سے جگمگا اُٹھی۔ آپ پر پہلی وحی جو آئی، اس کی ایک آیت ''**علم بالقلم**'' کے کلمات پر مشتمل ہے۔ اس آیت کی روشنی میں امت نے قلم کو ہاتھ میں لیا، تو علوم کے دفتر نہیں، بلکہ عظیم الشان کتب خانے تیار ہوتے چلے گئے۔ قرونِ اولیٰ سے اب تک تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہے، اور ہر زمانے میں ایسی بیش قیمت کتابیں طلبائے علوم کے ہاتھوں میں آجاتی ہیں جن سے علم کی زندگی اور تابندگی اور اس کی رونق بڑھ جاتی ہے۔

یہ کتابیں روشنی کے مینار ہیں، فضا میں جب کبھی جہل کی ظلمت بڑھ جاتی ہے، تو کوئی صاحب استعداد عالم انھیں کتابوں سے روشنی حاصل کرکے جہل کی تیرگی کو چھانٹ دیتا ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر کتاب ایک رُتبے کی نہیں ہوتی، جہاں بعض کتابیں بہت بلند، بہت روشن اور بہت نافع ہوتی ہیں وہیں بہت سی تحریریں بالکل بے معنی، ہذیان اور بے تکی ہوتی ہیں، پھر ان

دونوں مرتبوں کے درمیان بے شمار درجات اور مراتب ہیں، پڑھنے کے لئے وہی کتابیں منتخب کرنی چاہئیں، جو علم وحکمت کی صحیح ترجمانی کرنے والی ہوں۔

علم وحکمت کی اَساس، اللہ کا کلام ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں، جنھیں حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے، قرآن وحدیث کی خدمت کے بہت سے شعبے ہیں، اور ہر شعبے میں امت نے خدمات کے بے شمار نقوش ثبت کئے ہیں۔ دنیا اور امت کو جب جیسی خدمت کی ضرورت پیش آئی ہے اللہ نے مردانِ کار کو پیدا فرمایا ہے، اور انھوں نے وقت کی ضرورت کو پورا کیا ہے، اس داستان کی تفصیل بہت طولانی ہے، جی تو چاہتا ہے کہ اس تفصیل کی جانب ہلکے ہلکے اشارے کردئے جائیں، مگر جب ان اشاروں کو ترتیب دینا چاہا، تو وہی طول طویل دفتر کی شکل اختیار کرنے لگے، اس لئے ان اشاروں سے صرف نظر کرکے جو بات اس وقت عرض کرنی ہے، اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تفسیر وحدیث کے ذیلی علوم میں ہر ہر عنوان پر بہت کچھ خدمتیں ہوئی ہیں، ان موضوعات پر تصنیف وتالیف کے ذخیرے کے ذخیرے موجود ہیں۔ مگر ایک موضوع ایسا بھی ہے، جس کو موضوع اور مقصود بنا کر متقدمین ومتاخرین میں سے غالباً کسی نے ہاتھ نہیں لگایا، یا اگر کسی نے کچھ لکھا، تو وہ آج دستیاب نہیں ہے۔ حالانکہ وہ موضوع بڑا اہم ہے، اور ایسا ہے بھی نہیں ہے کہ کسی نے اس پر غور وفکر نہ کیا ہو، یا اس سے سرے سے بحث ہی نہ کی ہو، متفرق اور منتشر طور سے اس موضوع کے اشارات اور تصریحات کتابوں میں ملتے ہیں۔ مگر مرتب اور مدون کرنے کی طرف کسی نے التفات نہیں کیا۔

وہ موضوع ہے ’’علم اسرارالدین‘‘ یعنی دینی علوم واعمال کی عقلی توجیہات اور ان کی علتوں اور حکمتوں کا تفصیلی بیان۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ احکام شرع حکمتوں اور مصلحتوں سے بے نیاز ہیں، اعمال اور ان کی جزائیں جو اللہ تعالیٰ نے متعین کی ہیں، ان میں کوئی مناسبت ملحوظ نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے، **فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة** صاحب حکمت کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، پھر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون حکیم ہوگا۔ قرآن پاک میں حکمت کا اتنے

عنوانوں سے تذکرہ ہوا ہے کہ یہ سوچا بھی نہیں جانا چاہئے کہ، اللہ تعالیٰ کے احکام کسی حکمت اور مصلحت پر مبنی نہ ہوں گے۔

علماء نے جستہ جستہ مختلف مقامات پر احکام کی حکمتوں اور علتوں پر بحث کی ہے، مگر اس حیثیت سے یہ موضوع اچھوتا رہا ہے کہ اس کی جانب مستقلاً اعتناء نہیں ہوا۔ امام غزالی نے، علامہ عزالدین عبدالسلام نے اور دوسرے محقق علماء نے اپنی تصنیفات میں متفرق طور سے اس موضوع پر بہت کچھ کلام کیا ہے، مگر اسے موضوع نہیں بنایا۔

اسلامی تاریخ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ غالباً پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اس موضوع پر پوری توجہ فرمائی، اور ''**حجة الله البالغة**'' کے نام سے ایک زبردست کارنامہ انجام دیا۔

یہاں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کے الفاظ نقل کرتا ہوں، جن سے ''**حجة الله البالغة**'' کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''شاہ صاحب کی سب سے معرکۃ الآراء کتاب اور علمی کارنامہ ''**حجة الله البالغة**'' ہے، جس میں دین ونظام شریعت کا ایک ایسا مربوط، جامع اور مدلل نقشہ پیش کیا گیا ہے، جس میں ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاق، علم الاجتماع وتمدن، سیاست واحسان کو ایک ایسے ربط وتعلق اور صحیح تناسب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہار کے موتی اور زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں، اور ان میں اصول وفروع، مقاصد ووسائل اور دائمی وموقت کا فرق نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو پاتا............ اسلام کی یہ مربوط وجامع ترجمانی، جو ''**حجة الله**'' کے صفحات میں دیکھنے میں آتی ہے، بہت کم دینی تصنیفات میں نظر آئے گی، اس طرح ''**حجة الله**'' اس دورِ عقلیت کے لئے ایک نیا علم کلام بن گیا ہے،............ ہمارے علم میں کسی مذہب کی تائید، اور اس کی حکیمانہ توجیہ وتشریح میں (ان زبانوں میں جن سے ہم واقف ہیں) اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی، اور اگر لکھی گئی تو اس وقت علمی دنیا کے سامنے نہیں ہے۔
>
> (تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۵، ص:۲۱۵، ۲۱۶)

حضرت شاہ صاحب نے جس اچھوتے موضوع کی ترتیب وتدوین کی ہے، دینی علوم میں اس کا مقام کتنا بلند ہے، اس کو خود شاہ صاحب ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں کہ:

> ’’علوم حدیث میں میرے نزدیک سب سے باریک، دقیق وعمیق، رفیع وبدیع، اسرار دین کا وہ علم ہے، جس میں احکام کی حکمتیں، اوران کے لمیات اور خواص اعمال کے اسرار ونکات بیان کئے جائیں، جن کے ذریعے انسان شریعت کی لائی ہوئی چیزوں کے بارے میں صاحب بصیرت بن جاتا اور خلط وخبط سے محفوظ رہتا ہے، (مقدمہ حجۃ اللہ البالغۃ ص ۳)

یہ علم اور موضوع ہے تو اس درجہ اور مرتبہ کا! مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ شاہ صاحب ہی نے اس کی ترتیب وتدوین کا آغاز کیا ہے، اور اب تک وہی اس کی انتہا ہیں۔

یہ کتاب حضرت شاہ صاحب نے عربی زبان میں لکھی ہے، شاہ صاحب بہت بلند پرواز اصحاب علم اور اصحاب دل حضرات میں ہیں، ان کی علمی وذہنی بلند پروازی کی وجہ سے ان کے علوم ومدرکات تک پہونچنا آسان نہیں ہوتا، جن حضرات نے حضرت شاہ صاحب کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس سے بخوبی واقف ہیں، پھر یہ ایک اچھوتا اور دقیق موضوع ہے، اس کی گہرائیوں تک عقل وفہم کی رسائی یوں بھی مشکل ہے پھر جب حضرت شاہ صاحب اپنے مخصوص انداز میں ایجاز واختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے حقائق کو کھولتے ہیں تو ان کے آسان کرنے کے باوجود غموض وامعان کی تہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ بلکہ بعض جگہ ان کی بلندیٔ ادراک کی وجہ سے کچھ تہیں اور بڑھ جاتی ہیں، اس صورتِ حال میں اس کتاب کو سمجھنے کا حوصلہ وہی علماء کر سکتے تھے، جن کو علمی رسوخ حاصل ہو، حضرت شاہ صاحب کے علوم سے مناسبت ہو، ان کی اصطلاحات سے فی الجملہ واقف ہوں، پھر اسرار وحکم کے سمجھنے کا ذوق بھی ہو۔ ہمارے اکابر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کو حضرت شاہ صاحب کے علوم ومعارف سے خاص مناسبت تھی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی علیہ الرحمہ نے تو حضرت شاہ صاحب کے علوم ومعارف کو اپنا موضوع زندگی بنایا تھا، مولانا سندھی **حجۃ اللہ البالغۃ** کا درس دیا کرتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں بھی اس کے درس کا سلسلہ تھا، حضرت قاری محمد طیب صاحب کے درس میں یہ خاکسار شریک رہا ہے، طالب علمی سے رسمی فراغت کے بعد ایک بار محنت کر کے پوری کتاب کا بالاستیعاب اور بغور مطالعہ کیا، اور ایک بار نہیں

متعدد بار کیا، ہر ہر سطر پڑھی، اکثر جگہیں تو حل ہوگئیں، مگر بعض مقامات پر تردد باقی رہا، بعض جگہیں سمجھ میں نہیں آئیں، اس وقت شدت سے احساس ہوا کہ کوئی صاحب نظر عالم اس کی مکمل شرح کر دیتا، تو اس کے بلند مضامین کچھ تو دسترس میں آجاتے، لیکن تلاش وتحقیق کے بعد بھی کسی شرح کا سراغ نہ ملا۔ نہ عربی میں نہ اردو میں، ترجمے تو دستیاب تھے، مگر ترجموں سے کچھ بات بنتی نظر نہیں آئی، پھر خود ہی محنت کرتا، جو مضامین سمجھ میں نہیں آتے تھے، انھیں بار بار پڑھتا رہا۔

اِدھر پچھلے دنوں یہ خوشخبری ملی کہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث، صاحب نظر عالم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہٗ اس کی مکمل شرح تصنیف فرمارہے ہیں، اس خبر سے بہت خوشی ہوئی، پھر جلد ہی اس شرح کی پہلی جلد ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' کے نام سے نہایت خوبصورت چھپی ہوئی مل گئی۔ بہت دنوں سے دل میں پڑی ہوئی مراد برآئی۔ اور خوشی دوبالا ہوئی۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام میں اس پر تبصرہ بھی لکھا، یہ کام بہت بڑا تھا۔ دعا کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کے ہاتھوں اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچادیں، معلوم ہوتا رہا کہ حضرت موصوف پوری مستعدی کے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، پھر ماشاء اللہ جلدوں پر جلدیں آنے لگیں، یہاں تک کہ اس سال یعنی ۱۴۲۵ھ کے اوائل میں آخری جلد بھی منظر عام پر آگئی۔ اللہ کے فضل سے یہ عظیم الشان منصوبہ پورا ہوگیا، اور اس صدی میں اب تک آئی ہوئی دینی وعلمی کتابوں میں ایک بہت ہی کامیاب اور امتیازی کتاب کا اضافہ ہوا۔

یہ کتاب عام شروحات کے طرز پر محض ایک شرح نہیں ہے، بلکہ ایک درسگاہ ہے، جس میں ایک متبحر استاذ اپنے طالب علموں کو علمی اسرار ونکات کو تفصیل کے ساتھ آسان تر بنا کر سمجھا رہا ہے، اور نہ صرف کتاب کو بلکہ فن کے مسائل کو نہایت تسلی بخش طور پر سمجھا رہا ہے۔

شرح کا انداز یہ ہے کہ پہلے شاہ صاحب کے مضامین عالیہ کو مفتی صاحب اپنے الفاظ میں ادا کرتے ہیں، اور اس طرح ادا کرتے ہیں کہ کہیں اغلاق اور اشکال باقی نہیں رہتا، اور مسئلہ خوب روشن ہوجاتا ہے، پھر شاہ صاحب کی عبارت نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اس کا ترجمہ اس انداز سے کرتے ہیں، جیسے درس میں ہونا چاہئے، تاکہ ہر عبارت اور لفظ کا ترجمہ ہوجائے، اور کہیں کوئی تشنگی باقی نہ رہے، اس کے مشکل الفاظ کی شرح، ضمائر کے مراجع کی تعیین وغیرہ پر اختصار

سے بحث کرتے ہیں۔

اس طرح یہ شرح، ایک باکمال استاذ کا درس ہے، جس سے ہر استعداد کے طلبہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، مولانا کو مشکل مسائل کی تسہیل کا فن خوب آتا ہے، اور انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اس فن کو اس کتاب میں برتا ہے، جو مضامین خود مشکل ہیں، انھیں کوئی کتنا ہی آسان کرے گا کچھ نہ کچھ دشواری تو رہے گی لیکن مولانا نے اس دشواری کو جس حد تک آسان کر دیا ہے، وہ ان کی مہارت تدریس وتفہیم کی روشن دلیل ہے۔

حجة الله البالغة اپنے فن کی یکتا کتاب ہے، اور اس کی یہ شرح بھی یگانہ روزگار ہے۔

مولانا خبر دیتے ہیں کہ ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ سے شرح کی تصنیف کا آغاز ہوا، اور ۱۹/ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ میں اس کی تکمیل ہوئی، درس وتدریس اور وہ بھی دارالعلوم دیوبند میں تدریس حدیث کے مشاغل کے ساتھ اتنا اہم علمی کارنامہ جو بڑی تقطیع کے ساڑھے تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، صرف پانچ سال میں مکمل ہو جانا، خاص تائید الٰہی اور نصرتِ غیبی کا مظہر ہے، حضرت مفتی صاحب پوری امت مسلمہ کی طرف سے عموماً، اور علمی حلقوں کی طرف سے خصوصاً شکریے کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازیں، اور مفتی صاحب کو بایں فیوض وبرکات تادیر سلامت باکرامت رکھیں۔

ماخذ: ضیاء الاسلام۔ نومبر، دسمبر (۲۰۰۴)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : اللؤلؤ والمرجان فی لطائف القرآن (یعنی قرآن کے تعبیری جواہر پارے)
مؤلف : مولانا رضوان الدین صاحب معروفی
(شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا)
صفحات : ۵۱۳
قیمت : درج نہیں
ناشر : مکتبہ الہدایہ ،محلّہ بانسہ پوسٹ کرتھی جعفر پور ضلع مئو یوپی ،پن کوڈ ۲۷۵۳۰۵۔ دیوبند، دلی اور مئو کے کتب خانوں پر دستیاب ہے۔

قرآن کریم علوم معانی کا ایک اتھاہ سمندر ہے، اس سمندر کی گہرائیوں میں ارباب ذوق اور اصحاب علم اترتے ہیں، اور اپنی اپنی استعداد کے بقدر علوم سے دامن بھر کر نکلتے ہیں، لیکن آج تک کوئی یہ نہ سکا کہ یہ سمندر کھنگالا جا چکا، اس کے سب موتی چن لئے گئے ہیں، چننے والوں نے بہت کچھ چنا، لیکن اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنا رہ گیا؟ ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے علوم حاصل کئے، فقہا نے قانون کی باریکیاں دریافت کیں، متکلمین نے عقائد کی تہوں کو کھولا، مؤرخین نے تاریخ کی سچائیاں پائیں، اہل تقوی کے سامنے دیانت اور تقوی کی راہیں کھلیں، اہل بلاغت نے فصاحت وبلاغت کے نئے اور تازہ نکتے نکالے، اور ہر ایک یہی کہتا رہا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ابھی کتنے اور حقائق ومعانی دریافت ہوں گے۔

کئی سال پہلے ہمارے عزیزم مولانا رصوان الدین صاحب معروفی سلمہ اللہ نے قرآن کریم کے کلمات وعبارات، ان کی تقدیم وتاخیر، ان کے حذف وذکر، ان کے تنوع و ترادف، ان میں اختلاف اعراب، تبدیلئ اسلوب وبیان، ربط آیات وغیرہ کو موضوع بنا کر غور کرنا شروع کیا، ان کی حکمتوں کی تلاش میں ایک تازہ علمی سفر شروع کیا، اور اس کا تذکرہ اپنے

حسن ظن سے اس خاکسار سے بھی کیا، مجھے ایک حیرت آمیز خوشی ہوئی۔ حیرت یہ ہوئی کہ ایک دقیق علمی مبحث، اس کی تہوں میں اترنا، اس کے حقائق کو تلاش کرنا، اور پھر انہیں بیان کرنا، بڑی جاں کاہی اور گہرے مطالعہ کو چاہتا ہے۔ سہولت پسندی کے اس دور میں ایک نوجوان عالم وفاضل آسان راہوں سے ہٹ کر ایک مشکل راہ کے سفر پر نکل رہا ہے۔ اور خوشی اس پر کہ یہ نوجوان میرا بہت ہی خاص عزیز ہے، اس کے ذریعہ سے علم کی نئی گرہیں کھل رہی ہیں۔ قرآن کریم کے معانی وبلاغت کا ایک جلوہ زار سامنے آرہا ہے، جو علوم قرآن کے طالبین کے لئے اردو زبان میں نئے انداز کا ایک تحفہ ہے، بہت آسان اور بہت ایمان افروز!

ان حقائق ومعانی کی تلاش میں انہیں بکثرت کتب تفسیر وبلاغت کا مطالعہ کرنا پڑا ہے، اس کے ساتھ ذوق صحیح کی ضرورت ہر قدم پر رہی ہے۔ بحمد للہ! انہوں نے اس مہم کو سر کرنے کی پوری محنت کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی محنت وکاوش کو قبول فرمائے اور دنیا وآخرت میں اسے نافع بنائے۔

ماخذ: ضیاء الاسلام۔ جنوری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : مسئلہ امام مہدی آخرالزماں
تالیف : مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب فیضیؔ
صفحات : ۱۲۸
طباعت وکتابت اور جلد: عمدہ روشن
قیمت : ۵۰
ناشر : مکتبۃ الفہیم ریحان مارکیٹ، صدر چوک مئوناتھ بھنجن، یوپی

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد کے زمانوں کے بہت سے احوال کبھی صراحۃً کبھی اشارۃً بکثرت بیان فرمائے ہیں، تاکہ آپ کی امت ان احوال وواقعات کے سلسلے میں بصیرت پر رہے، پھر آپ نے ان مواقع پر امت کے لئے کیا لائحۂ عمل ہوگا؟ اسے بھی ارشاد فرمادیا ہے، تاکہ کسی کو حیرانی اور سرگشتگی نہ ہو، بالخصوص قربِ قیامت کے احوال تو اتنی تفصیل اور کثرت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں، جیسے آپ ہر ایک کا تفصیلی مشاہدہ فرما رہے ہوں، اور وقت جوں جوں آگے بڑھتا جارہا ہے، رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشن گوئیاں ہوبہو سامنے آتی جارہی ہیں، بہت کچھ ظہور میں آچکی ہیں، اور بہت سے امور کا انتظار ہے، قربِ قیامت کی نشانیوں میں حضرت مہدی کا ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، دجالِ اکبر کا خروج، یاجوج ماجوج کا فساد، وغیرہ وہ امور ہیں، جنھیں خاصی تفصیل کے ساتھ آپ نے بیان فرمایا ہے۔

انسانی ذہن شکی ہے، اس کے سامنے جب تک کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آجاتا، تذبذب میں مبتلا رہتا ہے، حالانکہ ایمان نام ہے یقین کا، اللہ کے رسول ﷺ نے جیسا فرمادیا، اس پر یقین کرنا ہی ایمان ہے، لیکن شکی لوگ یقین سے دامن بچانے کے لئے بہت سی دوراز کار تاویلات کا سہارا لیتے ہیں۔

بکثرت احادیث کے قدر مشترک سے حضرت مہدی کا ظہور یقینی امر ہے، لیکن شکیوں کو تسلی نہیں ہوئی، مختلف انداز سے اس پیشین گوئی کو کمزور کرنا چاہتے ہیں، کچھ لوگ اس سلسلے کی احادیث کو ضعیف کہہ کہہ کر اس کی نفی کرنے کے درپے ہیں، کچھ لوگوں نے دیکھا کہ شیعوں کے یہاں امام مہدی کا مسئلہ بڑا بنیادی اور مرکزی ہے، اس سے انھیں شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو یہ مسئلہ شیعوں کے گھر سے اہل سنت میں در آیا ہو۔

پھر اس پیشن گوئی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کتنے برخود غلط افراد نے اپنے کو مہدیٔ موعود بنا کر پیش کیا، مگر بحمد اللہ امت کا مجموعی مزاج ہدایت کی شاہراہ سے منحرف نہیں ہے، اس لئے کوئی مدعی کامیاب نہ ہوسکا، مہدی کی جگہ خالی ہے، وہ اسی مہدی سے پر ہوگی جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

اس مسئلہ پر موافق ومخالف بحثوں کا سلسلہ عرصۂ دراز سے چل رہا ہے، اور جوں جوں قیامت قریب آرہی ہے، یہ بحث شدت پکڑ رہی ہے، یہ دور، عہد نبوی سے دور ہے، اس لئے اس میں ظلمتیں زیادہ ہیں، اور جس قدر ظلمت بڑھتی ہے، شکوک وشبہات بڑھتے ہیں، طبیعتوں میں بے اطمینانی بڑھتی ہے۔

مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب فیضیؔ نے بروقت اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اور بہت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مسئلہ کو منقح کردیا ہے، اس سلسلہ کی روایتوں کو خوب جمع کردیا ہے، اور ان کی اسنادی حیثیت بھی واضح کردی ہے، اس موضوع پر یہ کتاب بہت جامع اور مدلل ہے۔ موضوع کے عنوانات سے اس کی افادیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

مقدمہ	عقیدۂ مہدی پر مستقل تصانیف
فصل اول	تذکرۂ امام مہدی اور مختصر حالات
فصل دوم	احادیث مہدی
فصل سوم	احادیث مہدی مشہور ومتواتر ہیں
فصل چہارم	جمہور علماء امت کا اجماع
فصل پنجم	شکوک وشبہات اور ان کے جوابات

فصل ششم مدعیان مہدیت

کتاب کے ناشر ماشاء اللہ بہت خوش ذوق ہیں، کاغذاور کتابت وطباعت بہت معیاری ہے۔ قابل مطالعہ کتاب ہے۔

کتاب میں مرکزی اور ذیلی عنوانات بکثرت ہیں، مگر ناشر نے ترتیب فہرست پر دھیان نہیں دیا، یہ کمی ہے، آئندہ ایڈیشن میں اس کی تلافی کردیں۔

عرضِ ناشر محتاجِ اصلاح ہے، کسی سے اصلاح کرالینی چاہئے تھی۔

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں
مرتب : مولانا محمد عمران خاں ندویؒ
ترتیب جدید وحواشی : مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی، استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
صفحات : ۴۲۸
طباعت وکتابت : عمدہ
قیمت : ۱۴۰
ناشر : احیاءِ علم ودعوت، رفعت منزل 485/185 لکڑ منڈی، ڈالی گنج لکھنؤ

ساٹھ سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا ہوگا، مصر کے مشہور رسالہ ’’الہلال‘‘ میں ایک سلسلۂ مضامین ’’الکتب التی أفادتنی ‘‘(کتابیں جن سے میں نے استفادہ کیا) کے نام سے شائع ہوا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کو خیال ہوا کہ اس موضوع پر ہندوستان کے نامور اور جید علماء سے بھی مضامین حاصل کرنے چاہئیں، انھوں نے ہندوستان کی ممتاز ونامور شخصیتوں کے نام خطوط لکھے کہ وہ ان کتابوں کا ذکر کریں، جن کا ان کی سیرت کی تعمیر اور ان کے فکر وخیال کی تشکیل، اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں انقلاب انگیز اور بنیادی حصہ ہے۔

موضوع ہمارے ملک کی حد تک اچھوتا تھا۔ بہت سے اہل علم نے مضامین لکھ کر بھیجے، جو دار العلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان ’’الندوہ‘‘ میں شائع ہوئے، ان مضامین کا مجموعہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مضمون کے اضافے کے ساتھ ۱۹۴۶ء میں اس وقت کے مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء مولانا محمد عمران خاں ندوی نے مکتبہ دار العلوم کی طرف سے اپنے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ پچاس سال سے زائد عرصہ میں اس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے ملک میں نہیں شائع ہوا۔ حالانکہ یہ کتاب اہل علم کے لئے اس درجہ مفید ہے کہ ہر طالب علم بلکہ ہر صاحب علم کی

نگاہ میں رہنی چاہیئے، مجھے ایک مرتبہ اس کی تلاش ہوئی، تو بڑی مشکل سے دستیاب ہوسکی۔ البتہ ایک ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں کراچی، پاکستان سے شائع ہوا تھا۔

مولوی فیصل احمد بھٹکلی ندوی کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انھوں نے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے لئے بڑی محنت کی۔ موصوف نے اصل ''الندوہ'' اور ہندوستانی و پاکستانی دونوں ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر صحیح ترین متن مرتب کیا۔ مضامین نگار حضرات کا مختصر اور جامع تذکرہ ہر مضمون کے شروع میں تحریر کیا، کتاب میں آئے ہوئے اعلام واشخاص کا حواشی میں مختصر اور جامع تعارف لکھا، اور ساتھ ہی ساتھ ان مآخذ ومراجع کا بھی ذکر کیا، جہاں ان کا تفصیلی تذکرہ مل سکتا، ان مضامین میں جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا مختصر اور کہیں کہیں قدرے تفصیل سے تعارف کرادیا ہے، قرآن کریم کی آیتوں کا تعین، سورہ اور نمبر آیات کے ساتھ، احادیث نبویہ کی تخریج، اور اشعار کی تخریج وتحقیق وغیرہ کی ہے۔

اس طرح یہ کتاب جو بجائے خود نہایت دلچسپ اور مفید تھی، مرتب موصوف کے حواشی وتحقیق نے اس میں گویا چار چاند لگادئے، کتابوں اور اشخاص کے باب میں یہ ایک مختصر سا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔ کتابت وطباعت اور کاغذ کی عمدگی مزید برآں! مرتب موصوف نے بہت صحیح لکھا ہے:

> ''اس کتاب سے جہاں ماضی قریب کے برصغیر کے مشاہیر علم وادب کی محسن کتابوں کا علم ہوتا ہے، جنھوں نے ان کی شخصیت کی تعمیر اور ان کے افکار وخیالات کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، وہیں ان کی زندگی کے بعض مخفی گوشے بھی سامنے آتے ہیں، جن سے ان کے سوانح نگار کام لے سکتے ہیں''۔

مرتب موصوف شائقین علم وادب کی جانب سے شکریے اور دعائے خیر کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک بہت اہم علمی، تربیتی اور معلوماتی دستاویز تیار کردی ہے۔ ہر وہ شخص جس کو علمی ذوق ہو، اس کتاب کو بار بار پڑھے، اور فائدہ اُٹھائے۔ مدارسِ دینیہ کے طلبہ واساتذہ خاص طور سے اس کتاب کو اپنے مطالعہ میں رکھیں۔

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : زندگی سے لطف اٹھائیے
(اسوۂ حسنہ کی روشنی میں زندگی گزارنے کے سنہرے اصول)
مصنف : دکتور محمد بن عبدالرحمٰن العریفی
مترجم : حافظ قمر حسن
ناشر : مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، یوپی
(یہ کتاب مکتبہ ضیاء الکتب سے بھی طلب کی جاسکتی ہے)
صفحات : ۵۷۰
قیمت : ۲۵۰ روپئے
کتابت وطباعت : عمدہ

یہ کتاب ایک عرب عالم جناب ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن العریفی کی عربی تصنیف **استمتع بحیاتک** کا خوبصورت ترجمہ ہے، یہ کتاب کیا ہے؟ زندگی کو خوشگوار اور سہل بنانے کے اسلامی وشرعی طریقوں کا دلآویز مجموعہ ہے، آدمی اپنی زندگی میں، زندگی کے معاملات میں، زندگی کی مشکلات میں، کون سے راستے اختیار کرے؟ کیا طرز عمل اپنائے؟ اپنے قلب ودماغ کی سوچ اور فکر کا مرکز کسے بنائے؟ کہ زندگی آسان بھی ہو، خوشگوار بھی ہو، اور اسے اتباع سنت کی دولت گرانمایہ بھی حاصل ہو، لوگ بھی اس سے خوش ہوں اور اللہ بھی راضی ہو، مصنف نے بڑے عمدہ اُسلوب میں ان موضوعات کو اس کتاب میں پیش کیا ہے، بلکہ ایک ہمدرد اور شفیق استاذ کی طرح اپنے پڑھنے والوں کو سمجھایا ہے، دلچسپ واقعات اور اور دلنشیں مثالوں کے واسطے سے زندگی کے مسائل اور اس کی الجھنوں کے حل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور ہر ایک مسئلے میں رسول اکرم ﷺ اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ارشادات وواقعات کو ذکر کر کے ایمان وعمل کی ایک دنیا

سجادی ہے۔

آج کی زندگی باوجود مادّی وسائل کی ارزانی اور اسباب راحت کی فراوانی کے ہر شخص کے لئے ایک سنگین مسئلہ بنی ہوئی ہے، بے اطمینانی اور پریشانی میں ہر فرد ہچکولے کھا رہا ہے، سامان بہت ہیں مگر کون ہے جو کمی کا شاکی نہیں ہے، آج کی زبان میں ہمارا یہ دور ’’ٹینشن‘‘ کا دور ہے، اس صورت حال سے سب بے زار ہیں، مگر گھوم پھر کے سب اسی میں رہ جاتے ہیں۔

مصنف نے رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں اس بے اطمینانی اور پریشانی کا حل تلاش کیا ہے، اور ماشاء اللہ وہ اس تلاش میں کامیاب ہیں، انھوں نے بڑی دلسوزی سے اور بڑے خوبصورت پیرائے میں حیات نبوی کے نمونوں کو درج کیا ہے، کہ پڑھنے والا پڑھتا جائے اور اس کی دلچسپی بڑھتی جائے، اگر پڑھنے والا حوصلے سے کام لے، تو اس کی زندگی ایک خوشگوار فضا میں پہونچ جائے! اور ایمان میں بھی تازگی آجائے۔ بیان کا انداز بہت خوبصورت اور دلآویز ہے۔

مترجم نے ترجمہ بھی بہت خوبصورت کیا ہے، ترجمہ ایک مشکل عمل ہے، میرے سامنے اصل کتاب نہیں ہے، لیکن کتاب پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم اس مشکل وادی سے بحسن و خوبی گزرے ہیں، اتنی ضخیم کتاب کے ترجمے میں تبصرہ نگار کو اگر کہیں جھول محسوس ہو، تو ہوسکتا ہے، لیکن مجموعی اعتبار سے ترجمہ بہت اچھا اور کامیاب ہے، اور کتاب کے موضوع کے لحاظ سے بہت مناسب ہے۔ البتہ کتاب کے نام کے ترجمے میں خوش مذاقی کی کمی محسوس ہوتی ہے، یہ استمتع بحیاتک ٹھیٹ لفظی ترجمہ ہے، اس کے بجائے ’’زندگی کو خوشگوار بنایئے‘‘ یا ’’خوشگوار زندگی کا راز اسوۂ حسنہ کی روشنی میں‘‘ ہوتا، تو بہتر تھا۔

کتاب وطباعت، کاغذ اور جلد سب عمدہ ہے، مکتبۃ الفہیم کو مبارک باد ہے کہ ایسی خوبصورت، مفید اور روح پرور کتاب شائع کی!

ماخذ: ضیاءالاسلام۔ اپریل (۲۰۱۰)

☆☆☆☆☆☆

مقدمات وتقریظات

(۱) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ بحیثیت فقیہ ومجدد
(۲) غیر مقلدیت ۔ جماعت یا فرقہ؟
(۳) تأثر بر ’’حیات ابوالمآثر‘‘
(۴) جہاد اور شہادت
(۵) سیرت نبوی کی جامعیت کا ایک درخشاں پہلو
(۶) مقدمہ ’’اخلاق نبوی غزوات کے آئینے میں‘‘
(۷) تقریظ بر ’’مسجد نبوی میں تراویح عہد بعہد‘‘
(۸) اندلس اور ہندوستان
(۹) مقدمہ ’’قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے‘‘
(۱۰) تقریب بر ’’تذکرہ مولانا عبدالقیوم صاحب فتح پوری‘‘
(۱۱) علماء ومشائخ کے تذکرے کا دینی پہلو
(۱۲) تأثر بر ’’اپنی باتیں‘‘ (آپ بیتی مولانا زین العابدین معروفی صاحب نور اللہ مرقدہ)
(۱۳) فیضانِ حکیم الامت
(۱۴) مقدمہ ’’تبلیغی جماعت کی شرعی حیثیت‘‘

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ
بحیثیت فقیہ ومجدد

الحمدللہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا أن ھدانا اللہ ، والصلوٰۃ والسلام علیٰ من أرسلہ بالحق والھدایۃ وعلیٰ آلہ وأصحابہ وأتباعہ الذین لانقاذ الخلائق عن الضلالۃ والغوایۃ رحمھم اللہ وأکرمھم بالدرجات العلیٰ من الجنان.

نبی آخر الزماں سیّدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت جیسے خیر الامم اور آخر الامم ہے ویسے ہی یہ بہت زرخیز امت ہے، انسانیت کا جو بہتر سے بہتر نمونہ ہوسکتا ہے محبت الٰہی کے اعتبار سے، عبادت خداوندی کے لحاظ سے، اخلاق فاضلہ کے مقامات بلند کے اعتبار سے، ایثار ومروت کی حیثیت سے، غرض آدمیت کی ہر خوبی اور ہر کمال کے لحاظ سے، جو بلند سے بلند تر نمونہ ہوسکتا ہے، وہ امت میں بافراط پایا جاتا ہے، ابتدائی دور میں بہت کثرت سے، بعد کے زمانوں میں مقدار تو گھٹی ہے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ امت ان نمونوں سے خالی ہوگئی ہو، پوری امت کا خالی ہونا کیا معنی؟ ایسا بھی نہیں ہوا ہے کہ کوئی خاص وقت اور کوئی خاص جگہ ان دلآویز نمونوں سے خالی ہوئی ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

مثل أمتی مثل المطر لایدری اولہ خیر أم آخرہ (رواہ الترمذی فی ابواب الامثال) میری امت کی مثال بارش کے مانند ہے، نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس کا اول بہتر

ہے یا آخر!

یہ زبانِ نبوت سے امت کی زرخیزی کا بیان ہے، ہر دور میں امت کا دامن مثالی انسانوں کے روشن نمونوں سے لبریز رہا ہے، ہاں بیش وکم کا فرق ہوا ہے، اور ظاہر ہے کہ زمانۂ نبوت سے جس قدر بُعد ہوگا، زمانہ کی برکت اور انسانوں کی دینی استعداد میں فرق آتا جائے گا، چنانچہ اس کی خبر خود حضور سرور کائنات ﷺ نے دی ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے، راوی اس کے بھی حضرت انس بن مالک ؓ ہی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

لایاتی علیکم زمان إلا والذی بعده أشر منه حتیٰ تلقوا ربکم ۔

تم پر جو بھی وقت آئے گا، اس کے بعد والا اس سے برا ہوگا، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو۔ (کتاب الفتن، حدیث: ۷۰۶۸)

مجموعی اعتبار سے زمانۂ نبوت سے بُعد کا یہی قدرتی اثر ہے، مگر اس امت کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ بعض اتنی طاقتور شخصیتوں کو پیدا کرتے ہیں کہ ان کی قوت استعداد بُعد زمانی اور بُعد مکانی کے فاصلوں کو سمیٹ کر فیضان نبوت کو اس طرح جذب کرتی ہے کہ زمانے کا زمانہ ان سے متاثر ہوتا ہے، اور عہد نبوت کی برکتیں ان کے وجود سے پھیل جاتی ہیں، ہر دور اور ہر ملک میں حق تعالیٰ اس طرح کی بابرکت ہستیاں پیدا کرتے ہیں، تاکہ بُعد زمانہ کی وجہ سے اسلامی تعلیمات اور دینی عقائد واعمال پر بدعت وجہالت کے جو خس وخاشاک چھا جاتے ہیں، ان کا صفایا ہو جائے اور دین کے علم وعمل کا آفتاب از سر نو اپنی چمک دمک کے ساتھ روشن ہو جائے

ترجمان غیب ﷺ نے اپنی تعلیمات میں اس کی بھی نشاندہی فرما دی ہے، فرمایا:

إن اللہ یبعث لهذه الامة علیٰ راس کل مأئة سنة من یجدد لها دینها ۔

اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر ایک ایسے شخص کو اٹھائیں گے جو امت کے لئے اس کی دین کی تجدید کرے گا۔ (ابوداؤد شریف، کتاب الملاحم)

سو سال کی مدت میں چار نسلوں کا وجود ہو جاتا ہے۔ اس مدت میں دین کی تعلیمات پر، دینی عقائد واعمال پر نئی نئی بے سروپا باتوں کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے، چونکہ حق تعالیٰ کو اس دین کی بقا

قیامت تک منظور ہے، اسی لئے اس امت کی بنیادی کتاب قرآن مجید کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے، پس ہر صدی میں ایسی بزرگ ہستی کا وجود امت کی پوری تاریخ میں ملتا ہے، جو ان بے سروپا نئی نئی باتوں کے ڈھیر کو صاف کر کے علیحدہ کر دیتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے ملک ہندوستان اسلام کے زیر سایہ آیا، یہاں بھی ہر دور میں ایسی طاقتور ہستیاں یکے بعد دیگرے اور کبھی کبھی ایک ہی وقت میں متعدد شخصیتیں رہی ہیں، جنھوں نے دین کے متعدد شعبوں میں تجدیدی کارنامہ انجام دیا۔

مغلیہ حکومت کے عہد زوال میں جہاں مسلمانوں کی حکومت پر گردش آئی، وہیں دینی اعتبار سے عام مسلمانوں پر بھی بڑا زوال آیا۔ بدعات، رسوم ورواج اور جہل وضلالت کا وہ پھیلاؤ اور عروج ہوا کہ دین اسلام کی اصلی شکل وصورت ایک دبیز گہن میں آ گئی، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسلام کے نام پر اتنی نئی نئی باتیں پھیلیں کہ دین کا حلیہ ہی مسخ ہونے کا ندیشہ ہو گیا تھا۔

اس وقت حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے دہلی میں متعدد بزرگوں کو کھڑا کیا، جن کو حق تعالیٰ نے اسلام کی تجدید کے لئے ذریعہ بنایا، دسویں صدی ہجری کے عظیم مجدد حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے خانوادۂ تجدید کی مختلف شاخیں دہلی میں ان نازک حالات میں سرگرم عمل ہوئیں۔ حضرت خواجہ محمد زبیر المتوفی ۱۱۵۹ھ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ حضرت مرزا مظہر جان جاناں المتوفی ۱۱۹۳ھ، یہ وہ حضرات ہیں جن کے انفاس قدسیہ سے دین اسلام کی علمی اور عملی اعتبار سے تجدید ہوتی رہی، ان حضرات کے کارِ تجدید کی تکمیل کرنے والی شخصیتیں، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ، حضرت شاہ غلام علی المتوفی ۱۲۴۰ھ، اور حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۰ھ، سرگرم کار رہے، پھر تیرہویں صدی ہجری میں اسی خانوادے سے تربیت پا کر امیر المومنین حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہ اور ان کے خلفاء حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید، حضرت مولانا عبد الحی صاحب، حضرت مولانا شاہ ولایت علی عظیم آبادی المتوفی ۱۲۶۹ھ، اور حضرت مولانا کرامت علی جون پوری المتوفی ۱۲۹۰ھ، کا آوازۂ تجدید بلند ہوا، اور اس تجدید کا دائرہ پورے ملک کو محیط ہوا، صوبہ سرحد سے بنگال کے آخری

کناروں تک اور ہمالیہ کی پہاڑیوں سے مدراس کی جنوبی وادیوں تک اس تجدید کا آوازہ گونجا۔

حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہٗ کی شہادت کے کچھ عرصہ بعد (حضرت سیّد صاحب کی شہادت ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو ہوئی تھی) ہندوستان میں برطانیہ کا مکمل تسلط ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ہندوستان میں ایک عام بغاوت پھیلی، لیکن اس میں اہل ہند کو ناکامی ہوئی، وہ زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں بڑا قیامت خیز تھا، علماء ومشائخ کی اتنی بڑی تعداد کو انگریزوں نے جام شہادت پلایا کہ پورا ملک علماء سے خالی ہوگیا، حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہٗ کی تحریک وتجدید سے مسلمانوں میں جو اصلاحات ہوئی تھیں اس قیامت صغریٰ کے بعد جو لوگ ان اصلاحات کو سنبھالنے اور بقا کا اہتمام کرنے والے تھے، ان کی بڑی تعداد دنیا سے رخصت ہوگئی، اور عامۃ المسلمین پر دین کے علم وعمل کے اعتبار سے پھر مردنی چھانے لگی، اِدکا دُکا علماء مختلف علاقوں میں موجود تھے اور احیاء دین کے لئے کوشاں بھی تھے، مگر یہ کاوشیں محدود تھیں، ان کے ذریعے سے اصلاحات کا پیمانہ بھی مختصر تھا، علماء کے اٹھ جانے کی وجہ سے علم بھی ناپید ہونے لگا تھا، اور کسی مذہب کا علم اٹھ جاتا ہے تو اس مذہب کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

حق تعالیٰ کا احسان ہے اور بزرگوں کی دعاؤں کی برکت ہے کہ حکمت الٰہی نے ہندوستان کے اس تیرہٗ وتار دور میں اسلام اور اسلامی عقائد واعمال کے باقی رکھنے کا فیصلہ کیا، وہ لوگ جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد وقتال کا نعرہ بلند کیا تھا، اور ہتھیار لے کر ان کے خلاف صف آراء ہوئے تھے، ان کی بڑی تعداد موت کی نیند سلادی گئی، مگر ان میں سے چند اہم ..... بہت ہی اہم ..... لوگوں کی قدرت الٰہی نے حفاظت کی۔ سیّدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (رحمہم اللہ ورضی عنہم) اس جہاد کے بڑے داعیوں میں تھے، یہ حضرات جہاد وقتال کی قیادت کررہے تھے، حضرت حافظ محمد ضامن صاحب علیہ الرحمہ کی شہادت کے بعد جب انگریزوں کا غلبہ ہر طرف چھانے لگا، تو یہ تینوں بزرگ بھی دار وگیر کی زد میں آئے، مگر اللہ نے غیب سے حفاظت فرمائی، حضرت حاجی صاحب علیہ الرحمہ نے تو ہجرت کرکے مرکز اسلام مکہ معظّمہ زادھا اللہ شرفاً وکرامۃً میں اقامت اختیار کرلی، ان کے ساتھ ان کے دونوں بزرگ

خلفاء بھی ہجرت کرنا چاہتے تھے، مگر حکمت خداوندی کا جلوہ غالباً حضرت حاجی صاحب پر منکشف ہو چکا تھا، انھوں نے ان دونوں حضرات کو یہیں ہندوستان میں رہنے کی تلقین کی، وہ شاید دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانی مسلمان علم کی کمی کی وجہ سے گمرہی کے دلدل میں پھنس جائیں گے، اس سے بچانے کے لئے طاقتور، صاحب علم اور صاحب نسبت شخصیات کی ضرورت ہے، وہ محسوس کررہے تھے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ دونوں ہمدم ورفیق بہت موزوں ہیں۔

چنانچہ یہ دونوں بزرگ یعنی مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ یہیں رہ پڑے، انگریزوں کی طرف سے دونوں کی تلاش جاری رہی، حضرت گنگوہی گرفتار کر لئے گئے، چھ ماہ جیل میں وقت بسر کیا، حضرت نانوتوی ان کے ہاتھ نہ آسکے، پھر انتقام کی آگ سرد پڑی تو دونوں بزرگوں نے الگ الگ محاذ سنبھالا اور ایک محاذ پر دونوں رفیق وہمدم ودمساز رہے۔

حضرت نانوتوی نے خارجی محاذ سنبھالا، یعنی اسلام کے خلاف باہر سے طوفان کا جو ریلا حملہ آور ہوا، حضرت نانوتوی اس کے مقابلے میں ناقابل تسخیر آہنی دیوار بن گئے، مسلمانوں کی حکومت کا آخری چراغ گل ہونا تھا کہ گمراہوں اور گمراہ کنندوں کی ٹولیاں حشرات الارض کی طرح پھیلنے لگیں، عیسائی پادریوں کا ریلا یورپ سے چلا، آریہ سماجی یہیں کی زمین سے ابلے، پھر اہل اسلام ہی کے درمیان سے متعدد فرقے ابھارے گئے۔ حضرت نانوتوی نے باہر کے ان حملوں کا کامیاب مقابلہ کیا، لیکن مولانا نے محسوس کیا کہ ان گمراہیوں اور جہالتوں کا سدباب علم دین کی روشنی سے ہوسکتا ہے، چنانچہ حضرت نانوتوی نے اس ہنگامۂ داروگیر کے نودس سال بعد علوم اسلامی کا ناقابل تسخیر قلعہ دیوبند میں تعمیر کرنا شروع کیا، اس محاذ پر دونوں بزرگوار ساتھ رہے۔ دارالعلوم دیوبند کی شکل میں نور کا جو عظیم الشان مینار دیوبند میں تعمیر ہوا، آج ڈیڑھ صدی ہونے کو آئی، اب اس کا کارنامہ محتاجِ تعارف نہیں، تمام اسلامی دنیا اس سے اخذِ نور کررہی ہے۔

حضرت گنگوہی نے داخلی محاذ کو اپنا میدان عمل بنایا، داخلی محاذ کا مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام کی صحیح خطوط پر تربیت، عقائد کی تصحیح، اعمال کی درستگی، قلوب کی سلامتی اور روحانیت کی پرورش! دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ حدیث جبرئیل میں جن باتوں کی یکجائی تعلیم دی گئی ہے، ان میں سے ہر ایک کو مسلمانوں میں زندہ کرنا، یہ تھا حضرت گنگوہی کا مشن! حضرت نانوتوی تو

اپنے محاذ پر کامیابی حاصل کر کے اور اس محاذ پر کام کرنے کے لئے ایک پختہ کار جماعت تیار کر کے تیرہویں صدی ہجری کے خاتمہ سے چند سال پہلے ہی حضورِ حق میں بلا لئے گئے، حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ چودھویں صدی کے تقریباً چوتھائی حصہ میں سرگرمِ عمل رہے۔

حضرت گنگوہی کے کارناموں کی قدرے تفصیل سے پہلے میں حدیث جبرئیل کو تحریر کر دینا چاہتا ہوں، جس کا ذکر حضرت گنگوہی کے میدانِ عمل کے سرنامے کے طور پر کیا گیا ہے۔

یہ مسلم شریف کی پہلی حدیث ہے، راوی اس کے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما ہیں، روایت کا حاصل یہ ہے کہ:

”ایک روز ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، اسی دوران ایک صاحب مجلس مبارک میں آئے، کپڑے ان کے بہت صاف شفاف اور بال نہایت سیاہ تھے، ان کے اوپر سفر کا کوئی اثر نہ تھا، لیکن ہم میں سے کوئی انھیں پہچانتا نہ تھا، وہ نبی ﷺ کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے، اور اپنے ہاتھ اپنے زانو پر رکھ لئے، اور عرض کیا:

اے محمد! مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے کہ وہ کیا ہے؟

فرمایا: اسلام یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت کی، اور محمد کے رسول ہونے کی شہادت دو، اور نماز کا اہتمام کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کا روزہ رکھو، اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔

عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا!

ہمیں حیرت ہوئی کہ یہ صاحب پوچھ بھی رہے ہیں اور تصدیق بھی کر رہے ہیں۔

پھر عرض کیا: ایمان کے بارے میں بتائیے کہ وہ کیا ہے؟

فرمایا: ایمان یہ ہے کہ اللہ پر یقین کرو، اور اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخر پر، اور تقدیر پر وہ خیر ہو یا شر، یقین کرو۔

عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا، اچھا احسان کے متعلق بتائیے کہ وہ کیا ہے؟

فرمایا: اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

عرض کیا: قیامت کے متعلق خبر دیجئے، کہ وہ کب آئے گی؟

فرمایا: جس سے یہ بات پوچھی جارہی ہے، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔

عرض کیا: اچھا اس کی کچھ علامتیں ہی بتادیجئے!

فرمایا: (۱) جب باندی اپنی مالکہ کو جنے۔ (۲) اور جب دیکھو کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن مفلس اور بکریوں کے چرواہے لمبی لمبی عمارتیں بنانے لگیں۔

پھر وہ صاحب چلے گئے، پھر عرصے کے بعد حضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عمر! تمہیں کچھ پتہ ہے کہ یہ پوچھنے والے کون صاحب تھے؟۔

میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔

فرمایا: وہ جبرئیل تھے، تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مومن کے لئے دین اسلام کی تکمیل کا انحصار تین باتوں پر ہے، ان تینوں کے رسوخ اور پختگی سے آدمی کا دین کامل ہوتا ہے۔

(۱) اسلام: یعنی توحید و رسالت کا اقرار اور اس کی شہادت، اور چاروں فرائض کا اہتمام، یہ پانچوں چیزیں اسلام کی بنیاد ہیں۔ دین کا ظہور آدمی پر انھیں پانچ باتوں سے ہوتا ہے۔

(۲) ایمان: یعنی باتوں کی تصدیق اور دل سے ان کا یقین! اللہ کی ذات کا، فرشتوں کا، کتب الٰہیہ کا، اللہ کے رسولوں کا، روزِ قیامت اور تقدیر کا یقین اور ان کی تصدیق۔

(۳) احسان: یعنی عبادت اور بندگی کی یہ کیفیت کہ خود کو ہمہ وقت حق تعالیٰ کے حضور میں محسوس کرے

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ نے دین کے ان تینوں شعبوں کی خدمت کے لئے خود کو وقف کیا، اور زندگی کی آخری سانس تک اسی نہج پر مسلمانوں کی تربیت کا بڑے وسیع اور اعلیٰ پیمانے پر اہتمام کرتے رہے۔

اس فریضے کی ادائیگی کے لئے ظاہر ہے کہ علم میں رسوخ، عمل میں پختگی، نسبت مع اللہ یعنی کیفیت احسانی میں استقامت، اور ان سب کے ساتھ عقل و رائے کی اصابت اور کامل درجے کی ہمت و شجاعت کا جامع ہونا شرط ہے۔

توفیق خداوندی سے جو ان سب باتوں کا جامع ہوگا، اس سے تجدید دین کا کام خوب ہوگا۔ ہم جب مولانا کے حالاتِ زندگی دیکھتے ہیں، تو ان میں یہ سب اوصاف بدرجۂ کمال نظر

آتے ہیں۔

علم میں رسوخ کا مدار تین چیزوں پر ہے، قرآن کریم کی صحیح سمجھ، سنت کا وسیع اور پختہ علم اور قرآن وسنت سے استنباط واستخراج کا ملکہ، یعنی علم فقہ میں مہارت۔ ان تینوں باتوں کو اگر ہم مختصر اور بلیغ تعبیر میں ادا کرنا چاہیں تو حدیث کی زبان میں اسے تفقہ فی الدین کہیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ: **من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین۔**

اللہ تعالیٰ کو جس شخص کے ساتھ خیر منظور ہوتا ہے اسے دین کے اندر فہم عطا فرماتے ہیں

دین کی یہ سمجھ، دین کے تمام امور اور احکام کو عام ہے، خواہ وہ عقائد ہوں، اعمال ظاہرہ ہوں یا اعمال باطنہ ہوں۔ اعمال ظاہرہ کے متعلق احکام وقوانین کی تعبیر اصطلاح میں ”علم فقہ“ سے کی جاتی ہے، اور اعمال باطنہ کی درستگی اور ان کے اصلاح کے طریقوں کو ”تصوف وسلوک“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ علم کے ان تینوں شعبوں کے امام تھے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ انھیں کمال درجہ ”تفقہ فی الدین“ حاصل تھا۔ حضرت کا یہ ”تفقہ فی الدین“ ہندوستان کی امت مسلمہ کے لئے حق تعالیٰ کا خصوصی عطیہ تھا۔ جہالت اور بدعت کی گھنیری تاریکی میں حضرت نے اسی کی مدد سے قرآن وسنت کی وہ شمع روشن کی، جس کا نور آپ کے فتاویٰ، تصنیفات، تلامذہ وخلفاء اور دارالعلوم دیوبند کے واسطے سے پورے ملک میں پھیلا۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کی شکست کے بعد ۶/۵ سال تک ہنگامۂ داروگیر چلتا رہا، اس کے بعد جب حکومت برطانیہ کا قدم مضبوطی سے یہاں جم گیا، اور ہندوستان میں بچے کھچے علماء ومشائخ نے محسوس کیا کہ اب حرب وضرب کے بجائے اہل اسلام کو اور ان کے دین کو اور تعلیمات دین کو بچانا ضروری ہے، تو ہمارے حضرات نے میدانِ عمل بدل دیا۔ ۱۸۶۶ء میں دار العلوم دیوبند کا قیام ہوا، اس وقت سے حضرت گنگوہیؒ کی وفات ۱۹۰۵ء تک ایک خاصا عرصہ میسر آیا، جس میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ نے اپنے رفقاء اور خلفاء وتلامذہ کی رفاقت میں دین کے عملی وعلمی اور روحانی میدان میں تجدیدی کارنامے انجام دیئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ تو زمانۂ طالب علمی سے رفیق تھے،

یہ دونوں بزرگ ایک جان دو قالب تھے، دونوں نے ایک ہی بزرگ حضرت مولانا مملوک العلی علیہ الرحمہ کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی، پھر ایک ہی استاذ وشیخ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی المتوفی ۱۲۹۶ھ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، پھر دونوں ایک ہی بزرگ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ المتوفی ۱۳۱۷ھ سے بیعت ہوئے، اور انھیں سے خلافت پائی، دونوں ۱۸۵۷ء کے جہاد، شاملی میں دوش بدوش رہے، دارالعلوم دیوبند کے قیام میں دونوں ہمدم ورفیق رہے۔ تیرہ چودہ سال حضرت نانوتویؒ کی سرپرستی ونگرانی میں مدرسہ رہا، اور پشت پناہی ورفاقت حضرت گنگوہی کی رہی۔ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوگیا، تو اب یہ پورا بوجھ حضرت گنگوہی پر آ گیا۔ ۲۵/۲۶ رسال تک حضرت گنگوہیؒ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست رہے، اسی کے ساتھ علوم دینیہ کے دوسرے مرکز جامعہ مظاہرعلوم سہارن پور کے بھی سرپرست رہے، خود گنگوہ میں درس وتدریس کی بساط بچھائے رکھی، باصلاحیت افراد واشخاص کی روحانی تربیت فرماتے رہے، اس عرصے میں انھوں نے علم وعمل اور روحانیت کے وہ بلند مینار اور نمونے قائم کردئے کہ دین ودیانت کی تازہ لہریں پورے ملک میں چلنے لگیں۔

کسی نے کہا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

سر سے قدم تک جہاں بھی نظر پڑتی ہے، ہر جلوہ دامن دل کو کھینچتا ہے، کہ جگہ تو یہ ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے فتاویٰ کا ایک حصہ بہت پہلے شائع ہوا تھا، لیکن چونکہ حضرت گنگوہیؒ اپنے دور میں فتاویٰ کے لئے پورے ملک کے مرجع اور مرکز تھے، اس لئے فتاویٰ کی ایک بڑی تعداد غیر مطبوعہ رہ گئی، اللہ نے اپنے ایک باتوفیق بندے کو توفیق مزید بخشی کہ ان باقی غیر مطبوعہ فتاویٰ کو بھی تلاش کر کے اکٹھا کرے، یہ ایک مشکل کام تھا، بہت محنت اور بہت دیدہ ریزی چاہتا ہے، مگر جس کے لئے وہ قادر مطلق آسان کردیں۔

اللہ کا ایک اور بندہ جو عاجز وقاصر ہے، بڑی دیر سے سوچ رہا ہے، کہ ان فتاویٰ کی روشنی میں حضرت گنگوہی کے تفقہ فی الدین کو جانے پہچانے اور دوسرے کو پہچوانے کی کوشش کرے، مگر جب ان کی شخصیت پر نگاہ پڑتی ہے تو جمال وکمال کے اتنے مظاہر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں

کہ کرشمہ دامن دل می کشد کی جا اینجاست

کئی صفحات آپ پڑھ چکے ہیں، مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں لکھ سکا ہوں، حضرت گنگوہیؒ کے تفقہ فی الدین کا تعارف مجھ جیسے قلیل البضاعت کی دسترس سے باہر ہے، اس کمال کے تعارف کے لئے ایک نابغۂ روزگار محدث وفقیہ اور عبقری شخصیت حضرت علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیری کا ارشاد نقل کرتا ہوں۔

مشہور مصری عالم علامہ سید رشید رضا علیہ الرحمہ ۱۳۳۰ھ میں دار العلوم دیو بند تشریف لائے، ان کی آمد کی تقریب سے دار العلوم میں ایک علمی جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ میں حضرت علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ نے دار العلوم کے درس حدیث کی خصوصیات، فقہ الحدیث کے اہتمام کا تعارف بہت عمدہ پیرائے میں کرایا تھا، اس ضمن میں سلسلۂ حدیث کے اکابر اساتذہ کا تذکرہ بھی فرمایا۔ فرماتے ہیں:

> ”حضرت شاہ عبد الغنی مجددی علیہ الرحمہ سے، شمس الاسلام والمسلمین، عارف باللہ، حافظ محقق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانئ دار العلوم دیو بند، اور فقیہ، حافظ، مجتہد، ولی کامل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔
>
> حضرت نانوتوی نے معارف وحقائق میں نیز مادہ پرستوں اور دہریوں کے خلاف محققانہ کتابیں تحریر فرمائیں، جن سے حق تعالیٰ نے بہت نفع پہونچایا۔
>
> اور حضرت گنگوہی کی خدمت میں بکثرت استفتاء اور سوالات آتے رہے، یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ حق وباطل میں بہت التباس واشتباہ ہو گیا تھا، حضرت نے ان مسائل کے صحیح جواب دئے، وہ فقیہ تھے، مجتہد تھے، پس اصول میں ہم نے حضرت نانوتوی کو اپنا امام اور پیشوا مانا، اور فروع میں حضرت گنگوہیؒ کو اپنا امام ومقتدا قرار دیا، اور ان دونوں بزرگوں سے نہایت صاف ستھرا علم ہمیں نصیب ہوا۔ (نفحة العنبر، ص: ۱۷)

حضرت شاہ صاحب نے حضرت گنگوہی کی شان میں بزبان عربی ایک قصیدہ لکھا ہے، جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فقیہ حافظ علم شهیر   کصبح مستنیر هدی سار
الیه المنتهی حفظاً وفقهاً   واضحی فی الروایة کالمدار

ففی التحدیث رحلة کل راوٍ　　وفی الاخبار عمدة کل قاری
فقیه النفس مجتهد مطاع　　وکوثر علمه بالخیر جاری
واحییٰ سنة کانت أمیتت　　وإذ وضح النهار فلاتمار
(نفحة العنبر، ص:۱۷۳)

وہ فقیہ ہیں، حافظ ہیں، مشہور نشان ہیں جیسے روشن صبح، جو مسافروں کے حق میں رہنما ہے۔ حفظ (حدیث) میں اور فقہ میں وہ انتہائی مقام پر ہیں، اور روایت میں وہ مثل مدار کے ہیں۔ علم حدیث میں وہ ہر راوی کی منزل ہیں، اور اخبار وآثار میں ہر قاری کا مدار انھیں پر ہے۔ وہ فقیہ النفس ہیں، مجتہد ہیں، مقتدا ہیں، ان کے علم کا حوض کوثر خیر کے ساتھ جاری ہے۔ انھوں نے مردہ سنت کو زندہ کیا جب دن واضح ہوجائے، تو جھگڑا نہ کرو۔

یہ بات وہ کہہ رہا ہے جو اپنے دور کا مسلم محدث کبیر ہے، جس کا حافظہ متقدمین علماء حدیث کے حافظے کی یاد تازہ کر رہا تھا، اور جس کی ذکاوت وذہانت کا اعتراف اکابر واصاغر سب نے کیا۔

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کے بارے میں اور باتوں کے ساتھ دو باتیں حضرت شاہ صاحب نے خاص طور پر جو بیان فرمائی ہیں، وہ یہ کہ ’’فقیہ النفس‘‘ تھے، اور یہ کہ وہ ’’مجتہد‘‘ تھے۔

فقیہ النفس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی توفیق سے ان کی علمی وعقلی صلاحیت واستعداد تفقہ فی الدین کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، قرآن سنت پر ان کی نظر کی وسعت اور ادراک کی گیرائی کی وجہ سے انھیں دینی علوم میں وہ ملکہ اور رسوخ حاصل ہوگیا تھا کہ کسی بھی واقعہ اور کسی بھی مسئلہ میں ابتداء ہی سے ان کی نظر صحیح فیصلہ پر پہونچتی تھی، بعد میں تحقیق کرنے والے جتنی بھی تحقیق کریں، کتابوں کی مراجعت کریں، صحت وصواب کا مرکز وہی رائے ہوتی ہے جس کی طرف اول مرتبہ میں حضرت کی نگاہ پہونچی ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ کسی مسئلے میں علماء کی رائیں اور تحقیقات مختلف ہوتیں، اور کوئی کسی کی رائے پر متفق نہ ہوتا، پھر اس کا فیصلہ حضرت کی خدمت میں لایا جاتا، پھر آپ مسئلہ کی حقیقت تک پہونچ کر اس کو اس طرح واضح فرماتے کہ سب مطمئن ہوجاتے، آپ کا ذہن ثاقب مسئلہ کی تہ میں

پہونچتا، بڑے بڑے علماء اپنے اشکالات پیس کرتے اور اس کا مکمل حل انھیں مل جاتا۔ تذکرۃ الرشید میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب علیہ الرحمہ کے متعدد دقیق سوالات نقل کئے گئے ہیں، ان کے جوابات کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت واقعی مجتہدانہ دل ودماغ رکھتے تھے۔

مجھے یہاں مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ حضرت کے فتاویٰ قارئین کے سامنے ہیں، ہر فتویٰ حضرت اقدس کے فقیہ النفس اور مجتہد ہونے کی شہادت ہے۔

جس دور میں حضرت کے درس وتدریس اور افتاء وتفقہ کا آغاز ہوا، پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ وہ دور ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ہے، اس دور میں علم کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ دور دور تک علماء کا نام ونشان نہ تھا، سنت کی جگہ بدعت کا غلغلہ تھا۔ مغلیہ حکومت کے زوال میں رافضیوں کا اچھا خاصا دخل تھا، چنانچہ شیعیت کے اثرات پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، پنجاب سے بنگال تک ہر طرف شیعوں کا عمل دخل تھا، بالخصوص نوابانِ اودھ کی وجہ سے پورا اتر پردیش رافضیت کی زد میں تھا۔ جہالت اور رافضیت کی ملی بھگت نے اہل سنت والجماعت میں بھی طرح طرح کی بدعات اور رسوم کو پیدا کر رکھا تھا، اس وقت کی بہت سی بدعات وخرافات کو آج لوگ جانتے بھی نہیں، لیکن اس دور میں وہ سب ایمان واسلام کے اجزاء ہی نہیں، مدار کار انھیں پر تھا۔

ماہ محرم کی بدعات شیعوں کے یہاں سے متعدی ہوکر سنیوں میں بھی اس طرح پیوست ہوگئی تھیں کہ اس ماہ میں پورا مسلم معاشرہ وقف تعزیہ وماتم ہوجاتا تھا، قلوب واذہان میں ان خرافات کا ایسا رسوخ تھا کہ ان کے خلاف زبان کھولنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ شادی غمی کے مواقع پر بدعات ورسوم کا وہ لامتناہی سلسلہ ہوتا، کہ دین اسلام کا نقشہ ہی بدل جاتا، نمازیں نہ ہوں، مسجدیں ویران ہوں، روزہ کی کوئی پوچھ نہ ہو، کچھ حرج نہیں، لیکن تیجہ، دسواں، بیسواں، چہلم، برسی، نیاز فاتحہ گیارہویں، ماہ رجب کے کونڈے، شب برأت کے حلوے پٹاخے، عرس، قوالی، مولود، قیام وغیرہ جن کا قرآن وحدیث میں، فقہ کی کتابوں میں، قرون اولیٰ کے اسلامی معاشرہ میں کہیں پتہ نہیں، وہ سب جزو ایمان اور مدار حقانیت بنے ہوئے تھے، ان کے خلاف آواز اٹھانا، اپنے آپ کو مصائب اور تہمتوں کا نشانہ بنانا تھا۔

اور عقائد کے بگاڑ کا یہ حال تھا کہ ہر پختہ قبر میں دفن ہونے والا....خواہ کوئی بھی ہو....

بندگی اور غلامی سے بلند ہو کر خدائی اختیارات کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری علیہما الرحمہ کے اختیارات وتصرفات تو ان کے خالق و مالک سے بھی آگے بڑھا دیئے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات وصفات میں اتنا غلو کیا گیا تھا جس کا کنارہ ملنا مشکل تھا۔ ایسے وقت میں دین اسلام کی اصل تعلیمات کو ان کی اصل شکل میں لانا، بدعات کے خلاف آواز اٹھانا، سنتوں کو زندہ کرنا جہاں بہت شجاعت وہمت کو چاہتا ہے، وہیں تفقہ فی الدین بدرجۂ اتم کا متقاضی ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے قلب مبارک میں حق تعالیٰ نے احیاء سنت اور قطع بدعت کا وہ جذبۂ وجوش بھر دیا تھا، اور اس کی ایسی شناخت عطا فرمائی تھی کہ کوئی بدعت اپنا روپ بدل کر سنت یا مستحب کے رنگ میں نہیں آسکتی تھی، لوگ مختلف انداز سے، مختلف اطراف سے، مختلف لوگوں کے فتاویٰ اور تحریرات کی روشنی میں سوالات کرتے تھے، مگر حضرت کی نگاہِ عالمانہ اور فراستِ مومنانہ ہر ایک عقیدہ وعمل کی وہ حیثیت متعین کر دیتی تھی جو قرآن وسنت کی روشنی میں واقعی ہوتی تھی، اور اس میں کسی مداہنت کا گزر نہ تھا۔ چاہے جتنی مخالفت ہو، خواہ کوئی تہمت لگے، مگر جو حق تھا، جو صداقت تھی، اس سے کبھی سر مو نہیں ہٹے۔

اس دور کا جہاد یہ تھا کہ دین اسلام اور سنت رسول اللہ ﷺ کے صاف ستھرے اور روشن چہرے پر بدعتوں اور جہالتوں کے جو گرد وغبار چھا گئے تھے، انھیں صاف کیا جائے، بعض بدعتوں بلکہ اکثر بدعتوں نے ایسے تقدس کا رنگ اختیار کر لیا تھا کہ شاید کسی کو وہم بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ بھی کچھ غیر شرعی چیزیں ہیں، جیسے مولود خوانی جس میں نبی کریم ﷺ کی ولادت کا ذکر نثر ونظم میں کیا جاتا تھا، اور اس کے لئے بڑے اہتمام سے مجلس سجائی جاتی تھی، روشنی کا اور خوشبو کا التزام واہتمام ہوتا، اہل مجلس کو شیرینی تقسیم کی جاتی۔ اس مجلس کے تقدس کا ایسا عقیدہ دلوں میں جما دیا گیا تھا کہ بہ نفس نفیس حضرت رسالت مآب ﷺ اس میں تشریف لاتے ہیں، اسی لئے اس میں کھڑا ہونا اور بہت ادب واحترام سے ایک مخصوص سلام پڑھنا ضروری تھا۔ پھر یہ نہیں کہ اس کا رواج صرف ہندوستان میں رہا ہو، مرکز اسلام سرزمین عرب اور خلافت اسلامیہ ترکی وقسطنطنیہ میں بھی اس کا برملا رواج تھا۔ خاص خاص علماء اپنی خصوصی مجالس اور خصوصی تحریروں میں اس کے بدعت ہونے

کا اعتراف کرتے تھے، مگر کھلے طور پر عوام میں اس کی نکیر کرنے اور دلوں میں جمی ہوئی عقیدت کو نکالنے کا حوصلہ حضرت گنگوہی ہی کو ہوا۔ ان کے فتاوے جب اس موضوع پر آنے لگے تو عوام میں غل مچ گیا، لیکن حضرت کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ ان کے فتویٰ کو کوئی ہلکا سمجھتا، بہرحال بدعت کے ماحول میں ایک زلزلہ سا آ گیا، خود وہ لوگ جو حضرت کے قریبی، بلکہ حضرت کے پیر بھائی تھے، انھوں نے مخالفت پر کمر کسی، گنگوہ کی قریبی آبادی رام پور، جو چند پشت پہلے حضرت کے آباء واجداد کا وطن تھا، وہاں کے ایک صاحب علم مولوی عبدالسمیع صاحب جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی علیہ الرحمہ سے بیعت تھے، وہ ان بدعات کی حمایت میں کمر باندھ کر کھڑے ہوئے، اور ''انوار ساطعہ'' کے نام سے بدعات کی اتنی زبردست وکالت کی، کہ اس وقت کی رائج الوقت ہر بدعت سکہ بند کار ثواب بن گئی۔ حضرت گنگوہیؒ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ سے اپنی نگرانی میں اور اپنی منشا کے مطابق اس کا جوابِ قاطع ''براہین قاطعہ'' کے نام سے لکھوایا، اور کتاب چھپی تو صرف جواب نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ انوار ساطعہ کو بھی اس میں شامل رکھا، تاکہ اصل بات اور اس کا جواب دونوں بیک وقت سامنے آجائے۔

جب یہ کتاب شائع ہوئی، تو ایوانِ بدعت میں بھونچال آ گیا۔ مخالفت، بدزبانی، تہمت طرازی سے بات آگے کفر سازی تک بڑھ گئی، مگر وہ ایک کوہِ استقلال تھا، عزم وشجاعت کا پہاڑ تھا، تفقہ فی الدین کا سرمایہ دار تھا، مخالفت کے طوفان آتے تھے، مگر علم اور عزیمت کی اس چٹان سے ٹکرا کر واپس چلے جاتے تھے۔

تاریخ علمائے حق کے عینی شاہد اور معتبر راوی حضرت امیر شاہ خاں فرماتے ہیں کہ:

> ''مولانا گنگوہی کی طبیعت علیل تھی، میں آپ کے پاس اکیلا تھا اور پاؤں دبا رہا تھا، یہ زمانہ وہ تھا، جس میں براہین قاطعہ شائع ہوئی تھی، اور اس پر لوگوں کی شورش ہو رہی تھی، حضرت نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ تخت پر جلوہ افروز ہیں، اور مجھے سامنے کھڑا کیا ہے، اور مجھ سے امتحاناً سو مسئلے دریافت کئے، اور سو کے سو کا میں نے جواب دیدیا ہے، اور آپ نے سب کی تصویب فرمائی، اور نہایت مسرور ہوئے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس روز سے میں نہایت خوش ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ اگر سارے عالم میرے خلاف ہوں گے تو بھی

ان شاءاللہ حق میری جانب ہوگا‘‘۔ (امیرالروایات)

یہ خواب مبشرات میں سے ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کوتفقہ فی الدین کا کیا مقام حاصل تھا۔ حضرت کے فتاوے اور تحریرات بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئے، ان امور کا بدعت ہونا ایسا واضح ہوا، اور سنت وشریعت کا جلوہ اتنا بے غبار ہوا کہ آج ان دونوں میں فرق و امتیاز کرنا ذرا بھی مشکل نہیں۔

عقائد حقہ اور اعمال مسنونہ کے مقابلے میں جتنے عقائد باطلہ اور اعمال بدعیہ کا رواج ہوا تھا، حضرت گنگوہیؒ کے تفقہ اور عزیمت وشجاعت کی بدولت سب علیٰحدہ علیٰحدہ ہوگئے، اور **جاء الحق وزھق الباطل** کا وعدہ پورا ہوا۔

حضرت نے اس کتاب میں بدعت کے تمام اصول واضح کردئے ہیں، آج بھی اگر کوئی اسے بغور پڑھے تو تمام رائج الوقت اعمال وتحریکات میں بدعت وسنت کا بخوبی ادراک کرسکتا ہے۔

بدعت وسنت کی توضیح وتنقیح میں حضرت کی تحریرات متعدد ہیں، براہین قاطعہ میں تو سب کا تفصیلی بیان ہے، اس کے علاوہ فتاویٰ کی شکل میں آپ خود اسی مجموعۂ فتاویٰ میں ملاحظہ کریں گے، نیز اس موضوع پر بہت بیش قیمت اور پُر مغز وہ مکاتیب ہیں جو حضرت اقدس حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے سوالات کے جواب میں لکھے گئے ہیں، ابتداء میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ مجالس مولود کے بارے میں نرم رائے رکھتے تھے، اور ان میں شریک ہوتے تھے، حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ نے اس پر نکیر فرمائی، تو اس موضوع پر بہت علمی مراسلت دونوں بزرگوں کے درمیان ہوئی، حضرت تھانوی کے عالمانہ اشکالات اور دقیق سوالات کے حضرت گنگوہیؒ نے جو بصیرت افروز جوابات تحریر فرمائے، وہ ان کے فقیہ النفس اور مجتہد ہونے کی روشن دلیل ہے۔

یہ مکاتبت ’’تذکرۃ الرشید‘‘ میں من وعن محفوظ کردی گئی ہے، واقعہ یہ ہے، کہ اگر اس دور میں سنت وبدعت کے مسئلہ کی حضرت گنگوہی نے اس درجہ توضیح وتنقیح نہ کردی ہوتی، تو آج دونوں کے درمیان خط فاصل کھینچنا مشکل ہوتا۔ حضرت گنگوہی کے انتقال کو سو سال سے زیادہ

عرصہ گزر گیا ہے، اب پھر شریعت وسنت پر بدعات کی یلغار ہو چلی ہے، لیکن آج بھی اگر کوئی اس مسئلے کو وضاحت اور تنقیح وتحقیق کے ساتھ سمجھنا اور بدعت کو سنت سے الگ کرنا چاہے تو حضرت کے مضامین ومقالات میں مکمل رہنمائی موجود ہے، بشرطیکہ دیانت داری کے ساتھ ان اصول وقواعد کی روشنی میں رائج الوقت رسوم اور طریقوں کا جائزہ کما حقہ لیا جائے۔

تفقہ فی الدین کے ساتھ حضرت مولانا گنگوہی نے اپنے حلقۂ بیعت ودرس میں ایسے علماء اور مشائخ کی تربیت فرمائی، جو حضرت کے بعد دین اسلام اور سنت وشریعت کے محافظ ثابت ہوئے، ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کے بڑے بڑے علماء دین، جو علمی تبحر اور جودت عقل وذہن کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے، وہ حضرت گنگوہی کی تربیت میں اپنے اوصاف وخصائص کو دین کی حفاظت، اس کی ترویج واشاعت اور اللہ ورسول کی محبت میں فنا کرنے کا ہنر سیکھ رہے تھے، اس وقت تعلیم دین کے دو مراکز دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور، حضرت کے ساختہ پرداختہ حضرات کے مرکز تھے، پھر وہاں سے سارے ہندوستان میں علم وعمل کی روشنی پھیل رہی تھی، اور آج بھی جہاں حق وصداقت اور سنت وشریعت کا جلوہ ہے، وہ انھیں دونوں اداروں کا فیض ہے، اور یہ دونوں ادارے پورے طور پر حضرت گنگوہی کے زیر اثر رہے ہیں۔

میں ان بزرگوں کے تذکروں کی تفصیل میں نہیں جاتا، جو حضرت گنگوہیؒ کے دائرۂ تربیت میں آفتاب وماہتاب بنے ہیں، یہ بہت طویل الذیل موضوع ہے، جس کا یہ مختصر سا مضمون متحمل نہیں ہے، میں نے صرف اشارے کر دئے ہیں، تفصیلات سے اہل علم ونظر واقف ہیں۔

آخر میں اس مضمون کا خاتمہ میں حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کے ان جامع، بلیغ اور مبنی بر حقیقت کلمات پر کرتا ہوں، جو انھوں نے اپنے والد گرامی حضرت مولانا سیّد عبدالحی صاحب علیہ الرحمہ کی تصنیف **نزهة الخواطر** کی کے تکملہ میں تحریر فرمائے ہیں، خیال رہے کہ مولانا سیّد عبدالحی صاحب ۱۳۱۲ھ میں حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور بغایت متاثر ہوئے تھے، حضرت مولانا علی میاں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے والد کی لفظ بلفظ ترجمانی ہے۔

”وکان آیة باهرة ونعمة ظاهرة فی التقویٰ واتباع السنة النبویة

والعمل بالعزيمة والاستقامة على الشريعة ورفض البدع ومحدثات الامور ومحاربتها بكل طريق والحرص علىٰ نشر السنة وإعلاء شعائر الاسلام والصدع بالحق وبيان الحكم الشرعي.

ثم لايبالي بما يتقاول فيه الناس ولا يقبل تحريفاً ولايتحمل منكراً ولايعرف المحاباة والمداهنة في الدين مع ماطبعه من التواضع والرفق واللين دائراً مع الحق حيث ما دار ويرجع عن قوله إذا تبين له الصواب ،

انتهت إليه الامامة في العلم والعمل ورئاسة تربية المريدين وتزكية النفوس والدعاء إلى الله واحياء السنة إماتة البدع ''(الاعلام بمن في تاريخ الهند من الاعلام ،المعروف به نزهة الخواطر ،ج:۸،ص:)

وہ ورع وتقویٰ میں، اتباع سنت میں، عزیمت پر عمل کرنے میں، شریعت پر استقامت میں، بدعات وخرافات کے ردو انکار اور ان کے خلاف کھلی جنگ میں، سنت کی نشر وترویج میں، اسلامی شعائر کے اعلاء واظہار میں، حق وصداقت کے برملا اعلان میں اور حکم شرعی کے واضح بیان کے اہتمام میں ایک روشن نشان اور حق تعالیٰ کے عظیم احسان تھے۔

وہ حق وصداقت کے اظہار کے بعد لوگوں کے کچھ کہنے سننے کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، ان کے یہاں نہ کسی تحریف کا گزر تھا، نہ انھیں کوئی منکر گوارا تھا، وہ دین کے باب میں جانبداری اور مداہنت جانتے ہی نہ تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ طبعاً نہایت متواضع، خوش مزاج اور نرم دل تھے حق کے ساتھ رہتے، جدھر بھی وہ ہوتا، اگر ان کی رائے کے خلاف درستگی ظاہر ہوتی، تو فوراً رجوع کر لیتے۔

علم وعمل میں، مریدین کی تربیت اور نفوس کے تزکیہ، دعوت الی اللہ، احیاء سنت اور قطع بدعت میں امامت کا درجہ..... ان کے زمانے میں..... انھیں پر ختم تھا۔''

اعجاز احمد اعظمی

۲۲؍محرم الحرام ۱۴۳۱ھ/ ۹؍جنوری ۲۰۱۰ء شنبہ

☆☆☆☆☆☆

غیرمقلد۔ جماعت یا فرقہ؟

(مقدمہ ''احسن التنقیح'')

انسانی دنیا میں اختلافات کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی، اگر کوئی مؤرخ انسانی اختلافات کی جستجو میں نکلے تو یہ تلاش اسے انسان کے بالکل ابتدائی عہد تک پہونچا کر چھوڑے گی، اختلاف کی کہانی اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک خانہ میں ہم انسان کے ان فطری اور طبعی اختلافات کی لمبی فہرست دیکھتے ہیں، جو قدرت کی جانب سے بنی نوع انسان کے مابین رکھے گئے ہیں، اس کی مثالیں عمروں کے تفاوت، امارت وغربت کے مظاہر، رنگ وروغن کے تنوع، ملکی وزمینی فرق، قبائل وعشائر کے امتیاز میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انہیں آپ اختلاف کا نام دے لیجئے، تنوع کہئے، گوناگونی سے تعبیر کیجئے، لیکن ہے بہرحال اختلاف کی صورت، اور بلاشبہہ یہ اختلاف اسی وقت سے ہے جب سے انسان کا خمیر گوندھا گیا، کون نہیں جانتا کہ چند متخالف ومتحارب عناصر کو آمیز کر کے انسان کا پتلا تیار کیا گیا تھا، اور پھر اسی اختلافی صورت حال کے تحت انسانی طبائع میں بھی اختلاف وانفراد کے جذبہ نے پرورش پائی، خواہشات ومیلانات میں تصادم ہوا، عزائم اور ارادوں میں ٹکراؤ ہوا، پھر انسان نے فطری اختلافات کی روزنوں سے چھلانگ لگا کر آپس میں ارادی اور اختیاری کش مکش شروع کردی، یہیں سے اختلافات کی داستان دوسرے اسٹیج میں داخل ہوجاتی ہے، پھر اس تصادم وٹکراؤ کے نتیجے میں انسانیت مختلف فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم ہوجاتی ہے اور بٹتی جاتی ہے۔ انسانی اختلاف کی ان دو لہروں میں پہلی لہر تو بالکل فطری اور اضطراری ہے، اور ہر جگہ موجود ومشاہد ہے، انسان کا یہ اختلاف بذات خود اس کے حق میں مضر نہیں، ان اختلافات کے باوجود بنی آدم اتحاد کی کسی نہ کسی مضبوط رسی میں بندھے رہتے ہیں، خود بھی زندہ رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی زندگی

فراہم کرتے ہیں۔ ایک گھر کے چند افراد باوجودیکہ قد وقامت، رنگ وروغن، شکل وصورت کے لحاظ سے باہم متفاوت ہوتے ہیں لیکن ''ہم خاندانی'' کی رسی میں جکڑے رہتے ہیں، کبھی انہیں وطن کا رشتہ ایک لڑی میں پروئے رکھتا ہے، کبھی اتحاد مقصد کی زنجیر انہیں باہم پیوست کئے رہتی ہے، کبھی وحدتِ دین انہیں مربوط رکھتی ہے۔ یہ تنوعات اگر اپنی حد پر رہیں تو صحیفۂ فطرت نہ صرف یہ کہ رنگ رنگ کے گل بوٹوں سے مزین رہے گا بلکہ انسانیت اپنی گوناگوں اور بوقلمونی رنگینیوں کی وجہ سے ایک ایسی جاذب نظر فضا پیدا کرے گی کہ:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کے جا ایں جاست

لیکن قیامت تو اس وقت ٹوٹتی ہے جب کوئی کم ظرف انسانی طبیعت ان اختلافات کو پھلانگ کر فتنہ وفساد کے شعلوں کو ہوا دینے لگ جاتی ہے، پھر یکا یک انسانوں کا ایک طبقہ اس آگ میں جل اٹھتا ہے، انسانی فتنوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے، ہر ایک کے پیچھے کوئی بندۂ نفس بیٹھا اپنی ہوا وہوس کی بھٹی انہیں قدرتی اختلافات کے ایندھن سے روشن کر کے اس کا دھواں دنیا میں پھیلا رہا ہوگا۔ اللہ نے صحیفۂ حق وصداقت میں انسانوں کو متنبہ کیا ہے کہ **''کان الناس امة واحدة فاختلفوا''** . انسان درحقیقت ایک جماعت کا نام ہے مگر کچھ لوگوں نے اختلاف کی بنا ڈالی، دین ایک ہی ہے مگر **ان الذین فرقوا دینهم و کانوا شیعاً**۔ کچھ لوگوں نے اپنا راستہ الگ بنایا اور فرقہ کی صورت میں علیحدہ ہوگئے، انسان کا وہ پہلا اختلاف اس کے حق میں تنوع ورنگا رنگی۔ اور یہ دوسرا اختلاف عذاب وبے لطفی!

بنی اسرائیل کے پاس علم وہدایت کی دولت آئی، مگر انہوں نے اپنی خواہشات کے نشے میں جماعت کی تکا بوٹی کر ڈالی اور بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئے، اور یہ سب علم کے بعد ہوا۔ **''فما اختلفوا حتی جاء هم العلم''. وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ماجاتهم البینة''**۔ اہل کتاب تفریق وانتشار کے شکار جہالت کی راہ سے نہیں ہوئے بلکہ یہ سب کچھ علم اور بینہ آجانے کے بعد ہوا۔

ملتِ واحدہ کے بعد ظہورِ بینہ کے بعد حصولِ علم کے بعد۔ آپ نے غور کیا، کس چیز نے انسانیت کو پارہ پارہ کیا؟ تاریخ چھان ڈالئے، ہر جگہ آپ کو یہی ملے گا کہ انسانی طبیعت کی کسی

کمزوری نے کسی ایک اختلافی چیز کو ہوا دینی شروع کی، ابتدا میں وہ ایک بے ضرر سا اختلاف تھا، خواہش نفس کی سوزش نے اسے چنگاری میں تبدیل کیا، اور دو چار افراد مل گئے، بالآخر آگ کا الاؤ تیار ہو گیا، پھر انسانی گردنیں پکڑ پکڑ کر اس میں جھونکی جانے لگیں، پھر تفرق وانتشار اور مجادلہ و محاربہ کا وہ ہولناک منظر نگاہیں دیکھتی ہیں کہ ظلم وطغیان کے ماتھے پر پسینہ آجاتا ہے۔

تاریخ کا یہ عمل اس امت میں بھی در آیا، جسے ''خیر امت'' کا لقب عطا کیا گیا تھا، تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، تاہم اتنا سمجھتے چلئے کہ تاریخ کے صفحات جہاں جہاں بھی انتشار و افتراق کی داستان سناتے ہیں وہاں کچھ اسی قسم کی صورت حال سامنے آتی ہے کہ ایک شخص کسی ایک اختلافی مسئلہ کو اپنی بحث وتحقیق نہیں زندگی کا مقصد بنالیتا ہے، اور فرقہ کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ ہماری مراد فرقوں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے **ما انا علیہ واصحابی** کی شاہراہ چھوڑ کر اپنی الگ ڈگر بنالی، ورنہ اس شاہراہ کے اندر رہتے ہوئے عبادات ومعاملات کی عملی تشکیلات میں جن حضرات نے کے درمیان تفقہ واجتہاد یا مختلف اخبار آحاد کی بنیاد پر اختلاف کی صورت نظر آتی ہے وہ بالکل فطری اور قدرتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسائل ومعاملات میں بہت سے مواقع پر ائمہ اربعہ کے فتاوے الگ الگ ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے کیسی سچی بات کہی ہے:

> ''پھر کیا حدیث کی بنیاد پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اگر کسی چیز کے حلال ہونے کا فتوی دیا ہے اور حنفی مذہب میں بجائے حلت کے اس چیز کے حرمت کے پہلو کو ترجیح دی گئی ہو؟ کیا حلت وحرمت کے یہ اختلافات جو خبر آحاد کی حدیثوں پر مبنی ہیں، محض ان کی بنیاد پر مجال ہے کسی حنفی کی جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس کا اندیشہ بھی کرسکتا ہے کہ اس فتوی کی وجہ سے فضل وقرب کے مدارج ومراتب میں ان کے کسی قسم کی کوئی کمی ہوگئی ہوگی؟ یقیناً نہ کوئی حنفی یہ تصور کرسکتا ہے اور نہ کرتا ہے۔ اسی طرح میں نہیں جانتا کہ باوجود ان تمام اختلافات کے حضرت امام ابوحنیفہ کے لئے رحمۃ اللہ علیہ یا دعائے خیر کرنے سے کسی شافعی کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہو؟''۔ (تدوین حدیث ص ۳۲۵)

یہی وجہ ہے کہ مختلف ائمہ کے ماننے والوں میں وہ خلیج کبھی حائل نہیں ہوئی، بالخصوص ان کے مابین اختلافی مسائل کی بنیاد پر، جس کا مشاہدہ صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے فرقوں میں ہم

کرتے ہیں۔ یہاں تو یہ صورت حال ہے کہ احناف کا بہترین اعتماد شوافع کے ائمہ حدیث وفقہ کو حاصل ہے، اور شوافع وموالک ائمہ احناف کی ثنا خوانی میں رطب اللسان ہیں، ائمہ کو تو چھوڑئے ان پر تو پوری امت کا اتفاق واعتماد ہے، بعد کے علما میں کون نہیں جانتا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی، امام ذہبی، علامہ ابن الہمام، جمال الدین زیلعی، امام نووی، علامہ زرقانی، علامہ سیوطی نیز ائمہ حدیث امام بخاری، مسلم اور دوسرے جلیل القدر محدثین مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بلالحاظ مسلک ومشرب ان کی تصانیف اور علم پر سب لوگ اعتماد کرتے ہیں، اور جن لوگوں نے کبھی آویزش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ خود انہی کے جماعت نے ان کا چھتاڑ کردیا ہے، علامہ خطیب بغدادی کا لہجہ ایک جگہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے متعلق تیز ہوگیا ہے تو خود شوافع کے اعتماد سے ان کو محروم ہونا پڑا۔ اس قسم کی مثالیں ڈھونڈھنے والوں کو بکثرت تاریخ کے ذخیرہ میں مل جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ائمہ فقہ کے یہ تنوعات بنیادی عقائد میں نہ تھے، بلکہ اخبار آحاد اور تفقہ واجتہاد کی بنیاد پر فروعی مسائل میں تھے، یہ اختلافات ضروری تھے، اس سے امت کو ''الدین یسر'' کا صحیح مفہوم سمجھنا میسر ہوا، یہ اختلاف درحقیقت ائمہ میں نہیں بلکہ عہد صحابہ ہی میں موجود تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

> ''حافظ ابوعمرو بن عبدالبر نے اپنی مفصل سند کے ساتھ رجاء بن جمیل کے حوالہ سے یہ قضیہ نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کو دیکھا جارہا تھا کہ قاسم جس حدیث کا تذکرہ کرتے عمر بن عبدالعزیز اس کے مقابلہ میں ایسی روایت پیش کردیتے جس کا مفہوم قاسم کی پیش کردہ روایت کے مخالف ہوتا۔ آخر دیر تک جب گفتگو اسی رنگ میں ہوتی رہی تو عمر بن عبدالعزیز نے محسوس کیا کہ قاسم بن محمد ان کے طریقۂ کار سے کچھ گرانی محسوس کررہے ہیں، یہ دیکھ کر عمر بن عبدالعزیز نے قاسم سے کہنا شروع کیا کہ آپ اس کی گرانی کیوں محسوس کررہے ہیں؟ آخر میں عمر بن عبدالعزیز کا اس باب میں جو خیال تھا اس کو ان الفاظ میں ظاہر فرمانے لگے:
>
> ''صحابہ کی روایتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، میں سچ کہتا ہوں کہ ان اختلافات کے معاوضہ میں سرخ اونٹوں سے اتنا خوش نہیں ہوسکتا تھا جتنا کہ اس کی اختلافی روایات سے خوش ہوں''۔

سرخ اونٹ ایک عربی محاورہ ہے، انمول جس کی قیمت کا مقابلہ کوئی دوسری چیز نہ کر سکے، اسے عرب سرخ اونٹ کہتے تھے، کیوں کہ سرخ اونٹ سے زیادہ قیمتی کوئی چیز عربوں کی نگاہ میں نہ تھی۔

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عمر بن عبدالعزیز کی اسی گفتگو کا شاید اثر تھا کہ بعد کو قاسم بن محمد مختلف جلسوں میں فرمایا کرتے تھے کہ عمر بن عبدالعزیز کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں میں روایات کا اختلاف اگر نہ ہوتا تو میرے نزدیک یہ کوئی خوشگوار بات نہ ہوتی۔ آج یہ انہی اختلافات کا نتیجہ ہے کہ لوگ اس کی تنگی میں نہیں ہیں جو ایک ہی قول یا روایت کی وجہ سے پیدا ہو جاتی، اب تو آزادی ہے ان بزرگوں کے مختلف اقوال میں سے جس قول پر بھی عمل میسر آ جائے وہ کامیاب ہے''۔ (جامع بیان العلم ج ۸۔ ص ۲۔ بحوالہ تدوین حدیث ص ۳۲۲)

انہی فقیہ مدینہ حضرت قاسم بن محمد بن سیدنا ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک قول علامہ ابن عبدالبر کے حوالہ سے مولانا گیلانی نے نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ:

سألت القاسم بن محمد عن القرأة خلف الامام فيما لم تجهر فيه فقال ان قرأت فلك فى رجال من اصحاب رسول الله ﷺ اسوة واذا لم تقرأ فلك فى رجال من اصحاب رسول الله ﷺ اسوة. (جامع بیان العلم ج ۲۔ ص ۸۰)

میں نے قاسم محمد سے پوچھا کہ جن فرض نمازوں میں زور سے قرأت نہیں کی جاتی ان میں امام کے پیچھے پڑھنے (یعنی سورہ فاتحہ) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اس پر قاسم محمد نے فرمایا کہ اگر تم پڑھو تو رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں میں تمہارے لئے نمونہ ہے، اور نہ پڑھو تو رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں ہی میں اس کا بھی نمونہ تمہارے لئے موجود ہے۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر محض اپنی رائے سے حدیث کے وسیع وعریض ذخیرے میں جس کو جو حدیث مل جائے، تمام اصول وضوابط کو طاق پر رکھ کر اسی کو اپنے عمل کی بنیاد بنالے، اس طرز عمل سے تحیر وانتشار تو پیدا ہوگا ہی، دین ایک مذاق بن کر رہ جائے گا۔

یہاں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے یہ اختلافات کبھی تکفیر وتذلیل اور

تفسیق وتجہیل کے دروازوں تک نہیں پہونچے، اور نہ ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کو بددین اور گمراہ کہہ کر جہنم کی طرف ڈھکیلنے کی کوشش کرتا، اختلاف اور پھر اعتماد واحترام کی ایسی روشن فضا کم ازکم اختلافات کی دنیا میں بہت کم دیکھنے کو ملے گی، پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ ان جماعتوں کی بنیاد کسی اختلافی مسائل پر نہیں ہے، بلکہ تفقہ واجتہاد کا خلوص ان میں شامل ہے، ہرایک نے رضا جوئی حق کو پیش نظر رکھا ہے، پھر ظاہر ہے کہ تفرق وانتشار کی وہ ہولناکیاں کس طرح نمودار ہوسکتی ہیں؟ جو محض خواہش نفس، ضد اور شیطانی اثرات کا کرشمہ ہوتی ہیں۔

آپ ایک نظر تاریخ کے ان اوراق پر بھی ڈال لیجئے، جہاں ائمہ متبوعین کسی ایک خاص موضوع سخن کو اپنے فرقوں کی بنیاد بنائے ہوئے ہیں، ان کی جماعت کا دارومدار چند اختلافی مسائل ہیں، وقتاً فوقتاً انہیں کا جھنڈا لہراتا رہتا ہے۔ شیعوں کی بنیاد 'مسئلہ امامت'، خوارج کی بنیاد 'مسئلہ تحکیم'، نواصب کی بنیاد 'بغض اہل بیت'، معتزلہ کی بنیاد 'مسئلہ صفات، خلق قرآن' وغیرہ، ان فرقوں میں دم خم اس وقت باقی رہا جب تک ان کے مسائل کو ہوا ملتی رہی، یا حکومت کا سہارا انہیں حاصل رہا۔ آج بجز کتب خانوں کی الماریوں کے کہاں ان کا وجود ہے، لیکن سچ پوچھئے تو امت اختلاف کی آگ میں اس طور پر جھلسی اور جلی ہے کہ غیر تو غیر ہیں، بہت سے اپنوں کے سامنے بھی اس کا پیکرِ جمال مخفی رہ گیا ہے۔

ہندوستان میں بھی اس قسم کے اختلافات انسانی کمزوری کے منبع سے پھوٹتے اور بہتے رہے، لیکن جب تک حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہی یہ لاوے ابلتے اور ٹھنڈے ہوتے رہے، لیکن جب سے انگریزوں نے یہاں قدم جمایا، انہوں نے اپنے خاص مقاصد کے تحت ان شعلوں کو ہوا دیتے رہنا ضروری خیال کیا، چنانچہ اسلامی ہندوستان کی پوری تاریخ میں مسلمان اتنے فرقوں میں نہ تقسیم ہوئے ہوں گے جتنے سو دو سو سال کے اس عرصے میں بٹ گئے ہیں، کبھی ظلی وبروزی نبوت کا ڈھونگ رچا گیا، کہیں سنت کے نام پر بدعت کا جھنڈا لہرایا گیا، کبھی قرآن کی آڑ لے کر حدیثوں سے انکار واعراض کی راہ ہموار کی گئی، کہیں عقل وفلسفہ کی بنیاد پر عقائد کی تیشہ زنی کی گئی۔ غرض ایک ایسا طوفان برپا کردیا گیا کہ اس کشمکش نے ملت اسلامیہ کے جسد واحد کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیا۔

انہیں فتنوں کی جلو میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ چند بھولے بھالے لوگ ایک خاص فتنہ میں مبتلا ہوتے ہیں، اور حدیث وسنت کی آڑ لے کر تفقہ واجتہاد اور ائمہ مجتہدین سے برگشتہ کرنے میں لگ جاتے ہیں، یہاں بھی صورت حال وہی ہے کہ امت کے سواد اعظم سے ایک ٹکڑی یہ کہہ کر علیحدہ ہوگئی کہ فلاں فلاں مسئلہ میں جو دور صحابہ سے مختلف فیہ چلے آرہے ہیں مسلمانوں کا عمل صحیح نہیں ہے، اتنے ہی پر بس نہیں، ایسے مسائل میں بھی انکار وتغلیط کا دروازہ کھولا گیا جن پر ائمہ اربعہ کا اتفاق چلا آرہا ہے، اس دردناک تاریخ کو میرے بجائے آپ مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم سے ذرا مفصل سنئے:

> ’’ابھی کچھ دنوں پہلے اسی سرزمین ہند میں مسلمانوں کی حکومت کا اقتدار جس وقت ختم ہوا، خواہ بجائے خود اسلام اور اسلامی قوانین سے اس حکومت کے تعلق کی نوعیت کچھ بھی ہو، لیکن اتنا بہرحال ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ کسی نئی بات کو چھیڑ کر مسلمانوں میں اختلاف وافتراق کی آگ بھڑکانا آسان نہیں ہے، لیکن حکومت کے اس دباؤ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی جائز و ناجائز مزاحمتوں کا اندیشہ دلوں سے نکل گیا، اور خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے، طرح طرح کے مشورے مسلمانوں کو ملنے لگے، اس سلسلے میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، یہاں سب سے مجھے بحث نہیں ہے، بلکہ ان احباب سے معافی چاہتے ہوئے جن کے دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگاتے ہوئے مجھے خود بھی تکلیف محسوس ہو رہی ہے، مگر کیا کروں؟ واقعہ کے اظہار کے بغیر شاید صحیح طور پر میں اس چیز کو سمجھانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، جس کے سمجھانے کے لئے اس تازہ تاریخی مثال کا میں نے انتخاب کیا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس تاریخی مثال کے جو اعاظم رجال واکابر وابطال تھے اب وہ بے چارے دنیا میں موجود نہیں ہیں، پھر بھی بچے کھچے ان کے نام لیواؤں کا خیال آ ہی جاتا ہے جو اپنے گزرے ہوئے انہیں بزرگوں کے نشان سرمزار کی حیثیت سے اس طویل وعریض ملک کے بعض گوشوں میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں، اب کچھ بھی ہو کہنا چاہتا ہوں کہ احیاء سنت وقمع بدعت اور خدا جانے کن کن الفاظ کن کن ارادوں کن کن نیتوں کے ساتھ کچھ دن پہلے اسی ملک ہندوستان میں اٹھنے والے یہ کہتے ہوئے اٹھے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کی دینی زندگی جس کے صدیوں سے وہ پابند چلے آرہے ہیں، غیر مسنون زندگی ہے۔ پھر اسی غیر مسنون زندگی کو مسنون بنانے اسی ’’خبر الخاصہ‘‘ یا ’’خبر الواحد

بعدالواحد‘‘ والی حدیثوں کے ذخیروں سے ان بزرگوں نے چن چن کر ان ہی حدیثوں کا انتخاب کیا جو ابتداء اسلام سے ہی ناگزیر قدرتی اختلافات کے رنگ سے رنگین تھیں، وہ خود بھی جانتے تھے یا انہیں جاننا چاہئے تھا کہ اختلاف کی یہ صورت نئی بات نہیں ہے، نیز آگاہ کرنے والے ہر زمانہ میں جیسے مسلمانوں کو آگاہ کرتے چلے آئے تھے، ہندوستانی مسلمانوں پر بھی جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں ان کو چونکانے والے یہ کہہ کہہ کر نہ چونکاتے رہے ہوں کہ ان اختلافات کی حیثیت وہ نہیں ہے جو کفر واسلام بلکہ طاعت وعصیان کے اختلافات کی حیثیت ہوتی ہے۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ ضریحہ، جن کی طرف منسوب کرنے والے چاہتے ہیں کہ اس غلط تحریک کی سیادت اور اولیت کو منسوب کردیں، وہی ایک جگہ نہیں بلکہ اپنی مختلف کتابوں میں صاف صاف یہ اعلان کر چکے تھے کہ ان اختلافات کی ہر صورت اور ہر شکل صحیح اور درست ہے، صرف ان ہی مسائل اور نتائج کی حد تک شاہ صاحب کا یہ فیصلہ محدود نہ تھا، جن کا تعلق تفقہ واجتہاد سے تھا، بلکہ خبر آحاد والی حدیثوں کی بنیاد پر جو اختلاف پیدا ہو گئے تھے، ان کے متعلق بھی شاہ ولی اللہ اس قسم کی عبارتیں چھوڑ کر دنیا سے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ روانہ ہوئے تھے، مجھے خیال آتا ہے کہ اسی کتاب میں کسی موقع پر شاہ صاحب کے اس قول کو ان کی کتاب ’’الاصناف‘‘ سے نقل کر چکا ہوں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ’’ایسے اختلافی مسائل جن میں صحابہ کے اقوال ہر پہلو کی تائید میں ملتے ہیں مثلاً عیدین اور تشریق کی تکبیریں، محرم کے بحالتِ احرامِ حج نکاح کرنے کا حکم، یا تشہد کے کلمات جو ابن مسعود اور ابن عباس کی طرف منسوب ہیں، یا آمین یا بسم اللہ کو آہستہ یا زور سے پکارنا یا نماز کی اقامت میں بجائے دو دفعہ کے ایک ایک دفعہ اقامت کے کلمات ادا کرنا، یہ اور اس قسم کی ساری باتوں میں اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں کوئی صورت یہ سمجھی جاتی ہے کہ شریعت کے مطابق اور اس کی مخالف شکل غیر شرعی شکل ہے، بلکہ سلف کا اگر اختلاف تھا بھی تو اس میں تھا کہ ان دو مختلف صورتوں میں اولیٰ اور بہتر شکل کیا ہے؟ ورنہ دونوں شکلوں کو شرعی شکل قرار دینے پر سب ہی متفق ہیں‘‘۔ (انصاف ص ۸۹)

اسی موقع پر شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلک کے فقیہوں کے فتوؤں اور ہر مسلک کے قاضیوں کے فیصلوں کی سب ہی تصحیح کرتے ہیں، بہ ضرورت ایک امام

کے مسلک کو ترک کر کے دوسرے امام کے مسلک کو اختیار کرنے کی مسلمانوں کو جو اجازت دی گئی ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ فقہ کے سارے اختلافی مسائل کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ شریعت کے دائرہ سے کوئی باہر نہیں ہے‘‘۔ (تدوین حدیث ص ۳۱۹)

میں ذکر مسلمانان ہند کی تاریخ کے اسی حادثہ کا کر رہا تھا جس میں زوال حکومت کے بعد اچانک اس ملک کے مسلمان مبتلا ہو گئے، وہی حادثہ جس میں دیکھا گیا کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں نے رزم گاہوں کا قالب اختیار کر لیا، نماز کی صفیں، نماز کی صفیں نہیں بلکہ باضابطہ جنگ کی صفیں بن گئیں، جو نماز نہیں پڑھتے تھے ان کو نہیں بلکہ نماز پڑھنے والوں کو نمازوں ہی کے پڑھنے والے اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخ رہے تھے، آپس میں لاٹھیاں اور جوتے صرف اس لئے چل رہے تھے کہ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی تم نے کیوں نہیں اٹھایا؟ یا امام ’’ولا الضالین‘‘ پر جب پہونچا تو اس پر نہیں کہ تم نے آمین کیوں نہیں کہی؟ کیوں کہ آمین تو سب ہی کہتے ہیں، جھگڑا اس پر تھا کہ صرف خدا ہی کو تم نے آمین کا یہ لفظ کیوں سنایا؟ خدا کے بندے جو تمہارے دائیں بائیں کھڑے تھے ان کو بھی اس لفظ کے سننے کا موقع کیوں نہیں دیا؟ مسلمانوں ہی کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو مسلمانوں کی مسجدوں سے نکال رہا تھا، اس لئے نکال رہا تھا کہ امام قرآن کے جس حصہ کو نماز میں پڑھتا ہے تم نے اسے سنا کیوں؟ بجائے سننے کے تم بھی اسی کو دہرانے میں مشغول کیوں نہ ہو گئے؟ جسے امام اپنی طرف سے اور تمہاری طرف سے پڑھ رہا تھا، اور بات اسی حد تک ختم ہو جاتی تو سمجھا جا سکتا تھا کہ خیر ایک حد پر پہونچ کر ختم ہو گئی، لیکن قصہ تو یہاں تک دراز ہوا کہ مسلمانوں کی دنیا جن لوگوں نے جبراً ان سے چھینی تھی ان ہی کے سامنے بخوشی ورضا اپنے دین کو بھی لے کر پہونچے، جن کی عدالتوں میں پیٹ کے جھگڑوں کے لئے جاتے تو سمجھا جا سکتا تھا کہ مسلمان مجبور ہیں، ان ہی عدالتوں کے حکام کے پاس وہ اللہ کی کتاب اور جن میں اس کے رسول کی حدیثیں تھیں، ان سب کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ آپ ہی بتائیے کہ ہم دو فریقوں میں ان کتابوں کی رو سے واقعی مسلمان کون ہے؟ اور مسلمانوں کی مسجدوں کے استعمال کا قانونی حق کسے حاصل ہے؟ طیش کی آگ اور غصے کے شعلوں میں ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کا سارا سرمایہ جل کر بھسم ہو چکا تھا ان فیصلوں پر خوشی کی شادیانے بجائے جاتے تھے، جو اللہ اور رسول کے جھٹلانے والوں کی

طرف سے کوئی فریق حاصل کرتا تھا، اور ان ہی فیصلوں کی آڑ میں محمد رسول اللہ ﷺ کو رسول ماننے والی امت کی ایک جماعت عبادت گاہوں سے ڈھکیلی جارہی تھی، جو نہ عیسائیوں کے گرجے تھے اور نہ یہودیوں کے سنی گاگ، بلکہ یہ کیسا دلخراش منظر تھا کہ مسلمانوں کی مسجدوں سے مسلمانوں ہی کو نکالا جارہا تھا، کہ جو مسلمان نہیں تھے ان ہی حکام سے ان کے نکالنے کا فیصلہ خود مسلمانوں نے مسلمانوں کے لئے حاصل کیا''۔ (تدوین حدیث ۳۲۶)

لیکن پوری صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ ان کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، اب وہ کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتے جو آمین زور سے نہیں کہتا، یا رکوع میں جاتے اور سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ نہیں اٹھاتا، حقیقت ان پر واضح ہو چکی ہے، بطور نام نہاد کے اپنے مسلک کو ایک خاص نام سے موسوم کر کے جی رہے ہیں، شاید یہ نام بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہے''۔[۱]

حاشیہ میں مولانا گیلانی مرحوم نے ایک مشہور غیر مقلد عالم کا ایک لطیفہ بھی نقل کیا ہے، جس سے اس مسلک کی حقیقی تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

''اس موقع پر ایک لطیفہ کا بار بار خیال آرہا ہے، میں نے براہ راست بانی ندوۃ العلما حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت سنی ہے کہ حضرت کے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی تغمدہ اللہ بغفرانہ کی خدمت میں فرقہ اہل حدیث کے ایک ممتاز و نمایاں عالم وہیں حاضر ہوئے، مولانا ابراہیم صاحب سے جب ملاقات ہوئی تو حضرت گنج مرادآبادی نے پوچھا کہ مولوی صاحب! آپ عامل بالحدیث ہیں؟ بولے جی ہاں الحمد للہ، مولانا نے پوچھا کہ آں حضرت ﷺ سوتے وقت کون سی دعا پڑھتے تھے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ اس وقت یاد نہیں ہے، پوچھا کہ گھر سے نکلتے وقت کیا پڑھتے تھے؟ بولے وہ بھی یاد نہیں، الغرض یونہی آں حضرت مختلف اوقات و مقامات پر جو دعائیں پڑھا کرتے تھے، جیسے اکثر مولویوں کو یاد نہیں ہوتیں، مولوی صاحب بے چارے کو بھی یاد نہ تھیں، تب مولانا نے ان ہی اہل حدیث مولوی صاحب کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا، کیوں مولانا آپ نے رسول اللہ ﷺ کی صرف اختلافی حدیثوں کو یاد کیا ہے، لیکن جن حدیثوں کے متعلق کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے، ان کے یاد کرنے کی ضرورت کو عمل بالحدیث کے لئے ضروری خیال نہ کیا،

> کیا اسی کا نام عمل بالحدیث ہے؟ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب جھینپ سے گئے۔ مولانا محمد علی مرحوم یہ بھی بیان فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ کی حاضری کے زمانے میں مولوی ابراہیم صاحب نے ایک خواب دیکھا اور اسی خواب کی بنا پر حنفی مسلک پر واپس ہوگئے تھے۔ شاید اس مضمون کا ایک مکتوب بھی مولوی ابراہیم کا لکھا ہوا ہے حضرت مولانا محمد علی کے پاس تھا''۔ (تدوین حدیث)

یہ صرف ایک لطیفہ نہیں ہے بلکہ بقلم خود اہل حدیث حضرات کی سچی تصویر اور ان کی واقعی تاریخ ہے، اسی کو میں نے عرض کیا تھا کہ جو فرقے حقیقۃً فرقے ہیں اور جنہوں نے اتحاد اسلامی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اختلاف وانتشار کی قینچی تیار کی ہے، ان کی بنیاد عموماً کسی اختلافی مسئلہ پر بے جا اصرار وتشدد ہے، غیر مقلدیت کا فتنہ پہلے کے مقابلہ میں اب بہت کچھ ٹھنڈا پڑ چکا ہے، لوگ حقائق سے واقف ہو چکے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جن کا پورا سرمایہ اور تمام تر پونجی چند مختلف فیہ مسائل سے زیادہ کچھ نہ ہو، انہیں یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ یہ شعلہ ٹھنڈا پڑ جائے، اس میں انہیں اپنی اجتماعی موت نظر آتی ہے، اس لئے مولانا گیلانی کے الفاظ میں کچھ ''نشان سرمزار'' قسم کے افراد ہر تھوڑی تھوڑی مدت میں اپنی زندگی کا ثبوت دینے کی غرض سے اختلاف کی کوئی لے چھیڑ دیتے ہیں، اور اس طرح تھوڑی دیر کے لئے مسلمانوں کے اجتماعی معاشرہ میں ہلچل سی مچ جاتی ہے، اور اب تو سچ پوچھئے تو ہوس زر کی دوڑ میں بازی لگانے کی وجہ سے وہ لوگ بھی بہت کچھ فراموش کر چکے ہیں، تاہم جیسے سوتا ہوا آدمی کبھی کبھی نیند میں بڑبڑانے لگتا ہے، یونہی ان کے بعض حلقوں سے بعض خاص مواقع پر بے وقت کی راگنی الاپی جانے لگتی ہے۔

آمین بالجہر، رفع یدین، قرأت خلف الامام وغیرہ کے اختلافات تو اب بہت حد تک دم توڑ چکے ہیں، کبھی کبھی طلاق ثلثہ کے مسئلہ پر کوئی شخص صدائے بے ہنگام لگا جاتا ہے، البتہ گرمیٔ محفل باقی رکھنے کے لئے اب بھی اکثر وبیشتر آٹھ رکعت تراویح کے مسئلہ کو اٹھا کر بغلیں بجائی جاتی ہیں، رمضان قریب آتے ہی بڑے بڑے پوسٹر اور کتابچے نمودار ہونے لگتے ہیں، احناف کو چیلنج کیا جاتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے پرسکون ماحول میں تموج کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں [۲] پھر ''میں خاموش تو خاموش'' دولت کے خزائن پر ان کی نگاہیں گڑی رہتی ہیں۔

ہمارے علما جنہیں خلافیات کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں، چونکہ مسلمانوں کے انتشار کو بالخصوص فی زماننا بہت ناپسند کرتے ہیں، اس لئے ان تماشوں پر عموماً خاموش رہتے ہیں، کہ ان کے پاس ان چند مسائل کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر پروگرام تو ہے نہیں، کہاں تک ان کے تعاقب میں وقت ضائع کیا جائے، لیکن تشویش کی لہر کبھی کبھی تیز ہوجاتی ہے تو عوام کا مطالبہ ہونے لگتا ہے کہ ادھر سے بھی کچھ جوابی کاروائی کی جائے۔ [۳]

کچھ اسی قسم کا مرحلہ ہمارے دوست فاضل گرامی قدر جناب مولانا سید طاہر حسین گیاوی کے سامنے بھی آیا، اور موصوف قلم اٹھانے پر مجبور ہوئے، کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، لہجہ قدرے تند وتیز ہے، لیکن اس پر معذرت کی ضرورت نہیں ہے، اس کا الزام مولانا پر نہیں ہے، ان لوگوں پر ہے جو اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کو کسی نرمی اور کسی عزت واحترام کا مستحق نہیں سمجھتے۔

مولانا موصوف نے اس کتاب میں متعلقہ مباحث پر اب تک کے تقریباً تمام مواد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، اور ان پر مزید تحقیقات کا بہترین اضافہ بھی کیا ہے، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کتاب اس موضوع پر حرف آخر ہے، تاہم یہ ضرور ہے کہ اگر تحقیق وانصاف کو بالائے طاق نہ رکھ دیا گیا تو ذہن ودماغ کی سیرابی کا اس میں سامان موجود ہے، بعض جزئی مبحث میں ممکن ہے کوئی صاحب مین میخ نکالیں لیکن اس سے اصل مبحث پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔

میرا خیال ہے کہ جس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے لے کر اب تک غیر مقلدوں کی تحقیق پر کسی امام کا عمل نہ ہوا، اس میں ان حضرات نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر شدید غلطی کی ہے، انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ سارے اکابر کیوں کر غلط مسئلہ پر تیرہ سو سال تک متفق رہے؟ کیا یہ سارے حضرات ناواقف تھے؟ پھر اگر معاملہ وہاں تک رہتا جہاں تک ائمہ اربعہ کے اختلاف کی حدیں رہتی ہیں تو بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن یہاں تو بیک جنبش قلم وہ سب غلط، خلاف سنت جن پر آج تک ائمہ کا عمل ہے! اور ان کی تحقیق سو فی صد درست! اگر بات صرف دلائل کی بنیاد پر ترجیح کی حد تک ہوتی تو اس کتاب کی تصنیف کی چنداں ضرورت نہ تھی، اور اگر ہوتی بھی تو لب ولہجہ یہ نہ ہوتا، لیکن جو لوگ دوسروں کو گمراہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہوں ان

کے لئے یہی لہجہ مناسب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شرذمۂ قلیلہ کو پایۂ اعتبار سے ساقط کرنے کے لئے طلقات ثلٰثہ اور تراویح کا مسئلہ بہت کافی ہے۔

مقدمہ نگار نے ناظرین کا بہت وقت لیا، اب کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے، انصاف وتحقیق کی نظر سے پڑھئے اور ضد کو ایک طرف رکھ کر حق وراستی کے لئے سینہ میں وسعت پیدا کیجئے۔ اللہ توفیق دے۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

اعجاز احمد اعظمی

مدرسہ دینیہ شوکت منزل میاں پورہ غازی پور

۲۲/ جمادی الاخری ۱۴۰۳

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) تدوین حدیث ص ۳۳۰۔ حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ پچھلے دنوں سے دیکھا جارہا ہے کہ نام پر بھی اتفاق ان میں باقی نہیں رہا، بعض اپنے آپ کو بجائے اہل حدیث یا محمدی وغیرہ الفاظ کے کبھی شافعی کبھی حنبلی وغیرہ بھی کہنے لگے ہیں۔

(۲) یہ بھی مسلمانوں کی بدنصیبی کا ایک حصہ ہے کہ رمضان المبارک جو خالص عبادت ورضا جوئی الٰہی کا مہینہ ہے، اس کے برکات کو بھی ایک جماعت آتش اختلاف میں جلانے کے لئے تیار رہتی ہے، اور اختلاف بھی کیسا؟ ائمہ اربعہ میں کوئی بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ نہیں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(۳) عجیب بات ہے کہ اس فرقہ نے خالص علمی اور اصطلاحی چیزیں جو محض علما کے سمجھنے کی تھیں، اور عوام کو ان سے نہ صرف یہ کہ نفع کچھ نہیں ہے، بلکہ الٹا نقصان ہے، عوام کے بازار میں لے آئے، تاکہ عوام بغیر سمجھے انتشار وافتراق میں مبتلا ہو، بھلا جو لوگ ابتدائی علوم سے واقف نہ ہوں، وہ حدیث وفقہ کی اصطلاحات پر کیا قابو پاسکتے ہیں؟ لیکن اس جماعت کا اسی میں فائدہ ہے کہ مسلمانوں کو الجھا دیا جائے۔ کس قدر ظلم ہے؟ نہ جانے اس طرز عمل کو حدیث اور سنت سے کیا تعلق ہے؟۔

تأثر بر ’’حیات ابوالمآثر‘‘

ایک ایسی شخصیت جس کا علم گہرا تھا اور وسیع بھی! ایک ایسا عالم جس کی نگاہ ثاقب تھی اور ہمہ گیر بھی! ایک ایسا شب زندہ دار جس میں محدثین کی سی جانکاہی تھی اور صوفیا کا سا سوز بھی! وہ علم کا طالب تھا اور علما کا استاذ بھی! اس کو دیکھ کر علماء حدیث کے حیرت انگیز حافظوں کی تصدیق ہوتی تھی، اور ائمہ اجتہاد کی ذہانتوں کا یقین آتا تھا، اس کی ژرف نگاہی کے سامنے عقلیں ششدر رہ جاتی تھیں، اور اس کے ورع وتقوی کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا تھا، وہ غیرت وحیا کا پتلا تھا، وہ دینی صلابت میں بے نظیر تھا، وہ صحت علم اور حسن عمل کا جامع تھا، اس کی ہیبت اور اس کے وقار کے سامنے بڑے بڑے اساطین علم کی گردنیں جھکی رہتی تھیں، وہ عرصۂ دراز تک ایک سفالہ پوش تنگ و تاریک حجرے میں رہا کیا، مگر اس کے علم کا نور چہار دانگ عالم کو روشن کرتا رہا۔

۱۴۱۲ء میں روشنیٔ علم کا یہ پیکر اپنے خالق ومالک کے حضور پہونچ گیا، اس کے خاکی بدن نے مٹی کی چادر اوڑھ لی اور اس کی نورانی روح مرکز نور میں روپوش ہوگئی، ہمارے درمیان سے اس کا وجود ناسوتی اٹھ گیا، لیکن اس کا علم؟ سب کہاں؟ کچھ تلامذہ کے سینوں میں، کچھ کاغذ کے سفینوں میں محفوظ ہے، جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی، اور ہاں اس کے احوال وسوانح کی یاد دلوں میں؟ وہ بھی سب کہاں؟ قدرے قلیل باقی رہ گئی، اس کے بھی محو ہوجانے کا اندیشہ لگا رہا۔

علم کے ہر حلقے سے تجویزیں آئیں کہ احوال وسوانح کا جو کچھ حصہ لوگوں کی یادداشت میں اور مختلف اوراق میں محفوظ اور بکھرا ہوا ہے، اسے جمع کر کے مرتب کردیا جائے تاکہ اس عظیم شخصیت کا مجموعی خاکہ نگاہوں میں آجائے۔

یہ تجویز واجب التعمیل تھی، اس کے لئے قرعۂ فال اسی دیوانہ کے نام نکالا گیا، جو یہ سطریں اس وقت لکھ رہا ہے، اے کاش کہ اس قاصر القلم سے یہ کام بن پڑتا، لیکن قرعۂ فال جس دیوانے کے نام نکلا تھا جب وہ لکھنے کا ارادہ کرتا تو اس کا قلم تھرا جاتا، موضوع کی اہمیت اور خود اس کی بے لیاقتی دامن گیر ہوتی، اسی کش مکس میں دن گزرتے گئے، اچانک معلوم ہوا کہ حضرت اقدس کے اہل بیت ہی میں سے ایک ذہین وفطین صاحب علم وقلم جو حضرت ہی کے شاگرد ہیں، چپکے چپکے حضرت کی سوانح عربی میں مرتب کر چکے ہیں، ایک حیرت آمیز خوشی ہوئی، حیرت اس پر کہ کتنی خاموشی سے کام شروع کیا اور پایۂ تکمیل کو پہونچ بھی گیا، اور خوشی اس پر کہ حضرت کی اولاد ہی نے یہ فریضہ انجام دیا، یہ ہیں حضرت کے نواسے، مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کے بھانجے اور حاجی سعید احمد صاحب (کشمیر ٹیکسٹائلس) کے فرزند گرامی مولانا مسعود احمد صاحب! جو المآثر کے صفحات میں ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کے عنوان سے جلوہ گر رہتے ہیں۔

دل میں خیال آیا کہ ماشاء اللہ نوجوانی ہی میں قلم پختہ ہے، انہیں کے قلم سے اردو میں بھی سوانح آجاتی تو ''حق بحقدار رسید'' کا مصداق ہوتا، کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اردو سوانح کا سفر تقریباً آدھا طے ہو چکا ہے، پھر جوان کا کام دیکھا تو تلاش وجستجو، تحقیق وتفتیش، اقتباس و ترتیب اور نادر معلومات کا ایک مرقع نظر آیا، یہ خاموش کاوش بہت قابل قدر ہے، اللہ تعالی اسے قبول فرمائے، کتاب کی تعریف وتوصیف پر کچھ نہیں عرض کرنا ہے۔ ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے'' پڑھئے اور خود فیصلہ کیجئے، حضرت اقدس کی برکت سے ان کے حالات کا مرقع کتنا دل آویز ہے۔

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی وفات کے بعد مسلسل حضرت کے علوم اور ان کے تذکرے کی خدمت ہو رہی ہے، ترجمان الاسلام بنارس نے محدث اعظمی نمبر شائع کیا، مدرسہ مرقات العلوم مئو سے المآثر کا اجرا عمل میں آیا، جو بحمد للہ اب تک اس خدمت میں سرگرم ہے، حضرت کے نام پر عظیم الشان مکتبہ تعمیر ہوا، جس میں حضرت کا سارا علمی سرمایہ محفوظ کر دیا گیا ہے، یہ سب کچھ اس ایک شخص کی خاموش کاوش اور لگن اور اس کے حسن نیت کا ثمرہ ہے جسے حضرت اقدس کے ساتھ فرزندی کا شرف حاصل ہے، اور تلمذ کا بھی۔ یہ ہیں حضرت اقدس کے خلف الرشید حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دامت برکاتہم۔

مولانا موصوف حضرت کے سفر وحضر کے رفیق اور کاتب رہے ہیں، اور حضرت کے علمی کارناموں میں شریک رہے ہیں، چونکہ مولانا کا خط پاکیزہ ہے اور طبیعت میں احتیاط بہت زیادہ ہے، اس لئے مسودہ تیار کرنا، اس کو آخری شکل دینا، عموماً مولانا رشید احمد صاحب کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی، اس باب میں حضرت اقدس کو ان پر بڑا اعتماد تھا، انتظامی سلیقہ کی بنا پر حضرت نے انہیں کو مدرسہ مرقاۃ العلوم کا ناظم بھی منتخب فرمایا تھا جو بفضل خدا اب تک انہیں کی نظامت میں سرگرم عمل ہے۔

غیرت وخودداری اور خاموش کارگزاری میں مولانا موصوف ٹھیک اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر ہیں، ان کی نگرانی اور اہتمام میں کتنے اہم کام انجام پا گئے، لیکن نہ کوئی اعلان نہ اشتہار!

مولانا موصوف جامعہ مفتاح العلوم مئو کے فارغ التحصیل ہیں، اجازت حدیث انہیں اپنے والد محترم رحمہ اللہ کے علاوہ عالم اسلام کے مشہور بزرگ محدث حضرت علامہ زاہد الکوثری نور اللہ مرقدہ سے بھی حاصل ہے۔

یہ حقیر وخاکسار رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد مسلسل تدریس کی خدمت میں لگا ہوا ہے، باقاعدہ مضامین لکھنے کا اتفاق کم ہوا تھا، اکادکا کتابیں اس کے قلم سے نکلی تھیں، لیکن تحریر و قلم سے کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی، اصل ذوق تدریس ہی کا تھا، اور اب بھی ہے، تدریس کے ساتھ تحریر وقلم کے میدان میں کھینچ لانا یہ مولانا موصوف ہی کے حکم اور محبت کا نتیجہ ہے، المآثر کا اجرا طے ہوا تو اس کوتاہ قلم کو اس کا مدیر مقرر فرمایا، جس کے نتیجے میں مسلسل مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا، اور علمی حلقوں میں ایک نئے اہل قلم کا تعارف ہوا۔

غرض مولانا کی لگن یہ ہے کہ حضرت کے علمی وتحقیقی کاموں کو زندہ رکھا جائے، اس پر اضمحلال طاری نہ ہونے پائے، اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی یہ بھی ہے کہ حضرت کا مفصل تذکرہ لکھوانے کا شدید داعیہ ان کے قلب میں پیدا ہوا، ان کا فیصلہ یہ تھا کہ اسی قاصر القلم سے لکھوائیں، میرے قصور ہمت کے باوجود ان کے اس جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی، تو اللہ تعالی نے گھر ہی کہ ایک باصلاحیت عالم کو اس کام کے لئے مستعد فرمادیا، جنہوں نے دوسری مشغولیوں

کے ساتھ بہت کم مدت میں ایک مستند، معیاری اور محققانہ تذکرہ مرتب فرمادیا۔

حضرت کی ان علمی یادگاروں کی بقاوتحفظ میں مولانا رشید احمد صاحب کے صاحبزادگان بالخصوص مولانا ازہر رشید صاحب اور مولانا انور رشید صاحب بھی بہت دلچسپی لیتے ہیں، بحمد للہ حضرت اقدس کی نسل اور خاندان میں دین اور علم کا ذوق زندہ ہے، حضرت کے پوتوں اور نواسوں میں بہت کثرت سے اصحاب علم ہیں۔

حضرت کے دوسرے صاحبزادے حاجی سعید احمد صاحب اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے تحصیل علم کی تکمیل تو نہیں کر سکے تاہم ان کے صاحبزادگان میں اصحاب فراغت موجود ہیں، حضرت کی علمی یادگاروں کے سلسلے میں بڑے بھائی کی معیت میں انہیں بھی بہت دلچسپی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو علم وفضل سے اور دین وتقویٰ سے ہمیشہ آباد وشاداب رکھے۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی
۵؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

☆☆☆☆☆☆

جہاد اور شہادت

(مقدمہ ’’عہد نبوی کے غزوات وسرایا اور شہدائے اسلام‘‘)

اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی کوشش وکاوش میں اپنی جان کو قربان کر دینے کا نام ’شہادت‘ ہے۔ شہادت اسلام کی، اللہ ورسول کی وفاداری کا ایک بلند مرتبہ ہے، موت آتی ہے تو عام آدمی مرجاتا ہے، شہید بھی مرتا ہے، مگر اللہ کا حکم ہے کہ اسے مردہ نہ کہو اور نہ مردہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہے، اور زندگی کے فوائد سے سرفراز ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں اپنے برگزیدہ اور مقرب بندوں کا ترتیب وار تذکرہ کیا ہے، وہاں شہید کو تیسرے نمبر پر رکھا ہے۔ پہلا درجہ تو انبیاء کا ہے، اور اس میں کیا شبہ ہے کہ انبیاء کرام تو انبیاء کرام ہیں، خاص اللہ کے منتخب کردہ اور تربیت دادہ! ان کے بعد ’’صدیقین‘‘ ہیں، یہ صدق وصفا کے پیکر، قلب وذہن اور علم وعمل کے اعتبار سے انبیاء کے مثنیٰ ہوتے ہیں، ان کے بعد ’’شہداء‘‘ ہیں، جو قوت عملیہ کے پیکر ہوتے ہیں، اور یہ قوت بالآخر اللہ کے حضور میں جان کا نذرانہ پیش کر کے دم لیتی ہے۔

جان ہی دیدی جگرؔ نے آج پائے یار پر　　　عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

آخر میں صالحین کا تذکرہ ہے، جو ہیں تو اوصافِ صالحہ اور خصائل حمیدہ کے جامع، مگر کمالات میں گروہِ صدیقین وشہداء کے ہم پایہ نہیں ہوتے۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُوْلٰئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُوْلٰئِکَ رَفِیْقًا (سورہ نساء: ۶۹)

جو لوگ اللہ ورسول کی کی اطاعت کرتے ہیں، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ کا خصوصی انعام ہوا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ، اور یہ لوگ بہترین رفیق ہیں۔

ان چاروں طبقات میں انبیاء تو تمام کمالاتِ انسانیہ کے جامع ہیں، صدیقین میں قوت علمیہ کا غلبہ ہے، اور شہداء میں کمالاتِ عملیہ کا رنگ چھایا ہوا ہے، اور یہ وفاداری کا آخری مقام ہے کہ انسان اپنے سب سے قیمتی سرمایہ یعنی زندگی کو محبوب کے قدموں پر نثار کردے، پس جان چلی گئی مگر وہ مردہ نہیں ہے، زندوں سے بڑھ کر زندہ ہے۔

شہادت کے تصور کے ساتھ ذہن ودماغ میں جہاد کا تصور ابھرتا ہے، کیونکہ شہادت کی بنیاد جہاد ہی ہے، جہاد کیا ہے؟ کیا یہ فساد ہے؟ یا کوئی تعمیری اقدام ہے جس میں انسان کی اور انسانیت کی فلاح ہے؟ فسادیوں نے غل مچا رکھا ہے کہ جہاد، فساد کا دوسرا نام ہے، قتل وخونریزی کا بڑھاوا ہے، چوروں نے اپنے بچاؤ کے لئے شور مچا رکھا ہے کہ مجاہدین چور ہیں، حالانکہ اگر کوئی فسادی ہے تو یہی غل مچانے والے ہیں، اگر کوئی چور ہے تو یہی شور کرنے والے ہیں۔

دنیا میں کون سی قوم ہے؟ جو دوسروں سے نہیں لڑی ہے، جاہل اور نادان قوم نہیں، علم و دانائی رکھنے والوں کی قوم بھی لڑی ہے اور زمین کو خون سے لالہ زار بنایا ہے، کیا آپ ایسی کوئی تہذیب جانتے ہیں جسے مخالفتوں کے ٹکراؤ میں گرفتار ہونا نہیں پڑا ہے، پھر ٹکرانے کے بعد اپنے دشمنوں کا اس نے صفایا نہیں کیا ہے، تو جن لوگوں کے ہاتھ ہزاروں لاکھوں کے خون سے آلودہ ہیں، وہ مجاہدین کے خونِ شہادت کو دیکھ کر کیوں تھراتے اور تلملاتے ہیں؟۔

بات یہ ہے کہ دشمن ہر ایک کے ہوتے ہیں، لڑتے سب ہیں، یہ انسانوں کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، جس سے کسی کو مفر نہیں ہے، دنیا میں کسی تہذیب کو اور کسی تمدن کو آپ نہ دیکھیں گے کہ وہ لڑائی سے دامن بچا کر اپنے وجود کو برقرار رکھ سکا ہو، اصل دیکھنے کی چیز یا اعتراض وتحسین کی بات یہ ہے کہ یہ لڑائی کس مجبوری سے لڑی جارہی ہے، اور کس مقصد کے لئے اسے چھیڑا گیا ہے؟ مقصد کی بلندی، عمل کو بلندی بخشتی ہے، اور مقصد کی پستی عمل کو پست کردیتی ہے، دنیا کے لوگ اپنی ذاتی برتری، ملک کی ہوس، دولت کے جنون، عورت کے عشق میں لڑتے ہیں، اور یہ سب پست مقاصد ہیں، اس لئے یہ لڑائیاں محض فساد ہیں، اور مجاہد صرف اللہ کے لئے، اللہ کے حکم سے لڑتا ہے کہ دنیا میں اللہ کا کلمہ اونچا رہے، اسے نہ اپنی ذاتی برتری سے کوئی غرض ہے، نہ خاندانی حمیت سے کوئی واسطہ ہے، نہ ملک گیری کی ہوس ہے، تو یہ مقصد بہت اونچا ہے، اس ارادے اور

نیت کی وجہ سے اس کا یہ عمل خاک کی پستی سے اٹھ کر اوجِ ثریا پر پہونچ جاتا ہے، یہ عمل فساد نہیں جہاد ہے، اس سے انسانیت کی تخریب نہیں ہوتی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ نہ ہوتو آدمی، آدمی سے بے وجہ ٹکرائے گا، اور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر جائے گا: وَلَوْلَادَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (سورۃ البقرۃ:۲۵۱) اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتے تو زمین برباد ہوکر رہ جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر فضل فرماتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے جہاد کے بارے میں دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ اول یہ کہ اگر جہاد نہ ہو، اور اس کے ذریعے سے ایک دوسرے کی شوکت وقوت نہ ٹوٹے، تو زمین میں بربادی پھیل جائے، کوئی آدمی چین سے نہ رہے گا، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ انسانیت پر کرب وحزن کا غلبہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ دنیا والوں پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ انھیں جہاد کی اجازت ملی ہوئی ہے۔

ان دونوں باتوں پر غور کرنے کے لئے آدمی کو اپنی فطرت اور خلقی نہاد پر غور کرنا ہوگا، اس سے خوب اندازہ ہوگا کہ جہاد کی اجازت میں زمین کی اصلاح وخوبی کیونکر ہے، اور کس طرح اور کتنا بڑا یہ اللہ کا فضل ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ انسان مختلف جذبات وملکات کا مجموعہ ہے، یہ جذبات اور ملکات بعض بعض کے موافق اور معاون ہیں، اور بعض بعض کے مخالف اور متضاد بھی ہیں، اس مجموعۂ اضداد کو باقی رکھنا، اس کو سنبھالے رہنا، اور اس سے مفید کام لینا ایک بڑا نازک عمل ہے، اور یہ عمل وہی کرسکتا ہے جو انسان کے مختلف جذبات وملکات سے پوری طرح واقف بھی ہو، اور اسے ان میں توازن واعتدال پیدا کرنے کی پوری قدرت بھی حاصل ہو، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں بجز خالق انسان کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے، أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (سورہ ملک:) کیا جس نے پیدا کیا ہے وہی نہ جانے گا؟ جبکہ وہ بہت باریک بیں اور خبر رکھنے والا ہے۔

پس انسانی فطرت کے استعمال میں جب بھی کسی ماسوی اللہ نے دخل اندازی کی ہے،

اس نے یا تو اپنی لاعلمی کی وجہ سے یا قدرت نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ انسانیت کو پریشانی میں مبتلا کیا ہے، دیکھ لیجئے دنیا کے تمام ریفارمر، فلسفی اور مصلح ناکام رہے، جن کو وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل نہیں رہی۔ کوئی فلسفی اور ریفارمر ایسا نہ ملے گا جس نے اپنی ناکامی ونامرادی کا اعتراف نہ کیا ہو، بات اتنی سی ہے کہ اسے نہ تو انسان کی تمام مخفی صلاحیتوں سے واقفیت ہے، نہ ان پر قدرت ہے، یہ کام صرف خالق تبارک وتعالیٰ کا ہے، چنانچہ انھوں نے انسان پر احکام جاری کئے، تو توازن واعتدال اور امن واطمینان کا ایک بہترین نمونہ سامنے آیا۔

اللہ کے احکام کی حکمتیں اور باریکیاں تو انھیں کو معلوم ہیں، لیکن انھیں کی رہنمائی میں جب ہم غور کرتے ہیں تو حکمتوں کا ایک پورا گلستاں لہلہاتا اور کھلا ہوا نظر آتا ہے، انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو احکام عنایت فرمائے ہیں، ان پر غور کیجئے تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ہر جذبہ اور ہر ملکہ کے لئے اس کے مناسب احکام صادر فرمائے ہیں، کہ آدمی ان احکام پر عمل کرلے، تو وہ جذبہ تسکین کا سامان پالے گا، اور پھر اسے کوئی اور طلب باقی نہیں رہے گی، اس طرح دو متضاد جذبے اپنا اپنا محل استعمال پاکر مطمئن ہوجائیں گے، اور کسی کا کسی سے تصادم نہ ہوگا، اور انسانیت خوشحال ہوجائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بعض طاقتور جذبات ودیعت فرمائے ہیں، یہ طاقتور جذبات فطرتِ انسانی میں چھپے نہیں رہ سکتے، ان کا نمود وظہور بہر حال ہونا ناگزیر ہے۔

مثلاً محبت وعداوت کا جذبہ! مثلاً شہوت وعفت کا جذبہ! شہوت کا جذبہ انسان میں بہت طاقتور ہے، اسی پر نسل انسانی کی بقاء وتسلسل کا انحصار ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن جن راستوں سے اس جذبہ کی تسکین ہوسکتی ہے، آدمی ان راستوں پر دوڑتا رہے، لیکن اگر اس نے ایسا کیا تو عفت وپاکدامنی کا جذبہ، جو انسان کو انسانیت پر باقی رکھتا ہے، ٹوٹ پھوٹ کر کے بکھر جائے گا، فطرتِ انسان جیسے شہوت کے ہاتھوں مجبور ہے، ایسے ہی عفت وپاکدامنی کا جذبہ بھی اسے ہر قدم پر روکتا ٹوکتا ہے، اس روک ٹوک کے نتیجے میں باہم تصادم ہوتا ہے، اس سے انسانیت برباد ہوتی ہے، اور معاشرہ کی اجتماعی انسانیت جب برباد ہوگی، تو پوری آبادی بربادی کی آگ میں جھلس جائے گی، اللہ تعالیٰ نے جب انسانیت کی فلاح کے احکام اتارے، تو ہر ایک

جذبے کا محل استعمال متعین فرمادیا، اور اس کو اتنا عموم بخشا اور اس وسعت وعموم میں ایسی قیدیں لگائیں کہ جذبۂ شہوت بھی تسکین پائے اور عفت کے نازک حدود بھی برقرار رہیں، اور نسل انسانی کے بقاء وتسلسل کا عمل بھی جاری رہے۔

شہوت کے تقاضا کو پورا کرنے کیلئے مردوں اور عورتوں کو باہم نکاح کی اجازت دی، نکاح کے نتیجے میں دونوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان میں عورتوں کی ذمہ داری ذرا نازک اور پیچیدہ ہے، لیکن ان کی فطرت کے عین مطابق ہوتی ہے، اس لئے بیک وقت انھیں ایک ہی مرد سے نکاح کی اجازت ہے، ورنہ ایسی کش مکش بلکہ کشاکش میں پڑ جائیں گی کہ انھیں اس کا تحمل نہ ہوسکے گا۔

اور مردوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور عورتوں کی ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے ان کے لئے مزید وسعت درکار ہوتی ہے، تو ان کو بیک وقت چار نکاح کی اجازت ہے، چار نکاحوں کی ضرورت تو کسی کسی کو ہوتی ہے، ورنہ ایک ہی نکاح شہوت کے تقاضوں کی تسکین کے لئے کافی ہوتا ہے، اس طرح انسان کو اس کے شہوانی وفطری جذبہ کو بھی تسکین ہوجاتی ہے، اور عفت وعصمت کا فریضہ بھی دونوں فریق سے بحسن وخوبی ادا ہوجاتا ہے، اور نسل انسانی آگے کو قدم بڑھاتی رہتی ہے اور معاشرہ پُر امن وپُرسکون ہوتا ہے۔

یہی حال محبت وعداوت کا بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے ان دونوں طاقتور جذبات کے استعمال کے الگ الگ محل متعین کردئے ہیں، اگر ان کا استعمال ان کے محل پر ہوتا رہے تو دنیا امن وآشتی کا گہوارہ بنی رہے گی، محبت کا محل اللہ ہے اور اللہ والے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (سورۃ البقرۃ:) یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ (سورہ مائدہ:) یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (سورۃ البقرۃ:) جو لوگ ایمان والے ہیں، وہ اللہ سے بہت راسخ محبت رکھتے ہیں۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ اللہ ان سے محبت رکھتا ہے، اور وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ تیسری آیت میں فرمایا کہ کفار اپنے بتوں سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسے اللہ سے محبت ہوا کرتی ہے۔

یہ محبت کا محل ہے، اللہ تعالیٰ، اللہ والے، اور وہ جن سے اللہ تعالیٰ محبت رکھنے کا حکم دیں اور عداوت کا محل دشمن خدا، شیطان ہے، فرمایا: إِنَّ الشَّیْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ

عَـــــدُوّاً (سورۃ الفاطر:٦) شیطان تمہارا دشمن ہے، تو تم اسے دشمن بنالو۔ اب محبت ودوستی اور عداوت ودشمنی کا محل متعین ہوگیا، اب کہیں تصادم نہ ہوگا، اور ماحول میں فساد پیدا نہ ہوگا۔

ٹھیک اسی طرح فطرتِ انسانی میں اللہ تعالیٰ نے غضب کا مادہ بھی رکھا ہے اور حلم ورحمت کا مادہ بھی، اور یہ دونوں متضاد ہیں۔ حق تعالیٰ نے دونوں کیلئے الگ الگ محل عمل متعین کئے ہیں، محل رحمت وہ لوگ ہیں صاحب ایمان ہیں، اور محل غضب وانتقام وہ ہیں جو کفر وشرک میں ملوث ہیں، اور زمین میں فساد مچانے کے درپے ہیں، صحابہ کرام علیہم الرحمۃ والرضوان کے اوصافِ عالیہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: أَشِـدَّاءُ عَـلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْـنَهُـمْ (سورۃ الفتح:۲۹) کفار پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔ خود حضور اکرم ﷺ سے فرمایا گیا کہ: يَاأَيُّهَا النَّبِيّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (سورۃ التحریم:۹) اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔ اور فرمایا گیا: وَاخْـفِـضْ جَـنَـاحَـكَ لِمَنِ اتَّـبَـعَـكَ مِـنَ الْـمُـؤْمِنِيْنَ (سورۃ الشعراء:۲۱۵) اور جن مومنین نے تمہاری پیروی کی ہے، ان کیلئے اپنے بازو جھکادو۔

تو رحمت کا محل الگ ہے، اور غضب کا محل الگ ہے، غضب اور انتقام کی تشکیل جہاد و قتال کی صورت میں کی گئی ہے، کافر اللہ کا باغی ہے، دعوتِ حق کا دشمن ہے، جنت سے دور اور جہنم سے قریب ہے، ایک صاحب ایمان جس کی ہستی کے اجزائے ترکیبی میں غیظ وغضب کا عنصر بھی شامل ہے، اور وہ اپنے اظہار ونمود کے لئے بے قرار ہے، اس کیلئے اس سے بہتر محل کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ کے دشمن پر اظہارِ غضب کرے اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹادینے کی سعی وکوشش کرے۔

جب غیظ وغضب اپنے محل پر پہونچ گیا، اور طبیعت انسانی نے اس مسئلے میں قرار پالیا، تو محبت ورحمت کا عنصر اپنے محل پر بآسانی پہونچ جائے گا، یعنی اللہ کے ماننے والوں، اس کے دوستوں کی طرف لپکے گا، ایک طرف دشمن مٹے گا، دبے گا، کمزور ہوگا تو دوسری طرف دوستوں کی تعداد بڑھے گی، محبت واُنس میں استحکام ہوگا، دنیا راحت پائے گی۔

کیونکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ انسان کے جذبات وملکات کو ظہور وبروز کی صحیح راہ مل جائے اور ہر جذبہ اپنے صحیح محل اور مقام پر پہونچ جائے، تو جذبات کی کشاکش سے نجات مل

جاتی ہے، آدمی مطمئن ہوجاتا ہے، اور اس کے اطمینان کی وجہ سے دنیا میں اطمینان کی چادر تن جاتی ہے۔

اور اگر انسانی جذبات کے خروج وظہور کا صحیح راستہ نہ بنایا جائے، اور درست راستے سے اسے نکلنے کی اجازت نہ دی جائے، تو جذبات کا منہ زور طوفان اٹھے گا ضرور! مگر صحیح راستہ نہ پائے گا تو غلط رُخ اختیار کرلے گا، اور دنیا میں فساد برپا ہوگا۔

پانی کا سیل رواں چلے، اور اسے گزرنے کی صحیح راہ مل جائے، تو وہ بغیر کسی خرابی کے نکلتا چلا جائے گا، اور اگر اسے صحیح راستہ نہ ملا، تو ادھر ادھر پھیل کر کارآمد زمینوں کو غرقاب کردے گا، اور زرخیز زمینوں کو بنجر بنا کر رکھ دے گا۔

آدمی کو نکاح کی اجازت نہ ہو، یا نکاح نہ کرتا ہو، تو شہوت کا طوفان رک تو سکتا نہیں، اس میں ہلچل مچے گی، پھر نگاہ بھی فاسد، کان بھی بدبخت، خیال بھی آوارہ ہوکر رہ جائے گا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کئی عفتیں چکنا چور اور عصمتیں لٹ کر رہ جائیں گی، پھر خاندان کے خاندان پر تباہی کے بادل منڈلانے لگیں گے۔

نکاح کی قید میں عورت اور مرد کو ڈال کر تقاضائے شہوت پورا کرنے کی آزادی عطا کردی گئی، تو یہ دونوں بطور خود مطمئن تو ہوئے ہی، تمام انسانیت کو اندیشہ ہائے گوناگوں سے نجات مل گئی، پھر عزت وآبرو کے ساتھ نسل انسانی کے باقی رہنے کا انتظام بھی ہوگیا۔

خدا کی نازل کردہ شریعت کی یہ خوبی ہے کہ انسان کے تمام جذبات وملکات کا صحیح مصرف نہایت اعتدال اور توازن کے ساتھ متعین کردیا گیا ہے، ہر ایک جذبہ اپنے اپنے محل پر پہونچ کر پُرسکون اور مطمئن ہے، اسے کسی اور طرف تاکنے جھانکنے کی ضرورت ہی نہیں، نہ کوئی ہیجان نہ بے اعتدالی! خود بھی خرخشے سے خالی اور دنیا بھی ہر اندیشہ سے پاک!

جہاد بھی شریعت کے اسی نظامِ فطرت کا مظہر اتم ہے، اللہ نے انسان میں جب رحمت و محبت کا جذبہ رکھا ہے، اسی کے ساتھ شدت وغضب کا مادہ بھی ودیعت فرمایا ہے، اگر ان دونوں متضاد جذبوں کو ان کی اپنی اپنی راہ پر نہ ڈالا گیا، تو کش مکش ہوگی اور دونوں غلط جگہوں پر ظہور کریں گے، اور دنیا آماجگاہِ فساد بن جائے گی۔

ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ دنیا سے خیر وشر کی کش مکش مٹادی جائے، اس دنیا میں یہ کش مکش دائمی ہے، دونوں کا علیحدہ علیحدہ وجود تو قیامت کے بعد ہوگا کہ خیر تمام تر جنت میں اور شر تمام تر جہنم میں۔ دنیا میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں، پس ضروری ہے کہ محبت ورحمت کے جذبے کو خیر کی طرف متوجہ کردیا جائے، اور شدت وغضب کے رُجحان کو شر سے ٹکرادیا جائے، اس صورت میں آدمی بھی مطمئن ہوگا، اور عالم انسانیت بھی پُرسکون رہے گا۔

اور اگر ایسا نہ ہوتو غصہ وانتقام کی آگ کبھی خیر پر بھڑکے گی، کیونکہ اسے شر نہیں ملا، اور محبت ورحمت کی پھوار شر پر برسے گی، کیونکہ اسے خیر نہیں ملا، اور ان دونوں سے دنیائے انسانیت آفت میں مبتلا ہوگی۔

اس فطری انتظام کا اشارہ **أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ** میں ملتا ہے، صحابۂ کرام جو اس فطری نظام کے اولین اور بنیادی نمونہ ہیں، ان میں رحمت وغضب کی راہیں الگ الگ نمایاں ہیں۔ رحمت کا ظہور اپنی جگہ پر اور غضب کا ورود اپنی جگہ پر، اسی لئے ان حضرات میں بے نظیر خلوص اور اتحاد تھا۔

اگر جہاد کا یہ فطری نظام نہ ہوتا، تو باہم تصادم اور ٹکراؤ ہوتا، اور جہاں امن واطمینان ہونا چاہئے وہاں فساد وطغیان برپا ہوتا، چنانچہ تجربہ ہے کہ جہاں جہاں بھی جہاد کا نظام قائم ہوا باہمی محبت واخوت کا دور دورہ رہا ہے، جب کسی دشمن نے مسلمانوں کے معاشرہ پر حملہ کیا اور مسلمان جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، تو آپس کی کدورتیں، عداوتیں فنا ہوگئیں، اور ان سب کا رُخ غیروں کی طرف پھر گیا۔ اس لئے کسی مسلم معاشرہ کی بقاء واصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ ''نظامِ جہاد'' ہے، جہاد ہمارے لئے کوئی باعث ننگ وعار چیز نہیں ہے، بلکہ ایک فطری نظام ہے، جس کے فوائد دنیا میں بھی بہت ہیں اور آخرت میں بھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی گذر چکا ہے: **وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ** (سورۃ البقرۃ:۲۵۱) اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتے تو زمین برباد ہوکر رہ جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر فضل فرماتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں: **وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا** (سورۃ الحج: ۴۰) اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو ڈھا دئے جاتے تکیے، اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بہت کیا جاتا ہے۔

یعنی اگر کسی وقت اور کسی حالت میں ایک جماعت کو دوسری سے لڑنے بھڑنے کی اجازت نہ ہوتو یہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت کی سخت خلاف ورزی ہوتی، اس نے دنیا کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ ہر چیز یا ہر شخص یا ہر جماعت، دوسری چیز یا شخص یا جماعت کے مقابلے میں اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لئے جنگ کرتی رہے، اگر ایسا نہ ہوتا اور نیکی کو اللہ تعالیٰ اپنی حمایت میں لے کر بدی کے مقابلے میں کھڑا نہ کرتا تو نیکی کا نشان زمین پر باقی نہ رہتا، بددین اور شریر لوگ جن کی ہر زمانہ میں کثرت رہی ہے، تمام مقدس مقامات اور یادگاریں ہمیشہ کیلئے صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے۔ کوئی عبادت گاہ، تکیہ، خانقاہ، مدرسہ محفوظ نہ رہ سکتا۔ بناءً علیہ ضروری ہوا کہ بدی کی طاقتیں خواہ کتنی ہی مجتمع ہو جائیں، قدرت کی طرف سے ایک وقت آئے جب نیکی کے مقدس ہاتھوں سے بدی کے حملوں کی مدافعت کرائی جائے۔ مسلمانوں کو کافروں کے مقابلے میں جہاد وقتال کی اجازت دینا اسی قانونِ قدرت کے ماتحت تھا، اور یہ وہ عام قانون ہے جس کا انکار کوئی عقل مند نہیں کرسکتا۔

اگر مدافعت وحفاظت کا یہ قانون نہ ہوتا تو اپنے اپنے زمانے میں نہ عیسائی راہبوں کے صومعے (کوٹھرے) قائم رہتے، نہ نصاریٰ کے گرجے، نہ یہود کے عبادت خانے، نہ مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بڑی کثرت سے ہوتا ہے، یہ سب عبادت گاہیں ڈھا کر اور گرا کر برابر کردی جاتیں، پس اس عام قانون کے تحت کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کو ایک وقت مناسب پر اپنے دشمنوں سے لڑنے کی اجازت نہ دی جائے۔ (فوائد عثمانی)

نظامِ جہاد کا دنیا میں عظیم ترین فائدہ یہ ہے کہ خود اہل ایمان میں باہم للہ فی اللہ محبت قائم اور تعلقات اُستوار رہتے ہیں، اور سب سے پاکیزہ معاشرہ وہی ہوتا ہے جس میں باہم بے غرض محبت والفت قائم ہو، اس پاکیزہ معاشرہ جہاں اور بہت کچھ فوائد ہیں، ایک بڑا فائدہ یہ

حاصل ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو جب اس معاشرے کے مطالعہ اور مشاہدہ کا موقع ملتا ہے، تو بہت جلد ان کے قلوب میں ایمان داخل ہوتا ہے، جہاد کے تحت جو لوگ گرفتار ہو کر آتے ہیں، اور وہ اس پاکیزہ معاشرہ میں غلام بنا کر تقسیم کر دئے جاتے ہیں، تو دیر نہیں گذرتی کہ وہ حلقۂ اسلام میں خلوص و دیانت کے ساتھ داخل ہو جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی آزادی کی بہت سی سبیلیں بنا رکھی ہیں، ان سے فائدہ اٹھا کر بکثرت آزادانہ زندگی گزارتے ہیں، اور علم وعبادت کے نمونے بن جاتے ہیں، جب جہاد کا نظام موجود تھا تو غلاموں کی ایک فوج تاریخ کے صفحات میں ملتی ہے، جس نے علم ودین میں امامت وقیادت کا منصب بلند حاصل کیا۔

جہاد کے واسطے سے دنیا کی یہ برکت بجائے خود بے شمار برکات وفوائد پر مشتمل ہے، اس مختصر تحریر میں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں، تاہم پانے والے ان اشارات کی روشنی میں بہت کچھ پا سکتے ہیں۔

اخروی فائدہ اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ جہاد میں اللہ کے لئے جان دینے والا اللہ کے نزدیک وہ اعزاز پاتا ہے کہ حق تعالیٰ اسے مردہ کہنے کو منع فرماتے ہیں، وہ زندہ ہے، اور شہید ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے دربار سے اسے خاص عزت وتکریم، رزقِ کریم، اور جنت کے سائے میں پرواز اور عرشِ الٰہی کے نیچے قیام کی اجازت مل جاتی ہے۔

شہادت وہ اعزاز ہے، جس سے بلند تر صرف منصب نبوت اور مرتبۂ صدیقیت ہے، شہادت اللہ کے لئے، رسول کے لئے، اسلام کیلئے وفاداری کی ایک بلند اور محکم ترین دلیل ہے، قرآن پاک میں احادیث رسول میں مرتبۂ شہادت کے سلسلے میں بڑے بلند کلمات ہیں۔

اس لئے جہاد اور اس کے نتیجے میں شہادت یا فتح مندی، یہ سب انسانیت کی وہ بلندیاں ہیں جن تک رسائی ہو جانا دنیا وآخرت کی عین خوش بختی اور سعادت مندی ہے۔

مولانا انوار احمد صاحب لائق صد مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اسلام کے شہداء سابقین پر اتنی مفصل اور جامع کتاب تیار کر دی ہے، حق تعالیٰ انھیں شہداء کے طفیل میں کتاب کو بھی اور صاحب کتاب کو بھی قبول فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆

سیرت نبوی کی جامعیت کا ایک درخشاں باب

(مقدمہ ''امہات المومنین'')

فاضل گرامی مولانا انوار احمد صاحب خیرآبادی نے سیرت نبوی کا ایک پہلو منتخب کیا ''عہد نبوی کے غزوات وسرایا اور شہدائے اسلام'' انہوں نے بہت تحقیق وکاوش کے ساتھ اس موضوع پر دو ضخیم جلدیں تیار کردیں، اور اہل علم اور اہل ذوق حضرات سے خراج تحسین حاصل کیا، سیرت نبوی کے اس پہلو پر جب لکھ کر وہ فارغ ہوئے، تو ان کے اشہب قلم نے سیرت ہی کا ایک اور میدان تلاش کیا، ان کے دل ودماغ نے مطالعہ کی وادیاں طے کیں اور رسول اللہ ﷺ کی ازدواجی زندگی کا تفصیل سے جائزہ لیا، اور ''امہات المومنین'' کے نام سے ایک ضخیم جلد مرتب کردی، پہلے موضوع پر اس حقیر کو مقدمہ لکھنے کی اور لکھ کر سیرت نگاری کے ایک گوشہ میں شامل ہونے کی سعادت ان کے واسطے سے ملی تھی، اب زیر نظر کتاب میں بھی مجھے شامل کرنے کا ارادہ انہوں نے کیا کہ یہ خاکسار پھر سیرت نگاروں کی گردِ رہِ کارواں بن سکے، میری سعادت ہے کہ چند سطریں میں سرکار دوعالم فداہ روحی وابی وامی ﷺ کی خدمت اقدس میں نذر کروں۔

اس جگہ ابتداء میں سیرت نبوی کی جامعیت کے بیان کے لئے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ کی البیلی کتاب ''النبی الخاتم'' کا ایک صفحہ مستعار لیتا ہوں، مجھے یہ پوری کتاب بہت پسند اور محبوب ہے، اور یہ خاص صفحہ تو بڑا وجد آفریں ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے قارئین بھی اس وجد میں شریک ہوجائیں، فرماتے ہیں:

> ''پھر کیا مدینہ میں جو پایۂ تخت قائم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا، وہی منبر ہے، وہی مسجد ہے، وہی جھونپڑے ہیں، وہی چمڑے کا اکہرا گدا ہے، نہ حاجب ہے، نہ دربان ہے، امیر بھی آتے ہیں، غریب بھی آتے ہیں، دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے، عجیب دربار ہے!

> سلاطین کہتے ہیں شاہی دربار تھا کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔
>
> مولوی کہتے ہیں، مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتاء تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا۔
>
> صوفی کہتے ہیں خانقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ پھونک تھا، ورد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تحنث (چلہ) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، فاقہ تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دی جاتی ہیں کہ کھارے کنوؤں کا پانی میٹھا ہو جائے، بچوں کے سر ہاتھ پھیرا جاتا ہے، جس کو جو کہہ دیا جاتا ہے، پورا ہو جاتا ہے۔
>
> مگر سچ یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اس لئے کہ وہ سب کے لئے تھا، آئندہ بھی جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا، اسی روشنی میں چلنا تھا۔ (ص۱۵۳)

آپ معلم تھے، ہادی تھے، آپ کی تعلیم عام تھی، آپ کی ہدایت سب کے لئے تھی، آپ ساری انسانیت کے لئے معیار اور نمونہ تھے اسی لئے آپ کی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کرنے کا انتظام کیا گیا، آپ کی حیات طیبہ کے ہر گوشے کو اجاگر کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

اللہ نے انسان کی زندگی کو روز و شب کے دو بڑے شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے، پھر ان دونوں کے ذیلی اور ضمنی شعبے بہت سے ہیں تاہم بنیادی طور پر یہی دو شعبے ہیں، دن کی جلوتیں، اور رات کی خلوتیں! عام انسانوں کا حال تو یہ ہے کہ دن کی روشنی میں ان کی جلوتیں نمایاں ہوتی ہیں، نگاہیں ان پر پڑیں یا نہ پڑیں، ان کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو، لیکن رات کی تاریکی میں ان کی خلوتیں بہرحال مستور و مخفی رہتی ہیں، اور انہیں نمایاں کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

لیکن رسول کا معاملہ عام انسانوں جیسا نہیں ہے، کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، کسی کی نگاہ پڑے یا نہ پڑے، نہیں! رسول کی زندگی ہر امتی کی نگاہ میں رہنی چاہئے، وہ اسے تلاش کرے، جلوتیں بھی دیکھے، خلوتوں کو بھی جانے، تاکہ ہر مرحلۂ حیات میں آپ کے عمل کو اسوہ اور نمونہ بنائے، دن کی جلوتوں اور جلوتوں کے احوال و اعمال کو دیکھنا نیز آپ کے فرمودات واقوال کو سننا تو فطرۃً آسان کر دیا گیا ہے، ماننے والوں کا جھرمٹ ساتھ ہے، نہ ماننے والے بھی پرکھ رہے ہیں، ماننے والے سنتے ہیں اور تعمیل ارشاد کرتے ہیں، نہ ماننے والے بھی سنتے ہیں، دل سے متأثر

ہوتے ہیں، گو زبان سے انکار کرتے ہیں، تو جلوت کے کام اور جلوت کی باتیں سب دیکھ رہے ہیں، سب سن رہے ہیں، موافق بھی، مخالف بھی، دوست بھی، دشمن بھی، اور دونوں اپنے انداز میں یاد رکھتے ہیں، دوسروں تک پہونچاتے ہیں، دوسروں کو سناتے ہیں، ان دونوں راہوں سے رسول کی جلوتیں ان کی زندگی میں بھی عام ہوئی ہیں، اور ان کے بعد بھی ان کی بقاء وحفاظت کا ایسا حیرت ناک اور عظیم الشان انتظام ہوا کہ کوئی ایسا عمل جو رسول سے صادر ہوا ہو اور کوئی ایسا کلام جو رسول کی زبان سے نکلا ہو، ایسا نہیں ہوا کہ ان کاموں اور ان باتوں میں سے کوئی چیز گم ہوگئی ہو، حافظوں نے انہیں کھودیا ہو، اور تلاش کرنے والوں نے انہیں نہ پایا ہو، کس کس جتن سے آپ کے تلامذہ (حضرات صحابہ کرام) نے انہیں یاد رکھا، بعد والوں کو بتایا، زبان سے بھی بتایا، عمل کرکے بھی دکھایا، اور پھر وہ سب چیزیں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہیں، اور تواتر کے ساتھ بعد والوں میں پھیلتی رہیں۔

جلوتوں کا یہ انتظام تو مسلسل رہا، از اول تا آخر رہا، مکہ میں بھی رہا، مدینہ میں بھی رہا، حضر میں بھی رہا، اور سفر میں بھی رہا، فدا کاروں کا مجمع ہمہ وقت پروانوں کی طرح اس شمع ہدایت پر نثار ہوتا رہا، جنگ میں بھی، صلح میں بھی۔

ضروری تھا کہ آپ کی خلوتوں کے اظہار واعلام کا بھی انتظام کیا جائے، مکہ کی پوری زندگی آزمائشوں اور انکار وتمرد کے مظالم کی بھٹیوں میں تپتی رہی، وحی ونبوت کی تیرہ سال کی مکی زندگی مسلسل جانکاہیوں، مشقتوں، ایذاؤں اور کفر وانکار کی تلخیوں میں گھری رہی، مدنی زندگی کا بھی ابتدائی دور، مخالفت کی ہواؤں اور آندھیوں میں الجھا رہا، جن کے بگولے مکہ اور اطراف مکہ سے اٹھتے رہے، اور مدینہ کو جھلسانے کی کوشش کرتے رہے، پھر اخیر کے چند برسوں میں قدرے مہلت ملی، اگرچہ خرخشے اب بھی سکون کو درہم برہم کر رہے تھے، تاہم بقیہ چند سالوں میں ضروری تھا کہ دین کی تعلیم کی تکمیل کردی جائے، تربیت نفوس کا کام پورا کردیا جائے، اور موجودہ امت کو اس لائق بنادیا جائے کہ بعد کی امت جو بہت کثیر تعداد میں، مختلف طبقوں سے، مختلف ملکوں سے، مختلف رنگ ونسل سے حلقۂ اسلام میں آئے گی، ان کی تعلیم وتربیت کا فریضہ ٹھیک نمونہ کامل اور اسوۂ حسنہ کے طرز وانداز پر یہ حضرات ادا کرسکیں۔

پس زندگی کے انہیں آخری دنوں میں ارادہ فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں میں قدوسیوں اور پاکبازوں کی ایک بڑی جماعت تیار ہوگئی ہے جن کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی جلوتوں کو محفوظ کردیا گیا ہے، اورانہیں کے ذریعے یہ باتیں رہتی دنیا تک منتقل ہوتی رہیں گی۔

ارادہ کیا گیا کہ رسول کی خلوتیں، خلوت کی باتیں، خلوت کی راتیں، خلوت کی عبادتیں بھی روشنی میں آجائیں، تاکہ سیرت کا یہ شعبہ مخفی نہ رہ جائے، ہر آدمی کے لئے خلوت ناگزیر ہے، کیا مرد اور کیا عورت! تو کیا اس کے لئے رسول کی زندگی کا نمونہ درکار نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے، پھر اگر اس کا انتظام نہ ہو، تو نمونہ ادھورا رہ جائے گا، تلاش کرنے والا دن کو، اور دن کے اعمال کو تو روشن پائے گا لیکن رات کے حصے میں جو زندگی کا نصف حصہ ہے اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔

پھر یہ بھی ہے کہ انسانیت کا نصف یا نصف سے زائد حصہ صنف نازک (عورتوں) پر مشتمل ہے، ان کے لئے متعدد معاملات میں اسوہ اور نمونہ عورتوں ہی کی زندگی میں مل سکتا ہے، عورتوں کے کچھ خصوصی معاملات ہیں، جن کو سمجھانے، بتانے کے لئے عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ سارے جہاں کی عورتوں کے لئے، قیامت تک نسل انسانی میں جو عورتیں پیدا ہونے والی ہیں، ان سب کے لئے، ان کی تعلیم وتربیت کے لئے، ان کے نمونہ کے لئے عورتوں کی بھی ایک جماعت تیار کی جائے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کی مشیت نے مردوں میں ایک سے بہتر ایک آپ کی صحبت و رفاقت کے لئے انتخاب فرمائے اور ہر مذہب وملت سے منتخب فرمائے، بت پرستوں میں سے، یہودیوں میں سے، عیسائیوں میں سے، تاکہ آپ کی تعلیمات ہر طبقے اور ہر مذہب میں عام ہوں اسی طرح مشیت حق کا تقاضا ہوا کہ ان مختلف مذاہب وطبقات میں سے بہتر سے بہتر عورتوں کا انتخاب ہوتا کہ ان کے ذریعے سے انسانیت کے اس نصف حصے میں بھی اسوۂ حسنہ کا پھیلاؤ ہوسکے

عورت مرد کی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے، جس طرح عورت کے لئے مرد ایک بنیادی لازمہ ہے، بقائے نسل انسانی کا دارومدار دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ احتیاج اور ضرورت پر ہے، لیکن اس ضرورت کے علاوہ اور بھی زندگی کی کتنی ضرورتیں اس احتیاج سے وابستہ ہیں، اور اس طرح باہم وابستہ اور پیوستہ ہیں کہ انہیں جدا کرنا تو کیا ہر ایک کو علیٰحدہ علیٰحدہ دیکھنا اور

ان کا جائزہ لینا بھی مشکل ہے، لیکن ان ضرورتوں میں نمایاں اور غالب ضرورت وہی سمجھی جاتی ہے جس کا تعلق آدمی کی نوجوانی سے ہے، جس کے نتیجے میں نسل انسانی کا تحفظ ہوتا ہے، پھر اس کے متعدد لوازم انسان کی طبیعت کے تقاضے سے ابھرتے ہیں، حسن و جمال، عنفوان شباب، ہم سنی یا کمسنی وغیرہ ان لوازم کے ساتھ مردوں اور عورتوں میں موافقت ہوتی ہے، پھر جوانی کے جذبات بے قابو ہوں تو انسانیت تباہی کے دہانے پر پہونچ کر رہتی ہے، اور اس کو قابو میں رکھنے کے لئے دنیا کے تمام شرائع وقوانین میں نکاح کا دستور ہے۔

بیمار ذہنیتوں اور مریض دماغوں نے شور مچایا کہ پیغمبر اسلام نے ایک نہیں متعدد نکاح کئے گویا یہ بھی کوئی جرم ہے جسے وہ پیغمبر اسلام کی طرف منسوب کر کے ان کا مرتبہ گھٹانا چاہتے ہیں

جرم یہ ہے کہ آدمی بغیر کسی شرعی قاعدہ وقانون کے عورتوں کو اپنی خدمت میں رکھ لے، یا بغیر اذن الٰہی کے عورتوں سے شہوت کا تعلق رکھے، جیسا کہ پرانی تاریخوں میں بادشاہوں، امراء اور رؤسا کے احوال میں بکثرت ملتا ہے، یا مصنوعی مذہبی گھروندوں سے اللہ جانے کتنی کنواری لڑکیاں وابستہ ہوتی ہیں اور وہاں کے پجاریوں، پروہتوں اور پادریوں کی ہوسناکیوں کا شکار بنتی ہیں، جرم اگر ہے تو یہ ہے! لیکن مجرموں نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے بے قصوروں کے سر جرم کی تہمت لگائی۔

کاش آنکھ والے دیکھیں اور دماغ والے سوچیں کہ مکہ کا وہ نوجوان جو ساری انسانیت کے لئے نمونہ بننے والا تھا، جس کا بچپن ہی نہیں اس کی جوانی بھی معصوم ہے، اور اس کو جاننے والا ہر فرد، اس کا گھر، اس کا خاندان، اس کا شہر سب اس کی معصومیت کا گواہ ہے، اس کی جوانی کو جب عورت کی ضرورت تھی، تب ایک ایسی جگہ سے نکاح کا پیغام آیا، جہاں اس عمر کے نوجوانوں کے تمام شرائط ولوازم ناپید تھے، مگر اس نوجوان نے اس پیغام کو قبول کیا، پچیس سال کی عمر کے نوجوان نے چالیس سال کی بیوہ کو اپنے حلقۂ نکاح میں لیا، اور اس خاتون کے ساتھ جوانی کے بہترین ایام پچاس برس کی عمر تک گزار دیئے، یہ خود اس بات کی شہادت ہے کہ طبیعت کا یہ فطری جذبہ کس قدر پاکیزہ اور قابو میں تھا۔

اس پہلے نکاح کے لئے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتخاب درحقیقت خدا

کی جانب سے تھا، یہ نکاح کتنا بابرکت ثابت ہوا، اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں، جنہیں سیرت نبوی سے واقفیت ہے، آپ کی تمام اولادیں حضرت ابراہیم کے علاوہ انہیں کے بطن سے ہوئیں، پھر رسول اکرم ﷺ کی رفاقت کا حق ہر مشکل وقت میں ادا کیا، بالخصوص آغاز نبوت میں ان کی زبان مبارک سے تائید اور تسلی کے جو کلمات صادر ہوئے وہ بالکل الہامی کلمات تھے، اسی لئے ان کی وفات سے جو صدمہ حضور کو ہوا، اسے تا زندگی آپ نے یاد رکھا، ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ کا نکاح دوسری سن رسیدہ خاتون حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے ہوا ان کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کے نکاح میں آئیں، لیکن ان کی رخصتی کئی سال کے بعد مدینہ طیبہ میں ہوئی، ان چند برسوں میں حضرت سودہ تنہا آپ کے ساتھ رہیں، ہجرت کے سات آٹھ ماہ کے بعد ان کے ساتھ حضرت عائشہ بھی شریک ہوئیں، اس وقت آپ کی عمر شریف ۵۴ سال کے قریب تھی، باقی سب نکاح آپ کے ۵۵ سال کی عمر سے ۵۹ سال کی عمر تک میں ہوئے ہیں، اور یہ سب نکاح بجز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سب سن رسیدہ بیوہ خواتین سے ہوئے ہیں۔

ناظرین اس تفصیل سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کے یہ سب نکاح بشری حاجت کی مجبوری سے ہوئے ہیں؟ یا اس سے بہت ارفع واعلی خاص مقاصد کے تحت ہوئے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ آپ صرف ایک بشر نہ تھے، جو حاجات وضروریات کی بندشوں میں گرفتار ہوتا ہے اور اسی کے تابع ہو کر اپنی زندگی کے نقشے میں رنگ بھرتا ہے، آپ کی بشریت صرف مجبوریوں اور ضرورتوں کے حصار میں محصور نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ آپ اللہ کے رسول بھی تھے، اور یہی حیثیت آپ کی غالب تھی، اور بشریت اس کے سامنے مغلوب تھی، اسی لئے بشریت کی کمزوریاں تو آپ پر کیا اثر انداز ہوتیں، بشریت کے لوازم وآثار سے بھی آپ مغلوب ومتاثر نہ ہوتے تھے، کھانے پینے سے وہ بے نیازی کہ پیٹ پر دو دو پتھر بھی بندھ جائیں تو کمزوری نہ ہوتی، نیند سے اتنا استغنا کہ راتیں جاگ جاگ کر گزار دیتے، اور نیند کی مجبوری سے کبھی سوتے ہوئے آپ کو نہیں پایا گیا اور نیند بھی ایسی کہ آنکھ سو رہی ہے، مگر دل جاگ رہا ہے، جنگوں میں سارا لشکر تھک کر چور ہو جاتا اور آپ پورے نشاط سے نماز میں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، اور رات رات بھر

کھڑے ہیں، غزوہ خندق کی سنگین راتوں میں دیکھنے والے آپ کو دیکھتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کو اللہ کا حکم ہو چکا تھا کہ: **قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین ، لا شریک لہ و بذلک امرت و انا اول المسلمین** (سورہ الاعراف) تم کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا، اور میں پہلا فرمانبردار ہوں۔

آپ کی بشریت اس حکم الٰہی میں فنا ہو چکی تھی، پس آپ کا کھانا پینا، سونا جاگنا، نکاح کرنا کوئی بھی بشری تقاضے سے نہ تھا، حکم الٰہی کے ماتحت دین و شریعت کے بلند مقاصد حاصل کرنے کے لئے تھا۔

آپ نے اخیر زندگی کی قلیل مدت میں یعنی صرف چار سال کی مدت میں، جب کہ اسلام کی روشنی میں پورا عرب چمکنے کے قریب ہو رہا تھا اور عرب کے باہر بھی اس کی روشنی پھیلنے والی تھی، اسلام کا کام بہت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، اب ضرورت تھی کہ جہاں مردوں کی تربیت ہو رہی تھی عورتوں کا ایک گروہ بھی نمونہ کا گروہ تیار کر دیا جائے، اسی بلند دینی مقصد کے تحت ایسا ہوا کہ آپ نے خام فہم اور نا تجربہ کار عوتوں کا انتخاب نہیں کیا، کیوں کہ انہیں دوسروں کے لئے نمونہ بنانا تھا، وقت بھی کم تھا، فرصت تنگ ہو رہی تھی، شاید یہی وجہ ہے کہ چن چن کر مختلف طبائع اور مزاج، مختلف مذاہب اور دیانات کی سن رسیدہ فہمیدہ و سنجیدہ، بیوہ عورتیں جو زندگی کے سرد و گرم کا تجربہ کر چکی تھیں، ان کی ایک برگزیدہ، پاک اور منتخب جماعت کو مختلف اسباب و وجوہ کے پردے میں، قدرت نے آپ کی خدمت میں اس وقت مہیا کیا، جب آپ کا اپنے فرض سے سکبدوشی کا وقت آخر ہو رہا تھا، یہ بات کھل چکی تھی کہ اب مکہ فتح ہوگا، خدا کی زمین جھوٹے خداؤں کی نجاست سے پاک ہوگی، جس کے بعد آپ کا کام پورا ہو چکے گا، پس اس کام کو کامل طور پر پورا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ مردوں کے ساتھ چند عورتوں کی تعلیم و تربیت کا کام اپنی آخری زندگی میں اسی حیثیت سے انجام دیتے، جس حیثیت سے مردوں کی منتخب اور چیدہ جماعت کی تربیت آپ نے فرمائی تھی، لیکن فراست نبوی کا یہ کیسا روشن تجربہ ہے کہ آپ نے

مصنوعی مذہبی مقتداؤں اور نام نہاد روحانی پیشواؤں کی مجرمانہ پیش دستیوں کا راستہ ان عورتوں سے نکاح کر کے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

پچھلے دنوں بیت المقدس کی خدمت کے لئے ایک بزرگ ہستی حضرت عمران کی بیوی نے صرف ایک لڑکی (مریم) کو پیش کیا تھا، پھر دیکھئے اس ایک کنواری کی آڑ میں چرچوں پر، گرجاؤں پر، ان کے اماموں پر، خطیبوں پر، رہبانوں پر، پادریوں پر کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں، خدانخواستہ اگر کسی ایک اجنبی عورت کو نزدیکی کی وہ حیثیت دے دی جاتی، جو باہر مردوں کو حاصل تھی تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ بعد کو آدم کے لبادہ میں کتنے ابلیسوں کے لئے قرب ونزدیکی کا یہ حیلہ کن کن شرارتوں اور خباثتوں کی بنیاد بن جائے گا۔

الغرض ان عورتوں کو ''بیوی'' کا مقام عطا کیا، اور جس کو انسان سوچ نہیں سکتا، اس حد تک ان کے ساتھ حقیقی عدل اور برابری کا نمونہ آپ نے پیش کیا، اس وقت جب کہ آپ کا دماغ عالمگیر سیاست، عالمگیر حکومت، ہمہ گیر تعلیم وتربیت کی الجھی ہوئی پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف تھا، عین اس وقت عائلی اور خانگی زندگی کی ژولیدگیوں کو بھی نہایت خندہ پیشانی سے حل کر رہا تھا۔(النبی الخاتم)

لوگوں نے آپ کے حرم میں بہت سی خواتین کو تو دیکھا، لیکن یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ ان نکاحوں میں انسانی طبیعت کے تقاضے کتنا دخل رکھتے ہیں؟ اور شریعت وحکمت کی کتنی مصلحتیں کارفرما ہیں؟

آپ کتاب میں ازواج مطہرات امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے تذکرے تفصیل سے پڑھیں گے وہاں ان نکاحوں کی مصلحتیں اور حکمتیں واضح طور پر آپ پڑھیں گے، میں تو اشارات سے بھی کام لوں تو مضمون خاصا طویل ہو جائے گا لیکن چند ایک اشارے اگر ذکر کر دوں تو مضائقہ نہیں۔

ام المومنین حضرت صفیہ خاتون ایک یہودی عالم کی صاحبزادی تھیں، ان سے نکاح کے پہلے جتنی جنگیں کفار نے اہل اسلام کے ساتھ کی تھیں، ان سب میں یہود کا ہاتھ تھا، مگر حضرت صفیہ سے نکاح کے بعد یہود، مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے۔

سردار کفار ابوجہل کے قتل کے بعد مسلمانوں کے خلاف جنگ کی کمان ابوسفیان نے سنبھالی، لیکن حضرت ﷺ کا نکاح جب ابوسفیان کی صاحبزادی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے ہوا، اس کے بعد باپ نے مسلمانوں کے خلاف کوئی جنگ نہیں کی، بلکہ تھوڑے عرصے کے بعد وہ خود دائرہ اسلام میں آ گئے۔

ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا باپ مشہور رہزن تھا، اور مسلمانوں سے دلی عداوت رکھتا تھا، بنو مصطلق کا مشہور طاقتور اور جنگ جو قبیلہ اس کے اشارے پر کام کرتا تھا، اس نکاح سے پہلے مسلمانوں کے خلاف ہر جنگ میں اس قبیلہ کی شرکت ضرور پائی جاتی تھی، لیکن اس نکاح کے بعد یہ دشمنیاں یکسر معدوم ہو گئیں، پھر یہ قبیلہ مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہیں ہوا۔

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح پر غور کیجئے، ان کی ایک بہن سردار نجد کے نکاح میں تھی، اس نکاح نے ملک نجد میں صلح اور امن اور اسلام کے پھیلانے میں بہترین نتائج پیدا کئے۔

ام المومنین زینب بنت جحش، عائشہ صدیقہ، حفصہ اور ام سلمہ کے نکاح خالص اسلامی اغراض اور مصالح دینی پر مبنی تھے، حضرت زینب بنت جحش کے نکاح نے منہ بولے بیٹے کے بت کو توڑا، جب کہ زمانہ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کی بیوی نے سگے بیٹے کی بیوی کا درجہ حاصل کر رکھا تھا۔

حضرت عائشہ وحفصہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہن کے نکاح نے قرآن کریم کی حفاظت اور احادیث رسول کی نشر واشاعت اور عورتوں کی تعلیم وتربیت میں غیر معمولی فوائد پہونچائے۔
(رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان منصور پوری ملخصاً)

یہ مختصر مختصر سے نمونے ہم نے ذکر کئے، پورا علم تو اللہ ہی کو ہے، ہم کیا اور ہماری بساط علم کیا؟ اصل کتاب پڑھیے اور دل ودماغ کو روشن اور علم وایمان کو تازہ کرتے جائیے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف مدظلہ کو جزائے خیر عطا فرمائیں، آمین۔

☆☆☆☆☆☆

مقدمہ ’’اخلاق نبوی غزوات کے آئینے میں‘‘

رسول اللہ ﷺ کا سب سے روشن اور واضح سرنامہ وحی ونبوت کے بعد ’’حسن اخلاق‘‘ ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح آپ کی وحی ورسالت کی گواہی قرآن کریم میں دی ہے، اسی طرح آپ کے حسن اخلاق کی گواہی بھی دی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: **وَإِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیْمٍ** (سورۃ القلم:۴) بلاشبہ آپ بلند ترین اخلاق کے مالک ہیں، اور ارشاد فرماتے ہیں: **فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللہِ لِنْتَ لَھُمْ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ** (سورۃ النساء: ۱۵۹) یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ آپ ان کے لئے نرم دل ہیں، اگر آپ بدخو اور سنگدل ہوتے، تو یہ آپ کے پاس سے منتشر ہوجاتے۔ نیز ارشاد ہے: **لَقَدْ جَاءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْم** (سورۃ التوبہ:۱۲۸) تمہارے پاس تم ہی لوگوں کی جنس (یعنی بشر) سے ایک رسول آیا، اس کے اوپر ہر وہ چیز گراں ہے جس میں تمہارا ضرر ہو، تمہارے اوپر خیر کے لئے بہت حریص ہے، بالخصوص مومنین کے حق میں بہت مہربان اور رحم وکرم والا ہے۔

حق تعالیٰ سے بڑھ کر بندوں کا حال کون جان سکتا ہے، انھیں نے سب کو پیدا کیا ہے، **أَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ** (سورۃ الملک:۱۴) کیا وہی نہیں جانے گا؟ جس نے پیدا کیا ہے، جبکہ وہ لطیف (باریک بیں) بھی ہے، اور خبیر (ظاہر وباطن کی پوری خبر رکھنے والا بھی) ہے۔ تو جب خالق عزوجل نے خود اپنے رسول کے خلق عظیم کی گواہی دی ہے، تو اب کس شہادت کی ضرورت رہ جاتی ہے، آخر انھیں نے پیدا کیا، انھیں نے حسن استعداد ودیعت فرمایا، انھیں نے خاص طور پر تعلیم دی، اور خصوصی تربیت فرمائی، اور پھر ہمہ وقت نگرانی رکھی، پھر جب

وہی ارشاد فرمائیں کہ آپ عظیم ترین اخلاق سے مالا مال ہیں، تو کسے شک کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

پھر پرکھنے والوں نے پرکھا، دیکھنے والوں نے دیکھا، برتنے والوں نے برتا، خلوت میں، جلوت میں، دوستوں میں، دشمنوں میں، خوشی میں، ناخوشی میں، دولت میں، تنگدستی میں، مسجد میں، بازار میں، گھر کی تنہائیوں میں، باہر کے مجمعوں میں، صلح میں، جنگ میں، حضر میں سفر میں، جوانی میں، کہولت میں، بڑھاپے میں، صحت میں، مرض میں، عبادات میں، معاملات میں، اولاد میں، ازواج میں، غرض زندگی کے احوال کا کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا گیا، ہر جگہ ایک خاص بات جس میں کبھی فرق نہیں پڑا، وہ آپ کے اخلاق حسنہ اور خصائل حمیدہ کی جلوہ گری ہے کہ ہمیشہ آفتاب کی طرح چمکتی رہی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ جب دس سال کے تھے، ہجرت مدینہ کے موقع پر ان کی ماں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں یہ کہہ کر سپرد کیا تھا کہ پیش کرنے والے آپ کی خدمت میں ہدیہ پیش کررہے ہیں، میرے پاس کچھ نہیں۔ یہ ایک بیٹا ہے، جو سمجھدار ہے، میں اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں کہ آپ کی خدمت کرے گا۔ آپ ﷺ نے بچے کو قبول فرمایا، انھوں نے وقت اخیر تک یعنی دس سال تک آپ کی خدمت کی، بچپن کی عمر، غفلت کا زمانہ، اللہ ہی جانتا ہے کہ کہاں کہاں رسول اللہ ﷺ کے مزاج لطیف کے خلاف کیا کیا ہوا ہوگا، لیکن خود حضرت انسؓ گواہی دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> میں نے اللہ کے رسول ﷺ کی دس برس خدمت کی ہے، آپ نے کبھی مجھ کو اُف بھی نہ کہی، اور نہ کبھی فرمایا کہ فلاں کام کیوں کیا، اور فلاں کام کیوں نہیں کیا۔ (بخاری ومسلم)

یہ ہمہ وقت کے حاضر باش خادم کی گواہی ہے، کیا دس سال کی مدت میں اور وہ بھی اس عمر میں جبکہ کھیل کود کے شوق کا غلبہ ہوتا ہے، ان سے کبھی کوئی خلاف مزاج کام نہ ہوا ہوگا۔ خلاف مزاج بھی ایک واقعہ انھیں حضرت انسؓ کی زبانی سن لیجئے، اور رسول اللہ ﷺ کے حسن اخلاق کا جلوہ دیکھئے، فرماتے ہیں:

> رسول اللہ ﷺ سب سے بڑھ کر خوش خلق تھے، آپ نے مجھ کو ایک دن کسی کام کے لئے بھیجا، میں نے کہا کہ میں تو نہیں جاتا اور دل میں تھا کہ جہاں کا حکم دیا ہے وہاں جاؤں گا (یہ

> بچپن کا اثر تھا) میں وہاں سے چلا تو بازار میں چند کھیلنے والے لڑکوں پر گزرا، اچانک رسول اللہ ﷺ نے پیچھے سے میری گردن پکڑ لی، میں نے آپ کو دیکھا تو ہنس رہے تھے، فرمایا، جہاں میں نے کہا تھا تم گئے؟ میں عرض کیا جی ہاں! یا رسول اللہ میں جا رہا ہوں۔ (مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ان دونوں روایتوں سے اجمالاً رسول اللہ ﷺ کے مزاج وطبیعت کے جمال وکمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ تفصیلات دیکھنی ہو تو سیرت کی کتابوں اور احادیث کے ذخائر پر نظر ڈالئے، حسن اخلاق کے جلوے ہر جگہ جگمگاتے دکھائی دیں گے جن سے قلب وروح کو ایمان کی روشنی اور حسن خلق کی پاکیزگی حاصل ہوگی۔

حسن اخلاق کا ملکہ جب طبیعت میں راسخ ہوتا ہے، تو زندگی کے ہر میدان میں اس کا ظہور ہوتا ہے اور اگر اس ملکہ میں کچھ کمی ہوتی ہے، تو بعض حالات میں اخلاق عالیہ کا ظہور ہوتا ہے اور بعض نازک مواقع پر اس کا پتہ نہیں چلتا، خوشی کے حال میں اخلاق کا برت لینا مشکل نہیں ہے لیکن رنج وغم کی حالت میں اکثر اس کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، مزاج وطبیعت کے موافق کام ہو، تو حسن خلق کا معاملہ آسان ہے، مگر خلاف مزاج اور خلاف طبیعت مواقع پر اس کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

عام حالات میں جبکہ اپنے دوستوں، ہوا خواہوں کے درمیان آدمی ہوتا ہے، کھانے پینے کی فراوانی ہوتی ہے، مشکل حالات کا سامنا نہیں ہوتا، معمول کے مطابق زندگی کے لیل ونہار بسر ہو رہے ہوتے ہیں، اس وقت انسان حسن اخلاق کا مظاہرہ کر لے تو کچھ دشوار نہیں، لیکن اسی آدمی کو دیکھئے کہ مخالف حالات میں گھرا ہوا ہے، دشمنوں سے جنگ وپیکار کا ماحول ہے، ہر طرف اندیشوں اور خطرات کی یلغار ہے۔ کب حالات بے قابو ہو جائیں، کب لڑائی ہو جائے، کب دشمن چڑھ جائے، کہاں کیا خطرہ پیش آجائے۔ اس بے اطمینانی اور خوف وہراس کے ماحول میں بھی انسان کے عقل وہوش بجا رہیں، اس کا دل مضبوط، اس کی زبان قابو میں رہے، حسن اخلاق کے راستے سے اس کا قدم نہ ڈگمگائے، تو یہ انسانیت کی معراج اور طبیعت کا کمال ہے۔ اس کسوٹی پر آپ دنیا کے نامور اشخاص کو پرکھئے، اور دیکھئے کہ ایسے نازک مواقع پر ان کی طبیعت اور مزاج کا کیا رنگ رہا ہے۔ اکثر کو آپ پائیں گے کہ ان کے قدم پھسل گئے ہیں، اخلاق کا دامن ہاتھ سے

چھوٹ چھوٹ گیا ہے سوائے ان کے جو رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر ٹھیک ٹھیک چلے ہیں، جنھوں نے اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کو اس سانچے میں ڈھال لیا ہے، جو سانچہ نبی کریم ﷺ اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے تیار فرمایا تھا۔ اس نازک مرحلے میں رسول اللہ ﷺ کو ڈھونڈیئے کہ خطرات جنگ کے ماحول میں آپ ﷺ کے اخلاق فاضلہ کا ظہور کس کس طرح ہوا ہے؟۔

معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ترسٹھ سالہ زندگی کا وہ دور جس میں نزول قرآن کا سلسلہ چل رہا تھا، جو ۲۳ر سال کے لمبے عرصے پر محیط ہے، جس میں آپ لوگوں کی کمر پکڑ پکڑ کر جہنم سے کھینچ رہے تھے، اور جنت کے راستے پر لا رہے تھے، اور لوگ پوری قوت سے آپ کی مخالفت کر رہے تھے، یہ پورا دور خطرات اور اندیشوں بلکہ مصائب وآلام سے گھرا ہوا تھا۔ مکہ میں تیرہ سال کا عرصہ تو اس طرح گزرا کہ صرف مظلومیت کے مصائب سہتے رہے، آپ بھی اور آپ کے جاں نثار صحابہ بھی، پھر مدینہ آئے، اور ایک خود مختارانہ زندگی کا انتظام ہوا تو مخالفین نے جنگ کا عفریت مسلط کر دیا۔ مظلوموں کو بھی جہاد کی اجازت ہوئی، مدینہ کی دس سالہ زندگی کا کوئی سال ایسا نہیں گزرا کہ آپ اور آپ کے اصحاب فراغت سے زندگی کے روز مرہ کاموں میں مشغول ہوتے۔ خطرات کی آندھیاں چلتی رہیں، کبھی بہ نفس نفیس رسول اللہ ﷺ کفار ومخالفین کے مقابلہ کے لئے نکلتے، کبھی اپنے جاں نثاروں کو بھیجتے، پھر ان کی واپسی تک ان کی طرف دل وجان سے متوجہ رہتے، ان اندیشہ ناک احوال میں آپ کا سابقہ جہاں اپنے رفقاء اور جاں نثاروں کے ساتھ ہوتا وہیں کچھ کھلے کچھ چھپے دشمنوں سے بھی ہوتا، خوش حالی تو کم ہی ہوتی، زیادہ تر تنگدستی اور بدحالی سے سابقہ رہتا، ایک طرف منافقین اور دوسری طرف یہود اپنی سازش میں مصروف رہتے، کبھی کبھی اپنے رفقاء کی طرف سے بھی خلافِ مصلحت کوئی کام ہو جاتا۔ ان سب احوال میں آپ کے اخلاق عالیہ کا معیار مسلسل برقرار رہا، آج تک کسی مخالف سے مخالف کو یہ جرأت نہیں کہ آپ پر بد اخلاقی کی کوئی حرف گیری کرتا۔

عرصہ سے خیال تھا کہ جنگوں اور غزوات میں آپ کے بلند ترین اخلاق کا مطالعہ امت کے حق میں مفید ہوگا، سیرت نبوی کا یہ باب اگرچہ کتابوں میں پھیلا ہوا ہے، لیکن اگر اسے اسی

عنوان سے اکٹھا کردیا جائے، تو امت کے دلوں میں نبی اکرم ﷺ کی محبت میں بھی اضافہ ہوگا، جو کہ عین ایمان ہے، اور ہوسکتا ہے کہ اتباع کی بھی توفیق اللہ کی طرف سے کسی صاحب ایمان کو حاصل ہو جائے۔

اسی جذبے سے کسی وقت میں نے اپنے عزیز مولانا انتخاب عالم قاسمی سلّمہٗ ناظم مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور سے اس کا ذکر کیا، انھوں نے اس پر محنت کرنے کے لئے کمر ہمت کس لی، اگرچہ نظامت کی مصروفیتوں کے ساتھ مطالعہ وتحریر کا وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے، پھر یہ کہ عزیز موصوف میدان تحریر کے نو وارد ہیں، لیکن انھوں نے محنت کی اور سیرت وحدیث کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اور موضوع سے متعلق مضامین اکٹھے کرتے گئے اور انھیں ترتیب دیتے گئے۔ یہ مضامین میری نگاہ سے گزرتے رہے، میں ان پر مشورے اور اصلاح کا عمل کرتا رہا، پھر قسط وار انھیں ''ماہنامہ ضیاء الاسلام'' میں شائع کیا گیا۔ پڑھنے والوں نے پسند کیا، اور تقاضا ہوا کہ اسے علٰیحدہ کتابی شکل میں شائع کردیا جائے، اسی تقریب سے یہ چند سطریں لکھی جارہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرتب سلّمہٗ کی اس کوشش اور کاوش کو قبولیت سے نوازیں، اور لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو رسول اللہ ﷺ کے مزاج وطبیعت کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی
۱۸؍ربیع الاول ۱۴۲۶ھ

☆☆☆☆☆☆

اندلس اور ہندوستان

(مقدمہ ''اندلس میں اسلام'')

اندلس اسلامی عظمت کا گہوارہ! تہذیبی وتمدنی جلووں کا نظر فروز نظارہ! علم وحکمت کا زرخیز چمن زار! علما وحکما کا بہترین مطلع انوار! اسلامی عدالت وصداقت کا عظیم شاہکار! یورپ کی تاریک فضاؤں میں روشنی کا ایک بلند مینار! لیکن آہ کہ عبرتوں اور المناکیوں کی پردرد داستان بھی! مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا دلدوز نوحہ وماتم بھی! لکھئے تو قلم کا جگر شق ہو! پڑھئے تو دل بیٹھے! بولئے تو درد کا طوفان اٹھے! سنئے تو آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب جائیں! اسلامی اندلس کی تباہی کے پانچ سو برس کے بعد کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو نگاہوں پر اشکوں کا پردہ پڑا جا رہا ہے، جب یہ پردہ ہٹتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اندلس کی نہیں اپنے ملک ہندوستان کی داستان لکھ رہا ہوں، ایک داستان گزر چکی ہے، اور ایک داستان تیار ہو رہی ہے، جس کا میں خود ایک فرد ہوں، پانچ سو برس میں حالات بدلے ہیں، اس لئے داستان کی ظاہری ہیئت بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، ورنہ داستان کا بنیادی کردار اور بنیادی نظریہ ایک ہی ہے، اندلس کے حالات سے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو سبق لینا چاہئے، اور یہاں کی حکومت کو بھی اس سے سبق لینا چاہئے۔ یہی جذبہ تھا جس کے تحت رسالہ ضیاء الاسلام میں اندلس کے متعلق مضامین کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے، خدا کرے کسی کے دل میں اثر ہو جائے۔

اندلس کی اسلامی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مضمون کے چند جملے مستعار لے رہا ہوں، پاکستان کے معیاری مجلّہ سہ ماہی ''فکر ونظر'' نے اندلس کی اسلامی میراث پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے، اس میں کوئی ڈاکٹر ظہور احمد اظہر لکھتے ہیں:

''اسلامی اندلس جو آج ہسپانیہ ہے، تاریخ اسلام کا ایک ایسا ڈرامائی باب ہے جو بیک

> وقت شاندار بھی ہے اور المناک بھی! یہ باب ڈرامائی اس لئے ہے کہ جس طرح طریف بن مجالد، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اسلام کی شمشیر خاراشگاف لئے سمندر عبور کرتے اور پھر شہر اور قلعے فتح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی طرح ابوعبداللہ جیسے نالائق حکمراں اپنی کند تلوار کو عیسائی فاتحین کے سپرد کر کے جبل طارق کے دامن سے اپنے شکست خوردہ خانوادے اور ساتھیوں کے ہمراہ سمندر عبور کر کے افریقہ کی طرف آتے جاتے نظر آتے ہیں‘‘۔ (ص ۳۸۱)

پہلی صدی ہجری کے آخر میں طارق بن زیاد نے اندلس کے ساحل پر اپنی کشتیوں اور جہازوں کو جلایا تھا کہ اب غازی بن کر یا شہید ہو کر یہیں رہنا ہے، اللہ نے اس کے عزم وحوصلہ کی آبرو رکھی، آٹھ صدیوں تک یورپ کے بحر ظلمات میں اسلام کا آفتاب جگمگاتا اور نور پھیلاتا رہا، پھر دنیا نے دیکھا کہ یہ آفتاب غروب ہو رہا ہے، اور جو لوگ اس کے نور سے روشن تھے انہیں تاریکیوں میں ڈھکیلا جا رہا ہے، یا روشنی والے ملکوں کی جانب ہنکایا جا رہا ہے اور جو یہ بھی نہ ہوا تو انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ہندوستان میں بھی پہلی صدی کے اواخر میں محمد بن قاسم نے اپنا لشکر اتارا، اسلام کی تعلیمات اور اس کے عادلانہ نظام سے یہاں کے ہندوؤں کو آشنا کیا، اس کے بعد سے اسلامی فوجوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہا، پھر شہاب الدین غوری کے ہاتھوں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد پڑی، اس کے بعد حکومت کے خانوادے بدلتے رہے مگر وہ رہی مسلمانوں کے ہی ہاتھوں میں۔ سلطان اورنگ زیب کے وصال کے بعد حکومت میں بکھراؤ شروع ہوا، اور وہی زوال اندلس جیسے حالات پیدا ہونے لگے، طوائف الملوکی کی آندھی چلنے لگی، اور بالآخر یورپ ہی کی ایک قوم نے اسلام کو سلطنت سے بے دخل کر دیا۔ انگریز اپنے پیش رووں کی تقلید میں یہاں بھی وہی حالات پیدا کرنے لگے کہ مسلمانوں کا خیمہ اکھڑ جائے، سیاسی قوت ختم ہونے کے بعد مذہب کا تحفظ ایک مشکل کام ہے، اللہ کی مشیت تھی کہ مسلمان اس ملک میں باقی رہا، اور اسلام زندہ رہا۔ پھر جب انگریزوں نے ۱۹۴۷ء میں یہاں سے رخت سفر باندھا تو اپنی روانگی کے وقت اس نے وہ زہر پھیلا کہ مذہب کے نام پر ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، ایک حصہ مسلمانوں کا اور دوسرا حصہ؟ پہلے حصے کے لئے مسلمانوں کی تعیین نے خود بخود یہ نتیجہ پیدا کیا کہ دوسرا حصہ غیر مسلموں کا

ہے، پاکستان جتنا سمیٹ سکتا تھا مسلمانوں کو سمیٹ کر الگ ہوگیا، لیکن ظاہر ہے کہ وہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو نہیں لے جا سکتا تھا، پھر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس حصے میں رہ گئی، جس کو یہاں کا ہندو سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کا حصہ ہے، اور لطف یہ ہے کہ پاکستان کا مسلمان بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ صرف ہندوؤں کا ہے، یہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد رہ گئی، جو پاکستان کی پوری آبادی کے قریب قریب برابر تھی، ہندوستان کی تقسیم ایسا عمل تھا جس کا ردعمل فطری طور پر یہی ہوا کہ یہاں مسلمان اجنبی سا ہوگیا، اور ایک عرصہ تک اس پر بے بسی اور افسردگی چھائی رہی۔

اندلس پر جب عیسائی غالب آ رہے تھے اور اس کو مسلمان حکمراں سے خالی کرا رہے تھے تو انہوں نے مسلمانوں سے بہت سے معاہدے کئے تھے، ان میں اس بات پختہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے مذہب، ان کے مذہبی شعائر سے، ان کی زبان سے، ان کی علمی اور تعلیمی سرگرمیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، اگر کوئی مسلمان اندلس چھوڑ کر کسی اسلامی ملک میں جانا چاہے گا تو حکومت اس کی مدد کرے گی، مگر جونہی انہیں اقتدار حاصل ہوا، انہیں اپنا کوئی وعدہ یاد نہیں رہا، مسلمانوں کو جبراً حکم دیا گیا کہ عیسائی بن جاؤ، اسلام کو اسلامی معاشرت کو چھوڑو، اس حکم کی تعمیل کے لئے سازشوں اور وحشیانہ مظالم کا ایسا بھیانک دور شروع ہوا کہ جنگل کے درندے بھی شرما جائیں، مسلمان سب کچھ قبول کر سکتا ہے مگر اسلام سے دستبردار ہو جائے یہ بہت مشکل ہے، انہوں نے اسلامی ملکوں کا رخ کیا مگر عیسائیوں کے ہولناک مظالم کی وجہ سے ان میں زیادہ تر راستہ ہی میں ہلاک ہوگئے، ایک بڑی تعداد کو حکومت نے مزدور بنا کر پہاڑی اور جنگلی مقامات اور ملکوں میں بھیج دیا، اور انہیں پتھر کاٹنے اور جنگل صاف کرنے کی مشقت میں لگا دیا کہ وہ اور ان کی نسل آہستہ آہستہ اسلام کو بھول جائے، اس طرح اندلس سے اسلام کا خاتمہ کر دیا گیا، لیکن اس عمل میں انہیں بہت جلد کامیابی نہیں ملی، تقریباً دوسو سال کی مدت میں وہ اپنے منصوبہ کو تکمیل تک پہونچا سکے۔

ان دوسو برسوں میں مسلمانوں پر کیا بیتی، بڑی دلدوز داستان ہے، لرزہ خیز اور عبرتناک! یہ مستقل ایک مطالعہ کا موضوع ہے، شاید عزیزم مولوی ضیاء الحق سلمہ اس پر قلم اٹھائیں،

لیکن مسلمان ایک سخت جان قوم ہے، صدیوں انہیں اندلس میں مردہ رکھا گیا، مگر بین الاقوامی حالات کے دباؤں میں جونہی وہاں آزادئ فکر ونظر کا موقع ملا، صدیوں کی ظلم ستم کی راکھ میں دبی ہوئی ایمانی چنگاری لودینے لگی۔

ہندوستان میں بھی جب انگریزوں نے مسلمانوں کو حکومت سے بے دخل کیا تو ان کے عزائم وہی تھے جو اندلس کے عیسائی حکمرانوں کے تھے، مگر اس وقت حالات وہ نہ تھے کہ زبردستی عیسائی بنایا جاتا، انہوں نے ایک منظّم سازش کے تحت عیسائی پادریوں کی کھیپ یورپ سے لانی شروع کی، اور چونکہ سیاسی غلبہ انہیں حاصل ہو چکا تھا، اس لئے یہ پادری بے محابا اسلام کو اور مسلمانوں کو چیلنج کرتے اور مناظرہ کی دعوت دیتے، اور یہاں کی عوام کو عیسائی بنانے کا ہر ممکن طریقہ عمل میں لاتے، لیکن ان کا یہ عمل ناکام رہا، کیوں کہ یہاں علماء اسلام نے اس کا سخت مقابلہ کیا اور ہر جگہ انہیں فرار ہونے پر مجبور کردیا، برسوں مناظروں کا ہنگامہ گرم رہا، مگر عیسائیوں کو کامیابی نہ ملی۔

اسی دوران ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کے مظالم سے تنگ آکر ملک گیر پیمانے پر بغاوت کا ہنگامہ شروع کیا، یہ ایک غیر منظّم تحریک تھی، جس میں غیر تربیت یافتہ افراد نے بہت بدنظمی پھیلائی، ابتداء انگریزوں کا بہت نقصان ہوا، مگر بغاوت ناکام ہوگئی، انگریز کامیاب ہوگئے، یہ قوم جب غالب آتی ہے تو انتقام میں اتنا آگے بڑھ جاتی ہے کہ اسے عدل وانصاف بلکہ عقل وشعور کی کوئی حد یاد نہیں رہتی، یورپین قوم کی یہ قدیم تاریخ ہے، یہ قوم فاتح ہوتی ہے تو مفتوح قوم کے ساتھ اتنی سنگدلی کا مظاہرہ کرتی ہے کہ روح کانپ اٹھے۔

۱۸۵۷ء میں کامیابی کے بعد انگریزوں نے پورے ملک کو پھانسی گھر بنادیا، ہر بڑی شاہراہ پر پھانسی کے تختے لٹک رہے تھے، اور ہر تختے پر ہمہ وقت تازہ لاش جھولتی رہتی تھی، مسلمان نام کوئی شے ملی اور اسے بے دریغ پھانسی پر چڑھادیا، توپوں کے مونہوں میں باندھ کر اڑایا گیا، گولیوں کی بوچھار سے چھلنی کیا گیا، تہیہ کرلیا گیا کہ تھا کہ علماء اسلام کو اس ملک سے نیست ونابود کردیا جائے کہ اسلام کی اور مسلمانوں کی زندگی ان ہی کے دم سے ہے، علما ختم ہوں گے تو علم کا خاتمہ ہوجائے گا، اور علم گیا تو دین گیا۔

مگر بے خدا انسان کو دھیان نہیں رہتا کہ ان کی تدبیروں سے بالاتر ایک ہستی ایسی بھی ہے جس کے قبضے میں ساری کائنات ہے، وہ جسے باقی رکھنا چاہے اسے کوئی مٹا نہیں سکتا، اس ہنگامۂ دار و گیر کے شر سے ''دارالعلوم'' جیسا خیر عظیم وجود میں آیا، اس وقت کے بچے کھچے علما نے اپنے کو سیاست کے میدان سے ہٹا کر تعلیم و تربیت کے قلعے میں محصور کرلیا، اور پھر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ مسلمان ایک نئی طاقت بن کر ابھرنے لگا، انگریزوں نے دیکھا کہ وہ حرب و ضرب اور قتل و خون کے میدان میں ناکام ہوگئے ہیں تو انہوں نے زیر زمین جال بچھانا شروع کیا اور وہی تدبیر اختیار کی جس کو علماء اسلام نے اسلام کے بقا کے لئے اختیار کیا تھا، یعنی تعلیم و تربیت کی جانب رخ کیا، لیکن یہ تعلیم اور تربیت وہ تھی جس سے مسلمان کا نام تو نہ بدلے مگر اس کے اندر جو کچھ ہے سب بدل دے، نام اسلام کا رہے مگر روح غیر مسلم کی ہوجائے، انہوں نے انگریزی کالجوں اور اسکولوں کا جال بچھایا، جس میں مادی منافع کے بے شمار سبز باغ دکھائے، ان اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم و تربیت کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ بہت سے مسلمان، مسلمانوں جیسا نام رکھتے ہوئے، اسلام سے منحرف ہونے لگے، یہ کالج اور یہ اسکول درحقیقت انگریزوں کے شکارگاہ تھے، جن میں مسلمان بچوں کا شکار کیا جاتا تھا، اسی کو دیکھ کر اکبرالہ بادی مرحوم مغفور نے کہا تھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

دارالعلوم دیوبند نے جس تعلیم اور جس تربیت کا نظام قائم کیا تھا اس کا پھیلاؤ بڑھتا گیا معاشرہ پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، پس جہاں کہیں انگریزوں کے تربیت یافتہ افراد تھے وہیں ان کے دوش بدوش عربی تعلیم یافتہ حضرات بھی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم یافتہ پورے انگریز نہ بن سکے، انگریزی تہذیب میں ملوث ہوکر وہ بھی بالآخر پلٹ آتے تھے۔

پھر علما کی فکرمندی کی وجہ سے دم بہ دم اصلاحی تحریکیں بھی اٹھتی رہتی تھیں، اور از سر نو اسلام کی روح معاشرہ میں پھونکتی رہتی تھیں، انگریز اس محاذ پر بھی ناکام ہوا، اس کے بعد ایسا ہوا کہ انگریزوں کے مظالم کی وجہ سے سارا ہندوستان ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں اسے یہاں سے اپنی بساط لپیٹنی پڑی، اور یہی موقع تھا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہوئے، آزاد ہونے

کے بعد ہندوستان میں حکمرانی اسی پارٹی کو حاصل ہوئی جس نے ملک کی آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا، چونکہ اس پارٹی میں شامل ہوکر مسلمانوں نے بھی بڑا کام کیا تھا، اس لئے حکمران طبقہ کو ہمت نہ تھی کہ مسلمانوں کے خلاف کھل کر اقدام کرتے، مگر پاکستان بن جانے کی وجہ سے ان کے دلوں میں چور موجود تھا، خفیہ تدبیریں مسلمانوں کے خلاف ضرور رہیں، گو زبان سے ملک کے جمہوری دستور کی گردان جاری رہی، اب یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ حکمراں جماعت نے ہندوؤں کی ان تنظیموں کی در پردہ پرورش کی جو مسلمانوں سے براہ راست ٹکراتی تھیں، جن کا مطالبہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے مذہبی شعائر کو چھوڑ کر ہندو بن جائیں، یا ہندوستان چھوڑ دیں۔ یہ آواز پہلے دھیمی تھی پھر بلند ہوتی گئی، حکمراں پارٹی اپنے خفیہ عمل کے نتیجے میں میدان سے ہٹتی گئی، اور جارحیت پسند تنظیمیں ابھر کر ان کی جگہ لینے لگیں، یہاں تک کہ آج مرکز اور بہت سے صوبوں میں انہیں پارٹیوں کی حکومت ہے، ان جارحانہ تنظیموں نے ہر وہ طریقۂ عمل اختیار کر رکھا ہے جس سے مسلمانوں میں خوف وہراس پیدا ہو، اور وہ اس ملک میں اچھوت بن کر رہ جائیں، ان کا دین مذہب اور ان کی معیشت تباہ ہوکر رہ جائے، اس کے لئے یہ تنظیمیں اپنے نمائندوں کو اندلس (اسپین) بھیجتی رہتی ہیں تا کہ وہ طریقہ معلوم کریں جس کی بنیاد پر وہ اندلس کو مسلمانوں سے خالی کرا سکے تھے، ان نمائندوں کی کچھ رپوٹیں شائع ہوجاتی ہیں اور کچھ صیغۂ راز میں رہ جاتی ہیں۔

جمہوریت کے اس دور میں حالات وہ نہیں رہے کہ جبری طور مذہب تبدیل کرایا جائے اور بین الاقوامی قوانین اور ضابطوں کی وجہ سے یہ بھی آسان نہیں رہا کہ آبادی کو دوسرے ملکوں میں منتقل کر دیا جائے، اس لئے اندلس والا طریقۂ عمل بعینہ اختیار نہیں کیا جاسکتا، لیکن مختلف مرحلوں میں تقسیم کر کے بروئے کار لایا جاسکتا ہے، اور یہاں یہی ہو رہا ہے، اجودھیا میں مسجد گرانی تھی تو اسے کئی مرحلوں بانٹ کر ۱۹۹۲ء میں شہید کیا گیا، اس کی ابتدا ۱۹۴۹ء میں اس وقت ہوئی جب اس میں چوری سے بت رکھے گئے، اور انہیں نکالا نہیں گیا، مختلف شعلہ بار مقررین اور لیڈروں کی خدمات حاصل کر کے ہندوؤں کو متحد کیا گیا، پھر کیا کیا ہوا؟ قارئین کے حافظہ میں موجود ہوگا، کبھی مسجدوں پر نظر ہے، کبھی شہروں کے وہ نام جو مسلمانوں کے دور سے معروف ہیں، انہیں بدلا جا رہا ہے، کبھی مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کا شگوفہ چھوڑا جاتا ہے، اور حد یہ ہے کہ

ہندوستان کے جمہوری دستور میں تبدیلی لانے کا منصوبہ بنتا ہے، ان امور کے خلاف مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کی جانب سے چیخ وپکار مچتی ہے تو تھوڑی دیر سکوت ہوجاتا ہے، پھر عوام کو کسی دوسرے حساس مسئلہ میں الجھا کر از سر نو کام کی نیو ڈالی جاتی ہے، غرض مرحلہ بہ مرحلہ مسلمانوں کے صفائے کا انتظام ہورہا ہے۔

یہ سب کچھ ہورہا ہے، مگر جو لوگ سازش میں مصروف ہیں انہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ سب تدبیروں کے اوپر اللہ کی طاقت موجود ہے، خدائی طاقت کا نمونہ دیکھنا ہو تو یہ لوگ اپنی آنکھیں کھولیں کہ جب سے ان فرقہ پرست اور ظلم پرور تنظیموں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے، ملک گیر پیمانے پر آفتوں اور بلاؤں کی یورش ہورہی ہے، کہیں زلزلہ ہے، کہیں طوفان ہے، کبھی سیلاب ہے، کبھی خوفناک وبا ہے، اور نہ جانے کیا کیا ہے؟ اور کاروبار ومعاش کی تو وہ بربادی ہے کہ خود ہندو بھی چلا اٹھا ہے کہ یہ اسی حکومت کی نحوست ہے۔

یہ بات بہت کھری اور سچی ہے کہ محض کفر وشرک کے ساتھ تو حکومت چل سکتی ہے مگر ظلم وستم کے ساتھ نہیں چل سکتی، قدرت کے اس قانون میں کوئی استثنا نہیں ہے، جہاں بھی جو حکومت تباہ وتاراج ہوئی ہے، اس کے اسباب پر غور کیجئے تو اصل بنیاد تباہی کی ظلم کا رواج ہی ہوگا۔ مسلمان بھی ظلم کرے گا تو اس سے حکومت چھین لی جائے گی، کافر بھی ظلم کرے گا اسے گرا دیا جائے گا۔

البتہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کو اتنی بات یاد رکھنی چاہئے کہ کوئی قوم خواہ کتنی ہی سازش کرے، وہ مسلمانوں کو مٹانے کا خواہ کوئی بھی منصوبہ بنائے، لیکن سازش کی کامیابی کا انحصار اللہ کی مشیت پر ہے، اس کی مشیت کے بغیر ہر سازش ناکام ہے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ”**وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً ان اللہ بما یعملون محیط**“. (سورہ آل عمران) یہ خطاب خاص مسلمانوں سے ہے، اس میں دو شرطیں حق تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہیں، کہ اگر انہیں مسلمان پورا کردیں تو مخالفین کی ہر سازش ناکام کردی جائے گی۔ پہلی شرط یہ ہے کہ تم میں صبر ہو، یعنی ثابت قدمی، ہراساں نہ ہونا، مخالفتوں سے گھبرا نہ جانا۔ اور دوسری شرط ہے ’تقویٰ‘ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا، اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہنا، ظاہر وباطن میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا، اگر یہ دونوں خوبیاں اجتماعی طور سے مسلمانوں میں ہوں، اجتماعی اس لئے

کہا کہ انفرادی طور سے کسی کسی کے اندران خوبیوں کا ہونا، اجتماعی نصرت کو حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، عام معاشرہ میں، اس کی اکثریت میں یہ دونوں اوصاف موجود ہوں تو دشمنوں کی سازش ذرا بھی نقصان کا باعث نہیں ہوگی، پھر فرماتے ہیں کہ دشمن جو کچھ کرتا ہے سب اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

پہلے جملے میں مذکور دونوں شرطوں کے اوپر اللہ تعالی کا وعدۂ نصرت ہے، جو حتمی ہے اور اخیر کے جملے میں صراحۃً کہا گیا ہے کہ یہ سازش اللہ کے دائرۂ قدرت میں ہے، لیکن اس سے اشارۃً یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ کا فضل شامل حال ہو جائے تو دونوں شرطیں پورے طور نہ ہوں تب بھی نصرتِ الٰہی آسکتی ہے، اگر غور کیا جائے تو موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ اسی فضل الٰہی کی کارفرمائی ہے، ورنہ ہمارے معاشرے میں عمومی طور پر نہ صبر ہے اور نہ تقوی! پھر بھی اللہ تعالیٰ دشمنوں کی اکثر سازشوں کو مات دیئے جا رہے ہیں، یہ کھلا ہوا فضل ہے، اور اس فضل کا ظہور بار بار ہوا ہے، اور ہوتا رہتا ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب بھی ظلم کی چکی میں مسلمان پسا ہے، تو کچھ عرصہ کے بعد فضل الٰہی کا ظہور ہوا ہے، اندلس میں صدیوں ظلم ہوا، تو اب اسی ظلم کی تہ سے اسلام کے نام لیوا ابھرا ابھر کر آرہے ہیں (ابھی پچھلے ماہ پانچ سو سال کے بعد وہاں مسجد بنانے کی اجازت ملی ہے۔ ضیاء الحق) تقریباً پون صدی تک روس میں مسلمان مجبور و مقہور رہے، پھر فضلِ خداوندی ہوا تو مسلمانوں کی تقریباً ایک درجن ریاستیں نکل پڑیں، ہندوستان میں ہزاروں فسادات ہوئے، بے شمار جانیں مسلمانوں کی گئیں، جائداد اور ملکیتیں تباہ ہوئیں، مگر گن لیجئے، دیکھ لیجئے، پہلے کے مقابلے میں مسلمان دوگنا ہیں، اور ہر اعتبار سے خوشحال ہیں، ظلم کرنے والے پچھلی تاریخ سے سبق لیں، اور اپنے ظلم سے باز آئیں، اور کاش ظلم سہنے والے اللہ کی عائد کردہ شرطوں پر پورے اترتے تو ظالموں کا چشم زدن میں صفایا ہو جاتا۔

اندلس کی سرگزشت داستان سرائی کے لئے نہیں لکھی گئی ہے، سبق آموزی کے لئے لکھی گئی ہے۔ **فهل من مدكر**

☆☆☆☆☆☆

مقدمہ ''قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے''

میرے عزیز جناب مولانا ضیاء الحق خیرآبادی نے ابوالمعالی حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ کے سفرناموں کو جو ماہنامہ ''البلاغ'' بمبئی کے مختلف شماروں میں بکھرے ہوئے تھے، مرتب کرکے علمی ودینی اسفار کا ایک خوبصورت مرقع تیار کیا ہے، اس مرقع کو دیکھ کر قاضی صاحب کا ایک جملہ ذہن ودماغ میں جگمگانے لگا، اس جملہ نے اس وقت بھی مجھ کو بہت متاثر کیا تھا، جب میں نے ان کی زبان سے سنا تھا، اور آج جب یہ تحریر لکھ رہا ہوں، تو بھی طبیعت بے تاب ہے کہ اسے یہاں صفحۂ قرطاس کی نذر کروں۔

قاضی صاحب کے دورِ اخیر کی بات ہے، گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کے وقت قاضی صاحب ایک لمبے سفر سے تشریف لائے۔ چہرے پر تکان کے آثار صاف نمایاں تھے، کپڑے بھی متغیر ہورہے تھے، ان کے ایک بے تکلف دوست اور ساتھی نے خیریت دریافت کی، تو فرمانے لگے کہ آج کل سفر بہت دشوار ہوگیا ہے، ٹرینوں میں اتنی بھیڑ بھاڑ اور مسافروں میں اتنی بے قاعدگی ہوتی ہے کہ ریزرویشن ہوتے ہوئے بھی دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ جسم اور کپڑوں کا ستیاناس ہوجاتا ہے۔ طبیعت پریشان ہوگئی۔ دیر تک سفر کی مشکلات کا تذکرہ کرتے رہے۔ اس پر ان کے بے تکلف دوست نے ازراہِ بے تکلفی فرمایا کہ ''اسی لئے تو کہتا ہوں کہ آپ سفر نہ کریں، آپ سفر بھی کئے جاتے ہیں، اور اس سے پریشان بھی ہوئے جاتے ہیں''، قاضی صاحب نے فوراً فرمایا اور اپنی علاقائی زبان اور لہجے میں فرمایا کہ ''چپ رہو جی! تمہاری طرح ہم لوگ 'گھر گھُسنے' تھوڑا ہی ہیں''۔ سفر کرنے سے شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس آخری جملے کی معنویت سے دل پھڑک گیا۔ اس پر جتنا غور کیجئے معنویت کی تہیں کھلتی جائیں گی۔

سفر کرنے والے بہت ہیں، اور ہر ایک سفر کسی نہ کسی عنوان سے مسافر کے دامن شخصیت میں تکمیلی تحفے ڈالتا جاتا ہے، لیکن ہر سفر کے احوال وکوائف میں دوسروں کو شریک نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہر سفر کا سفرنامہ لکھا جاسکتا ہے۔

ہاں سفر ایسا ہو کہ اس کے ساتھ علمی اور دینی مقاصد وابستہ ہوں، مسافر نے اسی نقطۂ نظر سے سفر کے مرحلوں کو دیکھا ہو مقامات سفر کا اسی اعتبار سے مطالعہ کیا ہو، ایسے اسفار بیشک اس کے مستحق ہیں کہ ان کے سفرنامے لکھے جائیں، اور دوسروں کو سفر کے واردات میں شریک کیا جائے۔

سفر ایک درسگاہِ عبرت وموعظت ہے، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، **أفلم يسيروا في الارض فينظروا كيف كان عاقبة الذين من قبلهم** (سورہ محمد:۱۰) کیا ان لوگوں نے سفر نہیں کیا، کہ یہ پچھلے لوگوں کے انجام کا مشاہدہ کرتے۔

سفر عقل وفہم کے دروازوں کی کلید ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أفلم يسيروا فی الارض فتكون لهم قلوبٌ يعقلون بها أو آذان يسمعون بها (سورۃ الحج:۴۶) کیا انھوں نے زمین کا سفر کیا، کہ انھیں عقل حاصل ہوتی جس سے سمجھتے یا کان نصیب ہوتے جن سے یہ سنتے۔

سفر کا یہ وہ نقطۂ نظر ہے جس سے شخصیت کی تکمیل بدرجۂ کمال ہوتی ہے۔ قاضی صاحب ایک محقق عالم اور صاحب بصیرت مورخ تھے، اس کے ساتھ دینی حمیت وغیرت اور ایمانی وروحانی جذبات سے سرشار تھے، جہاں وہ تاریخ کے صفحات الٹتے پلٹتے اور ان کے مٹے مٹے نقوش کو ابھارتے اور صاف کرتے ہیں وہیں ایمانی عبرتیں، دینی حمیتیں اور روحانی حلاوتیں ساتھ ساتھ جلوہ نما ہوتی رہتی ہیں، ان کی مجلسی گفتگوؤں میں بھی یہ رنگ رچا بسا رہتا تھا، جہاں وہ علمی وتاریخی حقائق کے گوہر لٹاتے ہوتے، وہیں ان کی گفتگو سے اسلامی حمیت وغیرت کا درس بھی ملتا رہتا۔

قاضی صاحب نے جن اسفار کی داستان سنائی ہے، ان میں علم وتاریخ اور تہذیبی وتمدنی معلومات کے پہلو بہ پہلو عبرت وموعظت اور اسلامی حمیت وصلابت کے جلوے بھی ملتے ہیں۔

قاضی صاحب نے بہت سے سفر کئے ہیں، ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی، اور ہر سفر سے علمی وتاریخی سوغاتیں اور عبرتوں ونصیحتوں کے خزانے ساتھ لائے ہیں۔ پھر ان میں

قارئین کو شریک کیا ہے۔ ان سوغاتوں اور خزانوں کو عزیز مرتب سلّمہٗ نے اکٹھا کر کے تاریخی حقائق، تہذیبی وتمدنی معلومات اور علمی ودینی تعلیمات کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار کر دیا ہے یا یہ کہئے کہ بہترین الوان نعمت کا دسترخوان بچھا دیا ہے، ہم کو امید ہے کہ اس دسترخوان سے استفادہ کرنے والا، ان تمام فوائد سے متمتع اور آسودہ ہوگا، جن فوائد کے لئے سفر کی مشقت برداشت کی جاتی ہے، سفرناموں کے ادب میں یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اور قاضی صاحب کے باقیات صالحات اور حسنات کی ایک بہترین یادگار!

اعجاز احمد اعظمی

۱۵؍صفر ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۶؍مارچ ۲۰۰۵ء شنبہ

☆☆☆☆☆☆

تقریب

بر

''تذکرہ حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب فتح پوری''

الحمد الله رب العالمین و الصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آله وصحبه اجمعین. اما بعد

یہ چند سطریں ایک گمنام لیکن باکمال مرد درویش، ایک مستور لیکن صاحب نسبت مرد حق کی یاد میں لکھی جارہی ہیں، کمال کے لئے شہرت لازم نہیں ہے، جیسے شہرت کے لئے کمال ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس دنیا میں کتنی باکمال ہستیاں گزری ہیں جنہیں نہ ان کے زمانے میں پہچانا گیا، نہ بعد میں ان کی شہرت ہوئی، اور کتنے ہی بے کمال اور بے ہنر افراد آسمان شہرت وناموری پر جگمگارہے ہیں، شہرت نہ دلیلِ اخلاص ہے اور نہ ثمرۂ قبول حق! بلکہ بسا اوقات ناموری سامان فتنہ بن جاتی ہے، دنیا میں لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں اور آخرت میں آدمی مواخدہ میں گرفتار ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

یحسب امرئ من الشر ان یشار الیه بالاصابع فی دین اودنیا الا من عصمه الله. (رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوۃ شریف باب الریا والسمعۃ)

آدمی کے مبتلائے شر ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ اس کی طرف دین یا دنیا کے سلسلے میں انگلیوں سے اشارہ کیا جائے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی حفاظت فرمائیں (تو اور بات ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کی خاص حفاظت نہ ہو تو مشہور آدمی مبتلائے فتنہ ہو کر رہتا ہے، اسی لئے گمنامی اور خمول وخفا ایک امر محمود ہے، جو آدمی گمنام رہا اس نے بہت سی آفات سے

نجات پالی۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی باکمال نے شہرت نہیں پائی، بعد والوں میں اس چرچا نہیں ہوا، تاریخ کے اوراق میں اس ذکر نہیں آیا، اس کے آگے پیچھے آدمیوں کا ہجوم نہیں ہوا، تو زمانے نے اس کی ناقدری کی یا اس کے کمال میں کوئی خاص نقص تھا، یا اس کے اخلاص میں کمی تھی، لیکن یہ خیال عموماً صحیح نہیں ہے، اگر کوئی اللہ کا نیک اور مخلص بندہ ہے، صاحب علم وصاحب کمال ہے، اللہ کی نسبت کا حامل ہے، اس کی زندگی سنت وشریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، اس کے فیض سے متعدد لوگ فیضیاب بھی ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کا تعارف نہیں ہوا، ایک مخصوص اور مختصر حلقے کے باہر اس کا نام نہیں لیا گیا، پھر جوں جوں ماضی کے پردے دبیز ہوتے گئے، اس کا مختصر سا تعارف بھی مٹتا گیا، تو کیا ہم اسے ناکام کہیں گے؟ اس کے بارے میں بے کمال ہونے کا وسوسہ دل میں لائیں گے؟ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو اس نے قرآن نہیں پڑھا، حدیث نہیں سمجھی، شریعت کی روح کو نہیں پہچانا، اللہ تعالی کے معاملات سے باخبر نہیں ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان الله يحب الابرار الاتقياء الاخفياء الذين اذا غابوا لم يتفقدوا وان حضروا لم يدعوا ولم يقربوا ،قلوبهم مصابيح الهدى يخرجون من كل غبراء مظلمة. (رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوۃ شریف باب الریا والسمعۃ)

اللہ تعالی نیک مستور الحال لوگوں سے محبت رکھتے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ اگر وہ غائب ہوں تو انہیں کوئی نہ ڈھونڈھے، اور اگر موجود ہوں تو نہ انہیں بلایا جائے نہ قریب کیا جائے، ان کے قلوب ہدایت کے چراغ ہیں، غبار آلود اور تاریک جگہوں سے وہ نکلتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کی رہائش گاہیں عالیشان، نمایاں اور ممتاز نہیں ہوتیں، کچے اور اندھیرے گھر ان کے مسکن ہوتے ہیں، لیکن صرف ان کے گھر ہی اندھیرے ہوتے ہیں، ان کے دل ہدایت کے روشن چراغ ہوتے ہیں، جن سے لوگ راہ حق کا پتہ پاتے ہیں، ایسے گمنام لوگ اللہ کے خصوصی محبوب ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شہرت یافتہ حضرات خدا کے محبوب نہیں ہوسکتے، اللہ تعالی جب کسی شخص سے دین کا اہم اور عام کام لینا چاہتے ہیں تو اسے مشہور کردیتے ہیں، ایسے لوگوں کی

حفاظت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے، شہرت ان کے لئے باعث فتنہ نہیں بنتی مخلوق خدا ان سے فائدہ اٹھاتی ہے، یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو خود گمنامی کو پسند کرتے اور شہرت سے نفور رہتے ہیں، مگر اللہ تعالی اپنی حکمت بالغہ سے انہیں ان کے ارادہ کے بغیر ناموری عطا فرماتے ہیں، مشاہیر کی بزرگی اور ان کا تقوی وتدین لوگوں کے درمیان معروف ہوتا ہے، اس سے لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے کہ بزرگ صاحب نسبت اور باکمال وہی ہے جسے شہرت کی سند مل گئی، اور جو ایسا نہیں ہوا لوگ اس کو نگاہ سے گرادیتے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث اس طرز عمل کی کھلی تغلیط ہے، بلکہ ان گمنام اور مستور حضرات کو رسول اللہ ﷺ نے ہدایت کا چراغ قرار دیا ہے تو انہیں تلاش کرنا چاہئے، اور ان کی روشنی میں راہ ہدایت طے کرنے کو سعادت سمجھنا چاہئے، مگر لوگ عموماً ایسے بزرگوں کو نظر انداز کردیتے ہیں، مؤرخ کی آنکھ بھی اس سے نگاہ پھیر لیتی ہے، تاریخ کی زبان ان کے حق میں گنگ ہوجاتی ہے، اور یہ تاریخ تو عجیب شے ہے، بقول ایک دیندار، صاحب دل اور صاحب درد اردو کے شاعر وادیب ڈاکٹر کلیم عاجز کے کہ:

> ’’تاریخ تو امیر زادی ہے بادشاہ زادی ہے، یہ تو شاہراہوں پر اٹھلاتی پھرتی ہے، برق رفتار گھوڑے پر اڑی پھرتی ہے، اڑن کھٹولوں پر، پرواز کرتی ہے، یہ میناروں کو دیکھتی پھرتی ہے، قبوں اور کلسوں کی زیارت کرتی پھرتی ہے، لال قلعہ، تاج محل، قطب مینار، اشوک کی لاٹ، اجمیری گیٹ، کشمیری گیٹ کی بات کرتی ہے، یہ کونوں میں نہیں جھانکتی، گوشوں پر نگاہ نہیں ڈالتی، یہ تنگ گلیوں اور تاریک کوچوں میں جانے سے ڈرتی ہے، یہ محلوں کے پھاٹکوں پر کارڈ بھیج کر استقبال کراتی ہے، یہ ٹوٹے پھوٹے دروازوں پر اور بے کواڑ ڈیوڑھیوں پر دستک نہیں دیتی‘‘۔ (جہاں جہاں خوشبو ہی خشبو تھی ص ۶۳)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہیں تنگ گلیوں، تاریک کوچوں اور بے کواڑ کی ڈیوڑھیوں سے لعل شب تاب نکلتے ہیں، اکثر غریب اور بے نام لوگ اس طرح ملتے ہیں جیسے نالی کی کیچڑ میں چمکتا ہوا ہیرا، گرد وغبار ہی میں حسن کا چمکتا دمکتا مکھڑا ابھارہا نظر آیا ہے، جنہیں حقیر سمجھا گیا ان میں بہت توقیر والے ملے، پستیوں میں بہت بلندیاں دکھائی دیں، یہ پیمانہ ہی غلط ہے کہ مؤرخ اور سیرت نگار کے قلم سے جو رہ گیا وہ ہنر اور کمال سے بھی خالی تھا، جس کی نگاہ اسلام کی تعلیمات پر ہوگی وہ تو کبھی

اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ صاحب کمال وہی ہے جسے نام آوری ملی، اور جو بے نام رہا اور گمنام رہا وہ بے کمال بھی تھا۔

انہیں گمنام بزرگوں میں ہمارے محسن بزرگ مولانا قاری ولی اللہ صاحب فتح پوری مدظلہ کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب علیہ الرحمہ بھی تھے، جن کو اللہ تعالی نے شہرت کی حشر سامانیوں سے محفوظ رکھا، کمال ظاہری ومحاسن باطنی سے لبریز ہوتے ہوئے گمنام ومستور رہے، ان کی زندگی میں لوگوں نے انہیں دیکھا ان کی باتیں سنیں، ان کی مہمان نوازیوں سے مستفید ہوئے، انہیں تلاوت کرتے دیکھا، ان کی استقامت کو دیکھا، لیکن سادگی وبے رنگی کی گدڑی میں جو لعل چھپا ہوا تھا اس پر کس کی نگاہ گئی؟۔

حق تو یہ ہے کہ جس نے زندگی بھر اپنے کو مخفی رکھا جس کو شہرت وناموری کی کوئی لپک نہ تھی، جو اپنے کمال علمی وعملی کے باوجود گمنامی کی دبیز چادر میں لپٹا رہا، اسے اور اس کے حالات کو اللہ تعالی کے علم وہنر کے حوالے ہی رکھا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حروف ونقوش کی آڑھی ترچھی لکیریں اس کے واقعی اوصاف ومحامد کے حق میں راہ انصاف سے دور جا پڑیں۔

تاہم بعد والوں کا یہ بھی فریضہ ہے کہ اگلوں کے محاسن اعمال، مکارم اخلاق اور معالی احوال کو یاد رکھیں، ان کا مذاکرہ کریں، انھیں بعد والی نسل تک منتقل کریں، تاکہ بعد والوں کو یاد رہے کہ ان کے اسلاف کیسے تھے؟ ان میں اتباع سنت کی کیا شان تھی؟ ان کے احوالِ باطنی کیا کیا تھے؟ پھر ان کے دل میں حوصلہ اور ولولہ جاگے کہ ہمارے بزرگ بھی خاک کے پُتلے ہی تھے، گوشت وپوست کے ڈھانچے ہی تھے، انھیں امراض وعوارض میں وہ بھی گھرے رہتے تھے جن میں آج کا انسان مبتلا ہے، مگر اس کے باوجود وہ بندگی کا حق کس طرح ادا کرتے رہے۔ انھوں نے اللہ کو راضی کرنے کے کیا کیا جتن کئے، انھوں نے دنیوی مال ودولت کو کس طرح اپنی ٹھوکر میں رکھا۔ کیا یہ سب کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص تھا، ان کے بعد جو خاک کے پُتلے تیار ہوئے، اور ہڈیوں کے جوڑ ڈھانچے گوشت وپوست کا لباس پہن کر وجود میں آئے، کیا وہ اس صلاحیت سے محروم ہیں؟ جب انھیں یہ خیال آئے گا تو ان کے اندر کی سوئی ہوئی عبدیت جاگے گی، چھپا ہوا جذبۂ کمال ابھرے گا، خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ سکتا ہے، ایک چراغ سے دوسرا چراغ جل

سکتا ہے، ایک طوطی کی آواز سن کر دوسرا طوطی ترنم ریز ہوسکتا ہے۔ تو کیا معنیٰ کہ ایک انسان، دوسرے انسان کو دیکھ کر اسی راہ پر نہ چل پڑے۔

سیرت نویسی اور سوانح نگاری کی اصل منشاء یہی ہونی چاہئے، اور پڑھنے والوں کو بھی اسی نظر سے پڑھنا چاہئے، واقعات وحکایات کا بیان، شہور وسنین کا اہتمام، تاریخ ویوم کی تقدیم و تاخیر پر گہری نظر، مؤرخ کا فریضہ ہو تو ہو، سوانح نگار کو اس کا مکلّف نہیں بنایا جاسکتا، اس سلسلے میں اس کے تسامحات قابل عفو ہیں۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے، اسے مؤرخ کی نگاہ سے مت پڑھئے، بلکہ تذکیر واعتبار کی نگاہ سے پڑھئے۔ ان شاء اللہ آپ فائدے میں رہیں گے۔ ویسے لکھنے والے کو اپنے قلم کی کوتاہی، علم کے قصور، نگاہ کی درماندگی اور فکر کی نارسائی کا صرف اعتراف ہی نہیں، اچھی طرح احساس بھی ہے، اور اس کا یہی احساس اس کے لئے وجہ نجات ہے، اور اسی سے امیدواری توفیق ہے، اپنے بزرگوں سے دعاؤں کا ملتجی اور عام ناظرین سے حسن مطالعہ کا آرزومند ہوں۔

اس مختصر رسالہ کا ماخذ محترم بزرگ حضرت مولانا قمرالزماں صاحب زید مجدہم اور حضرت حافظ محمد زکریا صاحب فتح پوری مدظلہ کی مختصر تحریریں ہیں، جنہیں ان حضرات نے مرتب کیا تھا، اور وہ غیر مطبوعہ ہیں، اس کے علاوہ کچھ معلومات حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ اور ان کے برادر بزرگ حافظ عبدالمنان صاحب سے حاصل ہوئیں، باتیں سب انہیں حضرات کی ہیں الفاظ میں نے تحریر کئے ہیں۔

اعجاز احمد اعظمی

۱۳/رجب ۱۴۱۶ھ

☆☆☆☆☆☆

تقریظ بر ''مسجد نبوی میں تراویح عہد بعہد''

شیخ محمد سالم عطیہ علیہ الرحمہ مدینہ منورہ زادہ اللہ شرفاً کے رہنے والے ایک صاحب نظر اور معتبر عالم ہیں، عدالت عالیہ کے قاضی ہیں، مسجد نبوی شریف میں مدرس تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وعقل کا بڑا جامع توازن بخشا تھا، انھوں نے تراویح کے مسئلہ پر ایک نئے انداز سے قلم اٹھایا، پچھلی صدی میں پیدا ہونے والے ایک نئے فرقہ نے کچھ مسائل فقہیہ میں اپنی ایک شناخت ...شاہراہ امت سے ہٹ کر... بنائی، ان شناختی مسائل میں رکعات تراویح کی تعداد کا بھی مسئلہ ہے۔

قرون اولیٰ سے اب تک تمام ائمہ اور تمام امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ رمضان المبارک کی مبارک راتوں میں بعد نماز عشاء تراویح کی نماز بیس رکعات ہے، مگر اس ٹولہ نے اصرار کیا کہ تراویح صرف آٹھ رکعات ہے۔ علماء نے اس موضوع پر دلائل کی روشنی میں تفصیلی بحث کی، اور قلب وذہن میں ذرا بھی سلامتی ہو تو بحث اطمینان بخش ہے، مگر جن کی آنکھوں نے سورج کو چمکتا دیکھ کر انکار کی ٹھان لی ہو، انھیں کون دکھا سکتا ہے۔ تاہم امت کی سچی خیر خواہی رکھنے والے مایوسی کا دامن جھٹکتے رہے، اور نئے نئے انداز سے سمجھاتے رہے:

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

شیخ عطیہ نے مسجد نبوی میں تراویح کے عمل کو بنیاد بنایا، کیوں کہ یہی مسجد ابتداء سے احکام وشرائع اسلامی کی بنیاد رہی ہے، پہلی مرتبہ تراویح کی نماز یہیں قائم ہوئی، حضور ﷺ کی سنتوں کا آغاز یہیں سے ہوا، یہیں سے مشہور فرمان **علیکم بسنتی و سنة خلفاء الراشدین المهدیین** (تم کو میری سنت اور اصحاب ہدایت خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے) جاری ہوا،

شیخ موصوف نے عہد نبوت سے دور حاضر تک مسجد نبوی کی تراویح اور اس کی جماعت کا جائزہ لیا۔

انہوں نے دیکھا کہ اس چودہ سو سالہ تاریخی تسلسل میں کبھی تراویح کی جماعت آٹھ رکعات نہیں ہوئی ہے، ہمیشہ بیس رکعات پڑھی گئی ہیں، انہوں نے نہایت دیانت داری اور امانت داری کے ساتھ ان تاریخی معلومات کو مرتب کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

مصنف نے تاریخی تسلسل کے بیان کے بعد مشہور فقہی مذاہب: حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی تحقیقات ونظریات بھی ذکر کئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد چاروں ائمہ کے نزدیک تراویح بیس رکعات ہی سنت ہے، آٹھ رکعات کسی کے نزدیک سنت نہیں ہے، البتہ حنفیہ کے بیان کا مدار انہوں نے صاحب فتح القدیر **علامه ابن الهمام** کے ایک قول پر رکھا ہے صاحب فتح القدیر نے لکھا ہے، **و ظاهر بكلام المشائخ ان السنة عشرون ركعة و مقتضى الدليل ما قلنا** مشائخ کے قول کا ظاہر یہ ہے کہ تراویح بیس رکعات ہے، لیکن دلیل کا تقاضا وہ ہے جو ہم نے کہا۔

اسی کو حنفیہ کا مذہب قرار دیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، احناف کے نزدیک بھی پوری بیس رکعات سنت ہے، جو مصنف نے حنفیہ کی طرف منسوب کیا ہے، وہ علامہ ابن الہمامؒ کا رجحان ہے حنفیہ کا مذہب نہیں۔[۱]

مصنف نے کتاب میں وتر کا مسئلہ چھیڑا ہے موجودہ دور میں جو ائمہ مسجد نبوی میں تراویح پڑھاتے ہیں وہ وتر کی نماز تو تین رکعت پڑھتے ہیں، مگر دو سلام سے، پہلے دو رکعت پھر ایک رکعت پڑھتے ہیں، اور دعائے قنوت تیسری رکعت میں رکوع کے بعد جہراً پڑھتے ہیں، حنفیہ کے نزدیک وتر کی نماز تین رکعات ایک سلام سے ہے جیسے مغرب، اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے ہے اور سراً ہے، اس صورت حال کی وجہ سے احناف سعودی امام کے پیچھے تراویح پڑھنے کے بعد جماعت سے الگ انفراداً وتر پڑھتے ہیں یا اپنی علاحدہ جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس طرح ایک تشتت اور انتشار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، مصنف کو یہ صورت پسند نہیں ہے، انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ حنفی حضرات وتر میں الگ نہ ہوا کریں، بلکہ امام کے ساتھ وتر میں شریک ہو جائیں انہوں نے لکھا ہے کہ صاحب فتح القدیر علیٰ شرح الہدایہ نے ابوبکر رازی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

''اگر کوئی حنفی غیر حنفی کے پیچھے وتر پڑھے اور امام نے دوسری رکعت پر سلام پھیر دیا تو اس حنفی مقتدی کو دو امور کا اختیار ہے۔

(۱) وہ سلام نہ پھیرے اور امام کے ساتھ تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو جائے کیونکہ محل اجتہاد ہونے کی وجہ سے امام کے سلام پھیرنے سے اس کی نماز ختم نہ ہوگی۔

(۲) دو رکعت پر سلام پھیرنے کے بعد اپنے امام سے الگ ہو کر نماز پوری کرے''۔

بہر کیف اگر ان صورتوں پر عمل ہو تو اختلاف ختم ہو سکتا ہے، اور ہر ایک اپنے مسلک پر باقی رہے گا، کاتب حروف کے خیال میں دوسری صورت میں بھی انتشار کی ایک صورت رہ جائے گی، احناف کے لئے مناسب ہے کہ پہلی صورت کو عمل میں لائیں، مسئلہ مجتہد فیہ ہے قطعی نہیں ہے اور تفرق وانتشار سے بچنا مطلوب ہے، نماز کے بعض اور اجتہادی مسائل میں باوجود اختلاف مسلک کے ائمہ کی اقتداء بغیر کسی تنگی کے کی جاتی ہے، مثلاً جس وقت ائمہ حرم عصر کی نماز پڑھاتے ہیں، احناف کے نزدیک ابھی ظہر کا وقت ہوتا ہے، مگر تمام احناف ان کی اقتداء میں اسی وقت عصر کی نماز ادا کرتے ہیں، اسی طرح وتر کے مسئلہ میں بھی اگر مندرجہ بالا صورت اختیار کی جائے تو نامناسب نہ ہوگا، گو کہ جمہور احناف نے امام ابوبکر رازی کے اس قول کو قبول نہیں کیا ہے، ان کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ اگر امام وتر کی دو رکعت پر سلام پھیرتا ہے، تو اس کی اقتداء جائز نہیں، لیکن مسئلہ اجتہادی ہے، اگر تفرق وانتشار سے بچنے کے لئے ابوبکر رازی کے قول پر عمل کیا جائے تو گنجائش ہے۔ **واللہ اعلم**

رہا رکوع کے بعد قنوت کا مسئلہ تو حنفی مقتدی کے لیے اس میں امام کی اقتدا بے تکلف جائز ہے، یہ بندہ صاحب افتاء نہیں ہے، حضرات علماء غور کرلیں۔

یہ کتاب ۱۳۹۰ھ میں لکھی گئی ہے، مگر آج بھی تروتازہ ہے، فاضل عزیز مولانا محمد عارف صاحب مبارک پوری نے اس کو اردو لباس پہنایا، یہ ترجمہ قسط وار ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند میں شائع ہوا تھا، اب انہوں اسے کتابی شکل میں مرتب کردیا ہے۔

اعجاز احمد اعظمی

۷؍ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

حاشیہ

(۱) تفصیل اس کی یہ ہے کہ صاحب فتح القدیر نے مصنف ابن ابی شیبہ، طبرانی اور بیہقی سے حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ ”انہ ﷺ کان یصلی فی رمضان عشرین رکعة سوی الوتر رسول اللہ ﷺ“. رمضان شریف میں بیس رکعات علاوہ وتر کے پڑھتے تھے، پھر اس روایت کو انھوں نے ضعیف قرار دیا، اور فرمایا کہ اس کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کی وہ صحیح روایت ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، پھر مؤطا امام مالک کی روایت بیان کی ہے کہ ”کان الناس یقومون فی زمن عمر بن خطاب بثلث وعشرین رکعة“. حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ ۲۳/ رکعات پڑھتے تھے۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ ”وجمع بینهما بانه وقع اولا ثم استقر الامر علیٰ العشرین فانه المتوارث فتحصل من هٰذا کله ان قیام رمضان سنة احدی عشرة رکعة بالوتر فی جماعة فعله ﷺ ثم ترکه لعذر .... پھر لکھتے ہیں: انما استفدنا انه کان یواظب علیٰ ما وقع منه و هو ما ذکرنا فتکون العشرون مستحباً و ذٰلک المقدار منها هو السنة“. ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ پہلے تراویح آٹھ رکعات پڑھی، پھر بیس رکعات پر اتفاق ہوگیا، یہی متوارث ہے، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ رمضان کا قیام مع الوتر گیارہ رکعات سنت ہے، رسول اللہ ﷺ کی تراویح باجماعت ثابت ہے، بعد میں آپ نے اسے عذر کی وجہ سے ترک کر دیا تھا، اس گیارہ رکعت پر آپ ﷺ نے مواظبت کی، لہذا بیس رکعات مستحب ہے اس میں سے اتنی مقدار آٹھ رکعات مسنون ہے، اس بحث کے بعد علامہ ابن ہمامؒ نے و مقتضی 'الدلیل ما قلنا لکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صاحب فتح القدیر کا یہ رجحان ہے، مذہب احناف نہیں ہے۔

واللہ اعلم۔

چراغ سے چراغ جلا

چراغ سے چراغ جلتا ہے، بات سے بات نکلتی ہے، چودھویں صدی ہجری کے نصف اول میں مغربی یوپی کے ایک مردم خیز قصبہ تھانہ بھون میں ایک چراغ روشن ہوا تھا، یہ چراغ کاہے کو تھا ایک آفتاب تھا، جس کی روشنی سے گمراہیوں کی شب تاریک کی سیاہیاں چھٹتی اور ظلمتیں گھٹتی رہیں۔ اس آفتاب کی شعاعیں دور دور تک پھیلیں، ایک طویل عرصہ تک تھانہ بھون کا یہ مرد حقانی علم وعمل کا مرکز رہا، حق تعالیٰ نے اپنے خاص بندے کا فیض عام کیا، تھانہ بھون کا یہ عالم ربانی جو حکیم الامت کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے، علم وعمل، اخلاص وروحانیت، تعلیم وافادہ، تربیت وارشاد اور اخلاق وانسانیت ہر اعتبار سے ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا۔ اس ایک چراغ سے سینکڑوں انجمنیں وجود میں آئیں، درس وافادہ کی، تربیت وسلوک کی، اخلاص وللہیت کی، تصنیف وتالیف کی، مواعظ وارشاد کی، اور سب سے بڑھ کر نسبت مع اللہ اور سچی روحانیت کی!

جب تک علم وہدایت کا یہ آفتاب اپنے وجود مسعود کے ساتھ عالم شہادت میں جلوہ گر رہا، یہ ساری انجمنیں اور یہ تمام محفلیں اس سے کسب نور کرتی رہیں اور فیضیاب ہوتی رہیں، لیکن جب قانون الٰہی کے مطابق یہ سورج روپوش ہوا، تو اتنے چراغ روشن ہو چکے تھے کہ ہدایت وارشاد کی وہ بزم جو آراستہ ہوئی تھی، اس کی آب وتاب باقی رہی، اس حکیم امت کی درسگاہِ تربیت میں علم وعمل اور سلوک وروحانیت کے جو آبدار موتی فضل وکمال سے آراستہ ہوئے تھے، انھوں نے ہر طرف روشنی کے حلقے قائم کئے اور کام آگے چلتا رہا، اگلوں سے پچھلے علم حاصل کرتے رہے، اور ہدایت وارشاد کا ماحول بنا رہا۔

حکیم الامت حضرت اقدس مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ امت محمدیہ علیٰ

صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشن اورتابناک جماعت میں علم واعتبار سے ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہوئے ہیں کہ ان کا قلم مسلسل ہدایت کے موتی تو بکھیرتا ہی رہا، اس کے ساتھ ساتھ ان کی زبان حق ترجمان سے سے جو کلمات ہدایت صادر ہوتے، انھیں بھی لکھنے کا بڑا اہتمام رہا، اس دور میں الفاظ وکلمات کو محفوظ کرنے کے جدید آلات ابھی وجود میں نہ آئے تھے، اس وقت حق تعالیٰ کا خصوصی کرم یہ تھا کہ انھیں ایسے رجال کار بخشے گئے جو حضرت حکیم الامت کے اقوال وارشادات اورمواعظ وحکم کو قیدِ تحریر میں لانے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے، انھوں نے لفظ لفظ لکھا بھی! اور لکھ کر حضرت کی نگاہ اصلاح کے سامنے پیش بھی کیا، اور حضرت کے وقت اور عمل کی برکت بھی وہ تھی کہ سب کو ملاحظہ فرمایا اور اس کے استناد کی حیثیت پختہ کردی!

اس طریقۂ کار سے حضرت حکیم الامت کے مواعظ وملفوظات کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہوگیا، حضرت اقدس ایک زبردست عالم وفقیہ ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجے کے خطیب وواعظ بھی تھے، حضرت کے خطبات ومواعظ ہزاروں ہوئے ہیں، بہت طویل بھی اور قدرے مختصر بھی! آج ان کی تعداد بجز علام الغیوب کے کون جان سکتا ہے، لیکن جو مواعظ قلمبند کئے گئے اور ان کی اشاعت ہوئی، ان کی تعداد بھی ساڑھے تین سو سے زائد ہے۔ ملت اسلامیہ کی وسیع وعریض تاریخ میں یہ ایک ممتاز اور مثالی کارنامہ ہے کہ شخص واحد کے اتنے مواعظ جو کئی کئی گھنٹوں پر محیط ہوتے تھے مرتب اور مدوّن کئے گئے ، پاکستان کے ایک ادارہ ’’ادارہ تالیفات اشرفیہ‘‘ ملتان نے ۳۱؍جلدوں میں ۳۳۵ مواعظ کا مجموعہ ’’خطبات حکیم الامت‘‘ کے نام سے شائع کیا ہے، اس کا نقش ثانی بمبئ سے حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ نے بھی شائع کیا ہے۔

یہ تو وہ مواعظ وخطبات ہیں جنھیں حضرت حکیم الامت نے عمومی مجامع میں مسلسل بیان فرمائے ہیں۔ ان مواعظ کے علاوہ ان کے ان ملفوظات وارشادات کا بھی بڑا ذخیرہ ہے جو حضرت کی مجلسوں، خصوصی گفتگوؤں اور سفر وحضر کے مختلف مواقع پر صادر ہوئے ہیں، یہ روزمرہ کی عام گفتگوؤں کے مجموعے ہیں، جنھیں اہل ذوق اور اہم علم حضرات نے آپ سے سن کر قلمبند کئے، اور انھیں بھی حضرت کے ملاحظے سے گزارا۔ ان مجموعوں کی تعداد بھی ۷۰؍ سے زائد ہے، (ان تمام ملفوظات کا مجموعہ بھی مذکورہ پاکستانی ادارے نے ۳۰؍جلدوں میں ’’ملفوظات حکیم الامت‘‘ کے

نام سے شائع کیا ہے، [جواَب دیوبند سے بھی شائع ہوگیا ہے]) جن میں بعض تو مختصر ہیں لیکن بعض بہت مفصل کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں، ان ملفوظات کے تعارف کیلئے ’’فہرست تالیفات حکیم الامت‘‘ مرتبہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی علیہ الرحمہ کا قتباس نقل کرتا ہوں، لکھتے ہیں کہ:

> ’’حق تعالیٰ نے آپ کے قلب وزبان کوایسی توفیق عطا فرمائی تھی کہ کوئی لحظہ اور کوئی لمحہ یادالٰہی سے خالی نہ جاتا تھا، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اپنے معبود برحق کے ذکر میں رطب اللسان رہتے تھے، یا انبیاء کرام واولیاء عظام کے تذکرے یا عاشقان ذوی الاحترام کی حکایات وروایات یا دین برحق مذہب اسلام کے احکام ومسائل بیان فرماتے رہتے تھے۔
>
> حضرت والا کا ہر لفظ صبغة الله میں رنگا ہوا، ہر کلمہ شرابِ عشق حقیقی میں ڈوبا ہوا، ہر فقرہ حقائق ومعانی کے عطر سے معطر اور ہر جملہ ہدایت وارشاد سے مملو ہوتا تھا، جس سے حضرت والا کا مذاق ومسلک، طرز تعلیم وتربیت بھی معلوم ہوتا تھا، اصلاح اخلاق، اصلاح نفس اور نکات تصوف کے مختلف علمی وعملی، عقلی ونقلی معلومات وتجربات کے بیش بہا خزائن بھی حاصل ہوتے تھے۔
>
> اہل علم حضرات نے نفع عام کی غرض سے اپنے سنے ہوئے ملفوظات مختلف زبانوں میں قلمبند فرمائے ہیں۔ (فہرست تالیفات حکیم الامت، ص: ۳۰۰)

یہ ملفوظات زیادہ تر حضرت کی حیات مبارکہ میں ہی چھپ کر شائع ہوگئے تھے، آپ کے وصال کے بعد بھی مختلف اداروں اور مطابع کی طرف سے چھپتے رہے اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہے، اسی کے ساتھ بعض لائق وفائق حوصلہ مند وعقیدت مند علماء نے ان مواعظ و ملفوظات کی راہ سے دین متین کی خدمت کے اور بھی مفید طریقے اختیار کئے، اس طرح ان مواعظ وارشادات کی افادیت کا دائرہ بڑھتا چلا گیا۔

چنانچہ کچھ دنوں پہلے مولانا مفتی محمد زید صاحب تلمیذ خاص حضرت مولانا سید قاری صدیق احمد باندوی علیہ الرحمہ (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے مختلف دینی اور علمی موضوعات کو ان مواعظ وملفوظات سے منتخب کر کے یکجا کیا، اور انھیں الگ الگ کتابی شکل میں شائع کیا، اس سے حضرت کے علوم ومعارف سے استفادہ سہل تر ہوگیا۔

اب ہمارے عزیز مولانا محمد سمیع الدین قاسمی سلّمہٗ نے کمر ہمت باندھی، اور خدمت کی ایک نئی مگر تحقیقی راہ اختیار کی جو خاصی دقت طلب اور مشکل ہے، وہ یہ کہ حضرت اقدس تھانوی علیہ الرحمہ چونکہ ایک بلند پایہ عالم، محدث، مفسر، فقیہ اور متکلم تھے، اس لئے ان کی عام گفتگو میں بکثرت قرآن وحدیث کے حوالے آتے ہیں، تفسیری بیانات ہوتے ہیں، فقہی اصول ومسائل ہوتے ہیں، علم کلام کی گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں، تصوف وسلوک کے اسرار ونکات ہوتے ہیں، نیز فارسی کے اشعار موقع ومحل سے بکثرت ارشاد ہوتے رہتے ہیں۔ گفتگو کی روانی میں کتابوں اور مصادر ومراجع کے بیان کا اہتمام نہیں ہوتا۔ مولانا محمد سمیع الدین نے دراست وتحقیق کے لئے یہ راہ اختیار کی، کہ ہر حدیث، ہر فقہی اصول ومسئلہ اور دوسری علمی چیزوں کو ان کے مصادر ومراجع سے تحقیق کی، ہر ایک کا مستند حوالہ تحریر کیا، ہمارے اس دور میں اردو ہی کا ذوق کم ہوتا جارہا ہے، تو فارسی کو کون پوچھے، موصوف نے محنت کرکے فارسی اشعار کا ترجمہ کردیا ہے۔

اس خدمت کے لئے انھوں نے حضرت کے اخیر زندگی کے ملفوظات ’’الافاضات الیومیہ‘‘.....جو کہ سب سے ضخیم ترین مجموعہ ہے.....کا انتخاب کیا، اور سالہا سال کی محنت شاقہ اور ریاضت مستمرہ کے بعد ان ملفوظات کو از سرنو مرتب کیا، مضامین کی تفصیلی فہرست مرتب کی، اشاریہ تیار کیا، اب اس ضخیم دفتر سے استفادہ بہت سہل ہوگیا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے نوجوان علماء کو حضرت تھانوی کے علوم وکمالات سے مناسبت ہورہی ہے، یہ ایک امید افزا مستقبل کی جانب اشارہ ہے۔

مولانا محمد سمیع الدین قاسمی سلّمہٗ کی اس خدمت کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی، اور ملت اسلامیہ کے نوجوان علماء پر اعتماد بڑھ گیا، حق تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ وہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مردان کار پیدا فرماتے ہیں، خداوند تعالیٰ انھیں مزید توفیق سے نوازیں، اور ان کی کاوشوں سے امت کو فیضیاب فرمائیں۔

ایں دعا از من از جملہ جہاں آمین باد
اعجاز احمد اعظمی
۱۰؍ربیع الاوّل ۱۴۳۲ھ مطابق ۱۵؍فروری ۲۰۱۱ء دوشنبہ

تقریب بر ’’چن بسیشور‘‘

الحمد للّٰہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ أمابعد!

۱۹۷۲ء کا غالبًا اگست کا مہینہ تھا، میں صوبہ کرناٹک کے شہر میسور میں مسجد خاکی شاہ میں امام وخطیب کی حیثیت سے مقیم تھا۔ مسجد کے قریب ہی ٹاؤن ہال کی عمارت تھی، ایک دن ایک اشتہار نظر سے گزرا کہ ٹاؤن ہال کے وسیع ہال میں ’’دیندار انجمن‘‘ کا اجتماع ہونے والا ہے، یہ نام میرے لئے اجنبی اور نیا تھا۔ دیندار کے عنوان سے مجھے کشش ہوئی، تاریخ موعود پر میں بھی شریک اجتماع ہوا، دیکھا تو صورت وضع اور شکل وشباہت کے اعتبار سے خاصے دیندار لوگوں کا اجتماع ہے، بڑی بڑی داڑھیاں، سروں پر پگڑیاں، لمبے لمبے کرتے، لیکن ٹخنوں سے نیچے پاجامے! بس یہ ایک چیز کھٹک رہی تھی، مگر جب اجتماع کی کارروائی شروع ہوئی اور تقریروں کا آغاز ہوا تو بالکل ناقابل فہم! دل ودماغ میں اترنے کے بجائے سروں کے اوپر سے گزرتی چلی جارہی تھیں، اسٹیج پر لگے ہوئے بینر کو دیکھ کر پہلے ہی ایک وحشت محسوس ہوئی تھی، جس پر ’’چن بسیشور‘‘ لکھا ہوا تھا۔ تقریروں نے یہ وحشت اور بڑھادی، میں سوچ رہا تھا کہ مسلمانوں کی شکل میں یہ ہندو ہیں؟ پھر ’’صدیق‘‘ بھی اور ’’دیندار‘‘ بھی، لیکن اس کے ساتھ ’’چن بسیشور‘‘ عجب معمہ معلوم ہورہا تھا، ان کی بے معنی اور دوراز فہم تقریروں کے سننے کے بعد اندازہ ہوا کہ قادیان کی جھوٹی نبوت سے متاثر ہوکر ان صاحب کو بھی جن کا نام صدیق لیا جارہا ہے اور دیندار کے لقب سے انھیں یاد کیا جارہا ہے، نبوت کا شوق چرّایا ہے، اور ’’چن بسیشور‘‘ کا ہندوانہ لبادہ اوڑھ کر یہ صاحب مسلمانوں میں بھی اور ہندوؤں میں بھی کوئی نیا فتنہ جگانا چاہتے ہیں، اتنی بات اجمالی طور پر سمجھ میں آجانے کے بعد میں وہاں سے چلا آیا، اور پھر کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔

تاہم جب تک وہاں رہنا ہوا، جنوبی ہند میں مہدوی فرقہ اور ’’چن بسیشور‘‘ کے فرقہ کا

ذکر سنتا رہا۔ وہاں سے جب اپنے علاقہ شمالی ہندوستان میں آ گیا تو ان فرقوں کی یاد تو باقی رہی مگر نہ ان کے افراد سے کوئی سابقہ پڑا اور نہ ان کے لٹریچر کی کوئی بازگشت سنائی دی، لیکن ذہن میں یہ بات ہمیشہ جمی رہی کہ ختم نبوت کے بعد دجالوں اور کذابوں کی فہرست میں ایک مختصر اور محدود سہی! ناکام ونامراد سہی! ایک نام یہ ''چن بسیشور'' اور اس کا فرقہ ''دیندار'' کے نام پر بد دین بھی ہے۔

بہت عرصہ کے بعد پھر جنوب میں حیدر آباد آمد ورفت شروع ہوئی، تو اس مانوس فرقہ کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ حیدر آباد کے نامور اور غیور عالم دین حضرت مولانا مفتی عبد القوی صاحب مدظلہ سے ملاقات ہوئی، اور تعارف ہوا۔ یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی اور حضور خاتم النبین ﷺ کی امت کی زرخیزی پر یقین واذعان میں مزید اضافہ ہوا، کہ ختم نبوت کے مضبوط حصار پر جو بری نظریں لگ رہی ہیں، اور وہ وقتاً فوقتاً اس آہنی قلعہ میں شگاف ڈالنے کی سعی نامحمود میں مصروف رہتی ہیں، امت کے علماء جو صحیح معنوں میں وراثت نبوت کا حصہ پائے ہوئے ہیں۔ وہ ان چوروں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، اور جو فتنہ جہاں سے بھی لپکتا دکھائی دیتا ہے وہیں اسے دبانے اور بجھانے کے لئے سر بکف موجود ہوتے ہیں۔

مولانا مفتی عبد القوی صاحب مدظلہ نے کچھ عرصہ پہلے ''مہدوی فرقہ'' کا کامیاب تعاقب کیا تھا، اب ان کی توجہ ''چن بسیشور'' کے ناقابل فہم فرقہ اور اس کے ہفواتی وخرافاتی لٹریچر کی طرف ہوئی، یہ فرقہ اپنے پر پُرزے قائم رکھنے اور بڑھاتے رہنے کی کوشش جنوبی ہند میں کر رہا ہے۔ مولانا نے ان کے ہذیانی لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ اس لٹریچر میں ہے، وہ ہذیان اور ذہن ودماغ کے بے معنی طغیان کے علاوہ کچھ نہیں ہے، لیکن حسب مقولہ لکل ناعق لاحق، ہر شور وغوغا مچانے والے پیچھے کچھ لوگ لگ ہی جایا کرتے ہیں۔ اس لٹریچر پر بھی اعتقاد رکھنے والوں کا ایک گروہ غوغا مچانے پر لگ گیا ہے، اس لٹریچر کا پڑھنا ایک صحیح دماغ والے کے لئے شدید مجاہدہ اور سخت آزمائش ہے، مگر مولانا کا صبر قابل داد بھی ہے اور قابل دید بھی کہ انھوں نے ان کے مشکل الحصول لٹریچر کو حاصل بھی کیا اور اسے بغور پڑھا بھی، اور پھر اسے نہایت سلیقے سے مرتب کر کے اس فرقہ اور اس بانیٔ فرقہ کی اصل تصویر امت کے سامنے رکھ دی۔

حق تعالیٰ اس مجاہدہ، اس صبر واستقامت، احقاق حق اور ابطال باطل کو بہ طفیل حضرت خاتم المرسلین ﷺ قبول فرمائیں اور امت کو ہر فتنہ سے محفوظ رکھیں۔

علماء ومشائخ کے تذکرہ کا دینی پہلو

(تقریب بر ''علماءِ اعظم گڑھ'')

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله وصحبه اجمعین. اما بعد

اللہ کے برگزیدے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالی سے چند دعائیں کی تھیں، وہ دعائیں اللہ رب العزت نے پسند فرمائیں اور انہیں اپنے آخری صحیفۂ ہدایت میں نقل فرمایا، ان دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے: **واجعل لی لسان صدق فی الآخرین** (سورہ شعراء:۸۴) اے میرے رب! میرے بعد والوں میں میرا سچا تذکرہ قائم اور جاری رکھئے۔ پھر اللہ تعالی نے یہ دعا قبول فرئی، چنانچہ قبولیت کا بھی تذکرہ قرآن کریم میں ہے، حضرت ابراہیم اور ان کے صاحبزادے حضرت اسحاق اور پوتے حضرت یعقوب علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: **ووهبنا لهم من رحمتنا وجعلنا لهم لسان صدق علیا.** (سورہ مریم:۱۵۰) اور ہم نے ان سب کو اپنی رحمت عطا کی اور ہم نے ان سب کا نام نیک اور بلند کیا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: **وترکنا علیه فی الآخرین، سلام علی ابراهیم، کذالک نجزی المحسنین، انه من عبادنا المومنین.** (سورہ الصافات:۱۰۹تا۱۱۱) ہم نے ان کے متعلق پیچھے آنے والوں میں یہ بات رہنے دی کہ ابراہیم پر سلامتی ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا اور اس کی پسندیدگی ومقبولیت، پھر اس کا آخری صحیفۂ ربانی میں نزول، اور پھر قیامت تک اس کی لگاتار تلاوت، اس بات کی دلیل ہے کہ کسی صاحب ایمان کے ذکر خیر کا بعد والوں میں باقی رہنا، اللہ کی ایک نعمت ہے اور اس نعمت کی دعا اللہ کے صالح ترین بندے نے کی ہے، پھر بعد میں آنے والوں کی یہ سعادت ہے کہ ان کے حق میں

دعا قبول ہوئی اور انہیں اگلے نیک اور برگزیدہ بندوں کے ذکر خیر کی توفیق ملی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد میں جو بکثرت انبیاء علیہم السلام ہوئے، ان سب کا ذکر خیر بعد والوں میں جاری ہوا، اور ان سب کے ساتھ ”علیہ السلام“ کا لاحقہ ضروری ہوا، ذکر خیر کے دستور کی بنیاد خود اللہ تعالی نے ڈالی، چنانچہ ہر کتاب آسمانی میں حق تعالی نے اپنے صالح بندوں کا تذکرہ اہتمام سے کیا ہے، بالخصوص سب کتب سماویہ کی جامع کتاب قرآن کریم میں تو ان صالحین کے تذکرے اتنی کثرت اور تکرار سے ہوئے ہیں کہ منکرین کو یہ وسوسہ ہونے لگا کہ یہ شاید ”اساطیر الاولین“ کا (نعوذ باللہ) مجموعہ ہے، حالانکہ وہ تو کتاب ہدایت ہے جس میں ان لوگوں کا راستہ واضح کیا گیا ہے، جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہدایت کی راہ بتانے کا سب سے آسان ذریعہ یہی ہے کہ جو لوگ اس راہ پر چلے ہیں ان کا اور ان کے طریقۂ عمل کا تعارف کرادیا جائے، اسی لئے قرآن کریم میں صالحین کا تذکرہ بکثرت کیا گیا ہے۔

صالحین کے تذکرہ حسن اور لسان صدق کی جو بنیاد حق تعالی نے رکھی، امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے علما نے اس بنیاد پر تذکروں اور سوانح عمریوں کی بڑی عمارتیں کھڑی کردی ہیں، اس طرح ان کے ذکر خیر کا غیر منقطع اور استعداد محکم سلسلہ قائم ہوگیا۔

ان بزرگوں کا تذکرہ جہاں بجائے خود ایک بڑی نعمت وسعادت ہے وہیں امت کی ایک اہم بنیادی ضرورت بھی ہے، حق تعالی نے اپنی آخری کتاب اور اس کی بنیاد پر تعمیر ہونے والے دین اسلام کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، اس وعدے کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ اس کتاب اور اس کی شرح وتفسیر اور تشکیل وتکمیل کے جتنے عناصر واسباب ہیں ان سب کی حفاظت کی جائے، تاکہ قرآن بھی محفوظ رہے اور اس کے لانے والے پیغمبر کے حالات، ان کے ارشادات و فرمودات بھی محفوظ رہیں، اور ان کے اخلاق وسیرت کے جلوے بھی روشن اور واضح رہیں، اور یہ کہ ان میں کسی طرح کے تغیر وتبدل کو راہ نہ ملے، اس کے لئے اللہ تعالی ایسے مردان کار تیار کئے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کا لفظ لفظ یاد رکھا اور اسے دوسروں تک پہونچایا، انہوں نے آپ کی سیرت کو اپنے اندر جذب کیا اور بعد والوں کے لئے نمونہ بنے، پھر انہیں رجال کار نے عصراً بعد عصرٍ دین کو اس کی اصل حالت میں تازہ بتازہ باقی رکھنے کا اہتمام کیا۔

یہ حضرات پچھلی نسلوں میں دین کے منتقل کرنے کے واسطہ بنے، تو ضروری ہوا کہ ان

کی زندگیاں بھی محو وتغیر سے محفوظ رہیں، پس اس امت میں ایک مستقل فن ’’علم الرجال‘‘ کا وجود میں آیا اور لاکھوں انسانوں کی زندگیاں محفوظ ہوگئیں اور ان کا ذکر خیر پچھلوں میں مسلسل باقی رہا۔

امت کے ہر طبقہ نے اپنے پیش رو علما وصلحا کو ضبط کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اس کے لئے مختلف عنوان اختیار کئے ہیں، محدثین نے احادیث رسول کے راویوں کے حالات جمع کئے، تحقیق وتنقید کر کے ان کے مراتب ومدارج کا انضباط کیا، ان کے سنین ولادت ووفات کی تحقیق کی، ان کے حفظ واتقان، ان کی وسعت نظر اور دقت فکر کو بیان کیا، فقہا نے اپنے اساتذہ اور اساطین مذہب کے حالات مرتب کئے، ان کے درجات کا تعین کیا اور ان کی ذہانت وذکاوت کے واقعات تحریر کئے۔

علما کی ایک جماعت نے حضرات صحابہ کو موضوع بنا کر ان کے احوال وسوانح مرتب کئے، بعض علما نے ائمہ کبار کے حالات مدون کئے، بہتیرے علما نے خلفا وملوک کی داستان لکھی، بعض نے مختلف مذاہب ومسالک کے علما کا عنوان قائم کر کے کتابیں تصنیف کیں، چنانچہ طبقات حنفیہ، طبقات شافعیہ اور طبقات حنابلہ کے نام سے علما کا تعارف کرایا، بعض اہل تحقیق نے وفیات کو موضوع بنا کر علما کی بڑی تعداد کی زندگیا محفوظ کیں، کسی نے انساب کو عنوان بنا کر داد تحقیق دی، موضوعات کی یہ ایک لمبی فہرست ہے جن کے تحت ہزارہا ہزار بزرگانِ پیشیں کا ذکر خیر ہے۔

علما کی ایک جماعت نے مختلف دیار وامصار کے اہل علم واصحاب فضل کو موضوع بنا کر ان کے حالات کی تحقیق کی، مثلاً علامہ خطیب بعدادی المتوفی ۴۶۳ھ نے ۱۴؍ جلدوں میں تاریخ بغداد لکھی، پھر دوسرے عالم علامہ شمس الدین ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے ۸؍ جلدوں میں اس کا ذیل لکھا[۱] علامہ ابن عساکر المتوفی ۵۷۱ھ نے ۸؍ جلدوں میں تاریخ دمشق لکھی، اس کے علاوہ علما نے تاریخ مکہ، تاریخ مدینہ، تاریخ اصفہان وغیرہ مختلف ناموں سے ان مقامات کے علما کا تذکرہ کیا، علامہ سیوطی نے تاریخ قاہرہ لکھی۔

تذکرہ، سوانح، تراجم اور اسماء الرجال کا یہ عظیم الشان کتب خانہ زیادہ تر بلکہ ایک عرصہ تک تمام تر عربی زبان میں رہا، جو قرآن وحدیث کی زبان ہے، عربی کے بعد فارسی زبان دین کی دولت سے مالا مال ہوئی، پھر جب ہندوستان میں اردو زبان کا وجود ہوا اور علمی دنیا میں اس کی نشو

نما ہوئی، اور علمانے اس پر توجہ دی، تو علوم دینیہ کا بیشتر سرمایہ اردو زبان میں آیا، ان علوم کی فہرست میں جنہوں نے اردو زبان میں نمایاں مقام حاصل کیا، تذکرہ وسوانح کا علم بھی ہے، اس فن میں اصحاب علم نے خوب خوب داد تحقیق دی ہے، نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ پر ایک کتب خانہ کا کتب خانہ تیار کر دیا، آپ کے علاوہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے، صحابہ اور تابعین کے، محدثین و ائمہ کے، فقہا وعلما واسلاف کے ذکر خیر کی سنت وسعادت کا سلسلہ جاری کیا اور اب تک وہ سلسلہ قائم ہے۔

اردو زبان میں بھی اہل تحقیق نے مختلف عنوانوں سے اسلاف کے تذکرے لکھے ہیں، طبقات کے لحاظ سے بھی، مختلف مکاتبِ فکر کے لحاظ سے بھی، مقامات اور جگہوں کے لحاظ سے بھی ولادت ووفات کے اعتبار سے بھی علمانے ان بزرگوں کے احوال جمع کئے ہیں۔

اس سلسلے کی ایک زریں کڑی ہمارے مخدوم فاضل گرامی مولانا حبیب الرحمان قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم دیو بند کی مرتب کردہ کتاب ''تذکرہ علماء اعظم گڑھ'' ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا، جس میں مولانا موصوف نے بڑی تحقیق وتدقیق کے ساتھ نہایت جانفشانی، تلاش وجستجو سے اعظم گڑھ کے تقریباً دوسو علما کے حالات لکھے تھے۔ اس وقت سے اب تک کے وقفہ میں اور بھی بہت سے علما دنیا کا سفر پورا کر کے منزل آخرت میں کمر کھول چکے ہیں، مولانا نے اس ایڈیشن میں مزید محنت کر کے تقریباً پچاس علما کے حالات کا اضافہ کیا۔

لیکن جغرافیائی اعتبار سے ضلع اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء میں دو ٹکڑوں میں منقسم ہو کر چھوٹا ہو گیا، بڑے بڑے بہت سے علما ضلع مئو کے حصہ میں آ گئے، اور تذکرے کا دامن علماءِ اعظم گڈھ تک ہی محدود ہے اس لئے انہیں دوسری کتاب یا دوسرے مؤرخ کے لئے چھوڑنا پڑا۔

بہر حال یہ ایک مستند علمی دستاویز ہے جو اپنے نقش اول پر کیفیت اور کمیت ہر اعتبار سے فائق ہے۔ بزرگوں کا تذکرہ باعث سعادت ہے اور دعاء ابراہیمی کی قبولیت کا پیکر جمیل! اللہ تعالی اس تذکرۂ حسن اور ذکر خیر کو قبول فرمائے اور نافع بنائے۔ آمین

حاشیہ

(۱) تاریخ بغداد کا ذیل حافظ ابوعبداللہ محمد بن سعید الدبیثی المتوفی ۶۳۷ھ نے لکھا تھا، علامہ ذہبی نے اس کا اختصار کیا۔ وہی اختصار تاریخ بغداد کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

تأثر

بر

''اپنی باتیں''۔ آپ بیتی مولانا ین العابدین معروفی صاحب

استاذ محترم مولانا زین العابدین الاعظمی المعروفی علیہ الرحمۃ اپنے تقوی و دیانت، اپنی عفت ونزاہت، اپنی استعداد وذکاوت، اپنی محنت وریاضت، اپنے خلوص وللّٰہیت، اپنی جانکاہی و جفاکوشی، اپنی شفقت ومحبت، اپنی تعلیم وتربیت، اپنی کردار سازی ومردم گری، اپنی پاک باطنی و بے نفسی، اپنے علم وفن کے رسوخ وپختگی اور اپنے اخلاق وعمل کی بلندی و پاکیزگی کے لحاظ سے ہمارے اس دور میں سلف صالحین کے نمونہ اور اللہ کی نشانیوں میں ایک روشن نشانی تھے، تمام زندگی جس سادگی اور بے نفسی میں گزاری، تعلیم وتربیت کے روزمرہ معمولات میں جس بے تکلفی سے لگے رہے، اور اپنے کو کھپائے رہے، دیکھنے والوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کس بلند معیار ومرتبہ کے مرد کامل ہیں اور تواضع وانکساری کی سادہ چادر میں لپٹا ہوا کتنا عظیم گوہر گرانمایہ ہے، لیکن حق تعالی کو منظور تھا کہ گدڑی میں جو لعل چھپا ہوا ہے، اس کی ایک جھلک نگاہوں کے سامنے آجائے، تاکہ چلنے والوں کے لئے راستہ ہموار رہے، اور اندھیریوں میں ایک تیز شمع کی روشنی دور تک اجالا کرتی رہے۔

زندگی کے اخیر دنوں کی تابنا کی دیکھنے والوں نے خوب دیکھی، قریب والوں نے بھی اور دور والوں نے بھی، اس کی کچھ جھلکیاں اس خاکسار نے اپنے دو مضمونوں میں دکھائی ہیں، شاید ناظرین کی نگاہ سے گزری ہوں گی یا گزریں گی، یہ تو آخری لمحات کے ایمان افروز حالات ہیں۔

لیکن زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا؟ کس حال میں ہوا؟ کن کن منزلوں سے زندگی گزری؟ کس کس نشیب وفراز میں حالات نے ہچکولے کھائے؟ روزی کی تقسیم کس کس سرزمین سے وابستہ رہی؟ نشو ونما وتربیت کن کن بزرگوں کے سایہ رحمت کے ماتحت ہوتی رہی؟ افادہ و استفادہ کا سفر کن کن مرحلوں سے ہوتا ہوا تکمیل کو پہونچا؟۔

عمرعزیز کی طویل مدت کا یہ سفر، اس سفر کی منزلیں، بہت سے لوگوں، عزیزوں، قرابت مندوں، شاگردوں، اور مریدوں کے نگاہ سے گزرتی رہتی ہیں، مگر جیسے ہی یہ سفر اپنی آخری منزل پر پہونچ کر کمر کھولتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نگاہوں سے سارے مراحل اوجھل ہوگئے، جنھوں نے قریب سے دیکھا ہے، وہ صدمہ کی ایک کیفیت میں خودفراموشی کی دنیا میں کھو جاتے ہیں، جنھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے، ان کی زبان گنگ ہوجاتی ہے، جب زبان ہی گنگ ہوگئی تو قلم کا کیا یارا ہے کہ وہ اظہار کرے۔

پھر اللہ کو منظور ہوتا ہے کہ زندگی کے نافع اجزا اور مفید حصے لوگوں کے ذہن ودماغ میں محفوظ رہیں، تو حق تعالی کی تدبیر اس کا انتظام کرتی ہے، حضرت مولانا کی زندگی کے بقاء کا حسن انتظام اللہ کی طرف سے یہ ہوا کہ مولانا کے رنگ طبیعت کے خلاف، مولانا کے افتادمزاج سے الگ، خود انھیں کے قلم سے حالات وسوانح کی تحریر کا سلسلہ شروع کرایا گیا، مولانا کا رنگ طبیعت یہ تھا کہ وہ اپنے احوال وکوائف کا عموماً اظہار نہیں کرتے تھے، ان کا مزاج پوشیدگی اور کتمان حالات کا تھا، اس مزاج اور اس رنگ کے ساتھ یہ تصور کہ وہ اپنے حالات اپنے قلم سے لکھیں گے، ایک بعید تصور تھا، مگر اللہ کے فیصلے نے مولانا سے یہ انہونا کام نہ جانے کب شروع کرادیا تھا، پھر جب مولانا بستر مرض پر آئے، اور دنیا سے رخصت ہونے کے آثار سامنے آنے لگے، اور ساتھ ہی ساتھ ایمان ویقین کی روشنی تیز سے تیز تر ہونے لگی، نصائح اور وصایا کا سلسلہ شروع ہوا، تو خود آپ کو بھی اور آپ کے صاحبزادوں کو بھی ناتمام لکھی ہوئی آپ بیتی یاد آنے لگی، مولانا نے وعدہ کیا کہ مہلت ملی تو اسے اپنی حدتک تکمیل کو پہونچاؤں گا، اور امید ظاہر کی کہ مہلت ملے گی، چنانچہ زندگی کے وقفے میں حق تعالی نے مہلت عطا فرمائی، کچھ بطور خود اور کچھ صاحبزادۂ محترم مولانا عبد الباسط صاحب سے بطور املا کے لکھوائی، اس کا نام خود مولانا نے ''اپنی باتیں'' رکھا۔

زندگی کے آغاز سے اس کے اختتام کے قریب تک یہ ایک مکمل، جامع لیکن مختصر آپ بیتی ہے، صاحب زندگی، اپنی زندگی سے جیسا واقف ہوتا ہے، دوسرا کیوں کر ہوسکتا ہے؟ پھر وہ صاحب زندگی اگر راست باز، دیانت دار، قوی الحفظ، فہیم وزیرک اور خداترس و بےنفس ہو، تو اس کا لفظ لفظ معیار حق وصداقت بن جاتا ہے، پڑھنے والوں کے لئے دیانت وامانت کی راہ روشن کرتا ہے۔

مولانا کے انتقال کے بعد مولانا پر جو مضامین ان کے تلامذہ و محبین لکھیں گے، وہ تو لکھیں گے ہی، اس کے ساتھ صاحبزادۂ محترم مولانا عبدالباسط صاحب نے اہتمام کیا کہ سچائی کی یہ دستاویز، اور روشنی کی یہ شمع دلآویز ڈھونڈھنے والوں، محبت کرنے والوں اور صدمہ وغم میں ڈوبنے والوں کے ہاتھوں میں آجائے، تاکہ ان سچے حالات کی روشنی میں محبت کی لو تیز اور غم کا زخم مندمل ہو۔

اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائیں، پڑھنے والوں کے لئے رہنما بنائیں، غمزدہ وارثین واہل محبت کے لئے سرمایہ تسکین بنائیں، اور مولانا کی روح کو اعلیٰ علیین میں فرحت وشادمانی سے نوازیں۔ آمین

تلمیذہ الاصغر
اعجاز احمد اعظمی
۱۶؍رجب ۱۴۳۴ھ

☆☆☆☆☆☆

فیضانِ حکیم الامت

تھانہ بھون کے درویش عالم، صاحب نسبت بزرگ، سنت وشریعت کے بے مثال داعی وسالک، طریقت وحقیقت کے ماہر شناور حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی شخصیت ایک آفتاب جہاں تاب تھی، جن کے فیوض برکات سے ایک عالم کا عالم مستفیض ہوا، آپ کی حیات طیبہ میں آپ کا فیض تو رواں دواں تھا ہی، علم کا نور، عمل کی پاکیزگی، نسبت باطنی کے برکات، شریعت وطریقت کا عموم وشیوع، اصلاح باطن اور پختگی عقائد کے برکات کا ظہور تو تھا ہی، آپ کے دنیا سے گزر جانے کے بعد بھی، جس کو اب ستر سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، آپ کے فیوض و برکات کا بحر بیکراں اب بھی دنیائے اسلام کو فیضیاب کر رہا ہے۔ **ذالک فضل اللہ یوتیه من یشاء وهو العزیز الحکیم۔**

آپ کے قلم سے صدہا دینی کتابیں، ضخیم بھی اور مختصر بھی نکلیں، جو افادیت اور نافعیت میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، ان کی اشاعت کا سلسلہ اب بھی قائم بلکہ روز افزوں ہے، ان سے امت فائدہ اٹھا رہی ہے، اس کے ساتھ ارشاد وتربیت کے ذریعہ سے مشائخ اور بزرگان دین کی اتنی بڑی جماعت تیار کردی تھی کہ ان کے فیض نسبت سے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش جگمگا گیا، آج ان کے براہ راست خلفاء میں سے کوئی بھی حیات سے نہیں ہے، لیکن ان کے سلسلہ کے ہزارہا بزرگان طریقت موجود ہیں جن سے نسبت وشریعت اور راہ طریقت کے فوائد عام ہو رہے ہیں۔

آپ کی بابرکت زندگی میں فیوض و برکات کا ایک بڑا دروازہ آپ کے مواعظ و خطبات کا تھا، ہندوستان کا وہ کون سا گوشہ اور کون سا خطہ ایسا ہوگا، جہاں حضرت کے قدم نہ گئے

ہوں اور وہاں آپ کے مواعظ نہ ہوئے ہوں، چھوٹا مجمع ہو یا بڑا مجمع، دینی واصلاحی موضوعات پر آپ کے بے شمار خطبات سے امت حاضرہ نے خوب نفع اٹھایا ہے، آپ کے مواعظ کیا ہوتے تھے علوم دینیہ کے دائرۃ المعارف ہوتے، شریعت کی حکمتیں اور نکات، طریقت کے مسائل و معارف، زندگی کے مشکلات کا حل، انسانی تشنگی کی سیرابی کا سامان، قلبی الجھنوں کی تسکین وتشفی، ذکر الٰہی اور تعلق مع اللہ کی موثر دعوت، تصوف وسلوک کی رہنمائی، غرض ہر دینی واخروی بلکہ دنیوی ضروریات وحاجات کے بیان پر مشتمل یہ خطبات ومواعظ ہوتے تھے، ان مواعظ میں دل کی چھپی ہوئی بیماریوں کا علاج ہوتا تھا، غلط عقائد ونظریات کی اصلاح ہوتی تھی، مختلف شکوک وشبہات اور وساوس کا ازالہ ہوتا تھا، مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پھیلی ہوئی برائیوں، کمزوریوں اور بے راہ رویوں کی نشان دہی اور ان سے بچنے اور نجات پانے کی رہنمائی ہوتی تھی، ان مواعظ میں اللہ نے ایسی تاثیر رکھی تھی کہ ایک ایک مجلس وعظ سے کتنی زندگیاں دنیا سے اپنا رخ بدل کر دین کے رنگ میں ڈھل جاتی تھیں، اللہ ہی جانتا ہے کہ حضرت کے مواعظ کا فیضان کہاں کہاں اور کس کس شکل میں پہونچا ہے۔

جو ان مواعظ میں حاضر ہوتے تھے وہ تو مستفیض ہوئے، حق تعالی نے ان مواعظ کے بقاء کا بھی ایسا حیرت انگیز انتظام کیا، جس کی نظیر امت میں کم ملتی ہے، حضرت کے پورے پورے وعظ، مجلس وعظ میں قلم بند کئے گئے، پھر ان پر حضرت نے نظر ثانی فرمائی اور بیشتر حضرت کی حیات ہی میں شائع ہوئے، ان مواعظ کا فیض بحمد للہ اب تک جاری ہے، پہلے حضرت کی زبان مبارک سے لوگ سن کر، حضرت کی مجلس میں حاضر ہو کر مستفید ہوتے تھے، اب ان مواعظ کو کتابی شکل میں پڑھ کر مستفید ہوتے ہیں، آپ کی نسبت باطنی، اور شریعت وطریقت کا نور اور اس کی تاثیر اب بھی باقی ہے۔

پھر اللہ نے اپنے خاص خاص بندوں کو توفیق دی کہ انھوں نے اس بحر بیکراں سے فیض واثر کی چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نہریں تیار کیں، تا کہ کم فرصت والے، کم استعداد والے، زیادہ محنت نہ کر سکنے والے بھی ان سے اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق فائدہ حاصل کریں، اور یہ کام حضرت حکیم الامت کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا، اس طرح حضرت کا افادہ

عام سے عام تر ہوتا رہا۔

میرے دوست مولانا قاری عبدالستار صاحب فتح پوری ایک ذی استعداد، باصلاحیت، صالحیت کے پیکر، سراپا حرکت وعمل عالم دین ہیں، دینی خدمات کا خاص ذوق رکھتے ہیں، ایک صاحب ذوق شاعر بھی ہیں، لیکن ان کی شاعری حمد ونعت کے نورانی دائرہ میں رہتی ہے، اس سے آگے شاعری کی ان وادیوں میں قدم نہیں رکھتے جن کے بارے میں قرآن نے **فی کل واد یھیمون** سے تعبیر کیا ہے، یعنی وہ ہر وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ قاری عبدالستار صاحب اس سے مبرا ہیں۔

وہ اپنی دینی خدمات میں مشغول تھے، پھر جیسا کہ راہ صداقت کے ہر مسافر کی قسمت ہے کہ اللہ کی طرف سے کچھ آزمائش کے مرحلے آتے ہیں، جس کے ہجوم میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا ہر طرف سے تنگ ہورہی ہے، ایسی تنگ ہورہی کہ آدمی گھبرا اٹھتا ہے، اور بے ساختہ دل سے صدا نکلتی ہے، **متی نصر اللہ**؟ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ ایسا مرحلہ قاری صاحب کی خدمات کے سفر میں بھی پیش آیا، میں نے انھیں مشورہ دیا کہ تنہائی اور سکوت کے ان ایام میں حکیم الامت حضرت تھانوی کے مواعظ کا مطالعہ کیجئے، ان کے مطالعہ سے اللہ کی محبت دل میں جاگے گی، قلب کو قوت حاصل ہوگی، ایمانی اطمینان میں اضافہ ہوگا، راہ عمل ہموار ہوگی، علوم ومعارف کی ایک پر کیف دنیا نگاہوں میں آئے گی، قاری صاحب نے اپنی سعادت مندی سے اس مشورہ کو قبول کیا، اور حضرت تھانوی کے مواعظ کا مجموعہ جو ’’التبلیغ‘‘ نام سے کئی جلدوں میں شائع ہوا تھا اس کا مطالعہ شروع کیا، اور جن آثار ونتائج کا میں مواعظ کے مطالعہ سے امیدوار تھا، وہ آثار بہت قوت سے ظاہر ہونے شروع ہوئے، اور اس پر ایک مزید اضافہ انھوں نے یہ کیا کہ ان مواعظ سے مختلف علوم ومعارف، نصائح وحکم، اور سبق آموز واقعات کے اقتباسات جمع کرنے کی مہم چھیڑ دی، ایک حد تک اس کام کو آگے بڑھانے کے بعد مجھے اطلاع دی، مجھے بہت خوشی ہوئی، یہ کام میں چاہتا تھا کہ خود کروں، یا اپنے لوگوں میں سے کسی صاحب ذوق سے کراؤں، قاری عبدالستار صاحب نے جب کام شروع کردیا تو میری دلی مراد برآنے کا سامان ہوا، میں نے کام کا نمونہ منگوایا، دیکھا تو مزید خوشی ہوئی، انھوں نے ڈوب کر مواعظ کا مطالعہ کیا اور بہت خوبصورت موتی نکالے، اور انھیں

سلیقے سے سجایا، یہ بڑی محنت، بڑے ذوق، بڑی جانکاہی اور تسلسل کا عمل تھا، قاری صاحب جن خدمات میں مشغول تھے ان میں مشغول رہتے ہوئے اس مسلسل اور جانکاہ عمل کا انھیں موقع نہ ملتا، مگر:

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

کبھی شر کے بطن سے خیر کا ظہور ہوتا ہے، حالات نے انھیں پریشان کیا، مجبور کیا، لیکن آدمی کے لئے میدان عمل تنگ نہیں ہے، انھیں ایک اور میدان مل گیا، اور انھوں نے خوب سے خوب تر محنت کی، اور محنت کا نتیجہ ایک ایسی دینی وعرفانی خدمت کی شکل میں آیا کہ اس کی افادیت دور تک اور دیر تک رہے گی۔ ان شاءاللہ

قاری صاحب کا عزم ہے کہ تلخیص واقتباس کا یہ سلسلہ حضرت تھانوی کے تمام مواعظ تک پھیلائیں، اس طرح تمام مواعظ کا بنظر غائر مطالعہ بھی ہو جائے گا، اور ان کی افادیت ایک نئی شکل میں جلوہ گر بھی ہوگی، ان مواعظ کی روحانی، علمی وعرفانی تاثیر سے پہلے تو پڑھنے والا متأثر ہوتا ہے، پھر دوسروں کو وہ اس تاثیر میں شریک کر لیتا ہے، اور **الدال علی الخیر کفاعله** کے مصداق حق تعالی کے یہاں امید ہے کہ یہ خدمت مقبول ہوگی۔

اللہ تعالی حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے فیوض وبرکات سے پوری امت کو بہرہ ور فرمائیں۔

اعجاز احمد اعظمی
۳۰ رجب ۱۴۳۴ھ

☆☆☆☆☆☆

تقریظ
بر
''عمدۃ الاقاویل فی تحقیق الاباطیل''

الحمد الله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین. اما بعد

دین اسلام کا آغاز اور اس کا ظہور عربی زبان میں ہوا، قرآن کریم عربی مبین میں نازل ہوا، اور ایسے اسلوب میں اور ایسی معنویت اور داخلی اور خارجی کمالات کے ساتھ نازل ہوا، نیز فصاحت وبلاغت کا وہ بلند مقام اسے حاصل ہوا کہ دنیا آج تک انگشت بدنداں اور سربگریباں ہے، اور کیوں نہ ہو؟ اللہ کا کلام ہے، اللہ کی صفت ہے تو جس طرح اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے ایسے ہی اس کا کلام بھی یکتا اور بے نظیر ہے۔

اسلامی علوم ومعارف کا تمام تر ذخیرہ عربی زبان میں ہے، فرامین وارشادات رسول عربی زبان میں ہے، آثار صحابہ وتابعین عربی زبان میں ہے، تفسیری کنوز وذخائر عربی زبان میں ہیں، حدیث رسول کے متعلقہ تمام علوم فنون عربی زبان میں ہیں، علوم فقہ کے تمام شعبے عربی زبان میں ہیں، عربی زبان اسلام کی بنیادی زبان ہے، اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام کے علوم وفنون کا تمام تر ذخیرہ عربی زبان میں ہو۔

پھر جوں جوں اسلام کا حلقہ وسیع ہوتا گیا دوسری زبانیں بھی اسلامی سرمایہ سے مالا مال ہوتی رہیں، بالخصوص فارسی زبان میں اس کا بڑا سرمایہ منتقل ہوا، مگر اردو زبان کی خوش بختی دیکھئے کہ اس کا وجود بہت بعد میں ہوا، ابھی چند ہی صدیاں گزری ہیں کہ یہ زبان عہد طفولیت سے نکل کر نشو

نما پاتے ہوئے عہد شباب تک پہونچی ہے، مگر دیکھا جائے تو عربی زبان کے بعد اسلامی علوم و معارف کی سب سے زیادہ سرمایہ داریہی اردو زبان معلوم ہوتی ہے، ہر علم وفن کا ذخیرہ اردو زبان میں موجود ہے، تفسیر قرآن سے متعلق، احادیث رسول سے متعلق، فقہ اسلامی سے متعلق، جو دین کے بنیادی علوم ہیں، اردو زبان میں ہر ایک کا معتد بہ ذخیرہ جگمگا رہا ہے، کسی کا بہت زیادہ کسی کا کسی کا قدرے کم۔

تفسیر قرآن پر نظر کیجئے تو حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی تفسیر ’’موضح القرآن‘‘ سے شروع ہوکر موجودہ دور کے متعدد علما و مشائخ کی تفسیری کاوشوں، بالخصوص حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا ادریس کاندھلوی کی ’’معارف القرآن‘‘ اور مولانا عاشق الٰہی بلندشہری کی تفسیر ’’انوارالبیان‘‘ تک ایک زبردست تفسیری سرمایہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، لیکن بعض تفسیری نکات ودقائق جن کا تعلق زبان وبیان کی گہرائیوں سے ہے، حضرات علما نے انہیں عربی زبان کے سفینوں میں ہی باقی رکھا، اردو ایک اجنبی زبان ہے، ان نکات ودقائق کو اس زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، کیوں کہ اس کے مخاطب علما ہیں اور وہ عربی میں دسترس رکھتے ہیں۔

اسی طرح حدیث سے متعلق بہت سے فنون اردو میں آچکے ہیں، مگر کچھ فنی چیزیں جن کا تعلق خاص اہل علم سے ہے، انہیں بھی عموماً اردو زبان میں منتقل نہیں کیا گیا، مثلاً اسماء رجال کا وسیع وعریض علم، عربی زبان کی ابھی تک امانت ہے، احادیث رسول کے بحر ناپیدا کنار میں ایک بڑا علم احادیث کی مختلف حیثیات کی معرفت ہے، جب کسی حدیث کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن میں یہی بات راسخ ہوتی ہے کہ وہ ارشاد رسول ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ کتنی ہی باتیں لوگوں کی زبانوں پر، کتابوں کے دفاتر میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوکر چل پڑی ہیں، حالانکہ تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ ارشاد رسول نہیں ہے، ایسی باتوں کا جاننا اہل علم کے لئے بالخصوص، عام اہل اسلام کے لئے بالعموم ضروری ہے، کیوں کہ جو بات رسول اللہ ﷺ نے نہ فرمائی ہو اس کو آپ کی طرف منسوب کرنا سخت گناہ کبیرہ ہے، آپ ﷺ کا ہر فرمان دین ہے، اور جو کچھ آپ نے نہیں فرمایا اس کو آپ کی طرف منسوب کرنا گویا دین میں اضافہ کرنا ہے، اور یہ درحقیقت افترا علی اللہ و

علی الرسول ہے۔ اردو زبان میں اس کی طرف پیش رفت کم ہوئی ہے، کیوں کہ اہل علم عربی زبان میں مہارت کی وجہ سے اصل بنیادی مراجع سے اس کو دریافت کر سکتے ہیں، لیکن اب جب کہ حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ اردو میں آچکا ہے، ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اردوخواں طبقہ کو بھی اس کی واقفیت بہم پہونچائی جائے، تا کہ تمام اہل اسلام ایک بڑی غلطی سے محفوظ رہ سکیں۔

مولانا رضوان الدین معروفی سلمہ اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا کو تفسیر وحدیث کے ان خاص موضوعات کی طرف پیش رفت کی خصوصی توفیق اللہ کی جانب سے مرحمت ہوئی، انہوں نے تفسیری نکات ومعارف اور اس کے حقائق ودقائق جن سے اردو زبان کا دامن خالی تھا، بڑی خوبصورتی کے ساتھ اور عالم فہم انداز میں ''اللؤ لؤ والمرجان فی لطائف القرآن'' نامی کتاب میں اردو زبان میں انہیں تحریر فرمایا ہے، ایسے ایسے علوم ومعارف جن سے علم ومعرفت کی دنیا روشن ہوتی ہے، دل شاد ہوتا ہے، آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

اس خدمت کے بعد احادیث رسول کے اس خاص عنوان کی طرف متوجہ ہوئے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا، اور انہوں نے ان احادیث کی تحقیق کا بیڑا اٹھایا جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوکر رائج ہوگئی ہیں، حالانکہ وہ کلام نبوت نہیں ہیں، انہوں نے اپنی اس تحقیق کے آغاز میں ایک مفصل اور مبسوط مقدمہ لکھا ہے جو بہت ہی معلومات افزا ہے، اس میں انہوں نے حفاظتِ حدیث پر مفصل گفتگو کی ہے، پھر حدیثیں گھڑنے کے آغاز، اس کے اسباب ومحرکات پر تفصیلی کلام کیا ہے، پھر موضوع حدیثوں کی شناخت اور ان کی علامات پر بڑی جامع بحث کی ہے، اردو زبان میں اس موضوع پر اتنا مفصل اور جامع مقالہ شاید کہیں موجود ہو۔

اس مفصل مقدمہ کے بعد ایک سو سے زائد ایسی روایتوں کی تحقیق کی ہے جو حدیثوں کے نام سے رائج ہیں مگر وہ حقیقت میں حدیث رسول ﷺ نہیں ہیں، ہر ایک کی مکمل تحقیق کی ہے، اگلے پچھلے علما ومحدثین اور نقاد واہل تحقیق کے حوالے سے کلام کو مدلل کیا ہے۔

یہ ایک بڑی محققانہ علمی ودینی خدمت ہے، مولانا موصوف قابل مبارک باد ہیں، اور حق تعالیٰ کا ان پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے حدیث پاک کی تدریس کے ساتھ اس اہم موضوع کو تحقیق وتنقید کا ہدف بنایا، اور ماشاء اللہ ان سے یہ عظیم اور مفید خدمت کمال حسن وخوبی کے ساتھ

لی گئی، اور کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب دانستہ یا نادانستہ ایسی باتیں منسوب کی ہیں، جن سے آپ بری ہیں، تو حق تعالی نے ایسے لوگوں کو کھڑا کر دیا اور انہیں توفیق دی کہ اس غلط نسبت کی غلطی ظاہر کر کے آپ کی برأت کو واضح کریں۔

خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں ایک زندیق کو قتل کے لئے لایا گیا، وہ کہنے لگا تم مجھے تو قتل کر دو گے لیکن ان ایک ہزار حدیثوں کا کیا کرو گے جو میں نے وضع کر کے امت میں رائج کر دی ہیں، ہارون رشید نے جواب دیا، اے دشمن خدا! تو ابو اسحاق فرازی اور عبداللہ بن مبارک سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے؟ جو انہیں تحقیق کی چھلنی میں چھان کر ایک ایک حرف الگ کر دیں گے

غلط روایات کی غلطی واضح کر دینا ایک بڑی علمی و دینی خدمت ہے، جس کی توفیق اللہ تعالی نے مولانا رضوان الدین صاحب سلمہ کو عطا فرمائی۔

اللہ تعالی اس خدمت کو قبول فرمائیں اور انہیں علم و عمل اور روحانیت کے بلند درجات پر فائز کریں، اور امت کو ان کی خدمات سے بیش از بیش فائدہ پہونچائیں۔ آمین

☆☆☆☆☆☆

مقدمہ ’’تبلیغی جماعت کی شرعی حیثیت‘‘

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اندر انگریزوں کے خلاف ایک زبردست بغاوت ہوئی، لیکن وہ ناکام ہوئی، مغل حکومت کا چراغ جو ایک عرصہ سے جھلملا رہا تھا اس بغاوت کی آندھی میں بجھ گیا، اب پورے ملک میں انگریزوں کی جو مذہباً عیسائی تھے، حکومت قائم ہوگئی، اس حکومت نے بغاوت کا انتقام اس طرح لیا کہ ایک زبردست مہم کے تحت ذرا ذرا سے فرد جرم کے باعث پورے ملک میں پھانسیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کردیا، درۂ خیبر سے لے کر مشرقی بنگال تک کا ہر درخت پھانسی کا تختہ بنا ہوا تھا، چونکہ اس بغاوت میں علما بطور خاص شریک تھے، اس لئے نشانہ پر سب سے زیادہ یہی آئے، خبر دینے والوں نے خبر دی کہ پچاس ہزار سے زیادہ علما تختۂ دار پر کھینچے گئے۔ سوچئے! جس ملک سے پچاس ہزار علما ناپید کردیئے جائیں وہاں علم کیا باقی رہ سکتا ہے؟ اور جب علم ہی نہیں تو وہ دین بھی ناپید ہوجائے گا جس کا مدار علم پر ہوگا۔

چنانچہ اس وقت یہی ہوا کہ علما ختم ہوئے، علم دین نابود ہوا، دین میں اضمحلال پیدا ہوا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی علیہ الرحمہ کی ایک بات نقل کی ہے جس سے اس وقت کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا میرٹھی ’’تذکرۃ الخلیل‘‘ میں لکھتے ہیں:

> ’’ایک مرتبہ بندہ حاضر تھا، آپ (شیخ الہند) نے سر اٹھایا اور فرمایا مولوی عاشق الٰہی! ایک بات کہوں، ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ ہندوستان میں علم کی اتنی کمی تھی کہ دور کیوں جاؤ؟ خود ہمارے اضلاع (سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ وغیرہ) میں جنازہ کی نماز پڑھانے والا مشکل سے ملتا تھا‘‘۔ (ص ۱۸۱)

یہ حال اس ملک کا ہو گیا تھا، جہاں کبھی ہر طرف علم کی بہاریں خیمہ زن تھیں، اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے اللہ تعالی نے اہل دل کے دلوں میں ایک بات ڈالی، وہ یہ کہ دینی تعلیم گاہوں کا ایک نیا نظام شروع کیا جائے، چنانچہ دارالعلوم دیو بند سے اس کا آغاز ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے دس بیس سال میں مدارس کا جال بچھتا چلا گیا، اور علم کی بہاریں پھر واپس ہونے لگیں، لیکن اس کے باوجود ایک ہمہ گیر تحریک کی ضرورت تھی جو علاوہ خواص کے عوام کے درمیان مؤثر کام کرے، علما کے مواعظ کا سلسلہ جاری تھا، کچھ انجمنوں کے ذریعے کام کر رہے تھے، بہر حال بیشتر علما اپنی اپنی جگہ فکر مند تھے کہ دین کی اشاعت کس طرح ہمہ گیر پیانے پر عام ہو، مشائخِ طریقت تزکیۂ نفوس کا فریضہ انجام دے رہے، بعض حضرات مستقلاً خانقاہ میں قیام رکھتے، بعض بزرگان دین دورے کرتے، عوام کے درمیان جاتے، اور ان سب طریقوں کے اثرات آہستہ آہستہ مسلمانوں کے عمومی معاشرہ پر پڑ رہے تھے، اسی تجرباتی دور میں مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ایک صاحب عزیمت اور صاحب نسبت گھرانے کے فرد تھے، ابتداء حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی صحبت میں رہے، پھر باضابطہ تربیت حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی، جب ان کا قیام بستی نظام الدین بنگلہ والی مسجد میں اپنے والد مولانا محمد اسماعیل صاحب اور اپنے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب کی جگہ پر ہوا، اور میوات کی طرف سے آنے والے بدووں اور دیہاتیوں سے سابقہ پڑا، نیز ان کی جہالت اور بے دینی کے مناظر دیکھے تو مولانا کے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی، اور مدتوں کے ریاض اور دعاؤں کے بعد ایک خاص طریقے سے ان میں کام کرنے کا تجربہ ہوا، اس کے فوائد ظاہر ہوئے، پھر انہوں نے اس طریقے کو عام کرنا چاہا، کیوں کہ تجربے سے اس کے منافع ظاہر ہو چکے تھے، انہوں نے علما کو بھی دعوت دی کہ اس طریقۂ خاص کو دیکھیں، اگر مفید محسوس ہو تو اسے اختیار کریں، کچھ مضرتیں ہو تو اسے ظاہر کریں۔ یہ بات ان کے مطبوعہ ملفوظات کے پڑھنے سے بالکل عیاں ہیں، انہیں جہاں یہ تڑپ تھی کہ اس طریقۂ خاص کو لوگ اپنا کر اشاعت دین کا کام عام کریں، وہیں یہ بھی اندیشہ رہا کرتا تھا کہ کہیں یہ طریقہ منہاجِ سنت اور اصولِ شریعت سے منحرف نہ ہو جائے، اسی لئے وہ بار بار علما کو اس کی طرف متوجہ فرماتے تھے۔

مولانا کے نزدیک عوام میں دین کو عام کرنے کا یہ ایک مفید طریقہ تھا، چاہتے تھے کہ یہ

طریقہ صحیح منہاج پر کام کرتا رہے، بانی کے اخلاص، ان کی علمی گرفت اور تحریک کے آغاز ہونے کی وجہ سے یہ طریقہ ایک طریقۂ کار ہی رہا، اس میں مقصدیت کی شان نہیں داخل ہوئی تھی، غلو ابھی نہیں پیدا ہوا تھا، لوگ اسے تبلیغ واشاعت کا ایک طریقہ ہی سمجھتے تھے، بذات خود یہی دین نہیں بنا تھا، لیکن یہ کام بڑھتا اور پھیلتا گیا، خواص سے نکل کر عوام میں داخل ہوا، اور عوام ہی اس میں نمایاں مقام حاصل کرنے لگے، بانی کا انتقال ہوگیا، اس پر سے علمی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس میں اصرار داخل ہوا، ہر شخص پر اصرار کہ اس کام کو ضرور ہی اختیار کرے، اس اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ کام کا یہی طریقہ، اب طریقۂ کار نہیں رہا بلکہ مقاصد دین میں داخل ہوکر عبادت مقصودہ بن گیا، اس کے بعد یہ بات آہستہ آہستہ عموم پکڑتی چلی گئی کہ جو خاص اس طریقۂ مروج میں شامل نہیں ہوتا وہ مورد اعتراض بننے لگا۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ تو علما کو دعوت دیتے تھے کہ اس طریقۂ خاص کو دیکھیں، اور شریعت سے کہیں انحراف نظر آئے تو مطلع کریں، اصلاح کریں، اور اب اصرار کی وجہ سے اور عبادت مقصودہ بن جانے وجہ سے صورت حال پلٹ گئی ہے۔ اب علما کو اسی پیمانے پر ناپا جانا لگا، اگر کوئی عالم دعوت وتبلیغ کے اس طریقۂ خاص میں شامل ہے تب تو مقبول ہے، ورنہ نامقبول! پہلے علما کی نظر اور ان کا علم معیار تھا، جس پر اس طریقۂ خاص کو پرکھا جاتا تھا، اب یہی طریقۂ خاص معیار بن گیا ہے، اور علما کو اس کسوٹی پر پرکھا جانے لگا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کام بذات خود دین مقصود اور ضروری ہے۔

اسی اصرار اور عبادت مقصودہ بن جانے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس طریقۂ خاص میں شمول کی دعوت کو عام کر دیا گیا، خواہ عالم ہو یا عامی ہو، شیخ طریقت ہو یا صاحب ارادت ہر ایک کو دعوت دی گئی کہ اس ''رسم خاص'' کو اختیار کرے، اور یہ دعوت اتنی عام ہوگئی گویا یہی اسلام کی دعوت بن گئی، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ کسی بھی غیر مقصود طریقۂ کار کی عام دعوت دینا صحیح نہیں ہوتا، یہ حق صرف نبی کو ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اس طریقۂ کار میں شامل ہونے کی دعوت دے، جو اللہ کی طرف سے وہ لایا ہے، باقی انبیاء کے علاوہ کسی نے اللہ ورسول کے حکم کی تعمیل کی غرض سے اگر کوئی خاص طریقہ ایجاد کیا ہے تو اسے حق نہیں ہے کہ سب کو اس میں شمول کی دعوت دے، اور اس کا پابند بنائے۔

غیر نبی کے ایجاد کردہ کسی طریقے کو خواہ وہ تجربہ سے کتنا ہی مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہو، مقصود بنا دینا اس کی طرف دعوت دینا، اس پر اصرار کرنا، اس میں شامل نہ ہونے والوں پر اعتراض کرنا '**من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو رد**' (جس نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز جاری کر کے شامل کردی جو اس میں شامل نہیں ہے، وہ رد ہے) کے مصداق ہے۔

اس کام کا جس قدر پھیلاؤ ہوتا گیا ہر مزاج و مذاق کے لوگ اس میں شامل ہوتے گئے، اور ایسے لوگ اس میں مقتدائیت کے منصب پر قابض ہوتے گئے جنہیں دین کا ضروری علم بھی نہ تھا، اسی کے بقدر اس کا ہر جز اپنی حد سے تجاوز کرتا گیا، وسائل مقاصد بن گئے، غلو بڑھتا گیا، غیر ضروری امور ضروری بنتے گئے، التزام مالایلزم کی بھیڑ لگ گئی۔ خاص اس تبلیغی طریقۂ کار کا شاید کوئی ایسا جز ہو جو اعتدال پر رہ گیا ہو، اس بے اعتدالی اور غلو کی وجہ سے علما کو فکر ہوئی، گو عام مسلمانوں میں اس خاص طریقہ کا اتنا غلبہ اور اس کا اتنا رعب و دبدبہ ہے کہ اب اس کی خرابیوں پر متنبہ کرنا مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کی دشمنی مول لینا ہے، لیکن حق کو کہنا ضروری ہے اور اس میں جتنا باطل آمیز ہو گیا ہے اس کو الگ کرنا واجب ہے، اس لئے کچھ لوگ دبی زبان سے، کچھ لوگ کھلم کھلا ان خرابیوں کا اظہار کرنے لگے ہیں، گو کہ دنیاوی لحاظ سے ان کا یہ اظہار و بیان ان پر خاصا گراں پڑ رہا ہے، تاہم شریعت کا تحفظ ضروری ہے۔

ان علماء راسخین میں جو اس طریقۂ خاص کے غلو اور حد اعتدال سے خارج ہونے پر متنبہ ہوئے اور چونکے، ایک ہمارے بزرگ عالم جنہیں علم شریعت میں گہرا رسوخ حاصل ہے، حضرت مولانا محمد فاروق صاحب مدظلہ[۱] ہیں، جو موضع اتراؤں ضلع الہ باد کے رہنے والے ہیں، اور عارف باللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے معتمد خاص ہیں، ان سے اس مسئلہ میں استفتا کیا گیا، انہوں نے بے خوف لومۃ لائم مسئلہ کی اصل صورت حال واضح کردی، البتہ زبان اور انداز بحث خالص علمی اختیار کیا تا کہ علما اسے بغور پڑھیں اور سمجھیں، اور ناسمجھ لوگ اسے فتنہ کا دروازہ نہ بنالیں، یہ رسالہ ایک مرتبہ چھپ چکا ہے، وہ ایڈیشن ختم ہو گیا ہے، پھر لوگوں میں اس طلب بڑھ رہی ہے، دوبارہ اسے شائع کیا جارہا ہے۔ خدا کرے تحفظ شریعت کے لئے یہ مفید ثابت ہو اور خواص کو براہ راست اور عوام کو بواسطۂ اہل علم نفع پہونچائے۔

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) مولانا محمد فاروق صاحب نے ۱۳۶۵ھ میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم کی تکمیل کی، ابتدائی اور متوسطات تک کی تعلیم الہ آباد میں حاصل کی تھی۔ حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے خاص معتقد تھے، طالب علمی کے زمانے میں تھانہ بھون حضرتؒ کی خدمت میں حاضری بھی دی تھی، فراغت کے بعد حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ اول حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کا دامن تھاما، پھر ان کے وصال کے بعد کسی شیخِ کامل کی تلاش ہوئی تو طلب وجستجو نے مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں فتح پور پہونچایا، یہاں اپنی سلامتی طبع، اعتقادِ کامل اور رزانتِ عقل کی وجہ سے بہت جلد حضرت کی خدمت میں رُسوخ حاصل کرلیا، حضرت کو ان پر بہت اعتماد ہوگیا تھا۔ اہم امور میں حضرت ان سے مشورہ بھی لیتے تھے۔ وہ حضرت کے مزاج شناس تھے، حضرت کی منشا پہچان کر اس کے مطابق کام کرتے تھے۔

تبلیغی جماعت کے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں انھوں نے مفصل گفتگو کی، اور جو کچھ ان کی نگاہ میں حق تھا۔ اسے واضح کردیا۔ گوکہ اس کے باعث وہ بہت سے عوام وخواص کا نشانۂ ملامت بنے، مگر کوئی اندیشہ وہ خاطر میں نہ لائے، افسوس کہ علماء نے ان کے اس فتویٰ پر اثباتاً یا نفیاً کوئی توجہ نہ دی، اگر ان کی گفتگو حق ہے، تو اسے قبول کرنا چاہئے، اور اگر اس میں کوئی غلطی ہے، تو اسے واضح کرنا چاہئے۔ مولانا محمد فاروق صاحب بہت وسیع القلب انسان تھے، اگر دلائل سے ان کی غلطی واضح کی جاتی تو اسے وہ بے تکلف قبول کرلیتے۔ بلکہ وہ اس کے منتظر رہا کرتے تھے، بات کی پچ جانتے ہی نہ تھے، ان کا فتویٰ آج بھی اہل علم کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ (کھوئے ہوؤں کی جستجو ص ۴۵۰)

مولانا فاروق صاحب نے تبلیغی جماعت سے متعلق ایک مفصل کتاب ''الکلام البلیغ فی احکام التبلیغ''، بھی لکھی ہے، جس میں موجودہ تبلیغی جماعت کے طریقہ کار کا اصول شرع کی روشنی میں محققانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہت ہی زیادہ بصیرت افروز اور علما کے لئے خاصے کی چیز ہے، جس نقطہ نظر سے مولانا نے اس کتاب میں بحث کی ہے اس نظر سے ابھی تک کسی بھی صاحب علم نے تبلیغی جماعت کو نہیں دیکھا، یہ کتاب خاص علما کے لئے ہے۔

مولانا فاروق صاحب کا انتقال ۱۴؍صفر ۱۴۲۱ھ میں ہوا ہے۔